عمران خان کی درویش صفت خالہ نعیمہ آپا کی پُراثر سوانح حیات

/urdudigest.pk

مارچ 2013ء

اُردو ڈائجسٹ

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

شرافت، دیانت اور محبت کے خمیر میں گندھے ہوئے

قاضی حسین احمد

یادگار تحریریں

ستر سال کے قدیم فراق کے بعد

چند گھنٹوں کا وصال

''سمپورن سنگھ'' کو ملنے آنے والے گلزار کو بھی ''سمپورن سنگھ'' کے پاس چھوڑ گئے...

گلزار

دورۂ پاکستان کے پَل پَل کا احوال ایوب خاور اور وصی شاہ کے شاعرانہ قلم سے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا قرآن

پھر جب صور پھونکا جائے گا تو اس دن نہ تو ان میں قرابتیں ہوں گی اور نہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے O تو جن کے پلڑے بھاری ہوں گے، وہ فلاح پانے والے ہیں O اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے سو وہی لوگ ہیں جو اپنی جان ہار بیٹھے۔ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے O ان کے منہ کو آگ جھلس دے گی اور وہ اس میں بدشکل ہو رہے ہوں گے O کیا ہماری آیتیں تم کو سنائی نہ جاتی تھیں۔ پھر تم ان کو جھٹلاتے تھے O

(مومنون: ۲۳: ۱۰۵۔۱۰۱)

رسول ﷺ کا فرمان

جنت کی نعمتیں، آئیہ کریمہ۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ چیز (یعنی جنت) تیار کر رکھی ہے جس کو نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے اس کے متعلق سنا اور نہ کسی انسان کے خیال و تصور کی اس تک رسائی ہوئی۔ قرآن مجید میں سورۃ السجدہ کی آیت ۱۷ میں ہے: ''پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزا میں ان کے لیے چھپا کر رکھا گیا ہے اس کی متنفس کو خبر نہیں ہے۔''

(صحیح بخاری کتاب ۵۹۔ باب ۸: مسلم کتاب الجنۃ ابتدائی احادیث)

اُردو ڈائجسٹ

مارچ ۲۰۱۳ء
ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ
جلد نمبر ۵۳ شمارہ ۳

www.urdudigest.pk

صدر مجلس ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ الطاف حسن قریشی
مینیجنگ ایڈیٹر طیب اعجاز قریشی

ایڈیٹر اختر عباس
مجلسِ تحریر حافظ افروغ حسن ، سید عاصم محمود ، صغیرہ بانو شیریں
نوید اسلام صدیقی ، سلمیٰ اعوان
مہتمم طباعت فاروق اعجاز قریشی **انچارج کمیونیکیشن** افنان کامران قریشی
تغلیق و تزئین محمد شبیر، راکعہ رضا **کمپوزر** اشرف سکندر
پروف خوان کلیم اللہ فاروقی **معاونین** غلام سجاد، حنا انور

مارکیٹنگ/اشتہارات

advertisement@urdu-digest.com

ڈائریکٹر مارکیٹنگ ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093
مینیجر ایڈورٹائزمنٹ احمد فیاض 0322-7474010
لاہور ندیم حامد 0300-4242620
گجرات/گوجرانوالہ احسان اللہ بٹ 0300-9620294

سالانہ خریداری

خریداری نمبر ضرور تحریر کیجیے

subscription@urdu-digest.com فون: +92-42-37589957

اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے

330 روپے کی شاندار بچت کے ساتھ

پاکستان 1080 کے بجائے 750 روپے میں

بیرونِ ملک 50 امریکی ڈالر

اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں

325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور

فون نمبر: +92-42-35290738 فیکس: +92-42-35290731

editor@urdu-digest.com

قیمت: 90 روپے

طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے جسارت پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر سمن آباد لاہور سے شائع کیا

منیجنگ ایڈیٹر نوٹ

اللہ کی رحمت

بس میں جگہ نہ ملی۔ کافی دیر انتظار کیا لیکن ہر بس مسافروں سے کھچا کھچ بھری آتی کچھ دیر اسٹاپ پر کھڑی ہوتی لیکن کوئی مسافر اترنے کا نام ہی نہ لیتا اور پھر چند لمحوں کے بعد دوبارہ اپنی منزل پر روانہ ہو جاتی۔ میرا بیٹا محمد عرشیان کئی دنوں سے بس پر سفر کرنے کی ضد کر رہا تھا۔ وہ میرے ہمراہ بانگ کانگ، ملائیشیا، دبئی اور امریکا میں ٹرین اور بسوں پر سفر کر چکا تھا۔ نسبتاً سستا، آسان، محفوظ اور تیز رفتار ہونے کی وجہ سے تمام شہری امیر ہوں یا غریب، بزرگ ہوں یا جوان یا طلبہ و طالبات ان ذرائع آمدورفت پر سفر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ٹکٹ لینے سے لے کر قطار بنا کر بس یا ٹرین میں سوار ہونے تک تمام مراحل ان شہریوں کی روزمرہ زندگی کا لازمی حصہ بن چکے ہیں۔ مجھے لگتا ہے، ذرائع آمدورفت کے نظام نے ان شہریوں کے کردار پر گہرا اور مثبت اثر ڈالا ہے۔ قطار بنانا، اپنی باری کا انتظار کرنا، صبر سے کام لینا یہ مثبت رویے ٹرانسپورٹ سسٹم کی وجہ ہی سے ان کے کلچر کا حصہ بن چکے ہیں۔

میں اپنے بیٹے کو میٹرو بس اسٹیشن تک لے جاتے ہوئے دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں وہاں جا کر اس کا تاثر اور اعتماد مجروح نہ ہو جائے۔ لیکن پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر کے جیسے جیسے ہم قذافی اسٹیڈیم کے اسٹیشن کی سیڑھیاں چڑھتے گئے، میرا سینہ فخر سے پھولتا گیا۔ یقین مانیے، دنیا کے کئی بڑے شہروں کی ریل اور بسوں پر سفر کرنے کے بعد مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ لاہور کا میٹرو بس سسٹم بہت سے ملکوں خصوصاً بھارت کے دارالحکومت نئی دہلی کے ''جنگلہ'' بس سسٹم سے بدرجہ بہتر ہے۔ بھارت سے آنے والے میرے کاروباری دوست ہمیشہ موٹروے کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے اور لاہور میں صفائی، جگہ جگہ پھول، سبزہ اور سندر انڈسٹریل اسٹیٹ کا انفراسٹرکچر دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ ذائقہ دار کھانے اور مہمان نوازی تو لاہوریوں کا خاصہ ہے ہی، وہ عمر بھر لاہور کو بھلا نہیں پاتے۔

اب یہ بس سسٹم... گو ہمیں جگہ نہ ملی لیکن جتنی خوشی بس میں سوار عام اور غریب لوگوں کے چہروں پر دیکھی، وہ پہلے کم ہی نظر آئی تھی۔ لوگ قطار بنا کر بس کے لیے گھنٹوں سے انتظار کر رہے تھے مگر پُرسکون تھے۔ میٹرو بس کا عملہ جن میں خواتین بھی شامل تھیں، شیشے، فرش اور جالیوں وغیرہ کو صاف کرنے میں مصروف تھا۔ ہر تین منٹ بعد گھڑی کے مطابق بس اسٹیشن پر پہنچ رہی تھی۔ اتوار کی وجہ سے کئی کھاتے پیتے لوگ بھی بچوں کو بس کی سیر کرانے اسٹیشن لائے ہوئے تھے۔ لیکن بس میں جگہ نہ ملنے کے باوجود خوش اور پُراعتماد نظر آئے۔ خواتین بھی اپنے بچوں کے ساتھ علیحدہ قطار میں کھڑی تھیں۔ ٹکٹ نہ ہونے کے باوجود کوئی بدتمیزی ہوتی نظر نہ آئی۔

ہم نے پُل پر کھڑے ہو کر قذافی اسٹیڈیم کا خوبصورت نظارہ کیا اور ٹکٹ لینے والے کاؤنٹر اور مشین کا بھرپور جائزہ لیا۔ تقریباً ۵۰ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد جب میں نے قطار میں لگے ایک بزرگ سے سوال کیا کہ آپ کو اس بس میں سفر کرنا کیسا لگا؟ تو مجھے مثبت جواب کی اُمید نہ تھی۔ مگر وہ کہنے لگے: ''بہت اچھا..... میں آج صبح اسی بس سے یہاں آیا تھا اور اب واپس جہیں منڈر جا رہا ہوں۔ ان سیڑھیوں کی کوئی پرواہ نہیں۔ اللہ اس ملک کو نوز داریوں، گیلانیوں اور چوہدریوں سے چھٹکارا دلائے اور شہباز شریف کو اس ملک کا صدر، وزیراعظم بنا دے۔ اس بس نے ہمیں عزت دی ہے اور جینا سکھا دیا۔''

بظاہر تو یہ بس لاہور میں چلی لیکن سبھی پاکستانیوں کو اُمید، حوصلہ اور جینے کی اُمنگ دے گئی۔ انتہائی کم وقت میں ۲۷ کلومیٹر طویل میٹرو بس کے لیے انفراسٹرکچر کی تعمیر بلاشبہ ہمارے انجینئروں، مزدوروں کی انتھک و شبانہ روز محنت اور شہباز شریف کی دیوانگی کے حد تک سُپرویژن (Supervision) کا نتیجہ ہے۔ اس تعمیر نے جہاں بہت سے لوگوں کے دعوے غلط ثابت کیے وہاں تعمیرات کے شعبے میں بھی انقلاب بپا کر دیا۔

شہباز شریف سے کسی کو لاکھ اختلاف ہو سکتے ہیں لیکن یہ وہ منصوبہ ہے جس سے غریب اور مفلوک الحال شہریوں کو سکون اور راحت ملی ہے۔ روزانہ ۸۰ ہزار غریب اور عام شہری اس سہولت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ انھوں نے کبھی ایسی ''عیاشی'' کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ایئرکنڈیشنڈ بس، صاف ستھرے اسٹیشن، بغیر جھکے، بغیر بس کے پیچھے بھاگے، عزت اور احترام کے ساتھ سفر۔ اللہ تعالیٰ غریبوں اور مسکینوں کی بہت سنتا ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ ان سے اچھے سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔ بس میں عام، غریب اور مفلس شہریوں کے چہروں پر خوشی دیکھ کر مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئے گی اور ہمارے وطن پر چھائے نحوست کے بادل جلد چھٹ جائیں گے۔ ان شاءاللہ

ہمیں اس موقع پر سیاسی اختلافات پس پشت ڈال کر نتائج دینے والے ہر رہنما کی تعریف کرنی چاہیے۔ یوں ملک میں نئی جمہوری روایات اور کچھ کر دکھانے کا عزم جنم لے گا۔ بلاوجہ منفی تنقید کے بجائے تمام سیاسی قیادت کو اس تجربے سے سبق سیکھنا چاہیے۔ تاکہ دیگر صوبوں میں بھی اسی قومی جذبے سے عام شہریوں کی زندگی بہتر بنانے، تعلیم اور صحت و صفائی فراہم کرنے والے عوام دوست منصوبے شروع ہو سکیں۔

طیب اعجاز قریشی
tayyab.aijaz@urdu-digest.com

فہرست

گوشہ خاص

118	حاجی گل شہید	قاضی حسین احمد (مرحوم)
114	آغا جان کی سنہری یادیں	ڈاکٹر سمیحہ راحیل قاضی
120	دنیائے سیاست کا ہر دل عزیز انسان	محمد اکرم رانجھا
105	شفیق باپ اور عظیم قائد	آصف لقمان قاضی
97	باپ تھے اور آئیڈیل بھی	سمیحہ راحیل قاضی
49	قاضی صیب	اختر عباس
101	اُمید، وسیع افق اور جہدِ مسلسل	عبدالغفار عزیز
108	جماعت کا پیراہن چھوٹا پڑ گیا	نور اسلم خان سے گفتگو

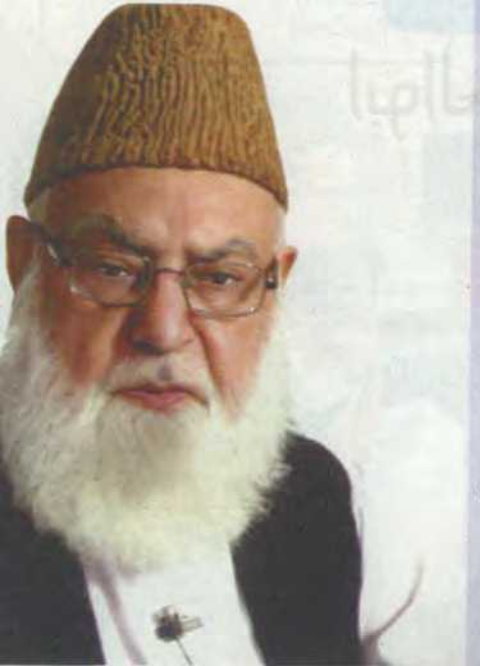

ہم کہاں کھڑے ہیں

فطرت کے اشارے اور تعزیریں

16

اُٹھنے والے سیاسی تلاطم کا تجزیہ الطاف حسن قریشی کے قلم سے

فوڈ پوائزننگ کے 7 جھوٹ

65

ڈاکٹر شائستہ خان

42

محمود غزنوی کو ہدایت دینے والے ولی اللہ کی اچھوتی داستان

ابوالحسن خرقانیؒ کا پیراہن

حبیب اشرف صبوحی

161 گلزار کا دورۂ پاکستان

خصوصی گوشہ

دوسری ہجرت ـــــ ایوب خاور

مرا بچپن یہیں کہیں پہ تھا ـــــ وصی شاہ

یادوں کی گٹھڑی

محبِ وطن ''۲۳ مارچ والے بابے'' کی اثر انگیز کہانی

نوید اسلام صدیقی

85

۱۵	کچھ اپنی زبان میں	الطاف حسن قریشی
۳۳	حضرت عبداللہ بن عمرؓ	خالد محمد خالد / ارشاد الرحمٰن
۴۵	عبادت میں حلاوت	ڈاکٹر فرخندہ کامران
۷۷	بیٹھے رہنا نئی نسل کو پسند	نیلوفر مرچنٹ
۸۱	جناح رنگ نسل	ڈاکٹر ندیم اکرام
۹۳	خود سے بیگانہ	صندل عظیم
۱۲۹	چنوں کا لفافہ	جاوید چودھری
۱۳۲	سات پریشان گن سائنسی دریافتیں	عبدالہادی سید
۱۳۵	طب کے نئے اُفق	طاہر اعجاز ڈنگہ
۱۳۸	موسم سرما کے ۱۰ ارچ	ڈاکٹر نصیر علی

250

قسمت کا دھنی

غریب دیہاتی، طالبہ پہنچ کر کامیاب کیسے ہوا؟ ـــ حیرت انگیز آپ بیتی

خالد ارشاد

71 اسکارف

کپڑے کا ٹکڑا جو نسوانی وقار کی علامت بن گیا

حنا انور

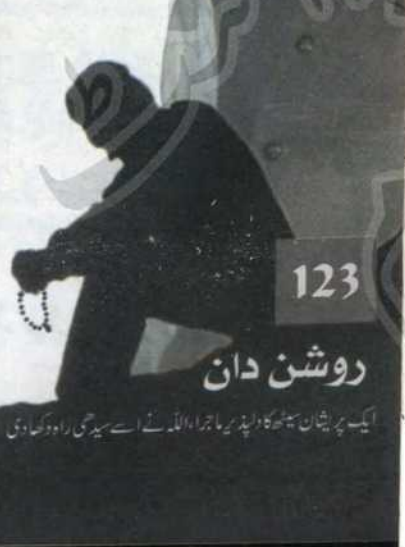

123

روشن دان

ایک پریشان سیلمہ کا دلپذیر ماجرا، اللہ نے اسے سیدھی راہ دکھا دی

زندگی سنوارنے والے ۱۳ رویے

فوزیہ فضل

سٹیفن آیم آر کووے کی انقلابی کتاب کا نہایت موثر خلاصہ

142

محمود عزیز

انوکھے لوگوں کے دلچسپ واقعات

241

حفیظ جالندھری سے جنرل سکندر مرزا کو پیپر ویٹ دے مارا

خونخوار ریچھ کا سامنا

ایک ماں اور موذی حیوان کے مابین دوبدو جنگ

ضمیر احمد

213

درویش نعیمہ آپا

آسیہ راشد

ماجد خان کی والدہ، عمران خان کی خالہ

225

۱۴۹	جڑیلوں کا نوٹنا سحر	سعید انصاری
۱۵۳	میراتھن کی تاریخ	کلیم اللہ فاروقی
۱۵۶	چیتے کی زندگی	ماہ دین یکی رڈ انٹر فردوس روحی
۱۹۴	مائی لنڈی	بشیر احمد چشتی
۱۹۷	ہوسن ویلڈ کی دو سہیلیاں	ایندی سا عمر تورا کینہ قاضی
۲۰۰	مدو بزرر	منزوا کرم
۲۰۳	راز ہستی	اعجاز احمد ٹنکہ
۲۰۹	خوش قسمت	ڈاکٹر زاہد پروین
۲۱۶	بابوستان کے حالی بابو	حسین احمد شیرازی
۲۲۲	مرفی لا	حنا انور
۲۳۱	باتیں دانش کی	رفیدہ کلیم فاروقی
۲۳۳	دنیا شیطان کی	محمود فیضانی
۲۴۴	بھیس بالکل مت جانو	پروفیسر ارشد جاوید
۲۴۷	ڈی ایچ اے کا ڈاکا	ڈاکٹر عائشہ صدیقہ
۲۵۷	فرق	ام ایمان
۲۶۱	مشورہ حاضر ہے	صغیرہ بانو شیریں
۲۶۴	کیسے کیسے چہرے	عمیر محمود
۲۶۷	اپنی سی کوشش	غلام سجاد
۲۷۱	قصہ کوئز	ادارہ
۲۷۳	چندلمحوں کا زبان کا چسکا	نوشین ناز
۲۷۷	چمن خیال	قارئین کے خطوط
۲۸۲	دردل پہ دستک	اختر عباس
۲۸۶	ماوروا ل کی شخصیات	چودھری محمد خلیل
۲۸۸	یوہوتو جانیں	ادارہ

سیاسی جماعتوں کی غیر معیاری رجسٹریشن

پارلیمنٹ کا یہ کارنامہ ہماری تاریخ میں یقیناً سنہری حروف سے لکھا جائے گا کہ اُس نے ایک آزاد، غیر جانبدار اور خود مختار الیکشن کمیشن کا نہایت مستحکم آئینی سانچہ فراہم کر دیا ہے۔ حکومت اور اپوزیشن نے جناب جسٹس (ر) فخر الدین جی ابراہیم کو چیف الیکشن کمشنر بنانے پر اتفاق کر کے دوسرا بڑا کارنامہ سرانجام دیا جن کا شمار پاکستان کی بااصول، جرأت مند اور صداقت شعار شخصیات میں ہوتا ہے۔ اُن کی سربراہی میں شفاف انتخابات کے سہانے خواب کی سدا بہار تعبیر کے لیے مختلف اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ عوام کی خواہشات کے مطابق انتخابی امیدواروں کی سکروٹنی کا ایک ایسا نظام ترتیب دینے کی سنجیدہ کوششیں ہو رہی ہیں جس میں ٹیکس چور، بینک ڈیفالٹرز، جعل ساز اور دہری شہریت کے حامل افراد انتخابات میں حصہ نہ لے سکیں اور اہل اور دیانت دار لوگوں کو آگے آنے کا موقع ملے۔ جناب شیخ الاسلام علامہ طاہر القادری جو آندھی کی طرح کینیڈا سے پاکستان آئے اور ہزاروں بچوں، عورتوں اور مردوں کے ہمراہ اسلام آباد کی ''کربلا'' میں پہنچ گئے، اور وہ عوامی طاقت کے بل بوتے پر حکومت سے یہ معاہدہ کر لینے میں کامیاب رہے کہ اسکروٹنی کے لیے ۳۰ دن دیے جائیں گے۔ اس کے بعد وہ الیکشن کمیشن کی تشکیلِ نو کے لیے کسی وکیل کی اعانت کے بغیر ازخود سپریم کورٹ میں پیش ہوئے، مگر وہاں تین روزہ سماعت کے دوران اُن کے تکبّر کا بت پاش پاش ہو گیا۔

الیکشن کمیشن پر لازم آتا ہے کہ وہ قومی زندگی کے اس نازک مرحلے میں بہت اونچی پرواز کے بجائے زمینی حقائق پر بھی نگاہ رکھے اور عملیت پسندی کا ثبوت دے۔ ہماری سیاسی زندگی میں جو خرابیاں گزشتہ چھ عشروں سے پرورش پاتی رہی ہیں، اُن کی ایک جست میں بیخ کنی سے گریز کیا جانا چاہیے۔ اگر سیاستدانوں کو جرائم پیشہ ثابت کرنے کی منہ زور مہم جاری رہی، تو تجربہ کار، جہاندیدہ اور عزت دار لوگ کنارہ کش ہو جائیں گے اور میدان میں نووارد، سیماب صفت اور تجربات کی تپش سے ناآشنا افراد اتریں گے جو کامیاب ہو کر جذباتی فیصلے کریں گے۔ اس اعتبار سے ماضی کو بہت زیادہ کھودنے کے بجائے ہمیں ارتقائی عمل کو فروغ دینا اور قوم کی عمومی اخلاقی صحت کے مطابق اعتدال اور توازن سے کام لیتے ہوئے اصلاحات کا مرحلہ طے کرنا ہوگا۔ الیکشن کمیشن کے بس میں جو کام تھا، اس میں اُس کی کارکردگی مایوس کن ہے، کیونکہ اُس نے ایک معیار مقرر کیے بغیر دو سو سترہ سیاسی جماعتیں رجسٹر کر لی ہیں جو ایک مذاق سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ ڈمی سیاسی جماعتیں، ڈمی اخبارات کی طرح جمہوریت کی صحت مند نشوونما میں بہت حائل رہیں گی، چنانچہ اُسے سیاسی جماعتوں کی رجسٹریشن کا سخت معیار مقرر کرنا، پورے عمل کو قابلِ اعتماد بنانا اور رائے دہندگان کو ذہنی انتشار سے محفوظ رکھنا ہوگا۔

الطاف حسن قریشی

ہم کہاں کھڑے ہیں

فطرت کے اشارے اور تعزیریں

آنے والے چند مہینے بڑے ہنگامہ خیز بھی ہوں گے اور ایک تبدیلی کے محرک بھی۔ غالب امکان یہ ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی اور صحیح سمت کا تعین کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔

اُٹھنے والے سیاسی تلاطم کا تجزیہ الطاف حسن قریشی کے قلم سے

زندگی روز بروز بوجھل اور حزن و ملال میں ڈھلتی جارہی ہے۔ سانحۂ کوئٹہ سے روح لرز اُٹھی ہے اور کراچی کے در و دیوار پر ہمارے نامۂ اعمال کی سیاہی پھیلتی جارہی ہے۔ لاہور میں جس بے دردی اور سفاکی سے ڈاکٹر علی حیدر اور اُن کا نوعمر بیٹا شہید کیے گئے' اُس نے سرطان کے پھوڑے کی ہلاکت آفرینی آشکار کردی ہے۔ پشاور میں اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ جناب خالد کندی اپنے ہی دفتر میں دہشت گردوں کی گولیوں کا نشانہ بنے اور اپنے اہل کاروں کے ہمراہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ بنوں اور اُس کے گردونواح میں دہشت گردی کے خون آشام واقعات کے شعلے چاروں طرف لپک رہے ہیں اور انہی میں جواں ہمت اور پُرعزم بشیر بلور شہید ہوئے۔ دہشت گردی اور فرقہ پرستی کے ڈانڈے آپس میں گڈمڈ ہو چلے ہیں اور حکومت بے بس دکھائی دیتی ہے جبکہ قومی سلامتی کے ادارے بھی ہر لحظہ دباؤ میں ہیں۔ اِس مہیب صورتِ حال کے بارے میں عمومی طور پر گہری تشویش تو پائی جاتی ہے' مگر ہماری قومی قیادت' ہماری عدلیہ اور ہماری فوج ایک واضح سمت اختیار کرنے سے گریزاں ہیں جبکہ بعض سیاسی اور مذہبی قائدین خوفناک دہشت گردی کو امریکی سازشوں کا شاخسانہ قرار دے رہے ہیں۔ اُن کے خیال میں امریکہ اور برطانیہ کی جابرانہ پالیسیوں کے نتیجے میں حریت پسند قبائل اپنی آزادی کے لیے خودکُش حملوں کا ہتھیار استعمال کرنے پر مجبور ہیں' اِس لیے اُن کے جذبوں اور قربانیوں کا احترام کیا جانا چاہیے۔ اُنہیں اِس امر کا بھی پورا یقین ہے کہ افغانستان سے قابض فوجوں کے انخلا سے دہشت گردی ختم ہو جائے گی اور فرقہ وارانہ تشدد کا تباہ کن سلسلہ بھی رک جائے گا اور اِن بنیادوں پر امریکہ اور اُس کے حواریوں کے خلاف جہاد ہمارے تمام تر مسائل کا حل ہے۔

حالات کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ عام انتخابات کی آمد آمد کے زمانے میں ایسے حادثات اور واقعات رونما ہو رہے ہیں جن سے تاثر ملتا ہے کہ یک سوئی کے ساتھ شاید عوام کو اپنے نمائندے منتخب کرنے کا موقع ہی نہ ملے اور دو تین سال کے لیے ٹیکنو کریٹس کی حکومت مسلط ہو جائے۔ گزشتہ مہینے اندیشہ ہائے دور دراز سیاہ بادلوں کی طرح ہمارے سیاسی اُفق پر تہہ در تہہ چھائے رہے' اُن میں بجلیاں بھی کوندتی رہیں اور زلزلے بھی آتے رہے۔

فوج کے ترجمان میجر جنرل عاصم سلیم باجوہ کے اِس دوٹوک پالیسی بیان کے باوجود کہ فوجی قیادت جمہوریت کے تسلسل پر یقین رکھتی ہے اور بروقت اور شفاف انتخابات قومی بقا کے لیے ضروری ہیں جبکہ بعض عناصر برملا کہہ رہے ہیں کہ انتخابات مقررہ وقت پر نہیں ہوسکیں گے' اور اگر ہو بھی گئے تو بہت خون خرابہ ہوگا اور فوج کو اقتدار سنبھالنا پڑے گا۔ اِسی تناظر میں قومی معیشت کی زبوں حالی کی باتیں بھی ہو رہی ہیں کہ ملک قرضوں کے بوجھ تلے سسک رہا ہے' اور توانائی کے بحران سے پیداوار اور برآمدات کے چشمے خشک ہوتے جارہے ہیں اور فطرت کی تعزیریں مختلف شکلوں میں ہمارے قومی وجود کو اپنے شکنجے میں کستی جارہی ہیں۔ پورا معاشرہ بے یقینی اور خوف کی لپیٹ میں ہے اور پانچ دس فی صد مراعات یافتہ طبقے کے سوا نوے فی صد آبادی غربت' بے روزگاری اور نفسیاتی ہیجان کا شکار ہے جو نظامِ حکومت چلانے والے فرعونوں اور شدادوں کے خلاف بغاوت پر تُلی ہوئی ہے اور کسی مسیحا کے انتظار میں ہے۔

☆☆☆

آج بظاہر تمام بڑی سیاسی اور مذہبی جماعتیں' سول سوسائٹی' عدلیہ' میڈیا اور فوج بروقت انتخابات کے بارے میں یک سو دکھائی دیتے ہیں اور ہمارے قابلِ احترام چیف الیکشن کمشنر جناب فخر الدین جی ابراہیم یہ اعلان بھی فرما چکے ہیں کہ دھاندلی کرنے والوں کے لیے وہ ڈراؤنا خواب ثابت ہوں گے' لیکن فضا میں سرگوشیوں کی سرسراہٹ بڑھتی جارہی ہے۔ پچھلے دنوں اسلام آباد جانا ہوا تو جناب زرداری کے پیرِ باصفا کے ایک رازداں سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے کہ پیر صاحب تو اپنے آپ کو انتخابات کے جھمیلوں سے الگ تھلگ رکھتے ہیں' تاہم زرداری صاحب اِن میں کم از کم ایک سال کی تاخیر کے خواہش مند ہیں' کیونکہ اُن کا نامۂ اعمال کارکردگی کے ترازو میں انتہائی بے وزن لگتا ہے۔ یہ آوازیں بھی سننے میں آرہی ہیں کہ غیر آئینی الیکشن کمیشن کے تحت ہونے والے انتخابات بھی غیر آئینی ہوں گے اور اُن کے نتائج تسلیم نہیں کیے جائیں گے۔ دہشت گردی کے روح فرسا واقعات پُرامن اور شفاف انتخابات کے امکانات پر سوالیہ نشانات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر بلوچستان میں نیم بغاوت کی وحشت اثر صورتِ حال بعض علاقوں میں پائی جاتی ہے اور سیاسی جماعتوں کے لیے انتخابات میں حصہ لینا محال ہوتا جارہا ہے۔ کچھ تجزیہ نگاروں کے مطابق پاکستان دشمن طاقتیں انتخابات کے عمل میں دراڑیں ڈالنے کے لیے شیعہ سنی اور دیوبندی بریلوی اختلافات کو ہوا دے کر فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکانے میں سرگرم ہیں جبکہ الیکشن کمیشن بھی پارلیمنٹ کے ارکان سے غیر ضروری چھیڑ چھاڑ کے ذریعے نئے نئے مسائل پیدا کر رہا ہے۔ انتخابات کے التوا کے حق میں سب سے اہم نکتہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ افغانستان سے اتحادی فوجوں کے انخلا کے وقت امریکہ اِس امر کا ضرور اہتمام کرے گا کہ پارلیمنٹ کے بجائے اُسے ایک اطاعت گزار ٹیکنو کریٹ حکومت کی معاونت دستیاب ہو۔

۲۴ فروری کی دوپہر اِس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کی حامل تھی کہ آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی نے سینئر ایڈیٹروں' کالم نگاروں اور ٹی وی اینکرز کے سامنے آف دی ریکارڈ بریفنگ میں کھل کر اپنا مافی الضمیر بیان کیا جس سے اُن تمام تصورات اور خدشات کی نفی ہوتی گئی جنہیں بعض حلقے ایک مدت سے ہوا دیتے آئے ہیں۔ فوج کے سپہ سالار نے کہا کہ جب میں نے ۲۰۰۷ء میں منصب سنبھالا تو انتخابات سر پر تھے اور میں نے اِن میں فوجی

مداخلت روکنے کی حتی المقدور کوشش کی اور گزشتہ پانچ برسوں کے دوران ہر طرح کے دباؤ کے باوجود دستوری تقاضوں کے عین مطابق جمہوریت کا ساتھ دیا۔ آج ہم بروقت اور شفاف انتخابات اور پُرامن انتقالِ اقتدار کا مشن پورا کرنے کا عزم رکھتے ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ قوم خواب کی تعبیر کے قریب آ پہنچی ہے۔ ہم نے چیف الیکشن کمشنر کو پورے تعاون کا یقین دلایا ہے اور عوام سے یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ اپنے نمائندے منتخب کرنے میں ہر طرح آزاد اور محفوظ ہوں گے اور فوج انتخابات کے نتائج کھلے دل سے تسلیم کرے گی۔ جنرل کیانی کے اِن ایقان افروز خیالات سننے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مطلع بہت صاف ہو گیا ہے' سیاسی قوتوں کو اندرونی اور بیرونی حملہ آوروں کے خلاف ایک مضبوط ڈھال میسر آ گئی ہے اور شفاف انتخابات کا انعقاد یقینی نظر آتا ہے۔

☆☆☆

آرمی چیف نے سوالات کی بوچھاڑ میں بڑی متانت اور دانش مندی سے قومی سلامتی کو درپیش خطرات کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ اُن سے نمٹنے کی حکمتِ عملی پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اِس کی طرف بھی اشارہ کیا کہ انتخابات کو پُرامن بنانے کے لیے ریاست کے تمام اداروں' سیاسی جماعتوں اور سول سوسائٹی کو اپنی اپنی ذمے داریاں ادا کرنا ہوں گی' کیونکہ ہماری بقا کے لیے اِس پُل صراط سے بخیر و خوبی گزرنا ازبس ضروری ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر آئین کی حکمرانی' قانون کی عملداری اور ریاستی رِٹ کے احترام کو معیار بنا لیا جائے' تو داخلی امور بھی سُدھر جائیں گے اور خارجی عوامل بھی قابو میں آ جائیں گے۔ اُن کا اصرار تھا کہ ہمیں ہر حال میں آئین پر چلتے رہنا اور بنیادی مسائل پر اتفاقِ رائے پیدا کرنا چاہیے کہ یہی ہماری اصل قوت اور ایک محفوظ مستقبل کی ضمانت ہے۔ ہم آئین سے ماورا کسی ٹیکنو کریٹ حکومت کے حق میں ہیں نہ کسی سیاسی جماعت کی حمایت کر رہے ہیں۔ اپنے لیڈر منتخب کرنے کا حق صرف عوام کو حاصل ہے اور سیاسی جماعتوں کے انتخابات کے انعقاد میں ایک ذمے دارانہ طرزِ عمل اختیار کرنا اور ایشوز پر عوام کی راہنمائی کرنا ہوگی۔

خوشی کی بات ہے کہ انتخابات کے بارے میں سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے مابین قومی اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے' بڑی سیاسی جماعتوں نے اُمیدواروں سے درخواستیں بھی طلب کر لی ہیں اور اُن کے درمیان مذاکرات کے دور بھی چل رہے ہیں۔ ہم نے گزشتہ سال کے وسط میں سیاسی قائدین کو مشورہ دیا تھا کہ وہ انتخابات سے پہلے کم سے کم قومی ایجنڈے پر انتخابی اتحاد کا راستہ اختیار کریں تاکہ قوم کے اندر یہ اعتماد پیدا ہو کہ آنے والی حکومت مضبوط اور قومی ایجنڈے پر کاربند رہنے کی صلاحیت سے مالا مال ہوگی۔ ہماری تجویز تھی کہ اگر مسلم لیگ (ن)' جمعیت علمائے اسلام (ف)' جماعتِ اسلامی' مسلم لیگ فنکشنل اور سندھ اور بلوچستان کی قوم پرست جماعتیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں' تو دوسری جماعتوں کو بھی انتخابات کے حوالے سے اعتدال اور توازن کی راہ اپنانا ہوگی جو قومی زندگی میں صحت مند رجحانات کے فروغ کا باعث بنے گی۔ آج ہمارے لیے یہ امر قابلِ اطمینان ہے کہ مولانا فضل الرحمٰن ایک طرف جماعتِ اسلامی سے اختلافات ختم کرنے پر بات چیت کر رہے ہیں' تو دوسری طرف مسلم لیگ نون کے صدر جناب نواز شریف سے ایک مدت کے بعد سیاسی مذاکرات کے لیے رائے ونڈ آئے اور دونوں کے مابین انتخابی

مفاہمت پر اصولی اتفاق ہو گیا ہے۔ اِسی طرح نواز شریف اور جناب پیر پگارا کے درمیان انتخابی مفاہمت ہو چکی ہے اور جناب ممتاز بھٹو کی قیادت میں سندھ کی قوم پرست جماعتیں مسلم لیگ نون کے ساتھ ایک معاہدے میں منسلک ہیں جو سندھ میں ایک بہت بڑے سیاسی تغیر کا پیش خیمہ ثابت ہوں گی۔ نوڈیرو میں جناب نواز شریف کے بہت بڑے جلسۂ عام نے یہ پیغام دے دیا ہے کہ ایک خوشگوار تبدیلی صوبے کے سب سے بڑے سیاسی مرکز تک آن پہنچی ہے۔

☆☆☆

عام انتخابات جو فقط ڈھائی ماہ کے فاصلے پر ہیں' اُن کی راہ میں ہنوز متعدد رکاوٹیں حائل ہیں۔ سب سے بڑی رکاوٹ عوام کی حد سے بڑھی ہوئی توقعات ہیں جو کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی منتخب حکومت کی راہ تک رہے ہیں جس کے لیے کڑی شرائط عائد کی جا رہی ہیں اور مزاحمت بھی ہو رہی ہے۔ دوسری رکاوٹ ہمارا الیکشن کمیشن ہے جو آئے دن جعلی ڈگریوں کا تماشا لگائے رکھتا ہے اور اُس نے اپنی حیثیت کو متنازع بنا لیا ہے۔ تیسری رکاوٹ یہ ہے کہ پارلیمنٹ کی طبعی تحلیل سے پہلے بعض قانونی اور آئینی تنازعات سر اُٹھا رہے ہیں اور الیکشن کمیشن اور پارلیمنٹ کے درمیان یہ چپقلش مطلوبہ قانون سازی میں تعطل کا باعث بن سکتی ہے۔ چوتھی رکاوٹ بدامنی اور دہشت گردی ہے جس پر قابو پانے کے لیے سیاسی اور مذہبی جماعتوں اور عسکری قیادت کو ایک مشترکہ لائحہ عمل وضع کرنا اور اِسے غیر معمولی فہم و فراست سے عملی جامہ پہنانا ہوگا۔ بدقسمتی سے لشکرِ جھنگوی کے بارے میں وزیرِ داخلہ جناب رحمٰن ملک نے پنجاب حکومت کے خلاف سخت اعصابی اور سیاسی جنگ شروع کر دی ہے جس سے یہ تاثر پھیل رہا ہے کہ انتخابات کی بساط اُلٹ دینے کا جواز تراشا جا رہا ہے۔ پانچ سال گزرنے کے بعد وہ اعلان فرما رہے ہیں کہ اگر حکومتِ پنجاب نے لشکرِ جھنگوی کے خلاف آپریشن نہ کیا' تو وہ ایف سی' رینجرز اور ایف آئی اے کے ذریعے خود کلین اپ آپریشن کریں گے۔ جناب صدر اور ہمارے وزیرِاعظم اِس الٹی میٹم کے بارے میں انتہائی معنی خیز خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے پیپلز پارٹی مرکز کی طرف سے پنجاب پر چڑھائی اور دو حکومتوں کے درمیان ایک خوفناک تصادم کے حق میں ہے۔

انتخابات کی راہ میں نگراں حکومت کی تشکیل بھی ایک بڑی رکاوٹ بن سکتی ہے۔ آئین میں واضح طور پر درج ہے کہ نگران حکومتیں مرکز اور صوبوں میں حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کی مشاورت سے قائم کی جائیں گی۔ کئی ماہ پہلے وزیرِاعظم نے اعلان کیا کہ ہم اتحادی جماعتوں سے مشاورت کر رہے ہیں اور یہی اعلان اپوزیشن لیڈر جناب چودھری نثار علی خاں کی طرف سے بھی کیا گیا کہ ہم تمام اپوزیشن جماعتوں کو اعتماد میں لے رہے ہیں۔ دریں اثنا شیخ الاسلام اچانک ٹپک پڑے اور اُنہوں نے ''مک مکا'' کا صور پھونک ڈالا۔ اسلام آباد میں ہزاروں مریدوں کے درمیان یہ دھمکی آمیز اعلان فرمایا کہ ہماری مرضی کے بغیر کوئی نگران حکومت قائم نہیں ہو سکے گی' حالانکہ دہری شہریت کے حامل ہونے کے باعث وہ حکومت سازی کے معاملات میں دخل دینے کے مجاز نہیں تھے' مگر حکومتی نمائندوں نے اُن کا یہ غیر آئینی مطالبہ تسلیم کر لیا جس کے خلاف ایک شہری نے عدالتِ عالیہ میں رِٹ بھی دائر کر دی ہے۔ اب یہ سرگوشیاں ہو رہی ہیں کہ غیر سیاسی طاقتیں ایک ایسے نگران وزیرِاعظم کی تلاش میں ہیں جو دو چار ہفتوں بعد عدالتِ عظمیٰ میں یہ درخواست دینے کے لیے آمادہ ہو کہ بپھرے ہوئے حالات میں انتخابات نہیں ہو سکتے اور اِسی

حکومت کو چند سال کام کرنے کا آئینی جواز عطا کیا جائے۔ انہی دنوں وزیر خزانہ جناب عبدالحفیظ شیخ مستعفی ہو گئے اور زبانی طیور کی یہ خبر گردش کرنے لگی کہ وہی نگران وزیر اعظم ہوں گے کہ اُنہیں اسٹیبلشمنٹ کی درپردہ حمایت حاصل ہے۔ جنرل کیانی نے ڈیپ بریفنگ میں اِس تاثر کی پُر زور تردید کی اور یہ اصولی موقف اختیار کیا کہ یہ کام حکومت اور اپوزیشن کا ہے اور اُنہیں یہ آئینی ذمے داری جلد سے جلد نبھانی چاہیے۔ ہمارا خیال ہے کہ اسمبلیوں کی تحلیل سے پہلے پہلے نگران حکومتوں پر حکومت اور اپوزیشن کے مابین اتفاقِ رائے پیدا ہو جانے سے انتخابات کے عمل پر اعتماد پیدا ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ نگران وزیر اعظم چھوٹے صوبوں سے لیا اور کراچی سے اجتناب کیا جائے جو خونخوار مافیاؤں کے نرغے میں ہے جن کے سبب ہمارے قابلِ احترام فخر و بھائی شدید ذہنی دباؤ میں دکھائی دیتے ہیں۔

☆☆☆

انتخابات اور ملکی سلامتی کو آج فرقہ پرستی' انتہا پسندی اور دہشت گردی کے جان لیوا خطرات لاحق ہیں اور اُن کے بارے میں جنرل کیانی کی بریفنگ میں نہایت فکر انگیز اور اسٹریٹیجک اہمیت کی باتیں ہوئیں جن کا ابلاغ میری نظر میں آنے والے حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اُنہوں نے اسلامی فکر کی روشنی میں بنیاد پرستی کی یہ تعریف کی کہ ہر مسلمان جو بنیادی عقائد پر یقین رکھتا اور میانہ روی کی زندگی بسر کرتا ہے' وہ حقیقی معنوں میں بنیاد پرست (fundamentalist) ہے جبکہ یورپ میں یہ اصطلاح مذہبی شدت پسندوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے اور یہی اختلافِ نظر فساد کا باعث بنا ہوا ہے۔ پاکستان میں ۹۸ فی صد مسلمان امن پسند اور نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج کے فرائض ادا کرتے اور آپس میں مل جل کر خوشی خوشی رہتے ہیں۔ جب مغرب میں اسلامی شعائر کا احترام کرنے والے سیدھے سادھے مسلمانوں کو بنیاد پرست قرار دے کر اُنہیں غیر مہذب اور قابلِ گردن زنی قرار دیا جاتا ہے' تو شدید ردِعمل اُبھرتا اور تہذیبی اقدار کے دفاع کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اہلِ مغرب کی طرف سے اتنی عظیم اکثریت کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے اور اُن کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے اور ہمارے اپنے معاشروں میں بھی اُن کا احترام لازم ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایک چھوٹا سا طبقہ پروان چڑھ رہا ہے جو اپنے آپ کو مذہب کے بارے میں عقلِ کل سمجھنے لگا ہے اور شریعت کا جو مفہوم وہ سمجھ پاتا ہے' اُسے حرفِ آخر کا درجہ دیتا ہے۔ یہ وہ مذہبی انتہا پسندی ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا' کیونکہ وہ اعتدال' میانہ روی اور مشاورت کا دین ہے۔ یہی انتہا پسند طبقہ جب اپنی رائے کو طاقت کے ذریعے نافذ کرنا چاہتا ہے تو دہشت گرد بن کر معاشرے میں سرطان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسلام اور انسانیت کے دشمن یوں ریاست کے خلاف ہتھیار اُٹھاتے اور خودکش حملوں اور بم دھماکوں سے عالمی امن کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ اِس وضاحت کی رُو سے ہمیں اسلام کی بنیادی تعلیمات پر عقیدہ رکھنے والوں کا احترام' انتہا پسندوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے مذاکرات اور ہتھیار اُٹھانے والوں کے خلاف قیامِ امن کی خاطر طاقت استعمال کرنا ہوگی۔

میں جنرل کیانی کی باتیں جس قدر سمجھ سکا' وہ بڑی حد تک حقیقت پسندانہ پُر مغز اور ایقان افروز تھیں۔ اُن سے پتا چلا کہ ان تینوں اصطلاحات کی عام فہم تعریف ایک فوجی کے لیے کس قدر اہمیت رکھتی ہے جسے میدانِ جنگ میں

دشمن اور دوست کے درمیان واضح فرق کر کے فوری اقدام کرنا ہوتا ہے۔ اِس کا تعلق مسلمانوں کی ۹۸ فی صد آبادی سے ہے اور وہ جان پر کھیل کر وطن کی حفاظت کرتا ہے۔ جنرل صاحب کے تجزیے کے مطابق افغان طالبان اور پاکستانی طالبان کے معاملات جدا جدا ہیں' اِس لیے اُن کے حوالے سے ہمارے لائحہ عمل بھی فطری طور پر مختلف ہیں۔ افغانستان میں امن اور سلامتی کا حصول طالبان اور شمالی اتحاد کو قومی دھارے میں لے آنے ہی سے ممکن ہے' چنانچہ ہم امریکا اور اُس کے اتحادیوں کو یہ کلیدی نکتہ سمجھانے میں کامیاب رہے کہ طالبان کے ساتھ مذاکرات پوری سنجیدگی سے شروع کر دیے جائیں جن کی کامیابی میں پاکستان بھی اہم کردار ادا کر سکتا ہے' کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ ایک پُرامن اور مستحکم افغانستان پاکستان کے وسیع تر مفاد میں ہے۔ اِس کے برعکس پاکستانی طالبان ہمارے دستور' ہمارے قانون اور ہماری ریاست کی رِٹ تسلیم نہیں کرتے' اِس لیے اُن کے ساتھ مذاکرات کے بارے میں قومی اتفاقِ رائے کے بعد ہی سوچا جا سکتا ہے اور مذاکرات سے پہلے طالبان کی قیادت کو لچک اور اچھی نیت کا مظاہرہ بھی کرنا ہوگا۔

☆☆☆

اِس موضوع پر کچھ ایڈیٹروں' کالم نگاروں اور ٹی وی اینکرز نے شدید جذبات کا اظہار کیا اور خفیہ ایجنسیوں پر الزام لگایا کہ وہ دہشت گردوں کی پشت پناہی کرتی اور اُنہیں اپنا اثاثہ سمجھتی آئی ہیں' اسی لیے اُن کے خلاف نتیجہ خیز آپریشن کرنے سے اجتناب کیا جا رہا ہے۔ بعض دوستوں نے یہ بھی کہا کہ ریاست کا مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے' کیونکہ آج ہم مذہبی شدت پسندی اور دہشت گردی کے جس الاؤ میں جل رہے ہیں' وہ اِسی تعلق کے نتیجے میں سالہا سال سے دہک رہا ہے۔ ایک دانش ور صحافی نے یہ نکتہ اُٹھایا کہ پاکستانی طالبان کا موقف یہ ہے کہ چونکہ پاکستان افغانستان میں غاصب فوجوں کی اعانت کر رہا ہے' اِس لیے ہم اُس سے لڑنے پر مجبور ہیں۔ اب غور طلب نکتہ یہ ہے کہ جب افغانستان میں برسرِ جنگ طالبان سے مذاکرات کیے جا سکتے ہیں تو پاکستانی طالبان سے کیوں نہیں؟ ایک رائے یہ بھی تھی کہ طالبان کا مکمل صفایا ہونے تک پاکستان میں امن قائم نہیں ہو سکے گا۔ ایک باخبر صحافی اصرار کر رہے تھے کہ طالبان سے مذاکرات کرنے ہی میں پاکستان کی عافیت ہے اور فوج کو اپنی سوچ میں تبدیلی لے آنی چاہیے۔ جنرل کیانی اُن کے دعووں کی بلندی کا خندہ پیشانی سے جائزہ لیتے اور آزادیٔ اظہار کے ثمرات سمیٹتے رہے۔ اُن کا موقف یہ تھا کہ عسکری قیادت حکومت کے فیصلوں کے تابع ہوتی ہے اور فوجی آپریشن سے پہلے اُسے بہت سارے عوامل بروئے کار لانا پڑتے ہیں۔ اُنہوں نے انکشاف کیا کہ سوات کا مسئلہ حل کرنے کے لیے وہ اسفند یار ولی کے ہمراہ صدر زرداری کے پاس گئے اور اُنہیں صوفی محمد کے ساتھ معاہدے کے لیے تیار کیا' کیونکہ فوجی قیادت کی خواہش یہ تھی کہ اگر معاہدے کے ذریعے امن قائم ہو جائے' تو طاقت استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ صوفی محمد نے معاہدہ توڑ دیا اور اُس کے خوفناک عزائم قوم کے سامنے آ گئے۔ اُس نے سوات پر قبضہ کرنے کے بعد بُنیر کی طرف پیش قدمی شروع کر دی اور اُس کے ہم نواؤں نے مذہبی اعتقادات سے اختلاف کرنے والوں پر انسانیت سوز مظالم کا سلسلہ تیز کر دیا۔ اِن حالات پر قابو پانے کے لیے حکومت نے فوجی آپریشن کا حکم دیا اور ہم نے طاقت کا استعمال کرنے سے پہلے بیس لاکھ شہریوں کو وادیٔ مردان کی طرف ہجرت کے لیے تیار کیا۔ وہ عوام کے

تعاون سے کئی ماہ سختیاں جھیلتے رہے اور تاریخ میں وطن کے لیے ایثار کا ایک تابناک باب رقم کر گئے۔ فوج نے سوات اور اُس کے ملحقہ علاقے طالبان سے واپس لے لیے اور امن و امان قائم کر دیا' مگر اس داخلی جنگ میں جو سیکڑوں افراد گرفتار کیے گئے' اُن پر مقدمات چلے نہ دو دہشت گردوں کے سوا کسی کو عدالت سے سزا ہوئی۔ دوسرے علاقوں میں بھی فوجی کارروائیوں سے ہمیں یہی سبق ملا ہے کہ آپریشن اسی وقت کیا جائے جب اُس کے بعد کے معاملات سنبھالنے کے لیے قابلِ اعتماد انتظامات موجود ہوں۔

جنرل کیانی نے چند ماہ پہلے قومی سلامتی کا جو نظریہ پیش کیا' اُس میں داخلی خطرات کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔ بلاشبہ آج ہمیں داخلی چیلنجوں کا سامنا سب سے زیادہ ہے' کیونکہ لسانی' نسلی' قبائلی اور فرقہ وارانہ ریشہ دوانیوں اور خونریزیوں نے وطنِ عزیز کا چہرہ داغ داغ کر ڈالا ہے اور عالمی برادری میں اس کی عزت و وقار کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ہزارہ برادری پر دوبار قیامت ٹوٹ چکی ہے اور بلوچستان میں سرکشی کے خوفناک مناظر دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ انہی لسانی اور نسلی عداوتوں نے کراچی کا امن اور سکون تباہ کر ڈالا ہے جو پاکستان کا معاشی اور کاروباری دارالحکومت ہے۔ فرقہ واریت کی وبا پھیلتی جا رہی ہے۔ ہزارہ قبیلے کے خلاف دہشت گردی کے خلاف ملک بھر میں کئی روز تک دھرنے دیے جاتے رہے' اُن میں بڑے بڑے مقاماتِ پر سنی علماء اور سیاست دان شامل ہوئے اور اِس طرح قومی یک جہتی کا زبردست مظاہرہ دیکھنے میں آیا' مگر ان دھرنوں میں اسلحہ بردار عناصر بھی ایک منصوبے کے تحت داخل ہو گئے جنہوں نے پورا ملک مفلوج کر کے رکھ دیا۔ کراچی میں اُنہیں سپاہ محمد کے علاوہ ایم کیو ایم کی بھی حمایت حاصل تھی اور عام شہری یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ مختلف شیعہ تنظیموں نے اپنی بالادستی قائم کر لی ہے اور حالات ایک ہلاکت خیز فرقہ وارانہ تصادم کی طرف لڑھک رہے ہیں۔ جنرل کیانی نے اپنی سیکورٹی ڈاکٹرائن میں انتہا پسندی اور فرقہ واریت کو قومی سلامتی کے لیے بہت بڑا خطرہ قرار دیا ہے اور اُس کے سدِ باب کے لیے حکمتِ عملی بھی وضع کی ہے۔

☆☆☆

آرمی چیف نے اپنی سیکورٹی ڈاکٹرائن کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ ہم نے بیرونی خطرات سے آنکھیں بند نہیں کی ہیں اور اپنے پڑوسیوں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم رکھنے کی زبردست خواہش کے باوجود ہمارا تجربہ یہ ہے کہ جب تک بھارت بنیادی مسائل کے حل کی طرف نہیں آتا' اُس وقت تک پائیدار امن ایک سراب ہے۔ مسئلہ کشمیر پر پیش رفت تو دور کی بات' سرکریک کا معاملہ بھی جوں کا توں ہے اور ہماری تمام کوششوں کے باوجود بھارتی آرمی چیف نے سیاچن سے فوجیں ہٹانے سے انکار کر دیا ہے جبکہ پانی کا تنازع گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ اِس کے علاوہ بھارت نے کنٹرول لائن کی خلاف ورزیاں شروع کر دی ہیں اور اچانک ہماری فوج کے خلاف ایک جارحانہ رویہ اختیار کر لیا ہے۔ ہم یہ سب کچھ امن کی خاطر برداشت کر رہے ہیں اور اُمید رکھتے ہیں کہ ہمارے مثبت طرزِ عمل سے بھارت کی رائے عامہ پر اچھے اثرات مرتب ہوں گے۔ وہاں کی سیاسی اور انتظامی اسٹیبلشمنٹ کو حقائق کا بتدریج ادراک ہونے لگا ہے اور دہشت گرد عناصر کی بھی نشان دہی کی جانے لگی ہے۔

بریفنگ میں بلوچستان کے معاملات پر آزادانہ تبادلۂ خیال ہوا۔ جنرل کیانی نے پورے اعتماد سے کہا کہ وہاں

ایک بھی فوجی ڈپلائے ہے نہ کہیں فوجی آپریشن ہو رہا ہے' البتہ ایک ڈپٹی کمشنر بھی فوج کو سول ایڈمنسٹریشن کی مدد کے لیے طلب کر سکتا ہے اور ہم اِس کے لیے تیار ہیں' مگر بہتر یہی ہوگا کہ پولیس اور ایف سی کے ذریعے لاقانونیت اور بدامنی پر قابو پایا جائے۔ وہاں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ صرف پانچ فی صد علاقہ پولیس کی تحویل میں ہے جبکہ بقیہ پچانوے فی صد لیویز کے زیرِ انتظام ہے جو زیادہ تر سرداروں کے دائرۂ اثر میں ہیں۔ خفیہ ایجنسیوں کے پاس دہشت گردوں کو صرف گرفتار کرنے کے اختیارات ہیں جبکہ پولیس مقدمہ قائم کرتی اور تفتیش کے بعد اُسے عدالت میں لے جاتی ہے اور ناکافی قانون کے باعث ملزم عدالتوں سے اکثر چھوٹ جاتے ہیں۔ اُنہوں نے بتایا کہ براہمداغ کے جرائم کی فہرست خاصی طویل ہے اور اُس کے ساتھ براہِ راست مذاکرات نہیں کیے جا سکتے۔ بلوچستان کے حالات سے باخبر صحافیوں نے بتایا کہ لشکرِ جھنگوی کو بلوچستان لبریشن آرمی کی بھرپور حمایت حاصل ہے اور بھارت افغانستان کے ذریعے بلوچستان کو غیر مستحکم کرنے کے لیے شیعہ سنی فسادات کی آگ بھڑکانا چاہتا ہے' حالانکہ بلوچستان میں فرقہ واریت کا چند سال پہلے تک نام و نشان بھی نہیں تھا۔ ایک دانش ور کالم نگار جو بلوچستان میں اعلیٰ انتظامی عہدے پر بھی فائز رہ چکے ہیں' اُنہوں نے بتایا کہ جو اعداد و شمار دیے جاتے ہیں' وہ ہوم سیکرٹری کی فائلوں میں بہت پہلے سے تیار ہوتے ہیں جن کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بریفنگ کے دوران جنرل کیانی نے بڑے اعتماد سے کہا کہ وہ اپنے منصب کی معیاد ختم ہونے پر اِس میں توسیع قبول نہیں کریں گے اور اُن کی تمام تر کوشش ہوگی کہ بلوچستان سمیت پورے ملک میں ایک ہی دن انتخابات منعقد کیے جا سکیں۔ وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ آئینی تقاضا پورا کرنے کی خاطر ۱۶ مارچ سے کچھ روز پہلے اسلم رئیسانی کی حکومت بحال کر دی جائے گی' تاکہ نگران حکومت کا قیام عمل میں آ سکے۔ اُنہوں نے آئی ایس آئی اور ایم آئی پر تابڑ توڑ حملوں کے جواب میں نہایت مؤثر اور مدلل انداز میں اِس امر کی وضاحت کی کہ آئی ایس آئی کا مینڈیٹ بیرونی دشمنوں پر نگاہ رکھنا اور اُنہیں ناکام بنانے کے لیے منصوبہ بندی کرنا ہے۔ ملٹری انٹیلی جنس صرف فوجی آپریشن کے دوران سرگرم ہوتی ہے جبکہ داخلی حالات کے بارے میں معلومات جمع کرنا آئی بی' اسپیشل برانچ اور پولیس کی ذمے داری ہے' مگر بدقسمتی سے حکومت اِن سول اداروں کی کارکردگی بہتر بنانے کے بجائے بالعموم فوج کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی طرف دیکھتی رہتی ہے جس کے باعث شکوک و شبہات جنم لیتے اور بتنگڑ بنتے رہتے ہیں۔

☆☆☆

بریفنگ میں خبریت انتہائی کم' لیکن ذہنی غذا بڑی فراواں تھی۔ جنرل صاحب کی باڈی لینگویج میں بڑا اعتماد اور بڑا وقار تھا اور اُن کی گفتگو میں پائی جانے والی تازگی' شادابی اور دانش مندی نے ہمیں اِس یقین سے سرشار کر دیا کہ ملک میں انتخابات شفاف اور بروقت ہوں گے۔ بیشتر حاضرین جنرل کیانی کی صاف گوئی' بالغ نظری اور تجزیے کی گہرائی سے بے حد متاثر اور شادکام ہوئے۔ جمہوریت اور آئین و قانون کے ساتھ اُن کی غیر متزلزل وابستگی نے سبھی کے دلوں میں اُمید کے چراغ روشن کر دیے اور یہ احساس گہرا کیا کہ ہماری فوج کی قیادت محفوظ ہاتھوں میں ہے جو حال اور مستقبل کے چیلنجوں کا گہرا ادراک اور اُنہیں شکست دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اُن کے ہاں تحکم کے بجائے

ایک حلم تھا اور ایک وضعداری تھی۔ اُنہوں نے قومی طاقت (National Power) کے چار پانچ عناصر میں اقتصادیات کو بڑی اہمیت دی' پاکستانی معیشت کی زبوں حالی پر گہری تشویش کا اظہار کیا اور سویت یونین کی مثال پیش کی کہ عالمی طاقت کے تمام تر لوازمات سے لیس ہونے کے باوجود اقتصادی زوال کے ہاتھوں شکست و ریخت سے دوچار ہو گیا تھا۔ اُنہوں نے قومی سطح کے چالیس سے زائد ایڈیٹروں اور تجزیہ نگاروں کے ساتھ پانچ گھنٹے تک تبادلۂ خیال جاری رکھا' ہر سوال کا بے کم و کاست جواب دیا اور پاکستان کی صحیح سمت کی نشان دہی کی۔ اُن کی نظر میں صحیح سمت آئین کے مطابق نظمِ حکومت چلانا اور عوام کو بنیادی ضرورتیں' تحفظ اور انصاف فراہم کرنا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سول ملٹری تعلقات' قومی مفادات کے گہرے شعور اور آئین کی حکمرانی کے تصور پر قائم ہونے چاہئیں۔ اُنہوں نے واضح کیا کہ اسٹریٹیجک گہرائی کا نظریہ اب تبدیل ہو چکا ہے اور علاقائی گہرائی باہمی تعلقات کی گہرائی کے ساتھ منسلک ہے۔ افغانستان میں اگلے سال انتخابات ہو رہے ہیں جن میں افغانستان میں بسنے والے پشتون' تاجک اور ازبک آبادی کی شمولیت سے امن اور استحکام قائم ہوگا جو ہمارے خطے میں استحکام کو قوت فراہم کرے گا۔

پاکستان میں آنے والے چند مہینے بڑی اہمیت رکھتے ہیں' اِن میں انتخابات ہوں گے اور تازہ دم حکومتیں آئیں گی جنہیں معاشی ابتری' بدترین انتہا پسندی اور دہشت گردی کا سامنا کرنا ہوگا۔ غالب امکان یہ ہے کہ اسمبلیوں میں زیادہ تر جواں سال اور ناتجربے کار لوگ آئیں گے جو ایک نعمت بھی ثابت ہو سکتے ہیں اور بہت بڑی زحمت بھی۔ اگر اسمبلیوں کے نوجوان ارکان کو تجربے کار اور کسی قدر دیانت دار قیادت میسر آ گئی تو وہ تاریخ کو دہرانے کا موقع نہیں دیں گے' فطرت کے اشاروں کو سمجھتے ہوئے ایثار' تعمیر اور تخلیق کا راستہ اختیار کریں گے اور عوام کے معیارِ زندگی کے قریب رہتے ہوئے لائف اسٹائل اپنائیں گے۔ خود احتسابی اور خود شناسی سے اُن کی صلاحیتیں جلا پائیں گی اور وہ اپنے عزیز وطن کو مسائل کے بھنور سے نکالنے اور اُسے ترقی کی شاہراہ پر ڈالنے میں ایک عظیم کردار ادا کر سکیں گے۔ اِس کے برعکس اگر الزام تراشیوں کے سیلاب میں جہاندیدہ قیادت بہہ جاتی ہے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کا پاگل پن قائم رہتا ہے' تو جواں سال منتخب حکومتیں ملکی نظم و نسق میں افتری پیدا کریں گی اور اپنی ناتجربے کاری کے باعث مسائل کو اُلجھاتی رہیں گی۔ انتخابات سے پہلے اگر سیاسی جماعتیں ایک ضابطۂ اخلاق کے تحت جمہوری روایات کے ساتھ وابستہ رہتی ہیں' اچھے اُمیدوار میدان میں اُتارتی ہیں اور دولت اور برادری کے بجائے ایشوز کی قوت سے انتخابات میں کامیاب ہوتی ہیں' تو اُنہیں جنرل کیانی کے یہ الفاظ بڑی تقویت پہنچائیں گے کہ عوام اپنے جن لیڈروں کا انتخاب کریں گے' ہم آئینی طور پر اُن کے ساتھ تعاون کرنے کے پابند ہوں گے۔ ایک اعتبار سے یہ دوٹوک اعلان سول ملٹری تعلقات کے عظیم میثاق کی حیثیت رکھتا ہے۔

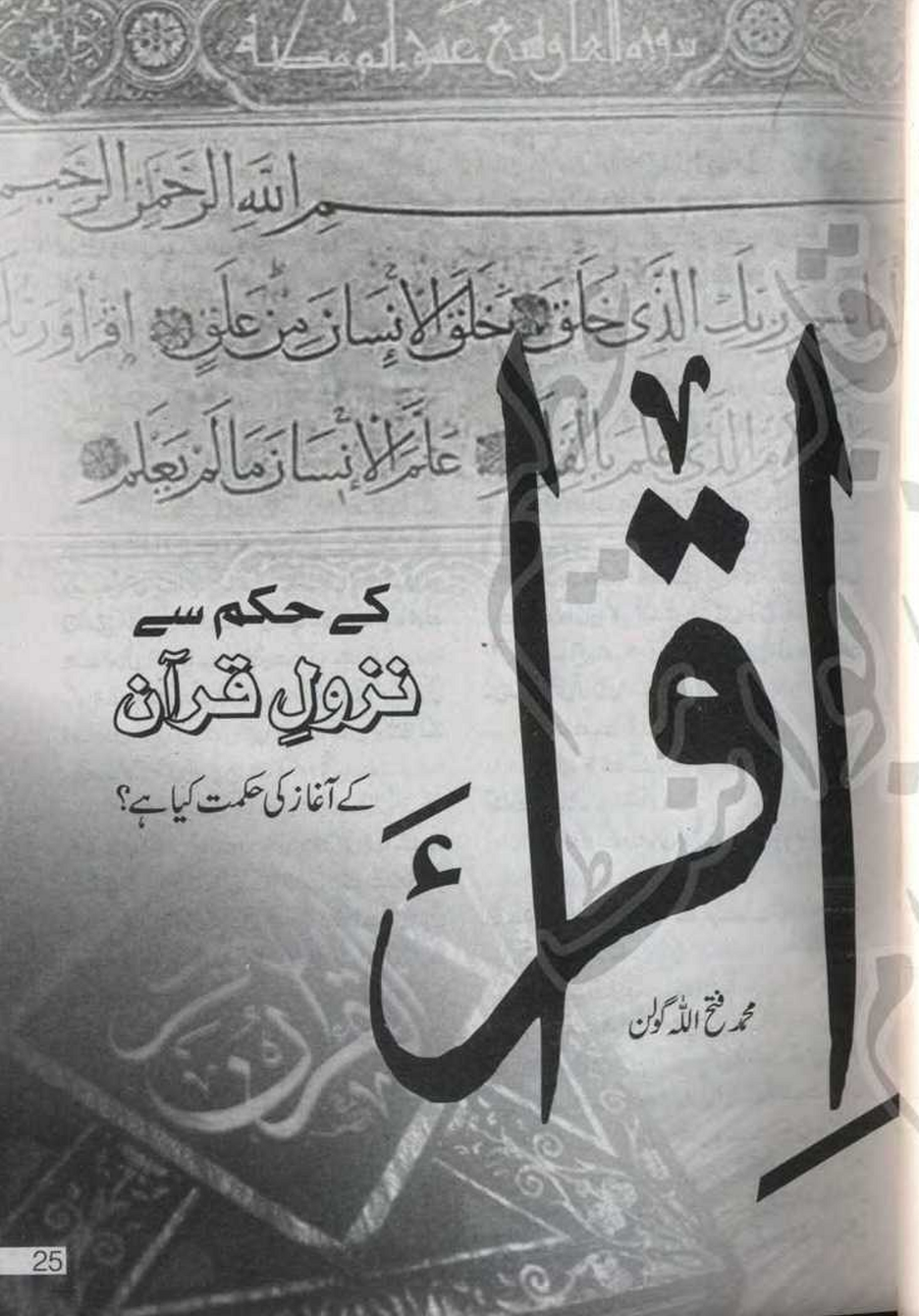

(اقرأ) کا حکم خداوندی تمام کمالات کی جامع اعلیٰ ترین ہستی کے لیے اور ان کے ذریعے سے ساری مخلوق کے لیے ایک حکم، دعوت اور خدائی ذمہ داری ہے۔ یہ کائنات جسے ہمارے غور وفکر کے لیے ہماری نگاہوں کے سامنے پھیلایا گیا ہے اور جو خالق کائنات کے پیدا کردہ نظام، اس کی قدرت، عظمت اور جمال کی گواہ ہے، لوح محفوظ کا محض پرتو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت انسان کے سوا اس کائنات کی ہر زندہ و بے جان چیز کو اس کائنات میں ودیعت کردہ تجلیات اور حکمتوں کو بے نقاب کرنے کی ذمہ داری سونپی ہے۔

ہر زندہ اور بے جان چیز کتاب کی مانند ہے، یہی وجہ ہے کہ ''انظر'' (دیکھیے) اور ''شاہد'' (مشاہدہ کیجیے) کے بجائے (اقرأ) (پڑھیے) کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ صرف کتاب کو ہی پڑھا جا سکتا ہے۔ چونکہ اس کائنات کی ہر زندہ چیز کتاب کی مانند ہے، اس لیے یہ کائنات ایک بہت بڑے خدائی کتب خانے کی حیثیت رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جہاں انسان کے سوا دوسری ساری مخلوق کو لکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، وہیں حضرت انسان کو لکھنے کے ساتھ ساتھ خصوصی طور پر پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

علم نظام کائنات کی تجلیات کی معرفت حاصل کرنے، کائنات کی مختلف اشیا کے درمیان موجود تعلق کو جاننے اور ان میں سے ہر ایک کو اس کے مقام پر رکھنے سے عبارت ہے۔ چونکہ اس تمام نظم و نسق اور نظام کائنات میں پائی جانے والی باریک بینی و ہم آہنگی کا باعث اتفاق محض کو قرار نہیں جا سکتا، اس لیے اس نظام کے لیے کسی واضع کا ہونا ضروری ہے، ایک ایسا واضع جس کے وجود میں کسی قسم کا ابہام نہ ہو۔

کسی بھی نظام کو وجود میں لانے سے پہلے اس کا ایسے ہی تصور کیا جاتا ہے، جیسے ایک ماہر تعمیرات نقشے کو کاغذ پر بنانے سے پہلے اس کا تصور کرتا ہے۔ اگر ہم انسان اور اس کے فکر کی مادی ساخت اور اُس کے اِس کے تصورِ وجود پر اثر انداز ہونے کے طریق کار سے صرف نظر کر لیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح لوح محفوظ کائنات میں موجود وسیع نظام سے عبارت ہے، اسی طرح قرآن کریم لوح محفوظ کا پرتو اور اس نظام کی تحریری صورت ہے، اس لیے انسان کا فرض ہے کہ وہ پڑھے اور جب بھی پڑھے سمجھنے کی کوشش کرے۔ بعض اوقات اس سے سمجھنے میں غلطی بھی ہو سکتی ہے اور علم کے جوہر کے ذریعے اعتماد و یقین کے مقام تک پہنچنے کی سعی و کاوش کے دوران صحیح و غلط تجربات سے گزر سکتا ہے۔

دیکھنا، مشاہدہ کرنا اور سمجھنا ایک دوسرے سے مختلف امور ہیں، جب کہ سمجھی یا قبول کی جانے والی بات کا قلب و شعور پر نقش ہونا بالکل مختلف چیز ہے اور اس کے بعد اسے عملی صورت پہنانا اور دوسروں کو اس کی دعوت دینا بالکل مختلف بات ہے۔ یہ تمام مختلف لیکن فہم و ادراک سے پیوستہ امور ہمہ وقت موجود رہتے ہیں، کیونکہ کائنات میں بہت سے قوانین کار فرما ہیں، جنھیں وضع کرنے والی ہستی باریک بینی اور ہم آہنگی کے ساتھ چلاتی ہے۔ ان میں سے بعض قوانین حسب ذیل ہیں:

۱۔ وحدت سے کثرت کی طرف سفر۔
۲۔ اس کثرت کے درمیان مشابہت، اختلاف اور تضاد کا پایا جانا۔
۳۔ اضداد کے درمیان فعال توازن کا پایا جانا۔
۴۔ باری باری ذمہ داری اٹھانا۔
۵۔ سیکھنا، بھولنا اور پھر نئے سرے سے سیکھنا۔
۶۔ جدوجہد کرنا۔
۷۔ تجزیہ و ترکیب۔
۸۔ کشف و الہام۔

چونکہ یہ تمام قوانین انسان پر بھی لاگو ہوتے ہیں، اس لیے فکر و نظر، عقیدہ و کردار اور طرز عمل کے لحاظ سے لوگوں میں تنوع، فرق اور اختلاف فطری بات ہے، لیکن یہ فطری امتیازات اور تضادات بے حس و حرکت نہیں ہوتے، بلکہ متوازن انداز میں فعل کردار ادا کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ فطری بات ہے کہ بعض اوقات ایمان کی طرف کی جانے والی سعی

علم سے محروم ہوتی ہے اور بسا اوقات علم کی خاطر کی جانے والی سعی نہ صرف ایمان سے خالی ہوتی ہے، بلکہ اسے نظر انداز کر دیتی ہے۔ اسی لیے علم و عبادت، اقرار و انکار، فضائل و رذائل، انصاف و ظلم، محبت و نفرت اور جنگ و امن ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کی زندگی میں سستی، پژمردگی اور دوسروں پر انحصار کی عادت پائی جاتی ہے، جب کہ بعض دوسرے انسان سمجھتے ہیں کہ وہ سب کچھ اکیلے ہی سرانجام دے سکتے ہیں، جس کے نتیجے میں ان کی زندگی میں جلد بازی، انتہا پسندی، جنون اور خواہش پرستی دیکھنے میں آتی ہے، جو کبھی تو تعمیری کردار ادا کرتی ہے اور کبھی تخریبی۔

رحمتہ للعالمین کی حیثیت سے مبعوث ہونے والی یکتائے روزگار شخصیت کی تعلیمات کے بارے میں بھی نسیان پیش آ سکتا تھا، لیکن اسے از سر نو یاد کرنے اور سیکھنے کی ضرورت تھی اور اس قسم کے تجزیہ و تحلیل کے نتیجے میں نئی بحث، نئے فکر اور نئی وحی کا ظہور ہونے والا تھا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، ایسا ہونا ناگزیر تھا اور آج تک ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے۔ معاشرتی زندگی کی عمارت استوار کرنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السّلام پر ''احکام'' کا نزول ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام پر انسانی تعلقات کے بارے میں بردباری، شفقت و رحمت، محبت اور صبر و تحمل کا الہام ہوا اور نبی اکرم ﷺ کو اوپر ذکر کردہ امور کے علاوہ علم، ارادہ، حکمت، اعتدال پسندی، افکار کا تجزیہ و تحلیل کرنے کی صلاحیت، فصاحت اور جوامع الکلم عطا کیے گئے، یہی وجہ ہے کہ مسلمان کی ذمہ داریاں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بھی ہیں اور مشکل بھی، لیکن ان میں لطافت اور عظمت بھی اسی تناسب سے زیادہ ہے، کیونکہ ان میں ''دس احکام'' اور محبت، عفو و درگزر، شفقت و بردباری اور صبر و تحمل جیسے معاشرتی اصولوں کے علاوہ علم و حکمت، ارادہ و انکسار اور تالیف قلوب بھی شامل ہیں، جس کا لازمی نتیجہ ان کی عظمت کے اثبات کی صورت میں نکلتا ہے، لہٰذا طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات کے میدان میں ہونے والے نئے انکشافات اور سائنس دانوں کے ہاتھوں حاصل ہونے والی ترقی احترام کی نظر سے دیکھے جانے کی مستحق ہے، کیونکہ ان کی وجہ سے کائنات کی اشیا کے درمیان موجود تعلق کے بارے میں بہت سے قرآنی حقائق سے پردہ اٹھا ہے، تاہم اس کے ساتھ ساتھ انسانیت کو خالق کائنات کے وجود الہام و وحی کے انکار اور انسانی ارادے کو حاکمیت اعلیٰ کا مقام دے کر الوہیت کا درجہ دینے کی فکری گمراہی سے بچانا بھی ضروری ہے۔

سائنسی تجربات اور نئے دریافت ہونے والے قوانین کی روشنی میں اگر طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات کے علوم کو نئی راہیں نہ دی گئیں تو اس معاشرے کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا، جس میں نئی ایجادات سے دھوکے میں مبتلا انسان سرکشی پر اتر آیا ہے، وہ تمام انسانی پابندیوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرنے لگا ہے اور زیادہ بے باک ہو کر احساس ذمہ داری سے محروم ہونے لگا ہے۔ آج انسان انسانی اقدار سے دور ہو کر ان جانوروں کی مانند ہو گیا ہے، جن پر تجربہ گاہوں میں تجربات کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا انسان پر لازم ہے کہ وہ اس شعور کو بیدار کرے کہ وہ انسان ہے اور یہ کہ معاشرہ اس پر تجربات کرنے کے لیے تجربہ گاہ نہیں ہے۔

غرض عصری علوم کو جمود و خمود اور بے فائدہ امور سے پاک کرنا ضروری ہے۔ اس سے ایک تو موضوع کے مسئلے کو اچھی طرح سمجھنے میں مدد ملتی ہے، جس سے علوم خصوصی طور پر بحث کرتے ہیں، دوسرے اس کے ذریعے انسان اپنے ارادے اور ذہنی صلاحیتوں کے مطابق اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے کے قابل بنتا ہے اور باطنی طور پر اپنے احساسات اور دل کی کیفیات کا مشاہدہ کر سکتا ہے، جس کے نتیجے میں تعلیم یافتہ انسان فصیح زبان اور ایسے دل کی مانند ہو جاتا ہے، جو اپنے سامنے کھلی کتاب کی طرح موجود کائنات کو ایک ایک سطر کر کے پڑھ سکتا ہے۔ اس بات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں کہ کائنات خصوصاً اس کے تکوینی امور کتاب سے مختلف نہیں، چونکہ قلم کو سب سے پہلے پیدا

کیا گیا ہے، اس لیے قرآن کریم میں سب سے پہلے نازل ہونے والا حکم (اقرأ) (پڑھیے) ہے۔

لیکن یہ مسئلہ اتنا سہل نہیں جتنا کہ پہلی نظر میں دکھائی دیتا ہے۔ اس نظریے کے باوجود کہ ظاہری و باطنی قوتِ احساس کی بقدر احساس و شعور قوی ہوتا ہے، کسی بھی حاسہ کو پیش آنے والے عارض کے دوسرے حواس پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اعجاز کے حامل قرآن کریم میں بہرے پن، اندھے پن اور گونگے پن کو ایک ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، کیونکہ اگرچہ آنکھ کے ذریعے بھی تکوینی امور کو پڑھنا ممکن ہے، لیکن تنزیلی امور کے پرتو کو محفوظ کرنے والے اسرار سے سب سے پہلے قوتِ سماع ہی محظوظ ہوتی ہے۔ زبان کا کام تو اس مشاہدے اور سماع کی ترجمانی کرنا ہے، لہٰذا جو انسان نفس و آفاق میں پائی جانے والی نشانیوں کو نہیں دیکھ سکتا وہ اپنے کانوں تک پہنچنے والے اسرار کو بھی نہیں سن سکتا اور اگر سن بھی لے تو سمجھ نہیں سکتا، اسی طرح جس دل کا خدائی احکام سے رشتہ ٹوٹ جائے وہ اپنے کانوں میں پڑنے والی آواز کو نہیں سمجھ سکتا، بلکہ بطرف شریعت پر غور و فکر کرنے کو بے فائدہ کام سمجھتا ہے۔

لہٰذا (اقرأ) کا حکم وحدت، تعامل اور تکمیل کی علامت ہے، نیز یہ مشاہدے، قدر پیمائی اور ذکاوت کے پہلو کی طرف اشارہ اور اس روحانی معرفت کی لفظی تعبیر ہے۔ چونکہ یہ ہمیں ملنے والا پہلا حکم ہے، اس لیے اس میں ہمارے غور و فکر کے بہت سے پہلو ہیں۔

اس موضع کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم نے اس کی کچھ زیادہ وضاحت کی ہے۔ ممکن ہے بعض اوقات ہم اپنے موضوع سے ہٹ بھی گئے ہوں، لیکن ہمیں امید ہے کہ اگر اس موضوع کا بار بار مطالعہ و تجزیہ اور اس پر غور و فکر کیا جائے گا تو ہمیں اس طوالت کے سلسلے میں معذور سمجھا جائے گا۔ ■

زیرِ نظر مضمون مشہور ترک مفکر اور دانشور استاد فتح اللہ گولن کی تصنیف ''اسلام اور دورِ حاضر'' سے لیا گیا ہے۔

فتح اللہ گولن کی یہ کتاب ان کے مساجد میں دیئے گئے مواعظ اور طلبہ و مریدین کے لیے منعقد کی گئی خصوصی مجالس میں سوالات کے جوابات کا مجموعہ ہے جسے مصنف کے شاگردوں نے تحریر کیا اور مصنف کی رضامندی اور تصحیح کے بعد شائع کیا گیا ہے، اس لیے بعض مقامات پر اس کے اسلوب اور مضامین پر خطیبانہ انداز کی چھاپ بھی نظر آتی ہے۔ ان لیکچرز میں انھوں نے اسلام کے حوالے سے پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات کے جوابات بڑے مدلل اور سائنسی انداز میں دیے ہیں۔

محمد فتح اللہ گولن نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی، جس کے اطراف میں اسلامی روح کی کرنیں پھیلی ہوئی تھیں۔ آپ کے والد اور والدہ دونوں دین کی گہری بصیرت کے حامل تھے۔ آپ کے دادا ''شامل آغا'' عزت و وقار اور دینی مضبوطی کا نمونہ تھے، جن کا اپنے پوتے کے ساتھ مضبوط روحانی اور قلبی تعلق تھا۔ آپ کے والد ''رامز آفندی'' اس مشکل اور بے شعور دور میں بھی علم و ادب، دین داری اور ذہانت کے لحاظ سے معروف شخصیت تھے۔

گولن ایک اسلامی اسکالر ہیں لیکن ان کی تعلیمات کا فوکس رواداری، برداشت، ایک دوسرے کو معاف کرنے کے سماجی رویوں کے علاوہ تعلیم کے فروغ پر بھی ہے۔ ان کی خدمت تحریک کے زیرِ اثر کئی این جی اوز ان کی فکر کو عام کرنے اور اسے عملی جامہ پہنانے میں لگی ہوئی ہیں۔

استاد فتح اللہ گولن کے بارے میں معلومات تقریباً ۲۵ ویب سائٹس پر موجود ہیں۔ مزید معلومات کے لیے مندرجہ ذیل ویب سائٹ کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے:

English:http://en.fgulen.com Urdu:http//pk.fgulen.com
Arabic:http://ar.fgulen.com

آیئے..... ! کتابوں کی صحبت میں کچھ وقت گزاریئے

زندگی کی سب سے قیمتی متاع
اچھی کتاب
سے زیادہ کچھ اور نہیں

کتابوں کی کہکشاں

کتابوں پر تبصرے کے روایتی کالم سے تھوڑا مختلف

محمود جمال

نیا سورج نکلتا ہے

جیسا کہ جوشؔ ملیح آبادی نے کہا ''رقص، اعضا کی شاعری ہے'' اسی کلیے کو پیشِ نظر رکھ کر کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ 'شاعری دراصل لفظوں کا رقص ہے'۔

جناب منظور ثاقب کی کتاب 'نیا سورج نکلتا ہے' اس وقت میرے سامنے ہے۔ ان کے کافی اشعار ایسے ہیں جن میں استادانہ پختگی نظر آتی ہے اور بہت ایسے ہیں جو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ مثلاً:

کوئی تو فیصلہ کرتا ہے پتھر کے مقدر کا
کسے ٹھوکر میں رہنا ہے کسے بھگوان ہونا ہے

کوئی اک وقت ہے اس کا معین
فلک پر واقعہ ٹھہرا ہوا ہے

یہ اشعار اپنی معنویت میں خاصے وقیع ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ہیں لیکن یہاں 'مشتے نمونہ از خروارے' کے طور پر ہی دیے جا سکتے ہیں۔ تاہم کتاب میں ایک دو چیزیں مجھے ایسی نظر آئی ہیں جن کا تذکرہ امید ہے خلافِ محل نہیں گردانا جائے گا۔ ثاقب صاحب سے معذرت کے ساتھ..... تلاش اور تراش دونوں فارسی کے الفاظ ہیں۔ کیا ان کے ساتھ ہندی کا لاحقہ 'تا' یعنی تلاشتا اور تراشتا لگ سکتا ہے۔ اہلِ لغت ذرا توجہ فرمائیں۔ قارئین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ تلاش، اپنی اصل کے اعتبار سے ترکی ہے۔ علاوہ ازیں ردیف تو وہی رہے گی جیسی چلتی آ رہی ہے لیکن قافیہ ہر شعر میں (مگر ہم وزن صورت میں) تبدیل ہوتا رہتا ہے اور اس کا تبدیل ہوتے رہنا ہی شعر کا اصل حسن ہے۔ اب اگر ردیف اور قافیہ دونوں ہی جامد ہوں یعنی ایک ہی لفظ یا لفظوں کی تکرار جاری رہے تو اچھے بھلے شعر کو بھی گہن لگ جاتا ہے۔ میں اس نکتے کو بھی اہلِ دانش کے حضور پیش کرتا ہوں۔ تاہم کتاب عمدہ ہے، چھپائی اور کاغذ بہت نفیس۔

نیا سورج نکلتا ہے، شاعر منظور ثاقب، قیمت ۲۰۰ روپے
پبلشر الحمد پبلی کیشنز۔ پرانی انارکلی لیک روڈ

رسولِ اکرم ﷺ اور تعلیم

علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی کتاب 'رسول اکرم اور تعلیم' دیکھی تو یوں لگا جیسے ڈاکٹر صاحب یہ کتاب لکھ کر اہم فریضے سے سبکدوش ہوئے ہیں۔ تعلیم یا یوں کہہ لیں کہ 'علم' کی اہمیت کیا ہے؟ اللہ رب العزت نے جب قرآن نازل فرمایا تو اس کا پہلا لفظ یعنی وہ لفظ جو جبرئیل علیہ السّلام کی زبان سے ادا ہوا اور رسول کرم ﷺ نے سنا

وہ تھا 'اقراء' (یعنی پڑھ)۔ اِس لفظ سے علم کی اہمیت واضح ہے۔ علامہ یوسف القرضاوی جن دلائل و براہین اور ایک سائنٹیفک طریقے سے علم کی اہمیت کو زیرِ بحث لائے ہیں وہ ان کے تبحرِ علمی اور عمیق طرزِ فکر کی دلیل ہے۔ انھوں نے کتاب وسنت اور ائمہ کے اقوال سے ثابت کیا ہے کہ حصولِ علم دین افضل ترین عبادت ہے۔ میں ان کی کتاب سے کچھ دلائل و اقوال یہاں دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں:

حسن بصریؒ کہتے ہیں:

''اگر علما نہ ہوتے تو لوگ جانوروں والی زندگی گزارتے۔ یعنی علما لوگوں کو بہیمیت کے دائرہ سے نکال کر انسانیت کے حلقے میں داخل کر دیتے ہیں۔''

یحییٰ بن معاذؒ کا قول ہے:

''علما امتِ محمدیہ کے لیے ان کے والدین سے بھی زیادہ رحیم و شفیق ہیں۔'' پوچھا کیسے؟ کہا: ''اس طرح کہ والدین تو ان کو دنیا کی آگ سے بچاتے ہیں جب کہ علما انھیں جہنم کی آگ سے بچاتے ہیں۔''

امام غزالیؒ کہتے ہیں:

''علم سے بے بہرہ افراد 'الناس' (لوگوں میں) شامل نہیں کیونکہ انسانوں کو چوپایوں سے ممتاز کرنے والی خاصیت علم ہے۔''

کتاب: رسول اکرم ﷺ اور تعلیم،

مؤلف: علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی، مترجم: ارشاد الرحمٰن

پبلشر: صبحِ روشن۔ آفس نمبر ۱۴، رتھرڈ فلور، مسلم سنٹر۔ اُردو بازار لاہور، قیمت ۲۵۰ روپے

روشنی ہی روشنی

جناب ماجد خلیل نے 'روشنی ہی روشنی' کے عنوان سے اپنی کہی ہوئی نعتوں سے مرتب ایک خوبصورت مجموعہ ہائے نعت شائع کیا ہے۔

اپنی جولانیٔ فکر کے حساب سے اس قبیلہ مدح خواہان میں ایک خوبصورت اضافہ ہیں۔ ان کا نمونۂ کلام ملاحظہ کیجیے۔

ایک شب وہ تھی کہ ہونا پڑا دہلیز بدر
ایک یہ دن ہے کہ دنیا تیری دہلیز پر ہے

تعلیمِ مصطفیٰ نے کیا سب کو پاش پاش
حرص و ہوس کے آئے جو پتھر دماغ میں

میں بہک سکوں یہ مجال کیا میرا رہنما کوئی اور ہے
مجھے خوب جان لیں مری منزلیں یہ شکستہ پا کوئی اور ہے

کتاب کی چھپائی بہت خوب اور کاغذ خوب تر ہے۔ ایسا کہ دل باغ باغ ہو جائے۔ آخری صفحے پر تصویر البتہ بہت بڑی ہے۔ پبلشر کے نام کو بھی ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ حالانکہ کتاب چھاپنے والے اس ترتیب سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔

کتاب: روشنی ہی روشنی، شاعر: ماجد خلیل،

ناشر: دبستانِ وارثیہ، کراچی، قیمت: ۳۰۰ روپے

مضامین و مکتوبِ بخاری

جو سید نجم الحسن بخاری کے سفر نامے ''ہائے امریکا'' کی اشاعت سے شروع ہوا۔ پانچ صد سات صفحات کی یہ کتاب پروفیسر غلام رسول تنویر کی ''مولفانہ'' مبصرانہ اور ناقدانہ کاوش ہے جس میں صاحبِ ممدوح کے علمی، ادبی و انشائی مضامین، سوانحی حالات، مکتوبات، ان کے بارے میں معاصرین کے تاثرات اور ان کی تخلیص ''ہائے امریکا'' سے انتخاب شامل ہیں۔

سید نجم الحسن بخاری کی ادبی شناخت ان کا انوکھا اسلوب بیان ہے۔ علی گڑھ میں طویل قیام نے ان کی زبان و بیان کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے مزاج کی کلاسیکیت، ان کے اسٹائل میں در آئی ہے۔ اس پر مستزاد علی گڑھ سپرٹ (Aligarh spirit) جو 'روح عصر' کی مانند ان کی تحریروں کا پیرہن ہے۔ انھیں مضمون آفرینی پر ملکہ حاصل ہے۔ ان کی زبان ٹکسالی ہے۔ ان کے مکتوبات اور خاکوں پر ان کے حسن مزاح کی چھاپ نمایاں ہے۔ ان کی تحریریں ان کے شخصی اوصاف (از قسم وضعداری، مروت، راست گوئی، حفظِ مراتب وغیرہ) سے مملو ہیں۔ بخاری بنیادی طور پر ایک مجلسی آدمی ہیں۔ خلوت نشینی ان کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں۔ عمر کے اس حصے میں بھی وہ احباب و اقارب سے رابطہ فکر و خیال قائم رکھے ہوئے ہیں۔

بخاری کی تحریروں میں فیصل آباد کی ادبی اور ثقافتی تاریخ کا جلی عکس نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں جن افراد اور اداروں کا تذکرہ ان کی تحریروں میں موجود ہے۔ ان کی اہمیت و ہمہ گیری کا سب کو اعتراف ہے۔ اس اعتبار سے بخاری کو فیصل آباد کا ادبی مورخ کہنا بے جا نہ ہوگا۔

بخاری کی طبیعت میں جو شوخی ہے اس کا اظہار ان کے مزاح میں برملا ہوتا ہے۔ مزاح نگار عموماً معاشرتی ناہمواریوں (Incongruities) کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔ بخاری کا مزاح، ابتذال اور پھکڑ پن سے مبرا ہوتا ہے۔ وہ بڑے لطیف پیرائے میں رمز و کنایہ کے ذریعے انسان کی بشری کمزوریوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ مزاح میں اگرچہ ان کا کینوس محدود ہے، لیکن ان کی وسعت فکری نے اسے جامع بنا دیا ہے۔

کتاب: مضامین و مکتوباتِ بخاری

تالیف: پروفیسر غلام رسول تنویر

پتا: کتاب مرکز امین بازار فیصل آباد، قیمت: ۳۰۰ روپے

www.urdudigest.pk

پیکرِ لُطف وقرار

کچھ لوگ باہر سے خوبصورت ہوتے ہیں، کچھ اندر سے لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنے ظاہر اور باطن دونوں جہات سے خوبصورت ہو۔ باطن کے خوبصورت ہونے سے مراد ہے اخلاق و کردار کا خوبصورت ہونا۔ میرا اندازہ ہے کہ خالد صاحب ایسے ہی تھے۔

وہ ایک دھیمے اور میٹھے لہجے کی باغ و بہار شخصیت ہیں۔ انھوں نے ایک واقعہ سنایا کہ وہ (یعنی خالد صاحب) عام بزنس کے ساتھ ساتھ زراعت کی طرف بھی آنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے ایک دوست کے ساتھ مشورہ کیا، دوست نے کیا مشورہ دیا، سنیے:

''اس مقصد کے لیے آپ کو 'ذرا' بدمعاش بننا پڑے گا اور اگر یہ نہ بن سکیں تو کم از کم حلیہ اور چہرہ ضرور ویسا بنا لیں۔ تب بات بنے گی۔''

آرٹ پیپر پہ چھپی یہ کتاب ان کی اہلیہ نے شوہر کی وفات کے بعد تیار کرائی ہے۔ دوستوں کے علاوہ بیٹے، بہو اور پوتوں کے مضامین بھی خوب ہیں۔ ٹائٹل اسلم کمال کا بنایا ہوا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کتاب ملنے کا پتا بھی نہیں لکھا۔

کتاب: پیکرِ لُطف وقرار، طابع: طلعت آرٹ پریس لاہور
ترتیب: انجم حمید بھٹی

نگر

شکست قبول بھی کر لی کہ داؤ ایسا تھا
تمام عمر نہ بھر پایا گھاؤ ایسا تھا

دونوں اشعار میں خیال آفرینی، لفظوں کا چناؤ اور رچاؤ کمال کا ہے۔ پروفیسر ظہیر اقبال کا مجموعہ کلام 'نگر' میں وہ فکر کی بلندی، سلگتے بے چین معاشرے کے آلام، محبوب کے جور وستم اور سب سے بڑھ کر شاعری میں وہ ایک باغیانہ سی رَوش جو حاضر و موجود کے خلاف کسی بھی رنگ اور درجے میں انقلابی اُٹھان کی محرک بن سکے موجود ہے۔ ان سب کی جھلک، پرتو یا جلوے ان کی فکر سے قطرہ قطرہ ٹپکتے ہیں۔ یہ کتاب ایسی نہیں کہ اسے سرسری سا دیکھ کر ایک طرف رکھ دیا جائے۔ یہ شاعری بڑے غور وفکر کی متقاضی ہے۔

وہ کون سی بستی تھی جہاں تجھ سے ملے تھے
اب یاد بھی باقی نہیں اس اجڑے نگر کی

کتاب: نگر، مصنف: پروفیسر ظہیر اقبال،
پبلشر: احبابِ ادب۔ ۱۶۶/والکرٹ روڈ میرپور خاص، قیمت ۱۵۰/روپے

نقوشِ نبویؐ کا اتباع کرنے والا ان سے بڑا کوئی نہیں۔ (حضرت عائشہؓ)

شب زندہ دار
حضرت عبداللہ بن عمرؓ

علم، تواضع، زہد وسخاوت، عبادت میں دوام، ضمیر کی استقامت اور موقف کی صداقت رکھنے والے ایک بیٹے کی ایمان افروز داستان اس نے اپنے محترم باپ کے ساتھ ہی اپنا دامن خیر سے بھر لیا تھا

خالد محمد خالد — ترجمہ وتہذیب: ارشاد الرحمٰن

یہ ایسے جلیل القدر صحابی کا تذکرہ جنھوں نے اللہ و رسول ﷺ سے اپنے تعلق کا آغاز ۱۳/برس کی عمر میں کیا۔ یہ وہ وقت ہے جب ۱۳/برس کے اس بچے نے اپنے باپ کی ہمراہی میں غزوۂ بدر میں ایک مجاہد کی حیثیت سے شرکت کا ارادہ کیا مگر رسول اللہ ﷺ نے کم سنی کے باعث اسے واپس لوٹا دیا۔ اس دن سے..... جی ہاں! اس بچے کا تعلق رسول اللہ ﷺ اور اسلام کے ساتھ اس دن سے شروع ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی قبل یعنی اس وقت سے جب اس نے اپنے باپ کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ اس دن سے لے کر آج کے دن تک جبکہ آپؓ اپنے رب سے ملاقات کر رہے ہیں۔ زندگی کے ان پچاسی برسوں میں ہم ان سے جہاں کہیں بھی ملتے ہیں، انھیں مستقل مزاج اور فرمانبردار ہی پاتے ہیں۔ ایسا استقلال اور ایسی فرمانبرداری کہ اپنے راستے سے سرِمو انحراف کرتے ہیں نہ اس

بیعت سے ذرہ بھر سرکتے ہیں جو انھوں نے کر رکھی ہے اور نہ کسی عہد کو توڑتے ہیں جو انھوں نے باندھ رکھا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ میں دکھائی دینے والی خوبیاں تو بہت سی ہیں: علم و تواضع، زہد و سخاوت، خمیر و منہج کی استقامت، عبادت میں دوام اور بہترین موقف پر قائم رہنے کی صداقت ان کی بہترین خوبیاں ہیں۔ آپؓ نے اپنی شخصیت اور پاکیزہ زندگی کو ان تمام فضائل و خصائل میں ڈھال لیا تھا۔ آپؓ نے اپنے والد عمرؓ بن خطاب سے خیر کثیر سمیٹی تھی اور والد ہی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے تمام تر خیر اور عظمت سے اپنا دامن بھر لیا تھا۔ پھر والد کی مانند اللہ و رسولؐ پر اپنے ایمان کو کمال تک پہنچا لیا تھا۔ اس لحاظ سے جب دیکھا جائے تو رسول اکرم ﷺ کے نقوشِ قدم کی پیروی کا آپؓ ایسا مظاہرہ کرتے ہیں کہ عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں۔

آپؓ رسول اللہ ﷺ کے ہر فعل کو بہ نظر غائر دیکھتے ہیں۔ پھر اسے پوری باریکی اور دقت سے بیان کرتے ہیں۔ مثلاً جہاں جہاں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی، آپؓ بھی وہیں وہیں نماز پڑھتے ہیں۔ جہاں رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو کر دعا کرتے ہیں، آپؓ بھی وہاں کھڑے ہو کر دعا کرتے ہیں۔ جہاں رسول اللہ ﷺ بیٹھ کر دعا کرتے ہیں، آپؓ بھی وہاں بیٹھ کر دعا کرتے ہیں۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ راستے میں ایک جگہ اپنی اونٹنی سے اترے اور دو رکعت ادا کیں۔ آپؓ بھی جب سفر میں اس مقام پر پہنچتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ کے اتباع میں وہی انجام دیتے ہیں۔ بلکہ آپؐ کو یاد آجاتا ہے کہ مکہ میں اس جگہ آپؐ کے اونٹنی سے اترنے اور دو رکعت ادا کرنے سے قبل آپؐ کی اونٹنی نے دو چکر لگائے تھے۔ لہٰذا آپؓ جونہی اس جگہ پہنچتے ہیں اونٹنی کو دو چکر لگواتے ہیں پھر دو رکعت ادا کرتے ہیں۔ آپؓ یہ سارا کام اسی طرح کرتے ہیں جس طرح رسول اللہ ﷺ کو کرتے آپؓ نے دیکھا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس اہتمام اور جذبۂ اتباعِ رسول ﷺ کو دیکھ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرط جذبات میں کہتی ہیں:

''عبداللہ بن عمر سے بڑا نقوشِ نبویؐ کا اتباع کرنے والا کوئی نہیں ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی طویل و مبارک زندگی رسول اللہ ﷺ سے اسی مضبوط دوستی کو نبھاتے گزار دی۔ حتیٰ کہ مسلمانوں پر ایک وقت ایسا آیا کہ ان کا نیک آدمی بھی یہ دعا کرتا دکھائی دیتا ہے: ''اے اللہ! جب تک میں زندہ رہوں تب تک عبداللہ بن عمرؓ کو بھی زندہ رکھ تاکہ میں ان کی اقتدا کرتا رہوں، میں تو ان کے سوا کسی کو نہیں جانتا جو دورِ اول کے طریقوں پر عمل پیرا رہتا ہو۔''

رسول اللہؐ کے نقوشِ قدم اور سنت کی پیروی کی یہ شدید خواہش ہی تھی کہ آپؓ رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کرنے سے ڈرتے تھے۔ اس وقت تک آپؓ کوئی حدیث بیان نہیں کرتے تھے جب تک اس کا ایک ایک حرف یاد نہ آجاتا۔

آپؓ کے ہم عصر کہتے ہیں: ''اصحابِ رسول میں عبداللہ بن عمرؓ سے بڑھ کر اس بات سے خوف کھانے والا کوئی نہیں کہ وہ حدیث میں کوئی کمی بیشی کرے۔''

اسی طرح آپؓ فتویٰ دینے میں بھی نہایت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے پاس ایک سائل کوئی فتویٰ پوچھنے کے لیے آیا تو انھوں نے جواب دیا:

''جو بات آپ پوچھ رہے ہیں مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں۔''

آدمی چلا گیا، ابھی وہ چند قدم ہی دور گیا تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ خوشی سے اپنی ہتھیلیوں کو بھینچ رہے تھے اور کہہ رہے تھے: ''عبداللہ بن عمرؓ سے ایک ایسا مسئلہ پوچھا گیا جس کا اسے علم نہیں تھا تو اس نے کہہ دیا کہ مجھے یہ معلوم نہیں!''

آپؓ اپنے فتووں میں اجتہاد سے گریز کرتے تھے کہ کہیں اجتہاد میں ان سے غلطی نہ ہو جائے۔ حالانکہ آپؓ جب تک زندہ رہے، دینِ عظیم کی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرتے رہے۔ وہ دین جس نے اجتہاد میں غلطی کر جانے والے کے لیے ایک اجر اور درست اجتہاد کرنے والے کے

لیے دو اجروں کا مژدہ سنایا ہے، دراصل ان کے ورع و تقویٰ نے ان سے فتویٰ دینے کی جرأت کو سلب کر لیا تھا۔

اسی طرح آپؓ منصب قضا سے بھی کنارہ کش رہے۔ قضا ایک ایسا منصب ہے جو حکومت و معاشرہ میں بلند ترین منصب تصور کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ منصب اپنے حامل کو دولت و عزت اور مقام و مرتبہ ہر چیز کی ضمانت دیتا ہے۔ لیکن پارسا و پرہیزگار حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو جاہ و حشمت اور دولت و ثروت کیا کیا ضرورت تھی؟

ایک دفعہ خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ نے آپؓ کو بلایا اور منصب قضا پر فائز ہونے کا مطالبہ کیا تو آپؓ نے معذرت کر لی۔ حضرت عثمانؓ نے اصرار کیا تو آپؓ نے مسلسل انکار ہی کیا۔

بالآخر حضرت عثمانؓ نے پوچھا: ''کیا تم میری نافرمانی کرتے ہو؟''

آپؓ نے جواب دیا ''ہرگز نہیں..... بلکہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ قضا کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ وہ قاضی جو جہالت میں فیصلہ کرتا ہے، وہ جہنم میں جائے گا۔

۲۔ وہ قاضی جو خواہش نفس کی بنیاد پر فیصلہ کرتا ہے وہ بھی جہنم میں جائے گا۔

۳۔ وہ قاضی جو اجتہاد (مقدمہ کو سمجھنے کی سرتوڑ کوشش) کرتا ہے اور درست فیصلہ صادر کرتا ہے، تو اس شخص کا معاملہ برابر برابر ہے، اس پر کوئی گناہ ہے نہ اسے کوئی اجر ملے گا۔''

لہٰذا میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ مجھے اس منصب سے معاف ہی رکھیے!''

حضرت عثمانؓ نے آپؓ سے یہ وعدہ لے کر کہ وہ یہ بات کسی کو نہیں بتائیں گے، ان کی معذرت قبول کر لی۔ کیونکہ حضرت عثمانؓ تو لوگوں کے دلوں میں آپؓ کے مقام و مرتبہ سے آگاہ تھے۔ انھیں یہ خطرہ لاحق ہوا کہ جب اتقیاء و صالحین کو ابن عمرؓ کا تحکمہ قضا سے دور رہنا معلوم ہوگا تو وہ بھی ان کے نقشِ قدم پر چل پڑیں گے اور اس طرح خلیفہ کو کوئی متقی شخص نہیں مل سکے گا جو قضا کے معاملات انجام دے سکے۔

دراصل اس طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنے نفس پر ہی متوجہ رہنا چاہتے تھے کہ اسے اطاعت و عبادت کے کاموں میں مزید کھپائیں اور اس کا تزکیہ کریں۔ کیونکہ حیاتِ اسلام کا یہ وہ دور ہے جب مسلمانوں نے دنیا فتح کر لی تھی اور مال و دولت کی برسات ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی حکومت کے مناصب اور عہدوں میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اموال و مناصب کی کشش و رغبت بعض مومن دلوں کے قریب ہونے کی کوشش کر رہی تھی جس نے کچھ اصحابِ رسولؐ کو جن میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی شامل ہیں اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ مناصب سے کنارہ کشی اور ان کی فتنہ سامانیوں اور چکاچوند سے دور رہ کر اور اپنے آپ کو زہد و ورع کی بلند مثال بنا کر اس دُنیا پرستی کے سامنے علمِ مزاحمت بلند کریں۔

.....

حضرت عبداللہ بن عمرؓ شب زندہ دار شخص تھے۔ رات مصلّٰی پر کھڑے استغفار اور آہ و بکا میں گزار دیتے۔ آپؓ نے عہدِ شباب میں ایک خواب دیکھا تھا جس کی رسول اللہ ﷺ نے ایسی تعبیر بیان کی کہ رات کا قیام آپؓ کی خوشیوں اور امیدوں کا آخری مرکز بن گیا تھا۔ آئیے! اس جاں فزا بیان کو سنیے جو آپؓ خود اپنے خواب کے متعلق بیان کرتے ہیں، آپؓ کہتے ہیں:

''میں نے عہدِ رسالتؐ میں خواب دیکھا کہ میرے ہاتھ میں ریشم کا ایک ٹکڑا ہے، میں جہاں بھی جانے کا ارادہ کرتا ہوں یہ ٹکڑا مجھے اڑا کر وہاں پہنچا دیتا ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ میرے پاس دو آدمی آئے ہیں، وہ مجھے آگ کی طرف لے جانا چاہتے ہیں، اس دوران ایک فرشتہ انھیں آملتا ہے اور کہتا ہے: چھوڑ دو!..... وہ دونوں آدمی مجھے چھوڑ دیتے ہیں۔

میرا یہ خواب اب میری ہمشیر حفصہؓ نبی ﷺ سے بیان کرتی ہیں تو آپؐ فرماتے ہیں: ''عبداللہ خوش قسمت

ہے، اگر وہ رات کو نماز ادا کیا کرے تو اس کا یہ رتبہ و مقام مزید بلند ہوگا۔"

اس دن سے لے کر اللہ سے ملاقات کے دن تک حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے سفر و حضر میں قیام اللیل کو ترک نہ کیا۔ آپؓ نماز پڑھتے، قرآن کی تلاوت کرتے اور اپنے رب کا کثرت سے ذکر کرتے۔ اپنے والد کی مانند جب قرآن کی آیاتِ نذیر سنتے تو آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو جاتا۔

عبید بن عمیرؓ کہتے ہیں: ایک روز میں نے عبداللہ بن عمرؓ کے سامنے یہ آیات تلاوت کیں:

"پھر سوچو کہ اس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر تمھیں (یعنی محمد ﷺ کو) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔ اس وقت وہ سب لوگ جنھوں نے رسولؐ کی بات نہ مانی اور اس کی نافرمانی کرتے رہے، تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔ وہاں یہ اپنی کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے۔" (النساء: ۴۱، ۴۲)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس آیت کو سن کر اس قدر روئے کہ آپ کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ اسی طرح ایک روز آپ اپنے بھائیوں میں بیٹھے یہ آیات تلاوت کرتے ہیں:

"تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انھیں گھاٹا دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اس دن جبکہ سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔" (المطففین ۱۔۶)

پھر مسلسل یہ آیت **یوم یقوم الناس لرب العلمین** دہراتے رہے اور آنکھوں سے آنسو بارش کی طرح برس رہے تھے۔ حتیٰ کہ آہ و بکا کی کثرت کے باعث گر پڑے۔

.....

اس عظیم انسان کے بلند ترین فضائل کی تشکیل کے لیے اس کا زُہد و ورع اور جود و سخا بیک وقت متحرک عمل ہوتے ہیں۔

آپؓ راہ خدا میں خوب دیتے ہیں کیونکہ آپؓ سخی ہیں۔

آپؓ حلال و طیب مال دیتے ہیں کیونکہ آپؓ پرہیزگار ہیں۔

آپؓ کو اس بات کی ذرا پروا نہیں کہ سخاوت آپؓ کو فقیر بنا دے گی۔ اس لیے کہ آپؓ زاہد ہیں، دولت کی دنیا سے آپؓ کو کیا غرض؟ آپؓ نے زندگی کا ایک حصہ امانت دار اور کامیاب تاجر کی حیثیت سے گزارا۔ آپؓ بہترین اور اچھی خاصی آمدنی والے لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ بیت المال میں بھی آپؓ کا ماہانہ اچھا خاصا تھا لیکن آپؓ نے اس عطا کو اپنے لیے کبھی ذخیرہ نہ کیا۔ آپؓ اسے بارش کی طرح فقراء و مساکین اور سائلین پر برسا دیتے تھے۔

ایک بار عبداللہ بن عمرؓ کے پاس چار ہزار درہم اور ایک چادر آئی۔ اگلے روز ایوب بن وائل نے آپؓ کو بازار میں اپنی سواری کے لیے ادھار چارہ خریدتے دیکھا تو آپؓ کے گھر جا کر پوچھا: "کیا کل ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن

"میرا یہ خواب اب میری ہمشیر حفصہؓ نبی ﷺ سے بیان کرتی ہیں تو آپؐ فرماتے ہیں: "عبداللہ خوش قسمت ہے، اگر وہ رات کو نماز ادا کیا کرے تو اس کا یہ رتبہ و مقام مزید بلند ہوگا۔"

عمرؓ کو چار ہزار درہم اور ایک چادر نہیں ملی تھی؟"

اہل خانہ نے کہا: "ہاں!..... ملی تھی!"

اس نے کہا: "میں نے تو آج انھیں سواری کے لیے چارہ ادھار خریدتے دیکھا ہے۔"

اہل خانہ نے کہا: "انھوں نے کل رات ہونے سے پہلے ہی اس مال کو تقسیم کر دیا اور چادر کندھوں پر ڈال کر باہر چلے گئے۔ واپس آئے تو چادر بھی ان کے پاس نہیں تھی۔ ہم نے پوچھا تو کہا: وہ ایک فقیر کو دے دی ہے!"

ابن وائل حیرت سے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے وہاں سے چلے آئے اور بازار میں آ کر ایک بلند جگہ کھڑے ہو کے لوگوں کو پکار کر کہنے لگے: "اے تاجرو! تم دنیا کو کس قدر محبوب سمجھتے ہو، یہ ابن عمر ہیں جن کے پاس چار ہزار درہم آتے ہیں تو وہ اسے بھی اللہ کی راہ میں تقسیم کر دیتے ہیں اور دوسرے روز اپنی سواری کے لیے چارہ ادھار خریدتے ہیں؟"

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی سخاوت فخر و غرور کا ذریعہ تھی نہ کوئی خوشنما افسانہ! آپؓ نے اپنی سخاوت کے لیے محتاجوں اور فقیروں کو خاص کر رکھا تھا۔ آپؓ کم ہی اکیلے کھانا کھایا کرتے تھے۔ کھانے پر یتامیٰ و فقرا لازماً آپؓ کے ساتھ ہوتے۔ بعض اوقات جب آپؓ کے بیٹے امیروں کو کھانے کی دعوت دیتے اور ان کے ساتھ فقرا نہ ہوتے تو آپؓ بیٹوں کو ڈانٹتے اور کہتے: "تم شکم سیروں کو دعوت دیتے ہو اور بھوکوں کو نظر انداز کرتے ہو۔"

فقرا آپ کی نوازشوں اور مہربانیوں سے آگاہ ہوگئے تھے اور آپؓ کے مشفقانہ سلوک کا مزہ چکھ چکے تھے۔ وہ آپؓ کی راہوں میں بیٹھے رہتے تاکہ آپؓ انھیں دیکھ کر اپنے ساتھ لے جائیں اور کھانا کھلائیں۔ یہ فقیر آپؓ کو اس طرح گھیر لیتے جیسے شہد کی مکھیاں پھولوں سے رس چوسنے کے لیے انھیں ڈھانپ لیتی ہیں۔

.....

مال و دولت آپؓ کے خادم تھے نہ کہ آقا! یہ ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کا ذریعہ تھے نہ کہ خوشحالی کا باعث! آپؓ کا مال صرف اپنے لیے نہ تھا بلکہ اس میں فقرا کا ایک معلوم حصہ بلکہ ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کرنے والا حصہ تھا جس کی کوئی مقدار مخصوص نہیں تھی۔

آپؓ نے اپنی اس سخاوت کو اپنے زہد و ورع سے مدد دے رکھی تھی۔ آپؓ دنیا پر مرے جاتے نہ اس کی طرف کھنچے جاتے بلکہ دنیا کی خواہش و آرزو صرف اس قدر کرتے جس سے جسم کو ڈھانپنے کے لیے لباس اور اسے قائم رکھنے کے لیے غذا بہم پہنچ سکے۔

خراسان سے آنے والے آپؓ کے ایک دوست نے آپؓ کو ایک عمدہ و نفیس حُلّہ بطور تحفہ دیا اور کہا: "میں خراسان سے تمھارے لیے یہ کپڑا لایا ہوں اور میری آنکھیں تب ٹھنڈی ہوں گی جب میں تمھیں کھردرے کپڑے اتار کر یہ خوبصورت کپڑا پہنے دیکھوں گا۔"

جناب ابنِ عمرؓ نے کہا: "تو پھر دکھاؤ!"

ہاتھ لگا کر دیکھا تو پوچھا: "کیا یہ ریشم ہے؟"

آدمی نے کہا: "نہیں..... یہ روئی کا بنا ہوا ہے۔"

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کچھ دیر توقف کیا پھر یہ کہتے ہوئے دائیں ہاتھ سے کپڑے کو پرے کر دیا: "میں اسے نہیں پہنوں گا..... مجھے تو اپنے بارے میں خطرہ ہے..... یہ خطرہ کہ اس کپڑے کا پہننا کہیں مجھے مغرور و

"جب آپؓ کے بیٹے صرف امیروں کو کھانے کی دعوت دیتے اور ان کے ساتھ فقرا نہ ہوتے تو آپؓ بیٹوں کو ڈانٹتے: "تم شکم سیروں کو دعوت دیتے ہو اور بھوکوں کو کیوں نظر انداز کرتے ہو؟"

متکبّر نہ بنا دے..... اور اللہ تو مغروروں متکبّروں کو پسند نہیں کرتا!!''

اسی طرح ایک روز ایک دوست نے آپؓ کو ایک بھری ہوئی بوتل دی۔

آپؓ نے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟''

دوست نے کہا: ''یہ ایک زبردست دوا ہے۔ میں عراق سے تمھارے لیے لایا ہوں!''

ابنِ عمرؓ نے کہا: اس دوا کا عمل کیا ہے؟ یعنی کس مرض کی دوا ہے؟''

اس نے کہا: ''یہ کھانے کو ہضم کرتی ہے!''

حضرت عبداللہ بن عمرؓ یہ سن کر مسکرائے اور اپنے ساتھی سے کہنے لگے: ''کھانا ہضم کرتی ہے؟ میں نے تو چالیس سال سے کبھی شکم سیر ہو کر کھانا ہی نہیں کھایا!''

قارئین کرام! جنابِ عبداللہ بن عمرؓ نے چالیس سال سے پیٹ بھر کر کھانا کسی تنگ دستی کی بنا پر نہیں چھوڑا تھا بلکہ زہد و ورع کے باعث اور رسول ﷺ اور اپنے والد کی اقتدا میں یہ معمول بنا رکھا تھا۔

آپؓ اس بات سے ڈرتے تھے کہ قیامت کے روز آپ سے کہا جائے کہ:

اذھبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیا و استمتعتم بھا

''نعمتیں تو تم نے دنیا کی زندگی میں ہی اڑالی تھیں اور وہیں ان سے لطف اٹھالیا تھا (اب کون سی نعمتوں کا مطالبہ کرتے ہو؟)

آپؓ سمجھتے تھے کہ میں اس دنیا میں ایک مہمان و مسافر ہوں۔ آپؓ نے خود اپنے بارے میں بیان کیا:

''رسول اللہ ﷺ کے وفات پا جانے کے بعد میں نے اینٹ پر اینٹ رکھی نہ کوئی درخت لگایا۔'' یعنی رہنے کے لیے کوئی مکان بنایا ہے نہ اس خواہش اور تمنا سے کوئی درخت لگایا ہے کہ اس کا پھل کھاؤں گا۔

میمون بن مہران کہتے ہیں: میں ابن عمرؓ کے پاس گیا اور ان کی تمام گھریلو اشیاء لحاف و بچھونے وغیرہ ہر چیز کا جائزہ لے کر اندازہ لگایا تو انھیں صرف ایک سو درہم قیمت کے برابر پایا۔

جنابِ ابن عمرؓ کی یہ حالت کسی فقر و تنگ دستی کی وجہ سے تھی، نہ کسی بخل کے باعث۔ آپؓ تو دولت مند اور سخی تھے۔ آپؓ کا یہ حال دنیا سے آپؓ کی بے نیازی، خوشحال زندگی سے دوری اور ورع و صداقت میں اپنے انداز پر کاربند رہنے کی وجہ سے تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے طویل عمر پائی۔ آپؓ نے اس اموی عہد میں زندگی گزاری جس میں دولت کی بارش ہو رہی تھی، ہر کہیں وسیع و عریض جاگیریں تھیں، اکثر مکانات بلکہ محلات کو فخر و رعنائی نے ڈھانپ لیا تھا۔ اس کے باوجود یہ جلیل القدر مینار اپنی بلندی و ثابت قدمی کے ساتھ باقی تھا۔ یہ اپنے منہج سے پھرتا ہے نہ اپنے زہد و ورع سے دست کش ہوتا ہے۔

جب آپؓ کے سامنے دنیا کے مال و متاع اور ساز و سامان کا ذکر کیا جاتا تو کہتے: ''میں اور میرے ساتھی (دنیا کے) معاملہ پر یکجا رہے ہیں اور میں ڈرتا ہوں کہ اگر ان کی مخالفت کروں گا تو ان سے مل نہیں سکوں گا۔''

پھر آپؓ دوسروں کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ میں نے تمھاری دنیا کسی کمزوری و ناتوانی کے باعث نہیں چھوڑی

''رسول اللہ ﷺ کے وفات پا جانے کے بعد میں نے اینٹ پر اینٹ رکھی نہ کوئی درخت لگایا۔'' یعنی رہنے کے لیے کوئی مکان بنایا ہے نہ اس خواہش اور تمنا سے کوئی درخت لگایا ہے کہ اس کا پھل کھاؤں گا۔

اور آسمان کی طرف ہاتھ بلند کر کے کہتے ہیں: ''اے اللہ! تو جانتا ہے کہ اگر تیرا خوف نہ ہوتا تو ہم اس دنیا (حکومت) کے معاملے میں اپنی قوم قریش سے لڑتے!''

.....

جی ہاں.....! اگر اللہ کا خوف نہ ہوتا تو آپؓ اس دنیا کے حصول کے لیے لڑتے اور کامیاب ٹھہرتے! بلکہ آپؓ کو تو کسی لڑائی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ دنیا آپؓ کی طرف بھاگتی ہوئی آ رہی تھی اور آپؓ دنیا کو اس کی مرغوبات و فریب کاریوں سمیت دھتکار رہے تھے۔ کیا خلافت جیسے منصب سے زیادہ پُرکشش بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے؟

حضرت علیؓ نے کئی بار خلافت کی پیش کش کی مگر آپؓ اس سے اعراض ہی کرتے رہے۔ حتیٰ کہ آپؓ کو دھمکی دی گئی کہ اگر خلافت کو قبول نہیں کرو گے تو قتل کر دیے جاؤ گے مگر آپؓ پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ انکار و اعراض کرنے لگے۔

حضرت حسنؓ کہتے ہیں:

جب عثمانؓ بن عفان شہید کر دیے گئے تو لوگوں نے عبداللہ بن عمرؓ سے کہا: ''تم لوگوں کے سردار ہو اور سردار کے بیٹے ہو۔ باہر آؤ تاکہ ہم تمھاری بیعت کریں۔''

ابنِ عمرؓ نے کہا: ''اللہ کی قسم! میں اگر اس ذمہ داری کا بار اٹھانے کی سکت رکھتا تو ضرور اٹھالیتا۔ میں کہتا ہوں کہ میری وجہ سے خون کا ایک قطرہ بھی نہ بہے۔''

لوگوں نے کہا: ''تم باہر نکل آؤ! ورنہ ہم تمھیں تمھارے بستر پر ہی قتل کر دیں گے۔''

لیکن اس پر بھی عبداللہ بن عمرؓ نے اپنا مذکورہ بیان ہی دہرایا۔

لوگوں نے لالچ بھی دیا اور ڈرایا دھمکایا بھی مگر انھیں کسی ذمہ داری کو قبول کرنے پر آمادہ نہ کر سکے!!

اس کے بعد جب کافی زمانہ گزر چکا تھا اور فتنوں کی بھرمار ہو گئی تھی تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی لوگوں کی واحد امید رہ گئے تھے۔ لوگ آپؓ سے اصرار کرتے کہ آپؓ منصب خلافت قبول کر لیں تو لوگ آپؓ کی بیعت کرنے کے لیے آجاتے ہیں مگر آپؓ مسلسل انکار کرتے رہے۔ آپؓ کا یہ انکار ایک ایسی راہ کے خطوط اور نقوش ثبت کر رہا تھا جو صرف آپؓ ہی کی طرف جاتی تھی کیونکہ اس راستے کو اختیار کرنے کی آپؓ کی اپنی ایک منطق اور دلیل تھی۔

حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد جب حالات خراب ہو کر خوفناک اور پُرخطر صورت اختیار کر گئے تو اگرچہ آپؓ منصب خلافت سے دور بھاگ رہے تھے تاہم اس ذمہ داری کو اٹھانے اور اس کے خطرات کا سامنا کرنے کے لیے ایک شرط پر تیار تھے کہ تمام کے تمام مسلمان مجھے قبول کریں، کسی ایک فرد پر بھی اس نقطۂ نظر سے تلوار نہ اٹھائی جائے کہ وہ مجھے خلیفہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

آپؓ کے مقام و مرتبہ اور محبت و عزت پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہونے کے باوجود یہ ممکن نہ تھا کہ تمام مسلمان آپؓ کی خلافت پر یکجا ہو جاتے۔ شہروں کی وسعت و دوری اور مسلمانوں کے درمیان ایسے اختلافات رونما ہو چکے تھے جنھوں نے مسلمانوں کو یوں پارہ پارہ کر دیا تھا کہ وہ باہم جنگ آزما ہو گئے تھے اور ایک دوسرے پر تلوار سونتے کھڑے تھے۔ یہ اختلافات ایسی فضا نہیں بننے دے رہے تھے جو اس اجماع کے لیے سازگار ہوتی جس کی شرط حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے لگائی تھی۔

ایک روز ایک آدمی نے آپؓ سے کہا: ''امت محمد ﷺ کے لیے تم سے زیادہ بُرا آدمی کوئی نہیں!''

آپؓ نے پوچھا: ''کیوں.....؟ اللہ کی قسم! میں نے تو کسی کا خون بہایا ہے نہ انتشار پھیلا کر کسی جماعت کا شیرازہ بکھیرنے کی کوشش کی ہے۔''

آدمی نے کہا: ''اگر تم چاہتے تو تمھاری خلافت پر دو آدمیوں کو بھی اعتراض نہ ہوتا۔''

آپؓ نے کہا: ''مجھے یہ پسند نہیں کہ خلافت مجھے اس حال میں ملے کہ ایک آدمی میری بیعت پر ہاں کہہ رہا ہو اور دوسرا ناں!''

ایک عرصہ تک حادثات رونما ہوتے رہے، بالآخر معاملہ حضرت معاویہؓ کے ہاتھ میں چلا گیا اور ان کے بعد ان

کے بیٹے یزید کے ہاتھ میں۔ پھر یزید کے بیٹے معاویہ ثانی نے خلافت پالینے کے بعد اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

ان دنوں حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک عمر رسیدہ بزرگ تھے لیکن اب بھی منصب خلافت کے لیے لوگوں کی امید تھے۔ مروان آپؓ کے پاس گئے اور کہنے لگے: ''اپنا ہاتھ بڑھاؤ! ہم تمھاری بیعت کریں۔ تم خود بھی سیدالعرب ہو اور سیدالعرب کے بیٹے ہو۔''

آپؓ نے اس سے کہا: ''ہم اہل مشرق کا معاملہ کیسے سیدھا کریں گے؟''

مروان نے کہا: ''ہم ان سے اس وقت تک لڑیں گے جب تک وہ بیعت نہیں کرلیتے۔''

آپؓ نے کہا: ''اللہ کی قسم! میں تو پسند نہیں کرتا کہ ۷۰ رسال تک خلافت میرے پاس رہے اور اس عرصہ میں میری وجہ سے ایک آدمی بھی قتل ہو۔''

.....

یہ قوت وتلوار کو استعمال میں لانے سے انکار ہی تھا جس نے جناب ابن عمرؓ کو انصارِ علیؓ و انصارِ معاویہؓ کے درمیان مسلح کشمکش میں غیر جانبدار موقف اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ آپؓ ان حالات میں ان الفاظ کو اپنا منہج وشعار بنائے ہوئے تھے:

ابن عمرؓ ان امور سے کنارہ کش رہے مگر اس عزلت و تنہائی میں آپؓ نے باطل کی حمایت نہیں کی۔ آپؓ نے کئی بار حضرت معاویہؓ کو جب کہ وہ حکمرانی کے نقطۂ عروج پر تھے، ایسے سخت انداز میں جواب دیے کہ حضرت معاویہؓ کو پریشان کر کے رکھ دیا۔ حتیٰ کہ حضرت معاویہؓ نے قتل کی دھمکی دیتے ہوئے کہا: ''جو میرے اور عوام کے درمیان ایک بال بھی رکاوٹ بنے گا تو وہ کٹ جائے گا۔''

ایک بار حجاج بن یوسف نے تقریر کے دوران کہا: ''عبداللہؓ بن زبیر نے قرآن مجید میں تحریف کی ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمر اس کی یہ بات سن کر فوراً بولے: ''تم جھوٹ بول رہے ہو، جھوٹ بول رہے ہو، جھوٹ بول رہے ہو۔''

> حضرت عبداللہؓ بن عمر نے فرمایا!
> ''جو شخص نماز کے لیے بلائے میں اس کے بلاوے پر لبیک کہوں گا اور جو شخص بھلائی کی طرف بلائے میں اس کی پکار بھی قبول کروں گا۔ لیکن جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے قتل اور اس کا مال لوٹنے کے لیے بلائے میں اس کی بات نہیں مانوں گا۔''

یہ سن کر حجاج حیران رہ گیا اور اسے اس بات سے بڑا دکھ پہنچا۔ حجاج تو وہ شخص تھا جس سے ہر چیز خوف کھاتی ہے۔ وہ اسی وقت آپؓ کو سخت سزا کی دھمکی دینے لگا۔

اس پر آپؓ نے حجاج کے منہ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا:

''تم جو دھمکی دے رہے ہو اگر اس پر عمل بھی کر ڈالو تو کوئی تعجب کی بات نہیں، تم تو مسلّط کیے گئے بیوقوف ہو!''

حضرت عبداللہؓ بن عمر قوت و جرأت کے باوجود آخری وقت تک اس بات کے حریص رہے کہ مسلح فتنہ وفساد میں آپؓ کا کوئی کردار ہو نہ حصہ۔ آپؓ نے اس مسلح کشمکش میں کسی فریق کا ساتھ دینے اور حمایت کرنے سے انکار کیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ مسلمانوں کا خون مسلمانوں ہی کے ہاتھوں بہتا دیکھتے تو غم والم سے پھٹ جاتے۔ آپؓ لڑائی کو روکنے اور مسلمانوں کے بہنے والے خون کو بچانے کی طاقت رکھتے تھے مگر فسادات آپؓ کی اس طاقت سے کہیں بڑھ گئے تھے اسی لیے آپؓ عزلت نشین ہو گئے۔

حضرت نافعؒ نے آپؓ سے سوال کیا تھا کہ اے ابو عبدالرحمٰن! آپؓ عمرؓ کے بیٹے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہیں۔ آپ فلاں فلاں خوبیوں اور فضیلتوں کے حامل ہیں تو پھر آپؓ کو حضرت علیؓ کی نصرت وحمایت سے کس چیز نے روک رکھا تھا؟

آپؓ نے جواب دیا: ''مجھے اس چیز نے روکا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر مسلمان کا خون حرام کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **قاتلو هم حتیٰ لا تکون**

فتنة ويكون الدين لله ''لڑو ان (کفار ومشرکین) سے حتیٰ کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین ایک اللہ ہی کا ہو جائے۔''

اور ہم نے کفار ومشرکین سے قتال کیا یہاں تک کہ زمین پر دین اللہ ہی کا ہو گیا تو آج ہم کس مقصد کے لیے لڑیں؟

میں اس وقت مشرکین سے لڑا ہوں جب حرم کعبہ ستون سے لے کر دروازے تک بتوں سے بھرا پڑا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے عرب کی سرزمین کو ان بتوں سے پاک کر دیا اور آج میں ان لوگوں سے لڑوں جو **لا الہ الا اللہ** کہتے ہیں؟''

یہ تھی آپؓ کی منطق اور حجت ودلیل اور یہ تھا آپؓ کا موقف!

.....

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے طویل عمر پائی، آپؓ نے وہ زمانہ دیکھا جب مسلمانوں پر دنیا کی فتوحات کے دروازے کھل گئے تھے، مال و دولت کی بارش ہو رہی تھی، عہدوں اور مناصب کی کثرت ہو گئی تھی، دنیا کی کشش اور رغبت کا سامان وافر ہو گیا تھا مگر آپؓ کی زبردست نفسانی قوت نے زمانے کی طبیعت اور مزاج کو بدل ڈالا، آپؓ کی اس قوت نے جاہ وجلال، مال و دولت اور فتنہ وفساد کے اس دور کو اپنی حد تک زہد وورع اور امن وسلامتی کا دور بنا دیا تھا۔ آپؓ نے پورے یقین وایمان، جذبۂ ایثار وقربانی اور پُروقار انداز میں فرمانبردار اور مستقل مزاج زندگی گزاری۔ دنیا آپؓ کی اس بہترین طبیعت پر کبھی غلبہ نہ پا سکی جس کو شاندار ایام اولیٰ میں اسلام نے اپنے سانچے میں ڈھالا اور صیقل کیا تھا۔

اُموی دورِ حکومت شروع ہوتے ہی طرزِ حیات میں تبدیلی واقع ہو گئی اور اس تبدیلی سے فرار بھی اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ ایسا دور تھا کہ ہر چیز میں وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ ایسی وسعت جس کو حکمرانوں کی طبیعت ہی پسند نہیں کرتی تھی بلکہ عوام وافراد بھی اس کے خواہش مند ہو گئے تھے۔

دنیاوی چکاچوند اور فریب کاری کے اس سمندر کے وسط میں فراخی و وسعت اور غنیمت و آسودگی کے فتنوں میں گھرے اس دور میں بھی جنابِ عمرؓ تھے کہ ہر چیز سے بے نیاز اپنی عظیم روحانی بلندی کے ساتھ زندگی گزارتے رہے۔ آپؓ نے زندگی کے مقاصدِ جلیل کی اس طرح نگہبانی کی کہ آپؓ کے ہم عصروں نے ان الفاظ میں آپؓ کو خراجِ تحسین پیش کیا:

''ابنِ عمر فوت ہوئے تو وہ فضل وکمال میں عمرؓ کی مثال تھے۔''

> ابوالعالیہ براء کہتے ہیں، ایک روز میں عبداللہ بن عمرؓ کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور انھیں معلوم نہیں تھا کہ میں ان کے پیچھے ہوں۔ اس دوران میں نے انھیں یہ کہتے ہوئے سنا: ''کندھوں پر تلواریں اٹھائے ایک دوسرے کا خون کر رہے ہیں اور کہتے ہیں: عبداللہ بن عمرؓ! ہاتھ بڑھاؤ ہم تمھاری بیعت کریں؟''

آپؓ کے فضائل و خصائل جب آپؓ کے معاصرین کو حیرت وتعجب میں ڈال دیتے ہیں تو وہ آپؓ کی اور آپؓ کے عظیم والد کی خوبیوں کا تقابل کرتے ہوئے یہاں تک کہہ جاتے ہیں: ''عمرؓ کے دور میں ان کی نظیریں موجود تھیں لیکن ابن عمرؓ کے زمانے میں ان کی نظیر موجود نہیں۔''

یہ تو ایک مبالغہ ہے جو ابن عمرؓ کی عظمت میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ کا تو کسی سے تقابل ہی نہیں کیا جا سکتا اور ممکن ہی نہیں کہ کسی بھی زمانہ میں ان کی کوئی نظیر موجود ہو۔

قارئین کرام! ۷۳ رہجری کو زہد وورع اور حق و صداقت کا یہ سورج مائل بہ غروب ہوا اور ابدیت کی کشتی مکہ ومدینہ میں ایام وحی کی اس نشانی کی میت کو اٹھا کر دنیا کے ساحل سمندر سے عالم آخرت اور رفیق اعلیٰ کی جانب رواں دواں ہو گئی۔

ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

جلال کے عالم میں فرمایا ''محمود! حدِ ادب سے مت بڑھو''

خرقانی کا پیراہن

ایک ولی سے ملاقات کی بے تابی کا ماجرا

وہ سلطان سے ملنے سے انکاری تھا اور محمود غزنوی دیوانہ وار اس سے ملنے کا متمنی تھا

حبیب اشرف صبوحی

سلطان محمود غزنوی اپنے پورے جا و جلال کے ساتھ دارالحکومت میں دربار لگائے بیٹھا تھا۔ درباری نہایت ادب سے دو رویہ کھڑے تھے۔ سامنے مرصع فرش پر اُمرائے سلطنت حاضر تھے۔ تصوف و معرفت کے نکات پر گفتگو چل نکلی۔ اولیاء اللہ کی عظمت و شان کا تذکرہ ہوا تو سلطان نے کہا:

''اولیائے اللہ کے مراتب کا کیا کہنا! ان کی صحبت میں بیٹھ کر تو انسان کی کایا پلٹ جاتی ہے۔''

یہ سن کر ایک امیر جس کا نام عبدالرحمان تھا، کھڑا ہوا اور نہایت ادب سے عرض کی:

اللہ سلطان کے اقبال کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ خرقان میں حضرت شیخ ابوالحسن نامی ایک ایسے ولی اللہ موجود ہیں۔ غلام نے کئی بار ان کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کیا۔ ان کا ایک عمل بھی سنت

نبوی ﷺ سے ہٹا ہوا نہیں۔

''تو ایسے ولی اللہ کی ہمیں بھی زیارت کرنی چاہیے۔''

یہ کہہ کر سلطان نے حکم دیا کہ خرقان جانے کی تیاری کی جائے۔

چند روز بعد سلطان حزم و حشم کے ساتھ غزنی سے خرقان جا پہنچا۔ حضرت شیخ ابوالحسنؒ خرقانی کی خانقاہ کے قریب دور دور تک شاہی خیمے نصب ہو گئے۔ سلطان نے ایک قاصد کے ذریعے شیخ کی خدمت میں پیغام بھجوایا کہ میں آپ کی زیارت کے لیے غزنی سے یہاں آیا ہوں۔ آپ خانقاہ سے میرے خیمے تک قدم رنجہ فرمائیں۔ ساتھ ہی سلطان نے قاصد کو اطلاع کی کہ اگر شیخ خیمے تک آنے سے انکار کریں تو اُن کو قرآن حکیم کی یہ آیت پڑھ کر سنا دینا:

ترجمہ: ''یعنی اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی اور حاکم کی جو تم میں سے''

قاصد نے شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلطان کا پیغام پہنچایا۔ شیخ نے فرمایا:

''مجھے معذور جانو''

اس نے آیت پڑھ کر سنائی تو شیخ نے فرمایا:

''میں ابھی **اطیعو اللہ** میں ایسا مستغرق ہوں کہ **اطیعو الرسول** کے معاملے میں نادم اور شرمسار ہوں۔ کاش اطاعت رسول ﷺ کا مقام مجھے حاصل ہو۔''

یہ کہہ کر ان پر گریہ طاری ہوا۔ حالت سنبھلی تو فرمایا:

''میاں ایسی صورت میں ''**اُولی امرمنکم**'' کی جانب کیونکر متوجہ ہو سکتا ہوں؟''

قاصد نے واپس جا کر سلطان کو شیخ کا جواب دیا تو اس پر رقت طاری ہو گئی۔ اُٹھا اور دیوانہ وار شیخ کی خانقاہ کی طرف چل دیا۔

حضرت شیخ اپنی خانقاہ میں مصلّٰی بچھائے بیٹھے تھے۔ سلطان ادب سے سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ شیخ نے آنے کا مقصد پوچھا تو سلطان نے کہا:

''حضرت بایزید بسطامی کی باتیں سننے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''

بایزید فرماتے تھے کہ جس نے مجھے دیکھا بدبختی اس سے دور ہو گئی (یعنی وہ کفر و شرک سے محفوظ ہو گیا)

سلطان محمود نے کہا: ''رسول اللہ ﷺ کو ابوجہل، ابولہب اور کتنے ہی دوسرے منکروں نے دیکھا، پھر بھی وہ بدبخت کے بدبخت (یعنی کافر) ہی رہے۔ کیا بایزید کا یہ درجہ (نعوذ باللہ) زیادہ بلند ہے؟''

یہ سن کر شیخ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ جلال کے عالم میں فرمایا، محمود! حدِ ادب سے مت بڑھو۔ رسول اللہ ﷺ کو صرف صحابہ کرامؓ ہی نے دیکھا تھا۔ ابولہب، ابوجہل اور دوسرے کفار نے فی الحقیقت حضور ﷺ کو دیکھا ہی نہیں، کیا تم نے قرآن مجید کی یہ آیت نہیں پڑھی:

ترجمہ: ''یعنی اے رسول ﷺ تو اُن کو دیکھتا ہے، جو تیری طرف نظر کرتے ہیں حالانکہ وہ تجھ کو نہیں دیکھتے۔''

یہ سن کر سلطان نے معافی چاہی اور درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔ شیخ نے فرمایا:

۱۔ ایسی چیزوں سے پرہیز کرو جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

۲۔ نماز ہمیشہ باجماعت ادا کرو۔

۳۔ سخاوت کو اپنا شعار بناؤ۔

۴۔ خدا کے بندوں کے ساتھ ہمیشہ شفقت کا معاملہ کرو۔

سلطان نے کہا ''میرے لیے دعائے خیر فرمائیے۔''

یہ سن کر سلطان نے معافی چاہی اور درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔

شیخ نے صرف تین نصیحتیں کیں اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے

حضرت شیخ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور کہا، ''اے اللہ! سب مومنین اور مومنات کو بخش دے۔''

سلطان نے کہا ''میرے لیے خاص دعا فرمائیے۔''

شیخ نے فرمایا: ''اللہ تیری عاقبت محمود فرمائے۔''

اس کے بعد سلطان نے اشرفیوں کی ایک تھیلی شیخ کے سامنے رکھی اور کہا، یہ نذر قبول فرمائیے۔

شیخ نے جو کی ایک روٹی سلطان کے سامنے رکھی اور فرمایا: ''یہ تمھاری دعوت ہے اس کو تناول کرو۔''

سلطان نے جو کی روٹی کھانا شروع کی لیکن پہلا ہی نوالہ حلق میں اٹک گیا۔ شیخ نے یہ حالت دیکھی تو پوچھا: ''کیا نوالہ حلق میں اٹکتا ہے؟''

سلطان نے اثبات میں جواب دیا تو شیخ نے فرمایا: ''تو یہ اشرفیوں کی تھیلی بھی میرے حلق میں اٹک جائے گی۔ اس کو فوراً اٹھا لو، یہ اشرفیاں بادشاہوں کی خوراک ہیں۔ فقیر کے لیے جو کی روٹی نعمتِ عظمیٰ ہے۔''

سلطان نے اشرفیاں قبول کرنے پر اصرار کیا تو فرمایا: ''یاد رکھ! ان اشرفیوں پر نہ تیرا حق ہے نہ میرا۔ ان کو قوم کی امانت سمجھو، اگر تم ان کو قوم کی مرضی کے خلاف تقسیم کرو گے تو قوم کے مال میں خیانت کرو گے۔ اگر تو ان اشرفیوں کو خیرات ہی کرنا چاہتا ہے تو تیرے ملک میں بہت سے مساکین ہیں، جب تُو سو جاتا ہے تو وہ اس لیے جاگتے ہیں کہ ان کے پیٹ خالی ہوتے ہیں۔ تیرے ملک میں ایسے شریف اور سفید پوش بھی موجود ہیں جو بظاہر آسودہ حال نظر آتے ہیں لیکن عسرت اور ناداری نے ان کے سینوں کو چھلنی کر رکھا ہے۔ وہ اپنی خودداری قائم رکھنے کے لیے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ اگر تو ان کی خبر گیری نہیں کرے گا تو یاد رکھ! یہ قیامت کے روز ربِ ذوالجلال کے سامنے تیرا گریبان پکڑیں گے اور کہیں گے کہ یہی وہ شخص ہے جو غیر مستحق لوگوں میں مال بانٹتا تھا اور مستحقین کو بھوکا رکھتا تھا۔''

شیخ کی یہ باتیں سن کر سلطان دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ جب حالت سنبھلی تو عرض کیا: ''آپ مجھ سے کچھ قبول نہیں فرماتے تو مجھے ہی کوئی تبرک عنایت فرمائیے۔'' یہ سن کر شیخ نے اپنا کُرتا اُتارا اور سلطان کو دے دیا۔ سلطان نے نہایت ادب سے کُرتے کو چُوما اور اجازت طلب کی۔ شیخ اٹھ کھڑے ہوئے اور دروازے تک سلطان کو چھوڑنے کے لیے آئے۔ رخصت کے وقت سلطان نے پوچھا! حضرت، کیا بات ہے، جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو آپ نے میری طرف التفات بھی نہیں فرمایا۔ اب رخصت کے وقت اتنی عزت افزائی کیوں فرما رہے ہیں؟

شیخ نے فرمایا: ''جب تم فقیر کے حجرے میں آئے تھے تو تمھارے دماغ میں بادشاہت کی بُو بسی ہوئی تھی مگر اب رخصت کے وقت تمھارا یہ حال نہیں ہے۔''

دن گزرتے گئے، کئی سال بعد سلطان محمود غزنوی نے سومنات پر حملہ کیا۔ کئی روز جنگ ہوتی رہی، آخر جب سلطان کو فتح میں دشواری نظر آئی تو حضرت شیخ ابوالحسن خرقانی کا پیراہن منگوایا۔ پیراہن لایا گیا تو اسے پہن کر سلطان سجدے میں گر گیا اور دیر تک گڑگڑا کر فتح کی دعا مانگتا رہا:

''رب العالمین! شیخ ابوالحسن خرقانی کے پیراہن کے واسطہ، مسلمانوں کو فتح یاب فرما۔''

سلطان کی دعا قبول ہوئی، دیکھتے ہی دیکھتے میدان جنگ کا نقشہ پلٹ گیا۔ مسلمان فتح یاب ہوئے اور سومنات کے بُت ان کے گُرزوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔

یہ اشرفیوں کی تھیلی اسی طرح میرے حلق میں اٹک جائے گی جیسے جَو کی روٹی تمہارے حلق میں اٹکتی ہے

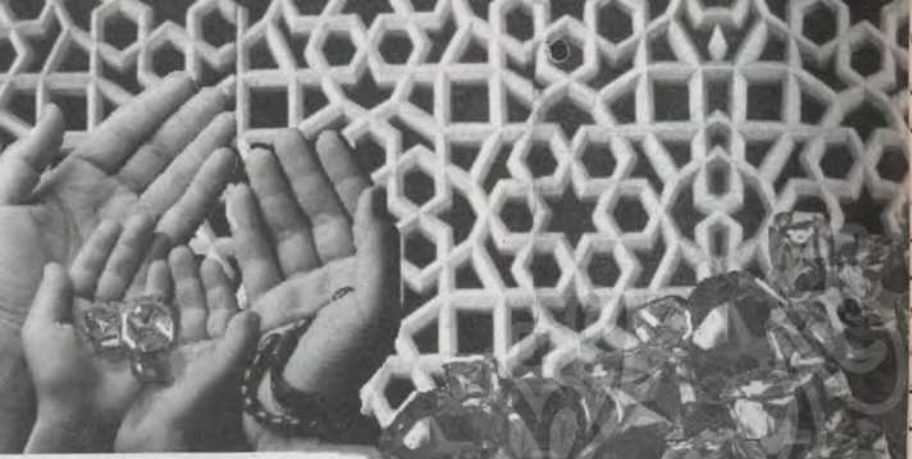

ڈاکٹر فرخندہ کامران

قربِ الٰہی کی نعمت خواہش سے زیادہ کوشش سے ملتی ہے

عبادت میں حلاوت

پانچ مضبوط بنیادوں کے بغیر نصیب نہیں ہوتی

ایک مسلمان کے لیے یہ بڑے اعزاز اور تکریم کا مقام ہے کہ جب اسے قربِ الٰہی حاصل ہو جائے۔ مگر قربِ الٰہی کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت و اطاعت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں بار بار فرماتے ہیں: **"اطیعو اللہ واطیعو لرسول"**، ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔''

کسی بڑی ہستی کی اطاعت کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں اس کے بارے میں کچھ بنیادی باتوں کا علم ہو۔ کیونکہ ہم دنیا میں بھی کچھ وجوہ کی بنا پر ہی کسی ہستی کی عزت و تکریم کرتے ہیں۔ ان میں درج ذیل اہم ہیں:

۱۔ علم
۲۔ قوت
۳۔ احسان کرنا
۴۔ احسان لینا
۵۔ جمال

یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ جب ہم کسی کے نام کے ساتھ بہت سی ڈگریاں لگی دیکھیں تو اس سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کسی نام کے ساتھ وزیر یا

جنرل کا لاحقہ ہو تو ہم قوت رکھنے کی وجہ سے اسے عزت دیتے ہیں۔ پھر جو ہم پر احسان کرے، اس کے شکر گزار ہوتے ہیں اور جس پر احسان کریں، اس کو بھی عزت دینے کا یہ انداز ہے۔ اسی طرح پُرکشش اور جاذب نظر انسان سے بھی لوگ عموماً مرعوب ہو جاتے ہیں۔

علم

''علم سب سے افضل عبادت ہے، اگر وہ رب تعالیٰ کی معرفت کا علم ہو اور اس کے اور مخلوق کے حقوق کی ادائی کا علم ہو۔'' (الزمر۔۹، مجادلہ،۱۱)

''علم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حیثیت کا ذریعہ بنایا ہے۔'' (فاطر،۲۸)

''اور اس نے سکھا دیئے وہ سب نام (جو چاہے) پھر پیش کیا ان کو فرشتوں پر اور پس فرمایا (اللہ نے) مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ، اگر تم سچے ہو۔ (فرشتے) کہنے لگے، تُو پاک ہے، ہمیں علم نہیں ہے، بے شک تُو ہی خوب جاننے والا، حکمت والا ہے تو جب اللہ نے فرمایا اے آدم! انھیں ان کے نام بتاؤ۔ (جو انھوں نے بتا دیئے تب اللہ نے) فرمایا، کیا نہیں میں نے کہا تھا تمھیں کہ بے شک میں ہی جانتا ہوں غیب کی (باتیں)، آسمانوں اور زمین کی اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو اور جب ہم نے کہا فرشتوں سے سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا۔'' (سورۃ بقرہ،۳۳،۳۲،۳۱)

یہ ساری آیات قرآن ہمیں علم کی اہمیت سے آگاہ کرتی ہیں۔ حضرت آدمؑ کو جو تکریم ملی یعنی انھیں فرشتوں نے بھی سجدہ کیا، اس کا باعث علم ہی تھا۔

فرشتے ہر وقت اللہ تعالیٰ کی تعریف، تقدیس اور تسبیح میں لگے رہتے ہیں، مگر انھیں کئی چیزوں کا علم نہیں ہوتا۔ انھیں صرف انہی چیزوں کا علم ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ ان پر منکشف کر دیں۔

دوسری طرف انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا گیا۔ اسے سارے علوم سکھائے گئے۔ پھر اس میں تجسس کا مادہ رکھا گیا کہ وہ ان کے علاوہ بھی غور و فکر کرے۔ اس کے باوجود خدا ہی کی ذات ہے جو عالم غیب ہے۔ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اگلے لمحے کیا ہوگا، مگر اللہ تعالیٰ آیت الکرسی میں فرماتے ہیں کہ اللہ کے علم کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا، وہی رب جو ذرہ سے کمال تک پہنچاتا ہے۔ قطرہ سے علقہ اور پھر ایک مکمل انسان کا روپ بناتا ہے۔ وہی رب جانتا ہے کہ ہمارے آگے پیچھے، دائیں بائیں اور مستقبل میں کیا ہوگا؟ اگر ہمیں مستقبل کا علم ہو جائے تو ہم اسی پریشانی میں رہیں گے کہ کل میں بیمار ہو جاؤں گا یا میرے ساتھ کوئی حادثہ ہونے والا ہے۔ اسی لیے یہ ساری آگہی اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی ہمارے دلوں کے حال جانتا ہے۔ سورۂ فلک میں فرماتا ہے کہ میں بذات الصدور یعنی دلوں کے اندر تک جاننے والا ہوں۔ گویا خدا تعالیٰ کی پوری کائنات میں سب سے زیادہ جاننے والی ہستی اور زمین و آسمان کے خالق ہیں۔ چنانچہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی عزت و تکریم اس لیے کرنی چاہیے کہ وہ سب سے زیادہ علم والے ہیں۔

قوت

دنیا میں کوئی طاقت و اقتدار کا مالک ہو، تو اسے بھی

اگر ہمیں مستقبل کا علم ہو جائے تو ہم بڑی پریشانی میں پڑ جائیں گے

خاص و عام سے عزت ملتی ہے۔ مثلاً کوئی وزیر، سرکاری افسر یا بڑا کاروباری ہمارے گھر یا دفتر آئے تو ہم اس کی خدمت میں کوئی کمی نہیں آنے دیتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ عزت کے قابل ہے..... وہ خدا جو ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے۔ وہی رب جو ایک معمولی بیج سے دیوہیکل درخت اُگا دیتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اللہ کی رضا کے بغیر پتہ بھی ہل نہیں سکتا۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کسی درخت کے پتے کب پیدا کرنے ہیں اور کس پر خزاں آئے گی۔ اسی رب کے ایک لفظ ''کُن'' سے سبھی اشیا وجود میں آئی ہیں۔

وہی بڑا پیدا کرنے والا اور سب کچھ جانتا ہے۔ اس کا کام تو یہی ہے کہ جب کسی چیز کو چاہے اور فرمائے ہو جا، تو فوراً ہو جاتی ہے۔'' (سورۂ یٰسین،۸۲)

وہ خدا جو زندگی اور موت دینے والا ہے تاکہ آزمائش کر سکے کہ کس کے اعمال اچھے ہیں۔ وہ جو ایک بے معنی قطرے سے کیسے ایک انسان کی تخلیق کرتا ہے..... تو کیا ہمیں اس کی قوت میں کوئی شک ہے؟ اگر کوئی شک نہیں تو ہمیں چاہیے کہ جب بھی اس رب کے سامنے جھکیں، تو شکر گزاری کی دولت سے مالا مال ہوں۔ نیز اللہ تعالیٰ کی عبادت ''ڈیوٹی'' سمجھ کر نہیں بلکہ محبت سے ادا کریں تاکہ آپ اس میں مزہ اور حلاوت محسوس کریں۔

احسان

احسان کے لغوی معنی اپنی استطاعت سے بڑھ کر دینا ہے۔ دنیاوی زندگی میں جب کوئی مشکل میں یا ویسے ہی ہماری مدد کرے تو ہم اس کے شکر گزار ہوتے اور اپنے ظرف کے مطابق اس احسان کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے، رب کائنات کے ہم پر کس قدر احسانات ہیں۔ شاید ہم انھیں شمار ہی نہیں کر سکتے۔ سورۂ رحمٰن میں اللہ جل شان فرماتے ہیں:

''تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔''

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے تو انسان کو تخلیق کر کے احسان فرمایا۔ پھر اسے اشرف المخلوقات کا درجہ دیا۔ بعدازاں اسے علم سکھایا اور فرشتوں سے سجدہ کرایا۔ اس انسان کو بولنا اور اپنے جذبات عیاں کرنا سکھایا۔ اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا کو جنت بھی دکھائی اور کہا کہ یہاں ہر چیز کھا پی سکتے ہو مگر اس درخت کے قریب نہ جانا۔ لیکن شیطان کو آدم کی عزت پسند نہ آئی اور اس نے آدم کو بہکا دیا۔ شیطان نے سب سے پہلے حیا کو ختم کیا اور اسی لیے آدم و حوا کا ستر ہٹا دیا۔ مگر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں ہر گرم و سرد سے بچانے کے لیے کپڑا اتارا۔

اسی رب نے ہمارے شعور کے بغیر سانس جاری کیا۔ ہمارا دل بھی اسی طرح غیر شعوری طور پر دھڑکتا ہے۔ ہمیں آنکھوں کی نعمت دی تاکہ ہم دنیا کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہو سکیں۔ کسی اندھے سے پوچھیے کہ آنکھیں کتنی بڑی نعمت ہیں۔ چہرے میں ناک، کان بھی بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

دنیا کی فیشن انڈسٹری کسی چہرہ سنوارنے کے لیے کروڑوں روپے خرچتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ ہمیں ۵/وقت کے وضو کرنے سے ایسا نور عطا فرماتا ہے کہ کوئی دیکھے تو دنگ رہ جائے۔

یہ سارے اللہ تعالیٰ کے احسانات ہیں جو بغیر قیمت کے اللہ نے ہمیں مفت عطا کیے۔ اسی لیے نہایت عاجزی سے ہمیں اللہ تعالیٰ کا احسان مند ہونا چاہیے۔

اللہ کی عبادت ڈیوٹی سمجھ کر نہیں محبّت سے ادا کریں پھر ہی مزہ اور حلاوت محسوس ہوگی

شکر گزاری

جو لوگ خوشی، غمی میں ہمارے کام آئیں اور دامے درمے سخنے ہماری مدد کریں، ہم قدرتاً ان کے شکر گزار ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں ہمیں سب سے زیادہ اللہ پاک کا شکر گزار بننا چاہیے۔ وہ ہم پر احسان در احسان کرتا رہتا ہے۔ مثلاً ہمیں ہر طرح کا رزق عطا کرتا ہے۔ مال، علم، عمر، صحت، بولنے کی قوت، چلنا پھرنا غرض کس کس احسان کا ذکر کریں؟ اگر آپ اللہ تعالیٰ کے احسانوں کا بدلہ دینا چاہتے ہیں تو اسی نے خود فرمایا ہے:

''خدا نے انس و جن کو اپنی عبادت کے لیے تخلیق کیا۔''

اگر ہمیں کسی سے محبت ہو تو اسی کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر صحابہ کرامؓ کو نبی کریم ﷺ سے محبت تھی۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ کی محبت اور اتباع میں صحابہ کرامؓ نے خود پر ظلم و ستم تک برداشت کیا۔

حضرت بلالؓ کی مثال واضح ہے کہ انھوں نے اللہ کی محبت میں کڑے ظلم برداشت کیے۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ان کی پشت دیکھی تو اس پر گوشت ہی نہ تھا۔ انھوں نے پوچھا ''یا سیدی! آپ نے اس ظلم کا کبھی ذکر نہیں کیا؟'' حضرت بلالؓ نے فرمایا ''جب برتن خریدا جائے، تو اسے بجا کر دیکھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی میری محبت آزما رہا تھا۔''

اللہ تعالیٰ سے جب محبت ہو جائے تو پھر اس کا ذکر کثرت سے ہوتا ہے۔ ہم اس سے ڈرتے اور رحمت کے طلب گار بھی ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ محبت ہے لہٰذا شرک کا شائبہ نہیں ہوتا اور عبادت خوب حلاوت دیتی ہے۔

جمال

جمال خوبصورتی کو کہتے ہیں۔ ہر انسان کو حسن اور خوبصورتی پسند ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی جمال پسند کرتا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ رب تعالیٰ نور السمٰوٰت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا جمال کائنات کی ہر شے میں دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک پودے کو دیکھیے کہ اسے کس طرح نہایت توازن سے تخلیق کیا۔

انسان کو دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بھی توازن سے بنایا ہے۔ اگر ہمارے کان ہاتھی کی طرح لمبے ہوتے تو ہم مضحکہ خیز مخلوق بن جاتے۔ پہاڑ دیکھیے کہ کس طرح زمین میں ٹھونکے گئے۔ کرۂ ارض پر نہریں نکالیں، دریا بنائے اور انھیں سمندروں میں ڈالا۔ اس کے بعد ہواؤں کو موافق کیا تاکہ جہاز چل سکیں۔ پھر بخارات پیدا کیے جن سے بادل بن کر بارش برساتے ہیں۔ یہ سبھی اشیا اور انھیں پیدا کرنے والا رب تعریف کے قابل ہے۔ سائنس کتنی ہی ترقی کر لے، بلندی پہ پہنچ جائے، وہ فطرت میں موجود جمال اور توازن کبھی حاصل نہیں کر سکتی۔

سورۂ کہف میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''دنیا کے تمام درخت قلم بن جائیں اور سمندر سیاہی بن جائے تو اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں۔''

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنے علم، قوت، احسان اور جمال کی اتنی مثالیں دی ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ مقصد یہی ہے کہ انسان اپنے رب کی عبادت ڈیوٹی سمجھ کر نہ کرے بلکہ اس میں حلاوت کا تڑکا بھی لگا لے۔

ایک حدیث قدسی کا مفہوم ہے: ''اگر بندہ اللہ کی طرف ایک قدم بڑھائے، تو اللہ اس کی طرف دس قدم بڑھاتا ہے۔''

دنیاوی کام کرتے ہوئے جس طرح لذت محسوس ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہوئے اسی وقت لذت محسوس ہو گی جب ہم اللہ کی تمام خصوصیات و صفات کو بغیر شک و شبہ کے تسلیم کر لیں۔ گویا تب زندگی سمعنا، اطعنا کی تصویر بن جاتی ہے کہ سن لیا اور مان لیا۔

(محترمہ علیمہ چیمہ کے درس سے ماخوذ)

قاضی صیب

اِک طرزِ تغافل ہے سو وہ اُن کو مبارک
اِک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

کھانا

ابھی شروع ہوا تھا، جب فون کی گھنٹی بجی، مہمان نے لمحہ بھر کی تاخیر کیے بغیر فون سنا۔ ''جی قاضی صیب!'' پھر اس نے پشتو میں دو چار جملے کہے، فون بند کیا اور ایک نمبر گھمانے لگا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ مودب تھا۔ خاموشی سے سنتا رہا اور پھر فون بند ہو گیا۔ ہم دونوں کئی مہینوں کی مسلسل منصوبہ بندی کے بعد وہ دوپہر بچا کر جوہر ٹاؤن میں نہر کنارے بنے ہوٹل سچوان میں کھانا کھانے آئے تھے۔ اس پُرسکون جگہ پر بیٹھ کر کرنے کے لیے ہم نے کتنی ہی باتیں اٹھا رکھی تھیں، گرم گرم چاولوں کی بھینی بھینی خوشبو آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ چکن جنجر سے گرم گرم بھاپ مرغولے بنائے اوپر کو اٹھ رہی تھی۔ تب تک ہم نے صرف سالن اپنی پلیٹوں میں ڈالا تھا۔

نور اسلم نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور جانے کی اجازت چاہی۔ میرے استفسار پر صرف اتنا کہا ''قاضی صیب محترم کا فون تھا، سمیحہ راحیل آپا کی طرف فوری جانا ہے۔ تفصیل ابھی اس لیے نہیں بتا سکتا کہ قاضی صیب نے صرف اتنا ہی بتایا ہے کہ سمیحہ آپا کے گھر کام کرنے والی مائی رو رہی ہے، جاؤ جا کر اس کا مسئلہ دیکھو، پولیس اس کے میاں کو پکڑ کر لے گئی ہے۔''

حوالہ قاضی صاحب کا تھا۔ نور اسلم کی ان سے محبت

اور تعلق کا مجھے کچھ اندازہ تھا کہ وہ صرف ان کے کہنے پر پشاور سے لاہور چلا آیا تھا۔ مسجد مکتب پراجیکٹ کی سربراہی اس کی منتظر تھی۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے چاروں صوبوں کے دور دراز دیہات میں غربت کی سطح پر جینے والے خاندانوں کے بچوں کے لیے مساجد میں پڑھنے کا انتظام اور اہتمام کر ڈالا۔ میں تین سال تک ان کے دور و نزدیک سے لاہور آئے اساتذہ کے لیے سالانہ پروگرام میں تربیت کے لیے جاتا رہا۔ بالکل لو پروفائل (low profile) میں ہونے والے اس کام کے دور رس نتائج کا کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ تمام اساتذہ زندگی میں پہلی بار اپنے اپنے گاؤں، گوٹھ سے نکلے تھے۔ ان کی تربیت کا ایک سلیبس تھا۔ ان کے لیے کتابیں اور پروگرام تھے اور یہ بھی اپنی اپنی مساجد کے امام بھی تھے۔

پہلی مرتبہ میں پینٹ کوٹ میں گیا تھا اور کافی انقلابی قسم کے خیالات کا اظہار کر آیا تھا۔ جو لوگ زمین پر توسیع کا کام خود نہیں کر رہے ہوتے، اکثر ان کے خیالات اسی طرح کے 'ارفع و اعلیٰ' ہوتے ہیں، خواب بننے اور خوابوں کو دنیا بنانے اور سجانے میں بہرحال انسانوں کے اندر کام کرنے کی نسبت محنت کم لگتی ہے۔ ان اساتذہ اور آئمہ سے بات کرنا بالکل آسان نہ تھا۔ وہ نئے عہد کی اصطلاحوں، ضرورتوں اور چیلنجز سے ہی بے نیاز تھے۔ ان کی زندگی میں تازگی اور روشنی کا نیا کھلنے والا روزن ہولے ہولے وسیع ہو رہا تھا اور انھیں حیران کیے دیتا تھا۔ ان کے خیالات میں وسعت اور تازگی آ رہی تھی اور معمول سے ہٹ کر، بہتر استاد بن کر پڑھانے اور عملی زندگی میں ان مجبور، لاچار اور بے سہارا بچوں کو آگے بڑھانے کے غیر روائتی کام پر وہ عملاً آمادہ ہو چکے تھے اور اب اسی کے طریقے سیکھ رہے تھے۔

اگر کسی کو پڑھانے کا اتفاق ہوا ہو تو وہ اتفاق کرے گا کہ دنیا میں اساتذہ کو پڑھانا سب سے مشکل کام اس لیے ہے کہ بیشتر اساتذہ ماننے اور سننے پر آمادہ کم ہی ہوتے ہیں۔ وہ جو اور جیسا کر رہے ہوں اسے ہی معراج مانتے ہیں۔ میری ٹائی اور سوٹ پر ہر بار بھرپور سوال اٹھانے کے باوجود خدا جانے کیا ہوا کہ قاضی صاحب کے اس منصوبے میں کام کرنے والے گوٹھ، گراں سے آئے آئمہ نے مجھے ذہنی طور پر قبول کر لیا۔ ان میں ہر عمر کے اساتذہ تھے اور نور اسلم ان کا سربراہ تھا۔ وہ انٹرنیٹ پر کام کرتا تھا اور ان اساتذہ نے کبھی کمپیوٹر کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ مگر کام کی اثر پذیری دیکھ کر مجھے قاضی صاحب پر بہت پیار آیا کہ کس بندے کو کہاں سے اٹھا کر لائے ہیں اور کس کام پر لگا دیا ہے۔ نور اسلم کی صلاحیتوں کا اندازہ مجھے اسلام آباد میں FCO (فارن اینڈ کامن ویلتھ) کے لیڈر شپ پراجیکٹ کے دوران ہوا جہاں وہ بہترین اسکول، اساتذہ، طلبہ اور ان کی تربیت کے لیے ایک مثالی ادارے کی نشاندہی کرنے کے لیے لاہور سے آیا کرتا تھا۔ اس کے پاس دنیا جہاں کے بہترین اسکولوں کے تربیتی، تفریحی نظام کی تفصیلات اور پاور پوائنٹ میں پریزینٹیشنز ہوتی تھیں اور میں سوچتا تھا، قاضی صاحب نے اس جن کو کیسے قابو کیا ہو گا؟ وہی جن میرے سامنے تھا۔ اس نے میز پر پڑی چابی اٹھائی، کوئی معذرت کیے بغیر اجازت لی اور سمیحہ راحیل قاضی کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا، جہاں سے اسے کام کرنے والی مائی کا مسئلہ حل کرانا تھا۔

شام کو اس کا فون آیا تو پتا چلا کہ مائی دیوز فیکٹری کے پیچھے رہتی تھی۔ فیکٹری میں چوری کرنے کے بعد چوروں نے پچھلی دیوار پھلانگی تو جاتے ہوئے ان کا کچھ سامان وہاں گر گیا۔ پولیس نے آسان ہدف دیکھ کر مائی کے میاں کو پکڑ لیا۔ اس کا پورے شہر میں کوئی والی وارث تھا، نہ داد رسی کرنے والا۔ وہ روتی سمیحہ راحیل کے گھر پہنچی اور بیٹی نے قاضی صاحب سے اسلام آباد رابطہ کیا اور قاضی صاحب جو ظلم کے خلاف بات کرتے تھے، جلوس اور

ریلیاں نکالتے تھے، ایک غریب کام کرنے والی بے سہارا اور بے آسرا مائی کی مدد کو یوں آئے کہ خود مجھے کتنی دیر حیرت ہوتی رہی۔ نور اسلم نہ صرف مائی کے میاں کو تھانے سے چھڑا کر لایا بلکہ اس کے گھر چھوڑ کر بھی واپس آیا۔ میں نے اسے ممتاز دانشور اشفاق احمد کا کہا سنایا، وہ کہا کرتے تھے: ''تھانے سے کسی دوست یا جاننے والے کا فون آ جائے تو فون پر پوچھے، ڈانٹے اور عقل سکھانے مت بیٹھ جاؤ۔ پہلے جا کر اسے مشکل سے نکالو، باقی سمجھانے کے شوق بعد میں پورے کر لینا۔''

قاضی حسین احمد نے جنھیں قدرت نے دائمی مسکراہٹ سے نوازا تھا، جماعت اسلامی کی ۲۲ رسال قیادت و امارت کی۔ اس سے پہلے وہ میاں طفیل احمد کے ساتھ جنرل سیکرٹری رہے۔ دو کمرے کے فلیٹ میں اپنی امارت کے سارے سال گزارنے والے قاضی صاحب کو میں نے ہمیشہ ایک مطمئن، متحرک اور متواضع آدمی پایا۔

منصورہ میں ذمہ داری سنبھالنے کے بعد جس گھر میں انھیں رہنا چاہیے تھا، وہاں جماعت کے ایک بیوروکریٹ بڑی بے نیازی سے رہتے رہے۔ لوگ باہم باتیں کرتے تھے، خدا جانے کسی نے ان سے بھی کہا کہ نہیں، بہرحال قاضی صاحب نے نہیں کہا اور خوش دلی سے سٹاف کے لیے بنائے گئے فلیٹ میں منتقل ہو گئے اور آخر تک وہیں رہے۔ نئے امیر سید منور حسن اس بھی سے ایک ہاتھ آگے چلے گئے، وہ گھر اور فلیٹ کے بجائے مہمان خانے کے ایک کمرے کے باسی ہیں۔

امرودوں بھری ٹرے

بہت سال پہلے رحیم یار خان سے تعلق رکھنے والے ہمارے دوست اکرم زبیر خان کے والد جماعت کی شوریٰ کے رکن تھے۔ ایک باران کا کوئی پیغام پہنچانا تھا تو اکرم زبیر کے ساتھ قاضی صاحب کے گھر جانے کا پروگرام بنا۔ سچی بات یہ ہے کہ ایک خوب صورت، کھلے ڈھلے اور آسودہ گھر کا تصور تھا۔ یہ بھی علم تھا کہ پشاور اور زیارت کا کاخیل میں ان کے گھر اور کاروبار ہیں۔

گھر کا دروازہ قاضی صاحب نے خود کھولا۔ ہمیں بٹھا کر اندر گئے اور کچھ دیر بعد ایک ٹرے اٹھا کر لائے۔ اس میں سیب اور امرود کٹے ہوئے تھے۔ بولے ''بھئی! گھر میں اس وقت یہی کچھ ہے۔ میں بھی کئی روز کے بعد آیا ہوں۔'' یہ ان سے پہلی ملاقات تھی، امرودوں کی طرف دھیان بھی نہیں گیا۔ وہ کہتے رہے ہم سنتے رہے، عام طور پر بڑے منصب پر پہنچ کر یا بزرگی کی منزل پر جا کر ہمارے ہاں بزرگ بن کر بات کرنے کا بہت رواج ہے۔ یہیں سے خلیج بننی شروع ہوتی ہے۔ آدھ گھنٹے کی ملاقات میں لمحہ بھر کو محسوس نہیں ہوا کہ ان سے پہلی ملاقات ہے اور وہ عالم اسلام کی اتنی بڑی جماعت کے قائد ہیں۔

بچوں کے لیے تفہیم القرآن کا تحفہ

روزنامہ نوائے وقت کے ساتھ میری بہت طویل رفاقت رہی۔ ماہنامہ پھول کے زیر اہتمام ملک کے ۶۰ ر سے زائد شہروں میں پھول کلب بنائے تو اکثر جگہوں پر جانا پڑتا۔ اتنی دور دراز سے خطوط اور فون آتے تو لوگوں کے اچھے لفظوں اور اچھے تصورات سے محبت کا بار بار اندازہ ہوتا، مجید نظامی صاحب اس حوالے سے بہت شفیق تھے کہ آگے بڑھتے کام کو روکتے نہیں تھے۔ انھوں نے ۳ رہزار کا ماہانہ بجٹ دیا ہوا تھا جو لکھنے والوں پر خرچ ہو جاتا۔ عام قارئین اور مقابلوں میں حصہ لینے والوں کے لیے لاہور میں تو ہم ڈان بریڈ اور پارلے والوں سے بڑے بڑے انعام لے لیتے مگر اندرون ملک والے محروم رہتے۔

میں نے ایک روز اللہ کا نام لے کر قاضی صاحب کو خط لکھ دیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے بچوں کے لیے ہر ماہ ایک تفہیم القرآن کا سیٹ اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی کتابیں بالخصوص خطبات

دینے کی منظوری دے دی اور پھر سالوں ہمیں باقاعدگی سے یہ تحائف ملتے رہے۔ اندرون پنجاب اور اندرون سندھ جب ڈاک سے یہ کتابیں پہنچتیں تو بچوں ہی نہیں ان کے والدین کی خوشی بھی دیدنی ہوتی جس کا وہ فوری اظہار بھی کرتے۔ ان تحائف نے جن میں البدر پبلی کیشنز کے عبدالحفیظ صاحب کی چھاپی ہوئی خرم مراد کی کتاب، چند تقریریں اور تعمیر انسانیت کے سعید اللہ صدیقی کی شائع کردہ صحیح مسلم اور صحیح بخاری کی جلدیں بھی شامل تھیں، بچوں کی تربیت اور ادارے کی نیک نامی میں بہت اضافہ کیا۔

بان کی چارپائی کا مزہ

ملک کے معروف آئی سرجن اور الخدمت پاکستان کے موجودہ سربراہ ڈاکٹر حفیظ احمد جنھیں ایک دنیا آنے والے سالوں میں جماعت کی سیاسی سرگرمیوں کی سربراہی کے لیے بھی بے حد موزوں پاتی ہے، بے حد نفیس اور مہربان انسان ہیں۔ خدمت ان کا شعار ہے اور عمدہ تجزیہ ان کی زندگی کا معمول۔ وہ قاضی صاحب کے بارے میں بات کرتے ہیں تو کھو سے جاتے ہیں۔ ''ہم نے کیا کھو دیا، ان کے جانے کے بعد احساس ہوتا ہے وہ خدا کی کتنی بڑی نعمت تھے۔ دن بھر سیاسی سرگرمیوں، ملاقاتوں میں مصروف اور رات کو پھر کام۔ ''وہ رکے۔ دو راتوں کی گواہی ہے میرے پاس، دونوں مختلف مواقع تھے۔

اسلام آباد میں تاریخی دھرنے کی رات میں ان کا میزبان تھا۔ سخت گرمی کے دن تھے اور میرے گھر میں اے سی نہیں تھا۔ ڈرائنگ روم میں بان کی چارپائی رکھ کر اوپر فوم ڈال کر ان کے لیے بستر تیار کیا تھا۔ دروازے کے نیچے دراز تھی جس سے مینڈک اندر آتے تھے۔ میں رات کے کئی پہر شرمندگی سے سوچتا رہا، اتنی بڑی جماعت کا قائد، لاکھوں لوگوں کا محبوب، میرا مہمان ہے اور کیا خبر وہ ٹھیک سے سو بھی سکے گا یا نہیں؟ نماز فجر سے بہت پہلے اسی گھبراہٹ میں کمرے میں گیا تو دیکھا، فوم کا میٹ رول کیا پڑا ہے اور وہ نماز پڑھ رہے ہیں۔

سلام پھیر کر بولے: ''ڈاکٹر صاحب بان کی چارپائی پر سونے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ ہمارے گھر میں ہوتی تھی مگر برسوں سے موقع ہی نہیں مل پایا۔'' ڈاکٹر حفیظ آج بھی بے یقینی کا شکار تھے کہ کیا خبر سوئے بھی تھے یا ساری رات عبادت میں ہی مصروف رہے۔ دوسرے دھرنے کے موقع پر اپنے ایک دوست سیال صاحب کے ہاں رات گئے قاضی صاحب کو لے کر پہنچایا، اس عالم میں کہ گھر کی بتیاں بند تھیں اور طے تھا کہ کسی کو بھی خبر نہ ہوگی کہ قاضی صاحب یہاں ٹھہرے ہیں۔ سیال صاحب نے بعد میں حیرت ملی پریشانی سے کہا کہ ''میں ساری رات چائے اور لوازمات لے کر ان کے کمرے میں وقفے وقفے سے جاتا رہا۔ تمھارا امیر کیا آدمی ہے، سوتا بھی نہیں۔''

جماعت کے اندر مزاحمتی طرزِ فکر

قاضی حسین احمد کو جماعت اسلامی کے اندر جو عزت احترام اور وقعت ملی وہ اس سے پہلے کسی اور کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ نصف صدی کی جامد روایات اور کم رفتاری نے جماعت کے اندر شدید مزاحمتی اور دفاعی مائنڈ سیٹ پیدا کر دیا ہے۔ پرانی بات پر اصرار، ہر نئی چیز سے انکار، ناکامیوں کا جواز، کامیابیوں پر اعتراض، قاضی صاحب کو زندگی بھر ان کے پیاروں سے بھرپور مزاحمت ہی ملی۔

میاں طفیل محمد سابق امیر ہونے کے باوجود شوریٰ میں تھے۔ وہ شوریٰ کے علاوہ بھی وقتاً فوقتاً پریس سے آزادانہ گفتگو کر جاتے۔ بنیادی طور پر وہ ایک صاف دل اور معصوم اور سیدھے سادھے انسان تھے جو جماعت کی رہنمائی پر طویل عرصہ فائز رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے دور کی کم وبیش تمام سیاسی پالیسیوں پہ جماعت کو دفاعی پوزیشن اختیار کرنا پڑتی رہی۔ وہ قاضی صاحب کی اختراعات اور تیز رفتاری پہ بھی معترض تھے۔ ایسے ہی

اعتراضات کے باعث جو بعد میں لایعنی ثابت ہوئے، بزرگوں کا ایک پورا گروپ نعیم صدیقی صاحب کی قیادت میں الگ ہو گیا اور انھوں نے تحریک اسلامی بنالی۔

وہاں کچھ ہی عرصے میں قیادت کے حصول کی جنگ شروع ہو گئی۔ بیچارے نعیم صدیقی صاحب قیادت کے حریص صالحین کی راہ میں رکاوٹ بنے تو انھیں سبکدوش کر دیا گیا۔ یہ وہ دن تھے جو نعیم صدیقی صاحب پہ بہت بھاری تھے۔ مجھے نعیم صدیقی (اپنی شاعری اور باکمال نثر، محسن انسانیت جس کی عمدہ مثال ہے) کے باعث بہت عزیز تھے۔ میں نے صفدر چوہدری صاحب سے رابطہ کیا اور صورتحال جاننا چاہی۔ صفدر صاحب جماعت کے شعبہ تعلقات عامہ کے سدابہار سربراہ رہے۔

انھوں نے کہا ''قاضی صاحب کے حکم سے میں نعیم صاحب کے گھر گیا اور انھیں کہا کہ قاضی صاحب محترم نے فرمایا کہ آپ ہمارے لیے اسی قدر محترم ہیں جیسے روز اول سے تھے۔ کسی لمحے کو بھی ہماری محبت میں کمی نہ ہو گی۔'' نعیم صاحب بیمار ہوئے تو منصورہ ہسپتال میں ان کا علاج ہوا۔ قاضی صاحب بطور خاص عیادت کے لیے جاتے اور ہمیں ان کا خیال رکھنے کا فرماتے۔ نعیم صاحب کی وفات کے بعد ان کے گھر گئے، بڑے صاحبزادے نوید اسلام صدیقی سے تعزیت کی اور درجات کی بلندی کی دعا کرنے کے بعد کہا ''مجھے یقین ہے کہ ہماری طرح ان کا دل بھی ہمارے لیے صاف اور مطمئن ہوگا۔'' بیٹے نے اس پر صاد کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نعیم صدیقی کا گھر قاضی صاحب کے گھر سے بالکل متصل تھا۔ دروازے اور صحن بھی جڑے ہوئے تھے۔ اختلاف اور علیحدگی کے بعد بھی جب قاضی صاحب سیڑھیوں پر یا سرراہ ملتے تو ان کی خوش مزاجی اور احترام میں رتی برابر فرق نہ آتا۔

سابقہ امیر جمع ہو گئے تو مشکل ہوگا

میاں طفیل صاحب کے اختلافی بیانات اور اخباری تنقید کے دوران ایک روز دارالضیافہ جہاں منور حسن صاحب باقاعدگی سے صحافیوں اور کالم نگاروں سے خود بھی ملتے اور قاضی صاحب سے تبادلہ خیال کا موقع فراہم کیا کرتے، بلایا گیا۔ اس موقع پر میں نے اپنی طرف سے بڑا انقلابی مشورہ دینے کی کوشش کی کہ امیر جماعت ایک ہی ٹرم کے لیے ہو یا دو ٹرم کے لیے تاکہ نئی قیادت نئی قوت کے ساتھ جماعت کو سنبھالتی اور چلاتی رہے۔ غلط پالیسیوں کا زیادہ نقصان نہ ہو۔ قاضی صاحب نے بے اختیار قہقہہ لگایا ''آپ سے ایک سابق امیر تو سنبھلتا نہیں دو دو، تین تین سابق امیر جماعت ہو گئے تو مشکل میں پڑ جائیں گے۔''

جماعت کے اندر بے لحاظ نقاد

صوبہ سرحد میں جماعت میں علماء کی تعداد باقی صوبوں سے زیادہ رہی ہے۔ سوئے اتفاق سے اب ان کی اکثریت تہہ خاک سو رہی ہے۔ مولانا گوہر رحمان علماء کے اس گروہ کا بہت نمایاں نام تھے۔ قاضی صاحب نے اپنی بصیرت اور فہم کے مطابق جس کا جماعت کے ارکان نے انھیں حق اور اختیار دیا تھا، جب جب کوئی نیا کام کرنا چاہا، سب سے زیادہ سخت الفاظ انہی علماء کی طرف سے استعمال ہوئے۔ شاید نیک لوگوں کا ہمیشہ سے یہی مسئلہ رہا ہے کہ وہ اپنی تعبیر اور رائے کو حرف آخر سمجھتے ہیں۔

پوری اسلامی تاریخ میں جگہ جگہ یہ مثالیں بکھری ہوئی ہیں اور اس سوچ اور انداز نے بہت سے خوابوں کو بھی بکھیرنے میں بڑی معاونت کی۔ ایک موقع پر جب کسی نے قاضی صاحب کے سامنے جمعیت علماء اسلام کے قائد مولانا فضل الرحمٰن اور ان کے کچھ احباب پر تنقید کی تو قاضی صاحب نے منع کیا۔ وہ صاحب اپنی رائے پر مصر رہے اور کچھ اور بھی ناگوار باتیں کہہ ڈالیں تو قاضی صاحب نے صرف ایک جملہ کہا ''اپنی رائے اور دلائل ضرور رکھیں مگر عدل کا دامن تو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔'' پھر کہنے لگے: ''ہمارے اپنے ساتھیوں

محبان رسول (ﷺ) توجہ فرمائیں

محبوب کائنات حضرت محمد ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں مختلف حکمرانوں کے نام خطوط ارسال کیے۔ یہ تمام خطوط انتہائی خوبصورت انداز سے معروف محقق، دانشور علامہ عبدالستار عاصم کی عنقریب شائع ہونے والی کتاب ''مکتوبات فخر کائنات ﷺ'' میں شامل ہیں۔ اور ساتھ ہی ان صحابہ کرامؓ کے حالات زندگی بھی شامل ہیں جو یہ خطوط مبارک لے کر جاتے رہے۔ آپ اپنی ذاتی لائبریری، گھر یا دفتر کے لیے آج ہی اپنی کاپی بک کروالیں۔ یاد رکھیں جس گھر میں رحمت اللعالمین ﷺ کے خطوط مبارک موجود ہوں گے وہ گھر دنیا کے بابرکت گھروں میں شامل ہوگا۔

رابطہ: مقبول اکیڈمی چوک اردو بازار لاہور۔ 0333-4393422/0423-37324164/0423-5855537

علم ادراک کے نئے خزانے (نئی کتابیں)

عراضہ.. ڈاکٹر عبدالقدیر خان-/1000	پیغمبر عالمؐ.. ملک مقبول احمد (نی سبیل اللہ)
تعلیمات قرآن.. ملک مقبول احمد-/300	کراچی میں مدفون مشاہیر.. ایم آر شاہد -/1000
پیش دستیاں... ڈاکٹر وحید قریشی-/400	میرے قائدؒ کا نظریہ.. آصف بھلی-/500
تحریکات پاکستان.. پروفیسر نذیر احمد تشنہ-/900	مٹی کا دیا (خودنوشت)... میرزا ادیب-/1000
ضرب الامثال.. پروفیسر نذیر احمد تشنہ-/600	تماشا گاہ عالم (خودنوشت)... زبیدہ سلطانہ-/700
حمید اختر.. علامہ عبدالستار عاصم -/2000	سفر جاری ہے (خودنوشت).. ملک مقبول احمد -/600
پاکیزہ زندگی... علامہ عبدالستار عاصم-/500	اہل قلم کے خطوط .. ملک مقبول احمد-/600
پنجاب کی لوک کہانیاں.. پروفیسر غلام مرتضیٰ-/400	انسائیکلوپیڈیا اصحاب النبیؐ.. ایم ایس ناز-/2400
سفر آرزو.. ملک مقبول احمد-/600	حکایات بصیرت .. عشرت رحمانی-/200
50 نامور ادبی شخصیات.. ملک مقبول احمد-/600	معاشی بدحالی اور زکوٰۃ.. علامہ عبدالستار عاصم-/500
سیاحت نامہ ترکی.. ملک مقبول احمد-/600	دختر پاکستان ملالہ.. علامہ عبدالستار عاصم-/500
بھارت کے فرعون (9 حصے..) اے حمید-/3600	لاہور کی باتیں.. اے حمید-/300
وطن کے سرفروش (5 حصے).. اے حمید-/2500	زندہ لوگ.. ڈاکٹر انور سدید-/600

مقبول اکیڈمی چوک اردو بازار لاہور 0423-37324164 0323-4393422

نے خاص کر مولانا نے جس قدر میری مخالفت اور دل آزاری کی ہے، اتنی تو ساری جمعیت العلماء اسلام نے مل کر نہیں کی ہوگی۔ خود ہی قیادت کا حق دیا ہے تو قیادت کے لیے دل کو بڑا کرتے ہیں۔''

اسلامک فرنٹ کی تشکیل اور پھر ناکامی پر بھی ان کو بہت تنقید سننی پڑی، اس موقع پر لگتا تھا کہ سب بکھر جائے گا۔ وہ خاموشی سے عمرے پر چلے گئے اور واپسی پر انھوں نے امارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس فیصلے سے ان کے ناقدین کے منہ بند ہوگئے اور کچھ عرصے کے بعد وہ دوبارہ امیر بھی منتخب ہوگئے۔

۲۰۱۳ء میں جماعت کے کارکنان اور قائدین محسوس کر رہے ہیں کہ ہمیں اپنے نام اور نشان کے ساتھ الیکشن میں اترنا چاہیے۔ زمینی حقائق یہ ہیں کہ دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں نے اسلامک فرنٹ کے تجربے کے بعد اپنے ہاں سیاسی جماعتیں الگ سے قائم کیں اور کامیابی حاصل کی۔ حتیٰ کہ جماعت اسلامی ہند نے بھی ویلفیئر پارٹی بنا لی۔ جو کام قاضی صاحب نے برسوں پہلے کر لیا تھا جلد یا بدیر جماعت کو اسی راستے کی طرف لوٹنا ہے جس میں اس کی اپنی فکر، نام اور قیادت سیاسی اُفق پر الگ نمایاں ہو۔

ان کا دل اور ظرف بہت بڑا تھا۔ محمد علی درانی

مشرف دور کے مشہور وزیر اطلاعات محمد علی درانی سے جو اب بہاول پور صوبہ بناؤ تحریک کے روح رواں ہیں، فون پر بات ہوئی تو میں نے پوچھا ''درانی بھائی! قاضی صاحب کے ساتھ آپ کا بہت وقت گزرا۔''

ان کا جواب تھا ''وہ ہمیشہ یاد آتے رہیں گے۔ اس قدر وقامت اور سوچ کے لوگ ہمارے ہاں ہیں بھی کہاں؟ ۱۹۷۸ء میں جب میں پشاور میں انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے گیا تو تب قاضی صاحب سے تعارف ہوا جو جلد ہی محبت کے تعلق میں بدل گیا۔ یہ تعلق سالوں پہ محیط ہے۔ پاسبان کا آئیڈیا لے کر ہم گئے تو انھوں نے کسی تاخیر کے بغیر اسے پسند کیا اور کام کی اجازت دے دی۔ اسلامی تحریک کے نفوذ کے کسی بھی کام کو وہ بہت جلدی قبول کر لیتے تھے۔''

درانی صاحب اسلامک فرنٹ کی ناکامی کے بعد جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو کر فاروق لغاری، پھر مسلم لیگ ق اور بعد میں مشرف حکومت کا حصہ بنے۔ میں نے پوچھا: قاضی صاحب سے جماعت کے بعد تعلق کیسا رہا؟ ان کا عجیب والہانہ جواب تھا۔ ''ان سے تعلق اور محبت میں کبھی فرق نہیں آیا۔ بیٹوں کی طرح سلوک رکھا۔ ان کا دل اور ظرف بہت بڑے تھے۔ وہ محبت دینے والے تھے، جاتے جاتے بھی جماعت کو ہر طبقہ فکر کے عام و خاص کی محبت تھما گئے۔''

سیالکوٹ میں تعزیتی ریفرنس

قاضی صاحب جس شب فوت ہوئے، صبح سیالکوٹ میں ایک تربیت گاہ جانا تھا۔ قدرت خدا کی کہ پشاور کے بجائے ان کا جنازہ میں نے سیالکوٹ میں ادا کیا۔ اس روز ملک کے طول وعرض میں، ہر بڑے شہر اور قصبے میں ہی نہیں، حرم پاک میں امام عبدالرحمٰن السدیس سے لے کر ترکی، مصر، سوڈان، انڈونیشیا، بوسنیا ہر جگہ انھیں لاکھوں لوگوں نے اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ سیالکوٹ کے تعزیتی پروگرام کا چونکہ میں خود حصہ تھا۔ حیرت سے مائیک پہ آنے والے مہمانوں کو دیکھ اور سن رہا تھا اور پیپلز پارٹی کے صدر، مسلم لیگ کے ایم پی اے، وزیر اعلیٰ کے مشیر میاں منشا، جمعیت اہل حدیث کے سربراہ، تاجروں کی انجمن، تحریک انصاف، زندگی کے ہر شعبے کے نمایاں لوگ اپنی اپنی محبت کا اظہار کر رہے تھے۔ قاضی صاحب زندہ تھے تو بھی سرخیوں اور محفلوں کی جان تھے۔ جماعت اسلامی کو صف اول کی سیاسی پارٹیوں میں لے آئے تھے۔ یہ وہی تھے جنھوں نے جمعیت العلماء اسلام کے ساتھ مل کر صوبہ سرحد (آج خیبر پختونخواہ) کی تاریخ میں پہلی مرتبہ حکومت بنائی۔

ڈاکٹر پرویز اقبال خلیل کی گواہی

پشاور سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر پرویز اقبال خلیل نے اس شام کیا خوب بات کہی ''پہلے الیکشن ہوتے تھے تو ہم دور دور سوات، دیر، مالاکنڈ جا کر اپنے جیتنے والے ساتھیوں کو مبارک باد دینے جاتے۔''

یہ ایسا الیکشن تھا کہ جدھر سے خبر آتی جیت کی خوشی ساتھ لاتی۔ میرا اپنا ساٹھ ہزار روپیہ مٹھائی کھلانے پر خرچ ہوا۔ یہاں تک کہ ہمارا اقلیتی ایم پی اے بھی جیت گیا۔ اس کا فون آیا تو بولا کہ ذرا تیار ہو کر آئیے گا۔ وہاں خوب رونق تھی اور ڈھول بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں چار پانچ جیپوں کو لے کر گیا۔ پھر ہماری خواتین بھی جیت گئیں۔ قاضی صاحب کی بصیرت اور قیادت نہ ہوتی تو کب ہونا تھا؟ ڈاکٹر پرویز خود پشاور ضلع کونسل کے نائب ناظم بھی منتخب ہوئے۔ وہ قاضی صاحب کی شخصیت اور قیادت پہ بات کرتے ہیں تو وقت کا حساب بھول جاتے ہیں۔ ''ہم ۶۰ رسال میں پہلی بار مولانا مودودیؒ کا نام اپنی تقریروں اور جلسوں میں لے سکتے ہیں۔ عوام ہم سے ہماری خدمت کی وجہ سے ہی نہیں قاضی صاحب کی قیادت کے باعث بھی محبت کرنے لگے ہیں۔ ہر سیاسی پارٹی کے رہنما یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کریں، قاضی صاحب نہ ہوتے تو کب ہونا تھا؟''

مولانا عبدالرب کے دس بیٹوں بیٹیوں میں سے سب سے چھوٹے، ملنسار اور وسعت قلب کے مالک قاضی حسین احمد کا نام جمعیت العلماء ہند کے قائد حسین احمد مدنی کے نام پر رکھا گیا۔ اس خاندان کے کسی بڑے چھوٹے نے کب سوچا ہو گا کہ تحریک دیوبند سے متعلق اس خاندان کا فرزند دلبند کل مولانا مودودیؒ کو پیارا ہو جائے گا اور پھر ایک دن آئے گا افغانستان سے بوسنیا تک، مصر سے تیونس تک، سوڈان سے کشمیر تک اس کے

> معروف صحافی اور دانشور جناب مجیب الرحمٰن شامی نے قاضی صاحب کے بارے اپنے جذبات واحساسات بیان کرتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی توانائی انھیں بخشی، انھوں نے اللہ کی راہ میں استعمال کی۔ انھوں نے بھرپور اننگ کھیلی اور ایک مطمئن شخص کے طور پر دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔ قاضی حسین احمد کی شخصیت اقبال کے اس شعر کی عملی تصویر تھی:
>
> تو رہ نوردِ شوق ہے، منزل نہ کر قبول
> لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو، تو محمل نہ کر قبول
>
> (محسن احسن بٹ)

چاہنے والے بیٹے اور بیٹیاں دیوانہ وار قاضی صاحب کے نعرے لگاتے نظر آئیں گے۔ سوڈان کی اسلامی تحریک کے قائد ڈاکٹر حسن ترابی اور صدر عمر البشر کے درمیان اختلاف ساری حدوں کو عبور کر گیا تو انھیں دنیا میں واحد قاضی حسین احمد ہی نظر آئے جو ان کے ثالث بن کر مسئلہ نمٹا سکتے تھے۔ ترکی میں جشن فتح ہوا تو قاضی صاحب صاحب واحد قائد تھے جنھیں کسی اور ملک سے اس مبارک لمحے کا حصہ بنایا گیا تھا۔ وفات پر افغانستان اور سوڈان کے صدر سے لے کر ترکی کے صدر و وزیراعظم کے ذاتی دستخطوں سے تعزیت نامے بھجوانے والوں کے سامنے ان کی عالم اسلام کے لیے خدمات اور کاوشیں تھیں جو بھلائے نہ بھلائی جاسکیں گی۔

عمران خان سے معذرت

جہاں وہ وسیع الظرف اور وسیع النظر تھے وہاں عدل اور انصاف کے معاملے میں بھی ان کا ثانی نہیں تھا۔ پنجاب یونیورسٹی میں اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکنوں کے ہاتھوں عمران خان کے ساتھ بدتمیزی کا واقعہ پیش آیا تو اظہر اقبال حسن سے جو اسی روز پنجاب کے قائم مقام امیر بنے تھے، پوچھا کیا معاملہ ہے؟ انھوں نے بتایا: یہ یہ سنا ہے، فوراً کہا، برا ہوا، بہت برا ہوا۔ یہ زیادتی نہیں ہونی چاہیے تھی۔

آپ عمران خان کے گھر جائیں اور معذرت کر کے آئیں۔ اسے حوصلہ دیں، دلاسہ دیں۔ نتیجتاً امیر العظیم، حافظ سلمان بٹ اور اظہر اقبال حسن جو اب پنجاب جماعت کے شعبہ تعلقات عامہ کے سربراہ ہیں، حفیظ نیازی کے گھر پہنچے۔

دو گھنٹے وہاں رہے۔ وہاں کارکنان کا مزاج بے حد بگڑا ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے خود بھی عمران خان سے بات کی، نہ صرف اسے حوصلہ دیا، معذرت کی اور تالیف قلب اور انصاف پسندی سے کام لیتے ہوئے اگلے روز ان کا مضمون روزنامہ جنگ میں شائع ہوا۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے بعض لڑکے اپنی غلطی ماننے پر آمادہ نہیں تھے۔ مگر قاضی صاحب نے اس تحریر میں اپنے بچوں کو ڈانٹا، غلطی پر تنبیہ کی اور گرفت کی۔ یہ کسی اسلامی تحریک کے قائد کا ہی خاصہ ہو سکتا ہے۔ عام سیاسی جماعت کا قائد ایسی تحریر اور ایسا اقرار کرنے کا کبھی سوچ بھی نہ سکتا۔ بعد میں اس ساری سازش کے سرغنے کا بھی پتا چلا کہ جس نے اپنے طور پر یہ پلان بنایا اور جمعیت کے ماتھے پہ ایک داغ لگانے کا باعث بنا۔

فیض کی شاعری

قاضی صاحب کو اقبال کے کلام پہ جس قدر عبور تھا، اس کی تو ایک دنیا گواہ ہے۔ ایک محفل میں انھوں نے فیض احمد فیض کی بیٹی کی دعوت پر شرکت کی تو بے نظیر بھی سامنے آ کر بیٹھ گئیں۔ وہاں قاضی صاحب نے مسلسل ۱۶ راشعار ایسے پڑھے جو فیض نے انقلاب، تبدیلی اور عوام کے لیے لکھے تھے اور کہا ''بے نظیر صاحبہ چلیں اقبال اور اسلام نہ سہی، فیض ہی سہی، اسی کی بات مان لیں۔ یہی نظام نافذ کریں۔''

وش یونیورسٹی اسلام آباد کے سربراہ پروفیسر طیب گلزار نے صحافیوں کے ساتھ ایک محفل کی بات بتائی جس میں وہ خود شریک تھے۔ ایک صحافی نے کہا ''آپ کو شاعری میں کون سب سے زیادہ پسند ہے۔'' جواب ملا: ''اقبال اور فیض دونوں پسند ہیں۔''

''فیض کے تو سارے خیالات ہی روسی نظام اور سوشلزم کے حق میں ہیں۔'' صحافی نے چڑانے کے انداز میں کہا ''اب آپ کیا کہتے ہیں؟'' قاضی صاحب مسکرائے اور بولے ''سچ تو وہی ہے جو میں نے کہا، کیا میں جھوٹ بولوں پھر.....''

موجودہ امیر جماعت کا اکرام واحترام

وفات کے بعد تو قاضی حسین احمد کی سو خوبیوں پر لکھنے کہنے والوں کی نظر ہے۔ جماعت کے ہر حلقے سے ان کی تعریف اور توصیف ہو رہی ہے اور برملا کہا جا رہا ہے کہ اس دور میں جماعت کا ان سے بڑا کوئی محسن نہیں ہے کہ جس نے زندگی بھر نظم جماعت میں رہ کر کام کیا اور جاتے ہوئے بھی جماعت کی عزت اور پذیرائی کا باعث بنا۔ سیالکوٹ میں مسلم لیگ ن کے ایم پی اے نے جو پروفیسر ڈاکٹر افضل اعزاز (سابق صوبائی وزیر) کے داماد ہیں یہ بتا کر حیران ہی کر دیا کہ ہمارے ہاں وہ آنے والے تھے کہ مقامی امیر جماعت نے منور حسن صاحب سے شکایت کر دی کہ مجھے علم ہے نہ اطلاع اور وہ سیالکوٹ آ رہے ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ یہ بات ان کے عہدے اور ذمہ داری سے چھوٹی تھی جو انھوں نے کہی مگر منور صاحب نے قاضی صاحب کو یہ کہہ کر منع کر دیا کہ مقامی امیر کہیں تو جائیے اور قاضی صاحب نظم جماعت کی اطاعت پر سیالکوٹ نہیں گئے۔ پشاور میں امیر جماعت کے دورے کے موقع پر ایک محدود محفل میں جس میں سربراہ شخصیات شامل تھیں، منور صاحب کے لیے قاضی صاحب ایسے مؤدب کھڑے تھے جیسے کارکن امیر کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ یاد رہے منور صاحب کو کراچی سے لاہور لانے اور اپنا قیم یا جنرل سیکرٹری بنانے والے قاضی صاحب ہی تھے۔ اپنے بیٹے اور بیٹی کو انھوں نے اس سال دوبار کہا کہ جماعت اسلامی اگر انھیں دریاں بچھانے پر بھی لگائے تو

خوشی سے کرنا اور تحریک سے جڑے رہنا۔

کیا انھیں اپنے بعد اولاد کے لیے جماعت کی طرف سے کسی مختلف اور سخت طرزِ عمل کا اندیشہ تھا؟ ان کے صاحبزادے آصف طلحہ قاضی جو نوشہرہ میں ان کی نشست پر ان کے مضبوط جانشین ہیں، پہلے امیر ضلع بھی رہے مگر قاضی صاحب کی موجودگی میں عتاب کا نشانہ بنے اور قاضی صاحب نے خاموشی سے بیٹے کی سبکدوشی برداشت کر لی۔

محترمہ سمیحہ راحیل قاضی صاحبِ فکر، صاحب الرائے اور بے پناہ صلاحیتیں رکھنے والی پاکیزہ روح ہے۔ وہ جماعت کی درس کونسل کی سربراہ رہیں۔ قومی اسمبلی کی رکن بھی رہیں۔ کئی کتابوں کی مصنف ہیں۔ جماعت کی خواتین میں شاید ہی کوئی ان جیسی متحرک، ووکل اور مدلل بات کرنے والی خاتون ہو مگر وہ بھی اسمبلی کی رکنیت کے دوران تنقیدی تیروں کا نشانہ بنتی رہیں۔ جماعتی مزاج یہ ہے کہ جونہی کوئی عوامی سطح پر مقبول ہونے لگتا ہے یا معاشرتی طور پر قبولیت کی سند پاتا ہے، اس کے لیے شدید تنقید اور مزاحمت شروع ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جماعت میں سیکڑوں باصلاحیت نوجوان ہونے کے باوجود شہرت، مقبولیت پانے والے یا میڈیا پر نمایاں ہونے والے نام گننے کے لیے انگلیوں کے پوروں کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ مرکزی شوریٰ میں ایک لابی ہمیشہ ایسی رہی ہے جن کی صلاحیت جماعت کو منصورہ اور اضلاع میں ضلع دفاتر کے اندر بند رکھنے میں ہی صرف ہوتی رہی ہے۔ جماعتی روایات اور سخت تربیت کے نام پر ان بزرگوں نے کافی غل مچایا جن کی قیادت ایف سی کالج لاہور کے ایک سابق پروفیسر کرتے رہے۔ لاہور جماعت کے ایک ڈاکٹر صاحب بھی اس کارِ خیر میں شریک رہے اور قاضی صاحب اور جماعت کے نوجوانوں کے لیے مشکلات کا باعث بنتے رہے۔

☆☆☆

قاضی صاحب کو جمعیت کے نوجوانوں سے بے پناہ محبت تھی۔ ان کا اظہار بھی کرتے اور خصوصی شفقت بھی۔ جواباً ان کو بھی وہ محبت ملی جس کا کبھی کسی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ''ہم بیٹے کس کے، قاضی کے'' جیسا والہانہ نعرہ اسی محبت کا جواب تھا۔ جمعیت نے میاں طفیل صاحب کا زمانہ بھی دیکھا۔ جنرل ضیاء کی حمایت نہ کرنے اور ریفرنڈم پر جماعت پالیسی کی مخالفت کے باعث عملاً کافی دوریاں واقع ہوگئی تھیں۔ قاضی صاحب کے آنے کے بعد جمعیت دفعتاً ہر اول دستہ بن گئی مگر ۱۹۹۳ء کے انتخاب میں اسلامک فرنٹ کی ناکامی کے بعد جمعیت کے لڑکوں میں بہت بے چینی تھی۔ ایک بار جمعیت کے اجتماعِ ارکان میں قاضی صاحب کا پروگرام تھا۔ تب کے ناظم اعلیٰ نے ماحول کی حرارت محسوس کر کے بطور خاص تاکید کی کہ روئے زمین پر ہمارے لیے وہ سب سے محترم ہستی ہیں۔ سوالات کی اجازت ہے مگر تحریری طور پر، احترام اور آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔

قاضی صاحب نے آتے ہی ماحول کی گھٹن کو محسوس کیا اور کہا کہ میں آج خطاب نہیں کروں گا بلکہ اپنے بچوں کے سوالات کے جواب دوں گا۔ وقت کی کوئی قلت نہیں ہے آپ سوال کریں گے میں جواب دوں گا اور ان شاء اللہ اپنے عزیزوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔ سوال آپ کھڑے ہو کر براہ راست کریں۔ اس کے فوراً بعد سوالات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

بعض سوال ہی سخت نہ تھے، انداز بیان بھی گستاخی کی حدوں کو چھونے لگا تھا۔ یہاں تک کہ سننے والے بھی سوال کرنے والے کو ناراضی کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ قاضی صاحب کا کمال یہ تھا کہ نہ ماتھے پہ شکن آئی نہ لفظ سخت ہوئے۔ تین گھنٹے کے بعد حالت یہ تھی کہ شاید ہی کوئی رکن ایسا ہو جس نے بڑھ کر والہانہ انداز میں پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے قائد کو گلے نہ لگایا ہو، ان سے ہاتھ نہ ملایا ہو۔

پریس کلب لاہور بے ساختہ جواب

پریس کلب لاہور میں اسلامک فرنٹ کا تعارفی پروگرام تھا۔ قاضی صاحب نے اپنے مخصوص پُرجوش انداز میں اسلامک فرنٹ کا تفصیلی تعارف کرایا۔ صحافی ہمیشہ سے بے لحاظ اور بے مروت ہوتے ہیں۔ سوالوں کا آغاز ہوا تو پہلا ہی سوال کسی میزائل کی طرح آیا۔ سوال کرنے والے کے لفظ اور جملے نامناسب حد تک ناگواری کا احاطہ کیے تھے۔ ''آپ کے پلے ہے کیا؟ ووٹ کوئی دیتا نہیں۔ آپ کے ساتھ کوئی چلتا نہیں، آپ کا پرابلم کیا ہے پھر نئے نام سے آگئے ہیں۔'' قاضی صاحب نے کیا محسوس کیا، کیسے ضبط کیا، بولے تو صرف اتنا:

''اک عرضِ تغافل ہے، سو وہ اُن کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے''

حضرت ابوہریرہؓ کی ۵/ہزار روایات

ایسے مشورے جو جملہ نما ہوتے ہیں، اندرون ملک سے ہی نہیں بیرون ملک سے بھی آتے تھے۔ ایک بار عرب دانشوروں کے ایک وفد نے مشورہ دیا کہ سیاست چھوڑ کر آپ کو اسکول کھولنے چاہئیں۔ تعلیم اور اصلاح کا کام کرنا چاہیے، اس کی زیادہ فضیلت ہے۔ قاضی صاحب نے پورے سکون سے ان کی بات سنی اور بولے: حضرت ابوہریرہؓ سے ۵/ہزار احادیث کی روایت ہم تک پہنچی ہے۔ حضرت عمرؓ اس معاملے میں پیچھے ہیں مگر کیا حضرت عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ اپنے کام، اس کے اثرات میں برابر ہیں؟ محفل پہ سناٹا چھا گیا۔ دوبارہ کسی نے اس موضوع پر بات آگے نہیں بڑھائی۔

طیب شاہین پنجاب یونیورسٹی اور صوبہ پنجاب کے ناظم رہے۔ پڑے باکمال، تیز طرار اور بہادر ناظم تھے۔ تعلیم کے بعد وہ پیپسی کولا میں چلے گئے اور اپنی محنت اور لیاقت سے وہاں جنرل مینیجر بن گئے۔ بعدازاں امریکا چلے گئے۔ مزید پڑھائی کی اور بزنس کا تجزیہ کرنے والی پوزیشن پہ فائز ہو گئے۔ ایک بار وہ منصورہ آئے، ایوب منیر نے کہا، قاضی صاحب طیب شاہین آئے ہیں، تب ان کو گئے کئی سال ہو چکے تھے۔ مسکرائے، اور بولے، پیپسی کولا والے..... پھر کہا، میں نے اپنے بیٹے پیپسی کولا والوں کی خدمت کے لیے تو تیار نہیں کیے۔ یہی سوچ تھی کہ ان کو باصلاحیت نوجوانوں کی ایک ٹیم ہر جگہ دستیاب ہو جاتی تھی جن سے وہ محبت کرتے، ان کا خیال رکھتے۔

قاضی صاحب کی وفات کے بعد وقتی طور پر تنقید کا محاذ خاموش ہے۔ تنقید اور بے وجہ تبصروں کے آسانی سے اپنائے جانے والے کلچر میں قاضی حسین احمد ایک مضبوط بند تھے۔ انگریزی اور ادبیات کے استاد اور مصنف پروفیسر ایوب منیر نے بتایا کہ کئی سال قبل ایک محفل میں کسی نے مولانا طاہرالقادری کے خلاف بات کی۔ قاضی صاحب نے لمحہ بھر کی تاخیر گوارا کیے بنا پروفیسر سے پوچھا، یہ آج پھول کے ایڈیٹر صاحب کہاں ہیں؟ یہ وہی پرچہ ہے نا جسے کسی زمانے میں امتیاز علی تاج نے شروع کیا تھا۔ انھوں نے نہ صرف بات پلٹ دی بلکہ محفل کے شرکاء کو تنقید کے آداب سے بھی آگاہ کیا۔

قاضی حسین احمد جسے زیادہ لوگ قاضی صیب کہا کرتے تھے، وہ اپنی زندگی کی ساری توانائیاں اپنے مقصدِ حیات کی سربلندی اور جماعت اسلامی کی سرفرازی کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کو ایک ملت بنانے، اختلافات کم کرانے، ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا سبق سکھاتے، پڑھاتے اپنی منزل پہ جا پہنچے۔

کون جانے منصورہ کی جامع مسجد میں جب وہ اپنے مہمانوں کو پورے اکرام اور احترام سے امامت پر فائز کرتے تو مہمانوں کے دلوں پر کیا بیتتی تھی؟ وہ مولانا اکرام اعوان ہوں، مفتی محمد حسین نعیمی، مولانا شاہ احمد نورانی یا سیف الاسلام۔ جو مہمان کسی دینی جماعت سے آیا، قاضی صاحب نے دل و جان سے اس کا احترام کیا اور اپنے کارکنان کو اپنے عمل سے اس کا درس دیا۔

معروف کالم نگار اوریا مقبول جان نے قاضی صاحب سے اپنے تعلق خاطر کا پل اقبالؒ کو قرار دیا۔ سید مودودیؒ نے اپنی تحریر میں اقبال کی ایک ایسی تصویر پیش کی جو صرف صاحب نظر شخص ہی دیکھ سکتا ہے۔ مجھے جماعت اسلامی کے بہت سارے زعما سے صحبت کا شرف حاصل رہا ہے۔ مولانا مودودیؒ کے بعد اگر میں کسی شخص کو بصیرت اور صاحب نظری کے مقام پر دیکھتا ہوں تو قاضی صاحب تھے۔ علم و تقویٰ اپنی جگہ لیکن رسول ﷺ کی جو حدیث ہے کہ ''مومن کی فراست سے ڈرو اس لیے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔'' وہ اس کی عملی تصویر تھے۔ مقام عرفان وہ چیز ہوتی ہے جہاں پہنچ کر حق الیقین کی حالت آجاتی ہے جہاں پہنچ کر داعی کے لیے دعوت کا کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ تسبیح لے کر بیٹھ جاتا ہے کہ وہ یقین کی منزل پا چکا ہوتا ہے۔ لیکن میں نے مقام عرفان پر پہنچ کر سید مودودیؒ کے علاوہ کام کرتے ہوئے کسی اور کو نہیں دیکھا۔ دوسری بات قاضی صاحب کی تھی کہ اللہ نے آپ کو یقین کی منزل سے روشناس کر دیا تھا اور وہ دنیا کی اغراض سے بالا ہو کر اللہ کے یقین پر کام میں مصروف تھے۔ اس مقام پر پہنچ کر دعوت کا کام کرنا اصل میں پیغمبرانہ کام ہے۔ یہ قاضی صاحب کی ذات کے اندر موجود تھا۔ (محسن بٹ)

پیپلز پارٹی کا دوست

میر بابر مشتاق نے بتایا کہ میرے ایک دوست جن کا تعلق پیپلز پارٹی سے تھا، وہ میرے ساتھ ایک روز لاہور آئے تو میں نے ان کو کہا کہ مجھے منصورہ میں کام ہے، تو تم میرے ساتھ چلو۔ کہنے لگا، اس شرط پر کہ قاضی صاحب سے میری ملاقات کرا دو۔ میں نے کہا، اگر قاضی صاحب منصورہ میں ہوئے تو ضرور ملاقات ہو جائے گی۔ ہم منصورہ پہنچے تو نماز عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ میں وضو کرنے کے لیے چلا گیا تو وہ مسجد کے گیٹ کے باہر کھڑا ہو گیا۔ میں وضو کر کے آیا تو دیکھا کہ قاضی صاحب مسجد کی طرف آ رہے ہیں۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میرے دوست کا رنگ زرد ہو گیا۔ میں نے کہا، کیا ہوا؟ کہنے لگا وہ دیکھو قاضی صاحب آ رہے ہیں۔ تو میں نے کہا، ڈرنے کی کیا بات ہے؟ کہنے لگا وہ اکیلے آ رہے ہیں، کوئی باڈی گارڈ ان کے ساتھ نہیں۔ ان کو ڈر نہیں لگتا۔

میں نے کہا، نہیں ہمارے رہنما صرف اللہ سے ڈرتے ہیں۔ اتنے میں قاضی صاحب قریب آ گئے اور انھوں نے خود ہی آگے بڑھ کر میرے دوست سے مصافحہ کیا۔ میں نے تعارف کرایا تو انھوں نے کہا: ''میں نماز عصر کے بعد آپ سے مہمان خانے میں ملوں گا۔ آپ میرے ساتھ چائے پئیں۔''

میرے دوست کی حیرانی دیدنی تھی۔ حیران و پریشان وہ کھڑا ہی رہا۔ نماز کا کہا مگر اس نے جواب نہ دیا۔ نماز عصر کے بعد میں اس کو مہمان خانے لے کر گیا۔ قاضی صاحب بھی آ گئے۔ کچھ اور بھی ملاقات کرنے والے افراد موجود تھے۔ قاضی صاحب نے سب سے حال احوال پوچھا۔ چائے پی اور اٹھ کر چلے گئے۔ میرا ساتھی بار بار مجھے کہتا رہا، میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ اپنے لیڈروں کے ساتھ اس طرح مل سکتا ہوں۔ ہمارا تو مقامی ایم این اے، ایم پی اے سے ملنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ جماعت اسلامی اور قاضی صاحب کے بارے میں ہمیشہ اس کے جذبات قابل قدر رہے۔ حتیٰ کہ پچھلے الیکشن میں اس نے جماعت اسلامی کو ووٹ دیا۔

اتحاد کے داعی

قاضی حسین احمد امت مسلمہ کے اتحاد کے سب سے بڑے داعی تھے۔ انھوں نے مختلف مکاتب فکر کے درمیان غلط فہمیوں اور آپس کی شکر رنجیوں کو دور کرنے کے لیے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ ایرانی قوم قاضی حسین احمد کو اپنے رہبروں میں شمار کرتی ہے۔ ہم پاکستانی قوم

جماعت اسلامی اور قاضی حسین احمد کے خاندان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ ان خیالات کا اظہار سابق ایرانی وزیر خارجہ علی اکبر ولایتی نے اپنے وفد کے ہمراہ منصورہ میں لیاقت بلوچ، جماعت اسلامی کے قائدین اور قاضی حسین احمد کے صاحبزادے آصف لقمان قاضی سے قاضی حسین احمد کے انتقال پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے کیا۔ وفد میں علی ولایتی، علی رضا حقیقیان، ڈاکٹر عباس فاموری، محمد حسین بنی اسد و دیگر رہنما بھی شامل تھے۔

علی اکبر ولایتی نے کہا کہ قاضی حسین احمد صحیح معنوں میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے جانشین تھے۔ ہماری ان سے ۲۵ سالہ رفاقت تھی انھوں نے دنیا میں تمام مذاہب کے درمیان ہم آہنگی اور اسلامی ممالک کے درمیان اتحاد کے لیے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ افغانستان پر جب روس نے حملہ کیا تو سب سے پہلے قاضی حسین احمد نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ میری ان سے آخری ملاقات تہران میں ہونے والی اسلامی بیداری کانفرنس میں ہوئی، جہاں انھوں نے اپنے خطاب میں امت مسلمہ کے اتحاد اور باہمی تنازعات اور شکر رنجیوں کو باہم گفتگو سے حل کرنے پر زور دیا اور عالم اسلام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی بات کی۔

حرف آخر

قاضی حسین احمد سے ہاتھ ملا رہا تھا جب اچانک دھماکے کی آواز آئی۔ مڑ کے دیکھا تو اوریا مقبول جان کی گاڑی ایک ادھ کھلے مین ہول میں گرنے کے بعد باہر نکلنے کے لیے زور لگا رہی تھی۔ اوریا مقبول جان کے ہاں علم اور معلومات ہی نہیں، جذبات بھی وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں، اس لیے اس شام وہ قاضی صاحب سے زیادہ بولے۔ اگلی صبح انھیں امریکی سفیر کی میزبانی کرنا تھی۔ ممکن ہے اسی لیے جلدی میں یہ حادثہ کر بیٹھے ہوں، ہمارے ہاں حادثے اسی جلدی میں ہوتے ہیں۔

منصورہ دارالضیافہ میں بجی یہ مختصر سی محفل اس لحاظ سے بڑی یادگار تھی کہ قاضی صاحب بیماری کے باوجود کئی گھنٹے ڈٹ کر بیٹھے اور کتنی ہی آف دی ریکارڈ باتیں مزے سے کر گئے۔ جماعت اسلامی کے لوگ بے شک قاضی صاحب کو کئی دہائیوں سے جانتے ہیں اور ان کی قیادت کے مزے لے رہے ہیں۔ ہر رہنما کے تجربات و مشاہدات اور رجحانات و میلانات اپنے پیش رو سے مختلف ہوتے ہیں۔ اسی سے تبدیلی کی توقع ہوتی ہے۔ اسی سے اداروں اور جماعتوں میں تبدیلی آتی ہے۔ قاضی صاحب کو بھی اس سے استثنا نہیں۔ ان کے آنے سے جماعت کی پالیسیوں، لوگوں، چہروں، باتوں، ترجیحات سبھی پہ فرق پڑا اور یہ ہر رہنما کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنے ویژن اور جس نقطہ نگاہ کو صائب اور بہتر خیال کرے، اس پر اپنے پیروکاروں کو لے کر چلے۔ قاضی حسین احمد اس شام کئی بار مسکرائے اور سچی بات ہے، اس قدر معصوم اور جاذب مسکراہٹ کو دیکھنا، ایک مختلف تجربہ ہوتا ہے۔ ان کی آنکھیں چمکتی ہیں اور پورا وجود اس لمحے کی خوشی میں شامل ہوتا ہے، نہ کچھ چھپانے کی حاجت ہوتی ہے اور نہ کچھ بتانے کی۔ دینی جماعتوں کے قائدین کو کبھی کبھی ضرور مسکرا لینا چاہیے۔

خود قاضی صاحب نے اس شام کئی سوال اٹھائے، حالانکہ وہ ہمارے سوالات کا اصل ہدف تھے۔ ان کا کہنا تھا، دانش وروں کا ایک طبقہ عرصے سے لکھ رہا ہے کہ بھوک بڑھ جائے تو انقلاب آتے ہیں۔ اس بات کو عقل، دلیل اور تجربے کی بنیاد پر ہر جگہ درست بھی تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں دانش وروں کی ایک نئی کھیپ تیار ہو رہی ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ ملک میں لوگ شدید معاشی مسئلے سے دوچار ہیں۔ مہنگائی، بیروزگاری، خودکشیاں، اس لیے لوگ ہماری تحریک میں کیسے نکلیں گے؟

قاضی صاحب کا دوسرا سوال بہت گہرائی اور وسعت لیے ہوئے تھا۔ ان کا کہنا تھا ''مخلص قیادت کے لیے یہ تو تجربے نے ثابت کر دیا کہ اشرافیہ یا ایلیٹ کلاس سے نہیں آسکتی۔ فوج کی قیادت کے ۳۱ برسوں

کا زوال بھی دیکھ لیا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہم لوگ جو اپنی جماعت کے ہر کام میں انتہائی مخلص، دیانت دار اور امانتوں کے ہر اصول اور ضابطے کا خیال رکھنے والے ہیں، خدمت کرنے کو زندگی کی بنیاد اور اصل سمجھتے ہیں اور بے غرضی سے کام کرتے ہیں، ہمارے بارے میں عام لوگوں کا خیال یہ کیوں نہیں ہے؟''

میں نے محسوس کیا، وہ اس حوالے سے دل سے اصل وجوہات جاننے کے خواہاں ہیں۔ بہتر ہوگا کہ کسی شام کچھ اہل علم وفکر کو پھر بٹھایا جائے اور کھلے دل و دماغ سے صرف اسی موضوع پر ان کو سنا جائے۔ وہ جن کے ہاتھ عوام کی نبضوں پر ہوتے ہیں وہ جو عوام کے جذبات سے کھیلتے بھی ہیں اور انھیں راہ بھی دکھاتے ہیں۔ وہ جو لوگوں میں سے ہیں۔ ایک بات تو طے ہے کہ اس بات کا احساس ہونا ہی ایک بے حد مختلف احساس اور خیال کی کھڑکی کھولتا ہے۔ لوگوں کا مختلف طرح سوچنے کو تسلیم کر لینا بے شک اس ''کون'' سے نکلنے کی ابتدا ہے، جس میں نیک لوگ بڑی سادگی اور اخلاص کے ساتھ یہ سوچ کر جیتے ہیں کہ سارا سچ اور سارا اخلاص انہی کے پاس ہے۔ حالانکہ یہ ایک نامکمل اور ادھورا سچ ہے۔ بہت سے لوگوں کے سچ مل کر ایک نسبتاً پورا سچ بنتا ہے، جو دور سے واضح نظر آتا ہے، اپنا آپ منواتا ہے۔

دین کی خدمت اور تبدیلی و اصلاح کا شعبہ ایسا ہے کہ اس میں کہنے والا کہتا ہے اور تحکم سے کہتا ہے۔ یقین سے کہتا ہے۔ اسے خبر ہوتی ہے کہ یہ صرف میری رائے نہیں ہے۔ چودہ سو سال کی روایت میری پشت پر ہے۔ سیاست میں منظر، مکمل طور پر بدل جاتا ہے۔ یہ دین اور ایمان کے مسئلے جیسا نہیں ہے۔ اس کو اس طرح سے نہ دیکھا جا سکتا ہے نہ ڈھالا اور سنبھالا جا سکتا ہے۔

یہاں سنانا نہیں سننا سب کچھ ہے۔ لوگوں میں رہنا سب کچھ ہے، ان کو جاننا، ان کی طرح کبھی سخت، کبھی نرم، کبھی سچ، کبھی جھوٹ، کبھی مصلحت، کبھی مصالحت، شادی، غمی، لڑائی، جھگڑے، تھانے، کچہریاں، نوکریاں، تبادلے، سفارشیں ہی اس سچ کی تکمیل کرتی ہیں، پھر انہی کے نعرے لگتے ہیں۔ انہی کی قیادت ملتی ہے، انہی سے پیار کرتے ہیں، انہی کو ووٹ دیتے ہیں، انہی کو نوٹ دیتے ہیں۔ اس فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ جماعت کا رہنما ہونا اصل میں کارکنان کا رہنما ہونا ہے۔ عوام کی رہنمائی ایک بالکل مختلف فنا ہے، کسی ضلعی یا صوبائی امیر کے لیے کارکنان کی محبت اور اطاعت تو سو فیصد ہوگی۔ ووٹ کے معاملے میں عوام کی رائے ذرا مختلف پیمانوں سے بنتی اور بگڑتی ہے۔ اس بات کو سمجھنا اور ماننا اتنا ضروری ہے، جس قدر یہ جاننا کہ مقامی سیاست میں خاندان، برادریوں، نوجوانوں اور حوصلہ مندوں کا کیونکر زیادہ ہو رہا ہے۔

یہ تو انسانوں کی رائے اور پسند کا معاملہ ہے، انتخاب کا مسئلہ ہے، جو لوگ مسئلے کو مسئلہ جان لیں، حل نکال لیتے ہیں۔ مثلاً کارپوریٹ دنیا میں ایک ٹوتھ پیسٹ نہ بکے تو اس طرح کی ریسرچ ہوتی ہے۔ اس کے رنگ، ساخت، خوشبو، خریداروں کے مزاج اور مالی پوزیشن سے لے کر اس جگہ کی دستیابی کہ جہاں اسے فروخت ہونا ہو۔

نیسلے نے کافی جیسی بدیسی، غیر روایتی اور مہنگی پراڈکٹ کو پاکستان کی مارکیٹ میں ناکامیوں کے بعد اس تحقیق کے زور پر ''تھری ان ون'' کر کے ایک منفرد عام برانڈ بنا دیا، جو عوامی نہ ہوتے ہوئے بھی عوامی ہو گیا۔ قیمتی اور مہنگا ہونے کے فیکٹر کو کم قیمت سے بدل کر ہر کسی کی دسترس میں پہنچا دیا۔ جماعت کے امراء کے ہوں یا اصلاع اور صوبوں کے، وہ عموماً عوام کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ ان سے لڑا جا سکتا ہے، بحث میں جیتا، نہ ہی ان کے بیانوں اور تقریروں پر تبصرے کی لذت حاصل ہو سکتی ہے، نہ شخصیت پرستی پر مشورے دیے جا سکتے ہیں۔ یہیں سے عوامی سوچ کی مرکزی شاہراہ سے ملانے والی پگڈنڈی سڑک سے پہلے ہی کھو جاتی ہے۔ کبھی ٹوٹ جاتی ہے۔ یہ حق ہے کہ وہ پسند کریں یا ناپسند، اس حق پر پابندی

کر یا اسے محدود کر کے نہیں بلکہ مان کر، اس کا احترام کر کے ہی راستہ نکلے گا۔

پھر وہ بڑی دل سوزی سے بولے ''ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم جو ہیں، عوام ہمیں نہیں سمجھتے، ہم لوگ معاملات میں جس قدر محتاط، دیانت دار اور انھیں ٹھیک اور صاف رکھنے والے ہیں، اخلاص سے خدمت کرنے والے ہیں، لوگ ہمارے بارے میں پورا سچ نہیں جانتے، ہمارے خلاف پراپیگنڈے کے لفظ کو چھاپ دیا جاتا ہے مگر ہماری اصل تصویر اور اصل پیغام چھپا لیا جاتا ہے۔''

قاضی صاحب کا فارم ہاؤس

انھوں نے پھر ہنستے ہوئے سید منور حسن سے پوچھا جو ایک زمانے میں کراچی سے سب سے زیادہ ووٹ کر لے کر ایم این اے بنے تھے کہ ''اس صنعت کار کی صاحبزادی کا کیا نام ہے، جس نے ''الخدمت'' کے ساتھ مل کر زلزلہ زدگان کے لیے بہت کام کیا۔ وہ بتا رہی تھی کہ راولپنڈی کے ایک اسٹیٹ ایجنٹ نے ان سے کہا، یہاں قاضی حسین احمد کا فارم ہاؤس ہے۔ اس خاتون نے کہا، میں نے تو ان کا دو کمرے کا گھر دیکھا ہوا ہے، وہ فارم ہاؤس کیسے لے سکتے ہیں؟ وہ بولا: آپ ان لوگوں کو نہیں جانتیں۔ جب اس خاتون نے اصرار کیا کہ ذرا اس کا اتا پتا تو بتاؤ، میرا تو اس میں حصہ نکلتا ہے۔ میں جا کر لینے والی ہوں۔''

اس پر وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا کہ میں نے سنا ہے، دیکھا نہیں ہے، حالانکہ شروع میں وہی آدمی یوں بات کر رہا تھا، جیسے وہ ایک ایک بات سے واقف ہے۔ میڈیا بھی عام طور پر یہی کرتا ہے۔ دس سال سے میرے بچوں کو امریکا میں پڑھائے جا رہا ہے۔ قاضی صاحب نے اس موقع پر اپنے دوسرے صاحبزادے سے اہل محفل کو متعارف بھی کرایا اور بتایا کہ ایک انگریزی اخبار نے لکھا، قاضی حسین احمد کی امریکا میں بڑی جائیداد ہے تو میرے بڑے بیٹے لقمان نے اسے خط لکھا کہ براہ کرم مجھے اس جائیداد کا ضرور بتائیں۔ اس انکشاف کا مجھے بہت فائدہ ہوگا اور میں جائیداد میں اپنا حصہ لے سکوں گا۔ اس پر اخبار نے نہ جواب دیا نہ تردید چھاپی۔ مگر ایک جھوٹی خبر چھاپ کر کتنے ہی لوگوں کی رائے تو خراب کر دی۔

اسد اللہ غالب صاحب تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی شرارتی سا سوال کر دیتے۔ کبھی چٹکی لیتے اور قاضی صاحب کے سخت ردعمل کا انتظار کرتے۔ میں نے پوچھ لیا، قاضی صاحب آپ نے میاں صاحب کو دل سے معاف کر دیا، کیا غصہ جاتا رہا؟ وہ بولے: وقت کے ساتھ چیزیں بدل جاتی ہیں۔ غصہ جاتا رہتا ہے۔ بڑے مقاصد سامنے ہوں تو فوکس ان پر ہوتا ہے۔ اس دوران اہل محفل کو پہلے نماز عشا کی دعوت ملی اور پھر کھانے کی۔ کھانے کے دوران اور یا مقبول جان معلومات کے دریا بہاتے اور سب ان میں غوطے لگاتے رہے۔ کسی اور کو بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ کھانا ختم ہوا۔

محفل کا دوبارہ آغاز ہوا تو میں نے دل کے کسی گوشے میں محفوظ ایک نازک سی بات پوچھ ڈالی کہ فوج کے خلاف اب جرنیلوں کے ناموں اور کاموں سے ہٹ کر بحیثیت ادارہ اس کے رول اور سیاست میں بار بار مداخلت اور قبضے کے خلاف بڑی دلیری سے بات ہونے لگی ہے۔ کیا آنے والے برسوں میں فوجی مداخلت اس سے روک سکے گی؟ قاضی صاحب بہت یکسو تھے اور پُر امید بھی۔ وہ بولے: دیکھیں اپوزیشن ایک نکتے پر آ جائے تو اس کے بڑے اچھے اثرات ہوں گے۔ مگر کچھ عرصے بعد سیاسی لوگوں نے ہی ان کو بلانا شروع کر دینا ہے۔ یہ سلسلہ ہر صورت رکنا چاہیے۔ پھر انھوں نے کہا، عدالتیں عمر قید نہ سہی، آئین توڑنے پر دو چار سال کی قید ہی دے دیں تو بھی سلسلہ رک سکتا ہے۔

غالب صاحب نے پھر جملہ کسا، قاضی صاحب! جماعت نے ہی ضیاء کے زمانے میں وزارتیں لی تھیں۔ قاضی صاحب نے اب کے انھیں دیکھا تو اس میں تھوڑی

سی ناگواری بھی شامل تھی۔ کہنے لگے، آپ لوگ آدھا سچ نہ کہا کریں، جماعت نے وزارتیں نہیں لی تھیں۔ نواب زادہ صاحب بھی تھے وہ قومی اتحاد کے وزراء تھے، باقی لوگ تو پھر بھی رہے۔ ہم تو چھوڑ آئے تھے، کیا یہ خوب اور حسن و قبح کی بات نہیں ہے کہ ہم نے کبھی فوج کو دعوت نہیں دی۔ جب فوج آئی، ہماری شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا؟ ہم نے قرارداد پاس کی کہ مارشل لاء کسی صورت قبول نہیں۔ عبوری سویلین حکومت انتخاب کرائے۔

ضیاء الحق کا معاملہ یہ تھا کہ جماعت کے سابق امیر اس کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ وہ ان کا ذاتی رجحان تھا۔ جماعت اور میاں صاحب مسلسل کشمکش میں رہے۔ جماعت کی شوریٰ نے اس عمل پر عوامی احتجاج نہیں کیا۔ ضیاء نے میاں صاحب سے اپنی شوریٰ کے لیے ۶۰ رنام مانگے تھے۔ جماعت کی شوریٰ نے نام دینے سے صاف معذرت کر لی۔

ایک کالم نگار نے یہ کہہ کر اضافہ کیا کہ پہلے سرکاری تقریبات میں صدر نے آنا ہوتا تھا تو تفریحی پروگرام روک کر کوئی سنجیدہ آئٹم ڈال دیا جاتا تھا۔ مشرف دور میں حالت یہ ہوگئی کہ جونہی صدر صاحب آتے، موقع نہ ہو لڑکیوں کی پرفارمنس ڈال دی جاتی تھی۔ بیوروکریسی یادوست احباب سبھی حکمرانوں کے مزاج شناس ہوتے ہیں اور اشارے سمجھتے ہیں۔

سوچتا ہوں کہ وانا، بلوچستان، افغانستان، عراق کشمیر اور فلسطین میں ہونے والے ہر ظلم اور زیادتی محسوس کرنے والے ایم ایس سی جغرافیہ کر کے پہلے طلبہ پھر پوری قوم کو اللہ رسول ﷺ کی دعوت دینے والے قاضی حسین احمد، جو تبدیلی کی ہر کوشش کی بنیاد میں موجود تھے اپنی انہی خوبیوں کی وجہ سے جماعت کے قائد ہونے کے ساتھ ساتھ عوام کے منتخب قائد بھی بن گئے۔ اب ان کی جماعت بھی عوامی قیادت کا پائیدار تاج اور اعزاز حاصل کر پائے گی یا یہ ایک خیال نامکمل خواب کے طور پہ تاریخ کے صفحات کا رزق ٹھہرے گا۔

علاقہ شب قدر میں دینی و اسلامی علوم بچیوں کا قدیمی ادارہ

جامعہ اسلامیہ فریدیہ کانگڑہ شب قدر فورٹ پشاور رجسٹرڈ

بچیوں کی دینی تعلیم کا ایک قدیم ادارہ ہے۔

اس ادارے سے فارغ التحصیل طالبات ملک کے مختلف اطراف میں دینی تعلیم کی روشنی پھیلا رہی ہیں۔

دینی تعلیم کے ساتھ پانچویں تک انگریزی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ لیکن وسائل کی کمی کے باعث گزشتہ پانچ برس سے کمروں کی چھتیں میسر نہیں، اس کے لیے خصوصی تعاون کی درخواست ہے۔

مدرسہ سہ ماہی "تجلیات فرید" کے نام سے علمی، دینی، اصلاحی رسالہ بھی شائع کرتا ہے۔

جسے مخیر حضرات سے تعاون کی پُر زور اپیل ہے تا کہ صنف نازک کی شان کے مطابق خوبصورت دارالقرآن درسگاہیں و دارالاقامے بنائے جاسکیں

مدرسہ کا اکاؤنٹ نمبر:
0100941-3
بنام: جامعہ اسلامیہ فریدیہ
یو بی ایل برانچ شب قدر

برائے رابطہ: مولانا ایاز احمد حقانی
جامعہ اسلامیہ فریدیہ کانگڑہ۔ شب قدر فورٹ پشاور
0334-9207586 0301-8854211

غذائیات

ڈاکٹر شائستہ خان

فوڈ پوائزننگ کے 7 جھوٹ جنھیں سچ سمجھ لیا گیا

ایک بار مشہور امریکی باکسر، محمد علی فوڈ پوائزننگ (یا غذائی سمیت) کا شکار ہوگئے۔ لوگ اسے معمولی بیماری سمجھتے ہیں، لیکن یہ جسے چمٹے، تکلیف کا ماجرا وہی جانتا ہے۔ چنانچہ محمد علی بھی ایک ہفتہ صاحب فراش رہے اور ان کے تمام مقابلے ملتوی ہوگئے۔

فوڈ پوائزننگ، آلودہ غذا کھانے سے چمٹتی ہے، ایسا کھانا جس میں جراثیم خوب پرورش پا چکے ہوں۔ اب ماہرین طب نے دریافت کیا ہے کہ انسان اکثر اس "معمولی" بیماری کا نشانہ بنے تو وہ طویل المعیاد طور پر کئی بیماریوں میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ مثلاً گنٹھیا، امراض بول، ذیابیطس اور گردوں و آنکھوں کی بیماریاں۔

۲۰۱۰ء میں کینیڈا کے صوبہ اونٹاریو میں ۱۵ رمرد و زن نے ایک کنوئیں کا آلودہ پانی پیا تو غذائی سمیت کا شکار ہو گئے۔ تب کینیڈین ڈاکٹروں نے یہ تحقیق کی کہ فوڈ پوائزننگ طویل المیعاد لحاظ سے انسانوں پر کیسے اثرات مرتب کرتی ہے۔ نتیجہ خاصا ڈراؤنا تھا: غذائی سمیت کا شکار لوگ عام انسانوں کی نسبت ہائی بلڈ پریشر، امراض قلب اور گردوں کی بیماریوں میں ۵۰ تا ۱۰۰ رفیصد زیادہ گرفتار ہوتے ہیں۔

ماہرین طب کا کہنا ہے کہ مرد و زن کی اکثریت

اس وجہ سے فوڈ پوائزننگ کا نشانہ بنتی ہے کہ اس بیماری کے متعلق کئی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر عام و خاص کو صحیح معلومات مل جائیں، تو مریضوں کی تعداد کم ہو جائے گی۔ ذیل میں غذائی سمیت سے تعلق رکھنے والے ایسے ۷ رجھوٹ پیش ہیں جنھیں بدقسمتی سے سچ سمجھ لیا گیا۔

(۱) گھر کا کھانا ریستوران کے کھانے سے بہتر ہے۔

حقیقت: ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے باورچی خانے صاف ستھرے ہیں اور مائیں بہنیں بھی دیکھ بھال کر کھانا پکاتی ہی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ (اچھے) ریستورانوں میں تربیت یافتہ اور تجربہ کار عملہ غذائیں تیار کرتا ہے۔ انھیں غذا تیار اور محفوظ کرنے کا طریقہ آتا ہے۔ پھر ہر اچھے ریستوران میں صفائی ستھرائی کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے، کیونکہ فوڈ پوائزننگ کا ایک بھی کیس کاروبار تباہ کر سکتا ہے۔

(۲) اگر گرم کھانا فریج میں رکھا جائے، تو وہ خراب ہو جائے گا۔

حقیقت: سچ یہ ہے کہ وہ یوں محفوظ ہو جاتا ہے۔ دراصل کھانا پکا کر اگر اُسے کمرے کے درجہ حرارت میں چھوڑ دیا جائے، تو اس میں جراثیم خوب پلتے بڑھتے ہیں کیونکہ انھیں سازگار ماحول مل جاتا ہے۔ اگر پکا کھانا طویل عرصہ یونہی پڑا رہے، تو آلودہ ہونے میں دیر نہیں لگاتا۔ لیکن فریج میں رکھا جائے، تو ٹھنڈک جراثیم کی افزائش سست کر دیتی ہے۔

(۳) برگر، چپس وغیرہ میں سب سے خطرناک عنصر مایونیز ہے۔

حقیقت: ماہرین غذائیت کا کہنا ہے کہ برگر و چپس میں موجود کباب، انڈے یا آلو کی وجہ سے عموماً غذائی سمیت چمٹتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بازار میں فروخت ہونے والی مایونیز عمل پاسچری سے گزار کر تیار کی جاتی ہے۔ یہ عمل بیشتر جراثیم مار ڈالتا ہے۔ مزید برآں ان میں شامل تیزاب جراثیم کو آسانی سے پھلنے پھولنے نہیں دیتے۔ لہٰذا گھر میں کچے انڈوں سے تیار کردہ مایونیز کی نسبت اچھی کمپنی کی تیار کردہ مایونیز بہتر ہے۔

(۴) مرغی، گوشت وغیرہ پر لگایا جانے والا دہی و مسالہ جات کا مرکب تیزابی اور جراثیم کش ہوتا ہے۔ چنانچہ بھنی جانے والی غذاؤں پر یہ مرکب لگانا مفید ہے۔

حقیقت: جراثیم کمرے کے درجہ حرارت میں تیزی سے بڑھتے ہیں۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ مرغ یا بڑے گوشت پر مسالہ جات و دہی وغیرہ لگا کر فریج میں رکھا جائے۔ اگر غذا کھلی چھوڑ دی جائے، تو اس میں جراثیم جنم لے کر اُسے آلودہ کر سکتے ہیں۔

(۵) اگر پھلوں یا سبزیوں کو چھیلنے کا پروگرام ہے، تو انھیں دھونے کی ضرورت نہیں۔

حقیقت: اگر پھلوں یا سبزیوں کو کاٹنے سے قبل دھویا نہ جائے، تو عموماً انھیں کاٹتے وقت بیرونی سطح سے جراثیم اندرونی حصے میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ ماہرین غذائیات کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے پھل یا سبزی کا گلا سڑا حصہ کاٹ دیجیے۔ پھر نلکے کے بہتے پانی میں دھوئیں۔

تربوز اور دیگر موٹی جلد والے پھل و سبزیاں صاف برتن میں رکھ کر دھوئیے۔ بعدازاں کسی صاف کپڑے سے انھیں خشک کر لیجیے۔

(۶) یہ ضروری ہے کہ مرغ، سرخ گوشت اور مچھلی وغیرہ کو پکانے سے قبل پانی میں کھنگال لیا جائے۔

حقیقت: گوشت کوئی بھی ہو، اُسے زیادہ دھونا نقصان دہ ہے وجہ یہ ہے کہ اگر وہ جراثیم سے آلودہ ہو، تو دھونے کے دوران گندے پانی کی چھینٹیں سنک اور دوسری چیزوں کو بھی جراثیم زدہ کر دیتی ہیں۔ گوشت کے جراثیم مارنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُسے درست درجہ حرارت پر پکایا جائے۔ اگر گوشت کچا رہے یا زیادہ پک جائے، تو دونوں صورتوں میں غذائی سمیّت پیدا کرتا ہے۔

(۷) اگر زمین پر گری کوئی بھی غذا پانچ سیکنڈ کے اندر اندر اٹھالی جائے، تو اُسے کھایا جا سکتا ہے۔

حقیقت: اس دیو مالا کو تو ایک برطانوی ہائی سکول کے طالب علم، جولین کلارک نے غلط ثابت کر دکھایا۔ تجربے سے قبل کلارک نے فوڈ پوائزننگ پیدا کرنے والے عام جرثومے، ای۔کولی (E.Coli) فرش پر گرا دیے۔ اس نے پھر فرش پر بسکٹ، توس اور ٹافیاں گرائیں اور پانچ سیکنڈ بعد اٹھالیں۔ جب اس نے بذریعہ خوردبین انھیں دیکھا، تو تمام غذاؤں کو جراثیم میں لت پت پایا۔

امریکا کے سائنس دانوں نے بھی غذائی سمیّت پیدا کرنے والے مشہور جرثومے سالمونیلا پر تجربات کر کے دریافت کیا کہ وہ فرش، لکڑی اور قالین پر چار ہفتے زندہ رہتا ہے۔ نیز جب ڈبل روٹی اور کیک کے ٹکڑے قالین پر گرا کر فوراً اٹھائے گئے، تو معلوم ہوا کہ سالمونیلا ان سے چمٹ چکے ہیں۔

UN WATER

پانی کا عالمی دن 2013

پانی کے تعاون کا بین الاقوامی سال

حدّثنا مُحمّدُ بنُ کثیر، أخبرنا اسرائیلُ، عن أبی اسحاق، عن رجلٍ، عن سعدِ بن عُبادۃ، أنّہ قال یارسولَ اللہ

إنّ أمّ سعدٍ ماتت فأیُّ الصّدقۃِ أفضلُ؟ قال "الماءُ" قال فحفر بئرًا وقال ھذہٖ لأمّ سعد

ابوالحق کی روایت کے مطابق حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دریافت کیا یارسول ﷺ! حضرت اُمّ سعد کا انتقال ہوگیا ہے۔ پس کون سا صدقہ افضل ہے۔ فرمایا پانی۔ پس انہوں نے کنواں کھدوایا اور کہا کہ یہ اُمّ سعد کی طرف سے ہے۔ (ابوداؤد)

صاف پانی (Clean Water)

صاف پانی کی دستیابی ہر آنے والے دن دشوار سے دشوار ترین ہو رہی ہے۔

پاکستان ان تیس ممالک میں شامل ہے جہاں صاف پانی کی شدید قلت ہے۔

خدمتِ خلق کو اپنا شعار بناتے ہوئے الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان نے دیگر خدمات کے ساتھ ساتھ صاف پانی کی دستیابی اور فراہمی میں بساط سے بڑھ کر مندرجہ ذیل خدمات انجام دی ہیں۔

380	715	1530
واٹر فلٹریشن پلانٹس	کنویں	ہینڈ پمپ

ان منصوبوں سے سالانہ 8 لاکھ سے زائد افراد مستفید ہو رہے ہیں

www.al-khidmatfoundation.org

ں کنویں کی تعمیر سے پہلے مجھے اور میرے گاؤں والوں کو پورے دن کی مسافت طے کے پانی لانا پڑتا تھا۔ دشوار گزار صحرائی رستوں پر بہت سے حادثات بھی پیش آتے جس میں سانپوں کے کاٹنے کے واقعات سرفہرست تھے۔ الخدمت نے ہمارے وں میں کنواں کھود کر ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔" (سیتا میگھواڑ۔ رھنا گام تھرپارکر)

ائے تھر میں 12 سالہ سیتا میگھواڑ "رھنا گام گوٹھ" کی رہائشی ہے۔ رھنا گام کی آبادی 475 افراد یط ہے۔ اس گاؤں میں الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان نے "عطاء الرحمٰن عثمان" کے مالی تعاون سے ے مئی 2011 کو کنویں کی کھدائی مکمل کی۔ گوٹھ رھنا گام کے علاوہ اردگرد کے مزید 15 گاؤں کا انحصار ف اس ایک کنویں پر ہے۔ جو انسانوں کے ساتھ ساتھ مویشیوں کی ضرورت بھی پوری کر رہا ہے۔

دستِ تعاون بڑھائیے۔

اپنے صدقات وعطیات سے خلقِ خدا کے لیے پانی کا بندوبست کیجیے۔

اپنے لیے۔۔۔اپنے والدین کے لیے

فی فلٹریشن پلانٹ	فی ہینڈ پمپ	فی کنواں
500,000 روپے	85,000 روپے	150,000 روپے

ایم سی بی بینک: اکاؤنٹ نمبر: 135401010037905 سوفٹ کوڈ: MUCBPKKA

سونیری بینک: اکاؤنٹ نمبر: 2011459382 سوفٹ کوڈ: SONEPKKALHR

میزان بینک: اکاؤنٹ نمبر: 020143500000017 سوفٹ کوڈ: MEZNPKKA

برائے رابطہ: +92 321 4228773

الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان

711، بے۔2، جوہر ٹاؤن، لاہور فون: 042-35957260

ای میل: info@al-khidmatfoundation.org

www.al-khidmatfoundation.org

اسکارف

کپڑے کا ٹکڑا جو خواتین کے لیے تحفظ اور وقار کی علامت بن گیا

حنا انور

اسلام نے عورت کو سب سے پہلے عزت دی اور معاشرے میں اسے فخر و عزت کا باعث بنایا۔ مسلمان عورتوں کو دوسروں کی نگاہوں سے محفوظ رکھنے کے لیے جو نشانی دی گئی اسلام اسے حجاب کہتا ہے۔ پہلے پہل حجاب کے طور پر بڑی چادر کا استعمال شروع ہوا جو بعد میں برقع کی شکل اختیار کر گیا۔ اب اس روایت میں کافی حد تک تبدیلی آ چکی ہے اور یہ جدید گاؤن اور اسکارف میں تبدیل ہو گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ آج کل گاؤن کا رواج قدرے کم ہو رہا ہے۔ جب کہ اسکارف کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے۔ ایک سروے کے مطابق پاکستان میں تعلیم یافتہ خواتین کی اکثریت اسکارف پسند کرتی ہیں۔ بہت سی ورکنگ ویمن اور یونیورسٹیوں اور کالجز کی لڑکیاں ماڈرن بننے کی دوڑ کے باوجود اپنے مذہب سے لگاؤ کے باعث اسکارف یا حجاب اوڑھنے کو ترجیح دیتی ہیں۔

اسکارف کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ دوپٹے کے ساتھ حجاب کی ضرورت کو بھی پورا کرتا ہے۔ بحیثیت مسلمان ہم قرآن و سنت کو اپنی زندگی سے الگ نہیں کر سکتے۔ عورتوں کے لیے حجاب حکم الٰہی ہے اور قرآن پاک میں بیشتر مقامات پر عورتوں کو حجاب کی تلقین کی گئی ہے۔

گاؤں میں عام طور پر وہ خواتین اسکارف یا عبایا کا استعمال کرتی ہیں جو کسی اونچے گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں پاکستانیوں کا سعودی ممالک میں کام کرنے کے لیے جانے کا کافی رجحان تھا اور وہ سعودی کلچر سے قدرے مرعوب بھی تھے، یوں ایسے مرد حضرات جو وہاں رہ کر آتے، وہ اپنی بیویوں کو وہاں کا عبایا ضرور پہناتے۔ یوں وہ عورتیں بطور نشان امارت کے عبایا استعمال کرتیں۔ اسی طرح نو بیاہتا خواتین میں بھی اسکارف اور عبایا

پہننے کا رجحان زیادہ دیکھنے میں آیا ہے۔ ایک دلچسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ بہت سی لڑکیاں بطور فیشن اسکارف کا استعمال کرتی ہیں۔ ان کا ماننا یہ ہے کہ یہ معاشرتی طور پر انھیں تحفظ کا احساس دلاتا ہے اور آتے جاتے پڑنے والی نامناسب اور میلی نگاہوں سے ان کو محفوظ رکھتا ہے۔

ان کی یہ بات بڑی حد تک درست ہے۔ عام زندگی میں بھی ہمارا مشاہدہ ہے کہ دفاتر میں کام کرنے والی لڑکیاں ہوں یا بڑے اداروں میں خدمات سرانجام دینے والی خواتین، اسکارف، عبایا یا خوبصورتی سے لی گئی چادر ان کی عزت اور احترام بڑھانے کا بھی باعث بنتی ہیں اور دیکھنے، ملنے والوں کی نگاہوں میں ان کے لیے ایک خاص مقام ہوتا ہے۔ اسکارف پہننے والی لڑکیوں کی شخصیت کو بھی ایک وقار کا احساس ہوتا ہے۔

کچھ خاندانوں میں مذہبی رجحان زیادہ ہونے کی وجہ سے لڑکیوں پر دباؤ ہوتا ہے کہ وہ ہر صورت میں حجاب کریں۔ لیکن سروے کے مطابق زیادہ تر لڑکیوں کا ماننا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے حجاب لیتی ہیں۔ سر پر اسکارف لینے سے انھیں تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ ایک لڑکی کا کہنا ہے کہ اس نے حجاب لینا اس لیے شروع کیا کہ جب وہ اسکارف پہن کر گھر سے نکلتی ہے تو دکاندار سے لے کر بس والے تک اور کلرک سے لے کر بزنس مین تک انھیں کام کی حد تک دیکھتے ہیں اور بامقصد بات کرتے ہیں۔ یوں وہ کسی حد تک مردوں کے ستانے سے بچ پاتی ہیں۔

اسی طرح دیکھا گیا ہے کہ مخلوط تعلیم والے تعلیمی اداروں میں لڑکیوں کے اسکارف لینے کی شرح زیادہ ہوتی ہے۔ ایسے اداروں میں جہاں لڑکے، لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہیں، لڑکیوں کا کہنا ہے کہ اسکارف یا مکمل حجاب لینے سے وہ زیادہ بااعتماد انداز میں اپنی کلاس پڑھ پاتی ہیں اور انھیں بار بار اپنے بال سنوارنے یا کپڑے درست کرنے کی فکر نہیں ہوتی۔ اس طرح وہ پوری دلجمعی کے ساتھ ٹیچر کو سننے اور نوٹ کرنے میں وقت دے پاتی ہیں۔

بہت سی طالبات کا کہنا ہے کہ مجھے فیملی کی طرف سے کسی بھی قسم کا کوئی دباؤ نہیں ہے، میں اپنی مرضی سے اسکارف لیتی ہوں، اس سے میں اپنے آپ کو پراعتماد اور محفوظ محسوس کرتی ہوں اور یہ دلی خوشی میرے ساتھ ہوتی ہے کہ میں نے اپنے رب رحمان کی مرضی اور حکم کو خوشی سے مانا ہے۔

اسکارف لینا اگرچہ ایمان پر عمل کا نام ہے، یہ صرف کپڑے کا ٹکڑا ہی نہیں بلکہ صحیح نسوانیت کی عکاسی کرتا ہے۔ عورتوں کے کردار کو ہر جگہ ان کے عمل کے بجائے ان کے ظاہری لباس کی کسوٹی پر زیادہ پرکھا جاتا ہے۔ کردار کی پختگی مرد و عورت دونوں کے لیے یکساں ضروری ہے۔ معاشرے کا ہر فرد اپنے معاشرے کی نمائندگی کر رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر مسلمان بھی اسلام کا سفیر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا لباس، طرز زندگی، لہجہ غرض ہر عمل صرف اس شخص تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ وہ پوری امت مسلمہ کا انداز کہلاتا ہے۔ بالکل اسی طرح اسکارف یا حجاب پاکیزگی کو ظاہر کرتا ہے۔ جب ایک عورت اسکارف یا حجاب اوڑھتی ہے تو معاشرہ بھی اس سے چند توقعات وابستہ کر لیتا ہے۔

اسے کردار کے اعلیٰ درجوں پر فائز کر دیا جاتا ہے۔ حجاب اوڑھنے والی ایک یونیورسٹی طالبہ کا کہنا ہے کہ لوگوں کو

"حجاب نے ہر جگہ مجھے عزت اور احترام دلوایا"

لگتا ہے کہ حجاب اوڑھنے والی لڑکیاں زیادہ سوشل نہ ہوں، لوگوں سے زیادہ بات چیت نہ کریں، یونیورسٹی میں کسی مخلوط گانے بجانے کی محفل میں شرکت نہ کریں۔ وہ ہم سے یہ توقع کرتے ہیں کہ ہم فوق البشر (Super Human) بن جائیں۔

اسی طرح ایک اور لڑکی کا کہنا ہے حجاب لینے کے بعد مجھے کبھی کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا، البتہ لوگوں کی نظر میں اپنے لیے عزت ضرور محسوس ہوتی ہے اور اگر معاشرہ ہم سے اچھی توقعات رکھتا ہے تو میرے خیال میں یہ ایک مثبت چیز ہے۔ میرے خیال میں اگر ہم اپنے مذہب کی نمائندگی کر رہے ہیں تو پوری طرح سے کرنی چاہیے اور اپنے لباس، اخلاق اور عادات کو ویسا ہی بنانا، اس صورت میں قطعی مشکل کام نہیں، جب ہماری تربیت ہی ویسی ہوئی ہو۔

ہر چیز کے مثبت و منفی پہلو ہوتے ہیں۔ کوئی بھی قانون بنایا جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں تین طرح کے لوگ سامنے آتے ہیں۔ ایک اس کو ماننے والے، دوسرے اس کے مخالف اور تیسرے وہ لوگ جو درمیانی راستہ نکالتے ہیں۔ بالکل اسی طرح مسلم معاشرہ میں کچھ خواتین مکمل حجاب کرتی ہیں۔ کچھ نہیں کرتیں ان میں ایک تیسری قسم بھی ہوتی ہے، وہ اسکارف یا برقع فیشن کے طور پر یا اپنی اصلیت چھپانے کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ کہیں کہیں کچھ خواتین اور لڑکیاں حجاب کے پس پردہ ایسے کام کرتی ہیں، جس سے درست حجاب لینے والی بھی مشکل کا شکار ہو جاتی ہیں۔

عام لوگوں سے جب پوچھا گیا کہ وہ اسکارف یا حجاب پہننے والی خواتین کو کیسا سمجھتے ہیں تو ایک دکاندار کا کہنا تھا جو عورتیں اسکارف لیتی ہیں یا مکمل حجاب کرتی ہیں، ہم ان کو عزت سے ہی دیکھتے ہیں لیکن کچھ لوگ ہیں جو حجاب کا غلط استعمال کرتے ہیں جیسا کہ اگر آپ مارکیٹ وغیرہ میں چوری کرنے والی خواتین دیکھیں تو وہ عموماً برقع وغیرہ میں ہوتی ہیں۔ ہم ان پر اعتبار کرتے ہیں لیکن اس طرح چوری کر کے وہ نہ صرف اپنی عزت بلکہ وہ حجاب کا بھی نام خراب کرتی ہیں۔

کالج یونیورسٹی کی لڑکیاں بھی اپنی شناخت چھپانے کے لیے حجاب، اسکارف کا استعمال کرتی ہیں کہ وہ اگر کسی غیر اخلاقی سرگرمیوں کا حصہ بنتی بھی ہیں تو کسی حد تک اس کو ظاہر نہیں کرتیں۔ اس وجہ سے پردہ کرنے والی سب خواتین کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور انھیں بعض مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

حجاب جیسے ایک پاکیزہ اور مذہبی فریضہ کو دھوکہ دہی کے لیے استعمال کرنا بالکل بھی مناسب نہیں۔ ایک مسلمان عورت حجاب، اسکارف اس لیے اوڑھتی ہے کہ یہ حکم الٰہی ہے اور حضور ﷺ نے اس کی ہدایت فرمائی ہے اور یقیناً عورتوں کا سر کو ڈھانپنا پاکیزگی، حیاداری، راست روی اور ایمان کی علامت ہے۔ اگر کوئی لڑکی یا خاتون اسکارف یا مکمل حجاب لے رہی ہے تو اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ جس دین اسلام کی نمائندگی کر رہی ہے اس پر خود بھی عمل پیرا ہو اور ایسی کسی بھی سرگرمی کا حصہ نہ بنے، جس سے لوگ اس پاکیزہ چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہو جائیں۔ ■

حجاب ڈے کی بنیاد فرانس میں حجاب کیخلاف پابندیاں بنیں۔ فرانس میں مسلم خواتین کے برقع اوڑھنے پر تنازعات پیدا ہونے کے بعد اپریل میں ہیملٹن کی مشہور میک ماسٹر یونیورسٹی میں کچھ مسلم و غیر مسلم طلباء نے حجاب ڈے منایا۔ کچھ عرصے بعد یہ دن فرانس میں قومی سطح پر منایا جانے لگا۔ بعد ازاں کینیڈا کی یونیورسٹیوں میں بھی اس دن کو منانے لگے۔ فرانس اور کینیڈا کے بعد اب چار ستمبر کو عالمی سطح پر حجاب کا دن منایا جاتا ہے۔

"حجاب جیسے پاکیزہ عمل کو دھوکہ دہی کے لیے استعمال کرنا نامناسب ہے"

طب و صحت

بیٹھے رہنا

نئی نسل کا من پسند نشہ

نیلوفر مرچنٹ

چند دن گزرے، مجھے احساس ہوا کہ میں کمپیوٹر کے سامنے زیادہ وقت گزارنے لگی ہوں۔ دوسروں سے میری ملاقاتیں کانفرنس روم، ہوائی اڈے کے لاؤنج یا کافی شاپ میں ہی ہوتیں۔ تب بھی ساری گفتگو بیٹھے بیٹھے ہوتی۔

رفتہ رفتہ میں غور کرنے لگی کہ آج کے بیشتر انسان روزانہ اپنا بیشتر وقت بیٹھے ہوئے گزارتے ہیں۔ اکثر مرد و زن دن بھر تقریباً ساڑھے نو گھنٹے بیٹھ کر گزارتے ہیں، چاہے وہ کسی بھی قسم کی سرگرمی انجام دیں۔ دوسری طرف سوتے ہوئے ان کے صرف سات، ساڑھے سات گھنٹے بسر ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بیٹھنا انسانی سرشت میں اتنا دخیل ہو چکا کہ اب محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم طویل عرصہ بیٹھے ہوئے گزارتے ہیں۔ ہم اس سچائی سے بھی بے خبر ہو چکے کہ حد سے زیادہ بیٹھنا غیر فطری بلکہ ایک قسم کا خلل ہے۔ میں تو یہ کہوں گی کہ جو لڑکے لڑکیاں

ذرا اُٹھ کر تو دیکھیے، زندگی اچھی لگنے لگے گی

کمپیوٹر یا ٹی وی کے سامنے بیٹھے زندگی گزار رہے ہیں، ان کے لیے بیٹھنا نشہ بن چکا یا اس کو ان کی سگریٹ نوشی سمجھیے۔

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ مسلسل نہ بیٹھیے، بلکہ گاہے گاہے چلیے۔ زیادہ دیر بیٹھنا صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک گھنٹہ مسلسل بیٹھنے کے بعد انسان میں ان خامروں (Enzymes) کی افزائش ''۹۰ رفیصد'' تک کم ہو جاتی ہے جو چربی جلاتے ہیں۔ مزید دیر بیٹھا جائے تو ہمارا نظام استحالہ سست پڑ جاتا ہے۔ یہ عمل ہمارے اچھے کولیسٹرول (ایچ، ڈی، ایل) کو متاثر کرتا ہے۔

جدید طبی تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ انسان متحرک نہ رہے تو امراض قلب، ذیابیطس اور سینے کے سرطان کا نشانہ بن سکتا ہے۔ زیادہ بیٹھنا، موٹاپے کو بھی جنم دیتا ہے۔ آج پوری دنیا میں فربہی کے باعث لاکھوں لوگ سالانہ چل بستے ہیں۔ جب کہ سگریٹ نوشی کی وجہ سے مرنے والوں کی تعداد کہیں کم ہے۔

گزشتہ سال سڈنی یونیورسٹی کے محققوں نے ان ۹ رہزار آٹھ سو اکیاسی مرد و زن پہ تحقیق کی جو طویل عرصہ ٹی وی دیکھتے یا کمپیوٹر کے سامنے بیٹھتے تھے۔ انکشاف ہوا کہ جو انسان روزانہ ایک گھنٹے سے زیادہ ٹی وی دیکھے تو فی زائد گھنٹہ اس کی زندگی کے ۳ رتا ۵ رمنٹ کم ہو جاتے ہیں۔ تحقیق سے وابستہ ایک ڈاکٹر نے تو بیان دیا کہ حد سے زیادہ بیٹھنا موت کو دعوت دینا ہے۔ اس کے نزدیک بیٹھنے میں طوالت کا مطلب ہے، روزانہ ۹ رگھنٹے بیٹھنا۔

انقلابی تبدیلی

کئی مرد و زن کا کہنا ہے کہ انھیں ورزش کرنے حتیٰ کہ چلنے کے لیے وقت نہیں ملتا۔ میں بھی اسی مسئلے سے دوچار تھی۔ آخر میں نے اس مشکل کا حل نکال ہی لیا۔ میں نے یہ کیا کہ چلتے پھرتے دوستوں سے ملاقاتیں کرنے لگی اور یہ کوشش کی کہ دفتری میٹنگز بھی چلتے پھرتے انجام پائیں۔

ظاہر ہے، کئی دوستوں اور دفتری ساتھیوں نے چلتے ہوئے باتیں کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن میں نے انھیں منانے کی سعی جاری رکھی اور کئی ایک کو منا بھی لیا۔ دراصل اپنی ''چلاؤ میٹنگز'' کے ذریعے جلد ہی مجھے فوائد ملنے لگے۔

سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ مجھے پتا چلا، کافی شاپ یا میز کرسی پر بیٹھے ہونے کی نسبت شانہ بشانہ چلنے والے کی باتیں میں زیادہ بہتر انداز میں سن سکتی ہوں۔ دراصل اس قربت میں کوئی اسرار ہے کہ انسان خود بخود ساتھی کی مدد سے مسائل کے حل ڈھونڈ نکالتا ہے۔

دوسرے چلنے کے سادہ عمل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ موبائل فون عموماً بند کر دیا جاتا ہے۔ آج کے دور میں یکسوئی سے کسی کی باتیں سننا نایاب بات بن چکی۔ یوں مجھے موقع ملتا ہے کہ ساتھی یا ساتھیوں پر بھرپور توجہ دے سکوں۔

جب کسی کے ساتھ پہلی بار چلنے کی یہ انوکھی میٹنگ اختتام کو پہنچے تو میرا ساتھی عموماً یہی کہتا ہے ''میں نے طویل عرصے بعد اتنا لطف اٹھایا اور مجھے خوب تخلیقی وقت ملا۔'' اس داد و تحسین کی وجہ یہ ہے کہ سائنس دریافت کر چکی کہ چلنا انسانی دماغ کی صحت کے لیے مفید ہے۔

چلنے کا ایک اور بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان فطرت کے قریب ہوتا ہے۔ وہ گرمی، سردی، بہار اور خزاں ہر موسم سے لطف اٹھاتا ہے۔ یوں انسان اپنی دنیا سے باخبر بھی رہتا ہے اور اس سے نہیں کٹتا۔

لہٰذا آج ہی اسی وقت کرسی یا صوفے کو چھوڑیے اور باہر جا کر چلیے پھریے۔ اس بظاہر معمولی عمل سے آپ بہت خوشی پائیں گے۔ آزمائش شرط ہے۔

ڈاکٹر ندیم اکرام

وہ ان کی توقع سے زیادہ سبک رفتار، مضبوط اور تیز فہم تھا

جناح رنگ و نسل سے برتر رہنما

'جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے'

ایک عظیم قوم کے عظیم رہنما کا تذکرہ

جال بڑی خوب صورتی سے بُنے گئے تھے۔ صوبائی گورنر، وزارت اور سر کا خطاب، وہ ان سب کے چُنگل سے بچ نکلا

کوئی بھی شخص اپنی جائے ولادت کے انتخاب میں آزاد نہیں ہوتا لیکن اس کو اس بات کی آزادی ہوتی ہے کہ وہ سنِ شعور پر پہنچ کر اس بات کا فیصلہ کرے کہ اس نے علاقہ، فرقہ اور قبیلہ سے وابستگی کو منفی مطلب برآری کے لیے استعمال کرنا ہے یا ان تنگنائیوں سے بلند ہو کر مثبت اقدار کو اپنانا ہے اور انسانی معاشرہ کو وسیع تر تناظر میں دیکھنا ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح پیدائش کے اعتبار سے جس بھی تعلق کے حامل

تھے لیکن ان کی بلند و بالا شخصیت سے یہ بعید تر تھا کہ وہ اس کے تعلق کی بنیاد پر تعصّب کا لباس زیب تن کر لیں۔ اگر کوئی لیڈر جو خود کسی نسلی تعصّب کا علمبردار ہے، قائداعظم کی شخصیت کو فرقوں یا گروہوں کی عصبیت میں مقید کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ قائداعظم کی شخصیت سے انصاف نہیں ہوگا۔ یقیناً مذہبی اقدار اور مشرقی روایات جناح کی شخصیت و کردار کے عقبی دیار پر ہمیشہ سایہ فگن رہیں۔ لنکنز اِن میں آنحضورﷺ کا نام دنیا کو قانون دینے والوں میں لکھا دیکھ کر اس ادارے کی طرف رغبت اور یورپ میں رہتے ہوئے انگریز خواتین کے ساتھ تقریبات میں ناچ کرنے سے انکار اسی بات کے غماز تھے۔ لندن میں شیکسپیئر کے ڈراموں کے لیے، انگریز نوجوانوں کا مقابلہ کر کے، جناح منتخب ہو گئے۔ والد کو خط لکھ کر اجازت مانگی، والد نے سختی سے منع کر دیا۔ جناح نے جب ڈائریکٹر کو والد کے فیصلہ سے آگاہ کیا تو اس نے حیران ہو کر کہا کہ ''یہ تمھاری زندگی ہے، اس سے تمھارے والد کا کیا تعلق؟'' جناح نے جواب دیا ''نہیں، ہمارے مشرقی معاشرہ میں باپ کا حکم حتمی ہے۔'' یورپ میں تجرد کی زندگی اور اہلیہ کی وفات کے بعد بھی جناح کی زندگی ایسی آلائشوں سے پاک دکھائی دیتی ہے جو کردار و شخصیت کو مجروح کر سکتی تھیں۔

اس دور میں ہندوستان میں جناح کے علاوہ لاتعداد رہنما موجود تھے جن کا تعلق مختلف جماعتوں اور مذاہب سے تھا۔ یقیناً یہ ایک طویل قطار تھی۔ آج جس دعوے کو ہم ثابت کرنے چلے ہیں وہ یہی ہے کہ ذرا تنقیدی نگاہ ان سب ہندوستانی رہنماؤں پر ڈالیے اور جائزہ لیجیے کہ کیا جناح کے علاوہ کوئی اور ایسا تھا جو کہ متحدہ ہندوستان کی سربراہی کا حقدار قرار دیا جا سکتا ہو؟ قائداعظم کی شخصیت کی جامعیت اور وسیع المشربی اس بات کی متقاضی تھی کہ وہ اعلیٰ انسانی اقدار کے فروغ کے لیے ہر انسان کو اپنے پیغام اور کردار سے متاثر کریں۔ وہ ''ہندو مسلم اتحاد'' کے سفیر گردانے گئے۔ مسٹر اور مُلا اور ہر فرقہ کے لوگوں نے قائد کی قیادت پر اعتماد کیا۔

ہندوستان کے غیر متعصّب لوگوں نے مذہب کی تفریق کے علی الرغم قائداعظم کی شخصیت کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ''قائداعظم ہندوستانی لیڈروں کی نظر میں'' ایک ایسی کتاب ہے جس میں قائداعظم کی شخصیت کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کرنے والے ان لوگوں کے حوالے دیے گئے ہیں جو سیاسی اور مذہبی حوالے سے قائداعظم سے غیر منسلک تھے۔

ڈاکٹر سچد انندسہنا، مسز سروجنی نائیڈو، کانجی دوارکاداس اور لاتعداد ہندو اکابرین بھی قائداعظم سے متاثر تھے۔ بقول سروجنی نائیڈو ''جناح کے جُثے کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے اندر کتنا غیر معمولی جذبہ اور کس بلا کا عزم پوشیدہ ہے۔ بظاہر آئین اور دستور کے پابند اور سختی سے ان پر کاربند۔ ایک حد تک الگ تھلگ، سنجیدہ اور شائستہ، مگر جو لوگ ان سے واقف تھے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جناح کے سینہ میں عورت کے دل کی طرح نرمی اور بچے کی معصومیت پوشیدہ ہے۔ وہ ایک عملی اور حقیقت پسند آدمی تھے۔'' مسز سروجنی نائیڈو نے قائداعظم کی شخصیت کا جائزہ کچھ یوں پیش کیا:

''جناح کی حقیقی عظمت کا راز ان کے علم اور تجربے کی حدود اور تنوع میں نہیں بلکہ ان کے زیرک دماغ اور روح کی بے عیب نگاہ اور بے داغ لطافتوں میں پنہاں ہے اور تعددِ مقاصد کی جگہ اس کی بنیاد ایک ایسی بلند و بالا صاحبِ کردار شخصیت کی معرکہ آرائی پر ہے جو ادائے فرض کی اولوالعزمانہ دیانت کار کے محکم اور حسین اصولوں پر استوار ہے۔'' ڈاکٹر سچد انندسہنا نے قائداعظم کی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہوئے خود اپنی ہی قوم سے گلہ کیا کہ ''بہت حد تک مسلمانوں کی علیحدگی کا الزام ہم ہندوؤں پر عائد کیا جا سکتا ہے۔ اب تک ہم لوگوں نے انہیں قوم کا جزو لاینفک نہیں قرار دیا۔ ہم لوگوں نے اب تک ان کے دل جیتنے کے لیے کچھ نہیں کیا۔'' بقول کانجی دوارکاداس ''جناح اگر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کانگریسی لیڈر

ان سے کوئی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتے تو اس میں حق بجانب تھے۔ جب کبھی کانگریسی لیڈروں نے یہ دیکھا کہ برطانیہ سمجھوتہ پر آمادہ ہو رہا ہے تو ان کے ذہن میں جناح کو نظر انداز کرنے کا خیال فوراً آ جاتا تھا..... جناح نے پاکستان نہیں جیتا، کانگریسی لیڈر جناح کو پاکستان ہار بیٹھے۔

جناح شروع ہی سے معاندانہ اور حاسدانہ رویہ کا شکار ہوئے۔ گاندھی جب جنوبی افریقہ سے واپس آئے تو ان کے اعزاز میں ایک تقریب میں جناح نے خطاب کیا۔ جوابی تقریر میں گاندھی نے جناح کو ''محمڈن'' کے طور پر یاد کیا۔ ہیکٹر بولیتھو اپنی کتاب (Jinnah of Pakistan) ''جناح آف پاکستان'' میں لکھتے ہیں:

Jinnah, in fact hoped from his anglophile appearance and secular wit and wisdom to convince the hindu majority of his collegues and countrymen that he was indeed qualified to lead any of their public organizations. Yet, here, in the first public words Gandhi uttered about him that every one had to note that Jinnah was a "Mohammaden".

(جناح اپنے لباس، تراش خراش اور دنیاوی ذہانت و ذکاوت سے یہ امید رکھتے تھے کہ وہ ہندو اکثریت، دوست احباب اور اہلِ وطن کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوں گے کہ وہ کسی بھی عوامی تنظیم کی سربراہی کے حقدار ہیں۔ لیکن گاندھی نے اپنی پہلی ہی عوامی تقریر میں جناح کے بارے میں ہر ایک کو یہ باور کرانا پسند کیا کہ جناح ایک ''محمڈن'' ہیں)

گاندھی، جس نے ہندووانہ طرزِ زندگی کو ترویج دیا اور ۱۹۲۰ء کے کانگریس کے اجلاس میں ہندی زبان کو ہندوستان کی قومی زبان قرار دینے کی قرارداد منظور کرائی، اسے ہندوستان کا متفقہ لیڈر بنانے کی کوشش کی جائے اور جناح جس نے وسیع المشربی اور وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی بھی مذہب، فرقہ اور گروہ کی دل آزاری کی کوشش نہیں کی اسے ''محمڈن'' صرف اس لیے قرار دیا گیا کہ کانگریس کی قیادت کو اس بات کا علم تھا کہ جناح کی شخصیت و کردار میں وہ تمام فضائل مجتمع تھے جو کہ کسی بھی کثیر الجہتی معاشرہ کی رہنمائی کا فرض ادا کر سکتے ہیں۔ ہندوؤں کی یہی تنگ نظری تھی کہ دیوار سے لگا دینے کی ان کوششوں کے بعد جناح کی مراجعت کا دَور شروع ہوا تا آنکہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کی خواہشات کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ یاد رکھیے! جناح نے قیادت طلب نہیں کی بلکہ جناح کو قیادت پیش کی گئی۔ اقبالؒ نے قائداعظم کو خط لکھا کہ ''پورے برطانوی ہندوستان میں تنہا آپ کی ذات ایسی ہے جس کی طرف مسلمانوں کی نظریں محافظت اور رہنمائی کے لیے اٹھتی ہیں۔'' جناب نذیر نیازی اپنی کتاب ''اقبالؒ کے حضور'' میں رقم طراز ہیں کہ ہندو اور دیگر کانگریسی لیڈر اقبالؒ سے ملنے آئے اور انہوں نے اقبالؒ سے کہا کہ وہ مسلمانوں کی طرف سے کانگریس کے ساتھ بات چیت کریں۔ اقبالؒ یہ سن کر غصہ میں آ گئے اور کہنے لگے۔ ''آپ مجھے بہلا پھسلا کر جناح کے مقابلہ میں کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور میں ان کا ایک معمولی سپاہی ہوں۔'' اس سب کچھ کے باوجود قائداعظم نے مسلمانوں کے مسائل کی وکالت تو کی لیکن دیگر مذاہب، فرقوں اور رنگ و نسل کے لوگوں کو حقارت سے نہیں دیکھا۔ یہ قائد ہی کی قیادت تھی کہ تقسیمِ ہندوستان کے وقت جو لوگ جاں بحق ہوئے ان میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے بہت کم تھی۔ اس دوران جان کی بازی ہارنے والوں میں کم و بیش نوے فی صد مسلمان تھے۔ ہندوستانی قیادت نے سیکولر ہونے کا دعویٰ کیا لیکن مذہبی تعصّب کا شکار ہوئے، جناح نے مسلم قومیت کی وکالت کی لیکن رواداری، تحمل، عدم تشدد، قانون کی پاسداری، آئینی راستوں کے ذریعہ جدوجہد اور وسیع المشربی پر

کاربند رہے۔

قائداعظم کی شخصیت کی جامعیت اوران کے معروضی نقطہ نگاہ کی چکا چوند سے کانگریسی لیڈروں کی نگاہ خیرہ ہو رہی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر جناح کو سیاسی جدوجہد کا کچھ اور موقع میسر آیا تو وہ پورے ہندوستان کے عوام کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ سٹینلے وولپرٹ اپنی کتاب جناح آف پاکستان میں لکھتے ہیں۔

Congress began to fear that in another six months, they would loose Eastern Punjab and Sikh support, as well as Calcutta and Western Bengal, possibly more of the princely states, also; especially Hyderabad and Bhopal; for the longer Jinnah argued? the stronger and greater his demands become.

کانگریس خطرہ محسوس کرنے لگی تھی کہ اگلے ۶ ماہ میں وہ مشرقی پنجاب، سکھ حمایت، کلکتہ، مغربی بنگال اوراس کے علاوہ خود مختار ریاستیں مثلاً حیدرآباد اور بھوپال کو کھو دیں گے۔ کیونکہ جتنا زیادہ جناح کو دلائل دینے کا موقع ملے گا وہ اتنا ہی زیادہ مضبوط ہوگا اوراس کے مطالبات بڑھتے چلے جائیں گے۔ سٹینلے وولپرٹ اپنی کتاب ''گاندھی پیسمز (Gandhi Passims) میں لکھتے ہیں کہ ایک وقت آیا جب گاندھی سنجیدگی سے سمجھنے لگے تھے کہ متحدہ ہندوستان کا وزیراعظم بننے کے لیے جناح مناسب ترین شخصیت ہیں۔ اس بات کا اظہار گاندھی نے نہرو کے نام خط میں بھی کیا لیکن نہرو نے گاندھی کی اس بات کو کبھی معاف نہیں کیا۔ ایک مرحلہ پر گاندھی نے تجویز پیش کی کہ جس طرح جناح پاکستان کے گورنر جنرل بنے ہیں اسی طرح وہ بھی بھارت کے گورنر جنرل بن جائیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی اس تجویز کو مان چکا تھا لیکن نہرو نے اس کو رد کر دیا۔

سٹینلے وولپرٹ لکھتے ہیں:

www.urdudigest.pk

Nehru rejected the idea of having Gandhi as his governor-general even more vehemently than he has vetoed Gandhi's "Jinnah Scheme" a year earlier. Nehru never forgot that Gandhi believed Jinnah would have been a better prime minister of India than he was.

(نہرو نے گاندھی کو گورنر جنرل بنانے کی تجویز اس سے زیادہ شدت سے مسترد کی جب ایک سال قبل انہوں نے گاندھی کی ''جناح اسکیم'' کو ویٹو کیا تھا۔ نہرو یہ بات کبھی نہیں بھولا تھا کہ گاندھی سمجھتے تھے کہ جناح ہندوستان کا نہرو سے بہتر وزیراعظم ثابت ہوگا)۔

اجازت دیجیے کہ موضوع سے ہٹ کر ہی سہی، گزارشات کا اختتام سٹینلے وولپرٹ کے چند جملوں کو مستعار لے کر کیا جائے۔ دیکھیے کہ انہوں نے ان عوامل کو کس طرح پیش کیا جس نے جناح کو برتر بنا دیا:

The countless "traps" set for him, some baited so handsomely- provincial governor, prime minister, knight hood he had eluded them all. Daggers, guns, bombs, all of them had missed the Grey Wolf. He had proved himself, too fast, too elusive, too strong for them.

(اَن گنت جال جناح کے لیے بُنے گئے۔ کچھ تو بہت خوبصورتی سے تیار کیے گئے۔ صوبائی گورنر، وزارتِ عظمیٰ، سر کا خطاب، وہ ان سب کے چُنگل سے بچ نکلا۔ چاقو، بندوق اور بم بھی اس مشاق کو چھو نہ سکے۔ اس نے ثابت کیا کہ وہ ان سب کے لیے بہت سبک رفتار، مضبوط اور تیز فہم ہے)

جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے
ہزار دام سے نکلا ہوں بے خطر ہو کر

ایک وجیہہ بوڑھے کی سچی داستان

اس کی غربت نے اسے ایک ہندو سیٹھ کا غلام بنا دیا تھا

دل پر آیا بوجھ کبھی یوں بھی ختم ہوتا ہے؟

۲۳ مارچ

یادوں کی گٹھڑی

نوید اسلام صدیقی

ایک قسمت کے دھنی نوجوان کی سچی داستان حیات اسے غربت نے غلامی دی اور ملک کی آزادی نے سرداری سے ہمکنار کیا

۲۳ مارچ ۱۹۴۷ء کے جلسے میں شریک ہونے والے گواہ کو زندگی بھر لوگ ۲۳ مارچ والا بابا ہی کہتے رہے

www.urdudigest.pk

یہ اپریل سن دو ہزار کی بات ہے، ہمارے ایک محلے دار کے والد صاحب اپنے گھر میں ہی اچانک بے ہوش ہوکر گر پڑے، اُن کے صاحبزادے اُن کو شیخ زید ہسپتال لے گئے، ڈاکٹروں کے مشورہ پر اُن کو ہسپتال میں داخل کروادیا گیا۔ وہ کئی دن ہسپتال میں داخل رہے، میں بھی ہسپتال میں اُن سے ملنے کے لیے جاتا رہا، ہسپتال کے اسی وارڈ میں ایک لمبا تڑنگا، پُر وجاہت، با رعب شخصیت والا بابا بھی داخل تھا، بہت باتیں کرتا تھا، وہ اکثر یہ بات کرتا تھا کہ اُس نے ۲۳/مارچ ۱۹۴۰ء کے منٹو پارک کے جلسہ میں شرکت کی تھی اور قائداعظمؒ کی پوری تقریر سنی تھی۔ سب وارڈ والے اسے '۲۳/مارچ والا بابا' کہتے تھے۔ ایک دن وہ نیچے ہسپتال کے لان میں بیٹھا ہوا تھا، میں اُس کے پاس چلا گیا۔ میں نے کہا بابا جی! میرا دل چاہ رہا ہے کہ آپ کی پوری داستانِ حیات سنوں اور پھر اسے نئی نسل کے لیے تحریر کروں۔ بابا جی جن کا نام نور دین تھا کہنے لگے:

''یہاں تو میری کوئی سنتا ہی نہیں بلکہ مجھے پاگل سمجھتے ہیں، انہوں نے میرا نام ہی 'تمہیں مارچ والا بابا' رکھ دیا ہے، بات شروع ہی کرتا ہوں تو اِدھر اُدھر کھسک جاتے ہیں۔ تم پہلے آدمی ہو جو میری داستانِ حیات سننا چاہتے ہو۔ عزیزم! میری داستان حیات آپ سمجھو کہ تاریخِ پاکستان ہے۔ سچی بات ہے میں تو پندرہ بیس سال بعد لاہور آیا ہوں، یہاں کے لوگوں کا لاابالی پن دیکھ کر دل کو بہت صدمہ ہوا ہے۔ یہ لوگ کسی بات کو سنجیدگی سے لیتے ہی نہیں، نہ ان کو ماضی پر غور کرنے کا ہوش ہے، نہ ان کو مستقبل کی فکر ہے، حال ان کا یوں گزر رہا ہے کہ جیسے میلے پر آئے ہوئے ہیں۔ خدا ان پر رحم کرے۔ میرے سینے پر ایک بوجھ ہے جب یہ اتر جائے گا تو میرے لیے اپنی جان جانِ آفریں کو سپرد کرنا آسان ہوجائے گا۔

میں نے کہا: آپ کی بات سمجھ نہیں آئی کس قسم کا بوجھ آپ محسوس کرتے ہیں۔ بابا جی نے کہا: '' عزیزم! ۳/باتیں ہیں جو میں نئی نسل تک پہنچانا چاہتا ہوں، تم سے مجھے امید ہے کہ یہ کام کرسکتے ہو۔

پہلی بات یہ بتانی ہے کہ ہم نے انگریز ہی نہیں ہندو کی غلامی کو بھی بھگتا ہے۔ ہندو کو کبھی دوست نہ سمجھو، وہ پاکستان بننے سے قبل جونکوں کی طرح ہم کو چمٹا ہوا تھا اور اس معاشرے کا خون پی رہا تھا۔ اور یہ تو ہمارے سامنے کی بات ہے کہ اس نے کشمیر پر ناجائز قبضہ کیا، تمام دریاؤں کا پانی بند کردیا، مشرقی پاکستان کو اس ملک سے علیحدہ کرواکر اپنا غلام بنا لیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے ۲۳/مارچ ۱۹۴۰ء کو خدا سے کچھ وعدے کیے تھے، ان وعدوں کی تکمیل کرنا ہمارا فرض ہے ورنہ خدا کی پکڑ سے ہم نہ بچ سکیں گے۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ آپس میں اتفاق و اتحاد پیدا کرو تاکہ ہندو کا یہ خیال کہ پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہوکر دوبارہ اس کو مل جائے گا، حقیقت کا روپ نہ دھار سکے۔

میں نے کہا، '' بابا جی! انشاء اللہ میں یہ باتیں نئی نسل کے ہر فرد تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ آپ کے لیے دعا بھی کرتا رہوں گا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ دے۔ باقی سچی بات یہ ہے کہ میں آپ سے ملنا اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتا ہوں اور اسے اپنی خوش نصیبی ہی کہوں گا کہ میں نے آپ کی صورت میں اپنی زندگی میں پہلا آدمی دیکھا ہے جو اس تاریخی جلسہ میں موجود تھا۔''

بابا جی نے اپنی پرانی یادیں تازہ کرنی شروع کردیں۔ انہوں نے بتایا: میرا گاؤں چکوال سے پندرہ بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہمارا علاقہ بارانی ہے، تقسیم ہند سے قبل ہر طرف غربت کا دور دورہ تھا۔ میرا باپ چھوٹے سے ایک قطعہ زمین کا مالک تھا، گاؤں کے اندر چند دکانیں تھیں، سب سے بڑی اور اہم دکان سیٹھ موہن لال کی تھی۔ وہ پورے علاقے کے ہر کاشت کار کی ہر فصل خرید لیتا تھا اور پھر سال بھر ضروریات زندگی اُس کو دیتا رہتا تھا۔ تقریباً چالیس پچاس دیہاتوں میں آباد تمام خاندان اُس کے مقروض تھے۔ جب کسی غریب مسلمان کے نام رقم زیادہ ہوجاتی تو سیٹھ اس کی زمین اپنے نام کروا لیتا۔ علاقے کی بے حساب زمینوں پر وہ قابض ہو چکا تھا۔

www.urdudigest.pk

علاقے کے تمام لوگ اپنی ہی غصب شدہ زمینوں پر مزارع کے طور پر کام کرتے تھے۔ اُس دور میں جس غریبی اور بھوک و افلاس کا دور دورہ تھا اُس کا آج کی نسل تصور بھی نہیں کرسکتی۔ ہر ہندو سیٹھ کے ماتحت ایک علاقہ تھا، جہاں ایک سیٹھ کا علاقہ ختم ہوتا تھا دوسرے کا شروع ہوجاتا تھا، اس طرح یہاں کا مسلمان ایک عذاب میں زندگی گزار رہا تھا۔

میرے والد کا بھی اُس سیٹھ کے قرضے میں بال بال جکڑا ہوا تھا۔ میری ۷/بہنیں تھیں بھائی کوئی نہیں تھا۔ ہماری زمین بھی موہن لال اپنے نام کروا چکا تھا اور اس پر اس کا قبضہ تھا، قرضہ ادا کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ ایک دن میں اور میرا باپ سیٹھ موہن لال کی دکان کے سامنے سے گزر رہے تھے، اُس نے میرے باپ کو بلایا اور کہا کہ جب تک تم میرا قرضہ ادا نہیں کرتے تمہارا بیٹا میرے پاس رہے گا۔ جب قرضہ ادا کردو گے اپنا بیٹا واپس لے جانا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی باپ مجھے اس کے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔

خدا جانے کیوں یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی کہ یہ میرا اپنا کاروبار ہے، میں دکان میں دیوانوں کی طرح کام کرتا۔ ہر وقت کاروبار کی بہتری کے لیے سوچتا رہتا، میری کئی تجاویز سے سیٹھ کو فائدہ ہوا تو آہستہ آہستہ وہ وقت آگیا کہ سیٹھ چھوٹے بڑے ہر معاملے میں مجھ سے مشورہ کرتا۔ سیٹھ کے ہندو دوست اُس کو اکثر کہتے رہتے کہ مُسلے کا بچہ بھی مُسلا ہی ہوتا ہے، یہ ایک دن تجھ کو ضرور ڈنک مارے گا۔ تُو ہماری یہ بات لکھ کر اپنے پاس رکھ لے کہ یہ موذی تجھ سے ایک کے بدلے دس لے گا۔ (اللہ تعالیٰ نے پھر ایسا ہی کیا، ایک کے بدلے دس نہیں بلکہ ہزاروں گنا اس سیٹھ سے لے کر دیا) سیٹھ ہنس کر اُن کو جواب دیتا کہ میں نے اس کا ڈنک نکال دیا ہے، بے شک یہ ہندو نہیں ہے لیکن یہ اب مسلمان بھی نہیں ہے، پوچھ لو اس سے کبھی اس نے نماز پڑھی ہو، کوئی روزہ رکھا ہو۔ دوسرے ہندو کہتے یہ کوئی بات ہے! سیٹھ تو کتنا سادہ ہے، مسلمان کا نماز روزہ ختم ہوسکتا ہے لیکن جب تک اس کے دل میں اسلام کا نور باقی ہے اور وہ اپنے نبیؐ کا کلمہ پڑھتا ہے وہ خطرناک ہوسکتا ہے۔ کیا تمہیں یاد نہیں ہے چند سال قبل لاہور میں علم دین نے صرف ایک کتاب لکھنے پر بیچارے راج پال کو بیدردی سے ہلاک کردیا تھا، کہتے ہیں کہ علم دین ایک ترکھان کا بیٹا تھا، سیدھا سادہ مسلمان، نہ اُس کی داڑھی تھی، نہ وہ کسی دینی مدرسے سے پڑھا ہوا تھا، کہتے ہیں ایک مولوی صاحب کی تقریر سُن کر اچانک اس کا اسلام بیدار ہوگیا، تو بھائی میرے مسلمان کا کبھی اعتبار نہ کرو، نام کا مسلمان بھی دن میں تارے دکھا سکتا ہے۔

میں دن بھر دکان پر کام کرتا، شام کو میری ڈیوٹی سیٹھ موہن لال کی بیٹھک میں ہوتی جہاں گاؤں کے تمام ہندو آکر جمع ہوجاتے، میں وہاں حقہ پانی کا بندوبست کرتا۔ پورے گاؤں میں صرف ایک ریڈیو ہوتا تھا، روزانہ رات کو خبریں بہت باقاعدگی سے سنی جاتی تھیں، وہ خبریں اور خبروں پر تبصرہ سن سن کر میں حالات حاضرہ سے بہت زیادہ باخبر رہتا تھا، لیکن زبان ہمیشہ بند رکھتا تھا۔ جس وقت میں سیٹھ کا قیدی بنا میری عمر نو دس سال ہوگی۔

سیٹھ جب کبھی سامان خریدنے کے لیے کسی دوسرے شہر مثلاً گوجر خان، راولپنڈی یا لاہور جاتا مجھے ساتھ لے کر جاتا۔ میرا کام اُس کے سامان کا خیال رکھنا، اس کے جوتے صاف کرنا، بازار سے خریدا ہوا سامان اٹھا کر لانا اور جو بھی آرڈر دے اس کی تعمیل کرنا ہوتا تھا۔ لاہور میں وہ گوالمنڈی میں اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں قیام کرتا، میں بھی اسی گھر میں ٹھہرتا۔ مارچ

منٹو پارک کے اس حصے میں جہاں آج مینار پاکستان کھڑا ہے ان دنوں وہاں گھاس کے قطعے نہیں تھے بلکہ چٹیل میدان تھا اور اس میدان میں آم کے درخت بھی ہوتے تھے۔

۱۹۴۰ء میں ہم لاہور میں تھے کہ اچانک کسی رشتہ دار کے مرنے کی خبر دلّی سے آگئی، سیٹھ اور اس کا لاہوری رشتہ دار دلّی چلے گئے، میں لاہور میں ہی رہا۔ میں سارا دن شہر میں پھرتا رہتا، ایک دن میں پھرتا پھراتا منٹو پارک کی طرف جا نکلا۔ منٹو پارک کے اس حصے میں جہاں آج مینارِ پاکستان کھڑا ہے ان دنوں وہاں گھاس کے قطعے نہیں تھے بلکہ چٹیل میدان تھا اور اس میدان میں آم کے درخت بھی ہوتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ بہت سارے لوگ زمین کو کدالوں بیلچوں کے ساتھ ہموار کرنے میں مصروف ہیں۔ میں نے ایک آدمی سے پوچھا یہاں کیا بننے لگا ہے؟ اُس نے بتایا کہ چند دنوں بعد یہاں بہت بڑا جلسہ ہوگا جس میں قائد اعظمؒ بھی تشریف لائیں گے، ہم جلسہ گاہ کے لیے میدان ہموار کر رہے ہیں۔ میں نے کہا میں چاہتا ہوں کہ میں بھی اس کام میں حصہ لوں، انہوں نے کہا بہت خوشی کی بات ہے آؤ میرے ساتھ میں تم کو کام بتاتا ہوں۔ انہوں نے مجھے ایک کدال دے دی پھر جب تک میری بازوؤں میں ہمت تھی میں وہاں اس کارِ خیر میں مصروف رہا۔ تم میرے ان ہاتھوں کو دیکھ رہے ہو ان ہاتھوں نے ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کے جلسے کے لئے اپنی پوری طاقت لگائی تھی۔ (معلوم ہوتا تھا کہ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان ہاتھوں کی وجہ سے وہ جلسہ منعقد ہو سکا تھا، میں نے ان کا دِل رکھنے کے لیے ان کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگایا)۔

غالباً ۱۹ر مارچ کو علامہ مشرقی کے خاکساروں کی عظیم الشان ریلی اور پریڈ کا مظاہرہ تھا جس میں ۳۱۳ر خاکساروں کا جیش شامل تھا، میں نے وہ زبردست مظاہرہ دیکھا تھا، پولیس نے بغیر کسی اشتعال کے اس پر اندھا دھند بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی تھی۔ اللہ نے مجھے بچا لیا لیکن کم از کم سو سے زائد آدمی اُس وقت شہید ہوئے تھے، بے حساب زخمی ہوئے تھے، بہت سارے زخمی میو ہسپتال میں داخل ہوئے تھے۔

۲۱ر مارچ ۱۹۴۰ء کو میں نے سنا کہ قائد اعظمؒ ریل گاڑی سے آرہے ہیں، گوالمنڈی کے پاس ریلوے روڈ سے کئی جلوس نعرے لگاتے ہوئے ریلوے اسٹیشن جا رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتا لاہور اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ افسوس میں ریلوے اسٹیشن کے اندر نہ جا سکا کیونکہ وہاں دور دور تک انسانوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ صبح ۹ر بجے فرنٹیر میل اپنے وقت پر پلیٹ فارم نمبر ایک پر داخل ہوئی۔ انسانوں کے اس بے پناہ سمندر میں زبردست ہلچل پیدا ہوئی۔ فضا اللہ اکبر، قائد اعظم زندہ باد، مسلم لیگ زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ میں نے بھی اس دن اپنا پورا زور لگا کر نعرے لگائے تھے۔

پہلے اعلان ہوا تھا کہ قائد اعظمؒ کو ایک جلوس کی صورت میں ان کی قیام گاہ پر لے جایا جائے گا لیکن پھر بتایا گیا کہ خاکساروں کے غمناک واقعہ کی وجہ سے جلوس کا پروگرام منسوخ کر دیا گیا ہے۔ ۲۱ر مارچ کو ہی شام کے وقت قائد اعظمؒ منٹو پارک میں تشریف لائے جہاں ہزاروں افراد نے آپ کا استقبال کیا۔ میں وہاں موجود تھا جب قائد اعظمؒ نے مسلم لیگ کے سبز پرچم کو پنڈال کے سامنے لہرانے کے لیے رسم پرچم کشائی ادا کی۔ بعد ازاں پورے برصغیر سے آئے ہوئے مسلم لیگ نیشنل گارڈز نے آپ کو سلامی دی۔ اس کے بعد قائد اعظمؒ نے مختصر سی تقریر کی تھی۔

۲۲ر مارچ ۱۹۴۰ء کو نماز جمعہ میں نے بادشاہی مسجد میں ادا کی تھی، اس کے بعد منٹو پارک چلا گیا وہاں بہت بڑا اجتماع ہو رہا تھا جس میں پورے ہندوستان سے مسلمانان

> میں وہاں موجود تھا جب قائد اعظمؒ نے مسلم لیگ کے سبز پرچم کو پنڈال کے سامنے لہرانے کے لیے رسم پرچم کشائی ادا کی۔

ہند نے شرکت کی تھی۔ یقین کرو جلسہ گاہ میں تِل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ بادشاہی مسجد تک انسانوں کے سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ قائد اعظمؒ کی وہ تقریر میں نے سنی تھی۔

میں نے کہا 'بابا جی! کیا آپ کو تقریر کی سمجھ آرہی تھی، کہنے لگے قائد اعظمؒ نے انگریزی میں تقریر کی تھی۔ بابا جی نے میری بات کا بہت بُرا مانا۔ کہنے لگے بیٹا تمہارا سوال سن کر مجھے بہت افسوس ہوا ہے، او بندۂ خدا! وہ آج کل کے بناپتی لیڈروں کی طرح کا لیڈر نہیں تھا، وہ تو مسلمانانِ ہند کے لیے ایک خدائی تحفہ تھا، ایسا ہیرے جیسا انسان صدیوں میں کہیں کوئی پیدا ہوتا ہے۔ اس کے قول و فعل میں تضاد نہیں تھا، اُس کو کوئی خرید نہیں سکتا تھا، وہ قوم کے ایک پیسے کو بھی اپنی ذات پر خرچ کرنے کا روادار نہیں تھا۔ اُس کے منہ سے جو بات نکل رہی تھی وہ درحقیقت اُس کے دل میں سے نکل رہی تھی اور سیدھی سامعین کے دل میں جا رہی تھی۔ ہر ایک کو پتا تھا، مجھے بھی پتا تھا جب کہ میں صرف ۱۵ر سال کی عمر کا ایک جاہل دیہاتی نوجوان تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، مجھے یقین تھا وہ ہم مسلمانوں کی بھلائی کی بات کر رہا ہے وہ ہماری بہتری کی بات کر رہا ہے۔ اُس نے صاف صاف اعلان کر دیا تھا کہ اگر برطانوی حکومت نے مسلمانوں پر کوئی ایسا آئین یا تصفیہ تھوپ دیا جسے ان کی تائید اور منظوری حاصل نہ ہو تو ہندوستان کے مسلمان زبردست مزاحمت کریں گے۔ مسلم ہندوستان ایسا کوئی آئین قبول نہیں کر سکتا جس کے تحت ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے۔ اگر انگریز دل سے یہ چاہتے ہیں کہ برصغیر کے لوگ امن اور چین سے رہیں اور خوش حال ہوں تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہندوستان کو خود مختار قومی مملکتوں میں تقسیم کر کے یہاں کی بڑی قوموں کو جداگانہ وطن دیا جائے۔

میں نے کہا بڑی بات ہے آپ کو یہ سب باتیں یاد ہیں۔

کہنے لگے یہ باتیں تو میں نے گاؤں میں آکر ہندوؤں سے سنیں اور پھر میرے دل پر نقش ہو گئیں، خدا جھوٹ نہ بلوائے اب تک یہ الفاظ میں ہزاروں دفعہ لوگوں کے سامنے دہرا چکا ہوں۔

۲۳ر یا ۲۴ر مارچ کو جب جلسہ میں قرارداد پاکستان منظوری کے لیے پیش ہوئی تو میں نے بھی یہ ہاتھ اٹھا کر تائید کی تھی۔ (کافی دیر وہ اپنی دائیں بازو کو دیکھتے رہے، میں بھی دیکھتا رہا۔ اور سبحان اللہ سبحان اللہ کہتا رہا۔ وہ کچھ اس طرح کا اظہار کر رہے تھے جیسے اُن کے اس ہاتھ اٹھانے سے ہی پاکستان وجود میں آیا تھا۔ یا یوں کہہ لیں کہ اس ہاتھ ہی نے پاکستان بنایا ہے۔)

چند دنوں بعد سیٹھ دلّی سے واپس لاہور آگیا۔ گاؤں میں سیٹھ کی بیٹھک میں روزانہ ہندو لاہور کے جلسے پر تبصرے کرتے رہتے تھے۔ مجھے وہ گونگا، بہرہ اور اندھا بے مذہب نوجوان سمجھتے تھے۔ میں بھی اُن کے سامنے اپنے آپ کو ایسا ہی ظاہر کرتا تھا۔ ہندو روزانہ یہ بات کرتے تھے کہ وطن ہمارے لیے ماں کی طرح ہے ہم جان دے دیں گے لیکن بھارت ماتا کے ٹکڑے نہیں ہونے دیں گے۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ ہر آنے والا دن مقامی ہندوؤں کے لیے نئی سے نئی پریشانیاں لا رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مئی ۱۹۴۷ء کے آخری دنوں میں کچھ خریداری کرنے کے لیے سیٹھ لاہور آیا تھا، میں بھی اس کے ساتھ تھا، ہم جس ہندو کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے اُس کے گھر میں ریڈیو تھا۔ ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا فارمولا طے کرنے کے لیے ایک اہم اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اجلاس کے بعد اسی دن شام ۴ر بجے ماؤنٹ بیٹن، جناح، نہرو اور سردار بلدیو سنگھ نے ریڈیو پر تقریریں کی تھیں۔ میں نے یہ تمام تقاریر سنی تھیں۔ قائد اعظمؒ نے اپنی تقریر کے اختتام پر ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ لگایا تھا۔ میں بھی اُس وقت پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگانے کے لیے بیتاب ہو گیا تھا، بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا کیونکہ میں تو اندھا گونگا بہرا بنا ہوا تھا۔ ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند پلان کے اعلان سے مسلم لیگ

www.urdudigest.pk

کا مطالبہ ''پاکستان'' پورا ہوگیا۔ سیٹھ اور ان کا دوست ان لیڈروں کی تقریریں سن کر کچھ دیر تو گم سم بیٹھے رہے جیسے ان پر سکتہ طاری ہوگیا ہو، آخر ہمارا میزبان بولا ہمارے لیڈروں کے دماغ میں بھس بھرا ہوا ہے۔ اے عقل کے اندھو! ہم مسلمانوں کے مقابلے میں کتنی بڑی اکثریت کے مالک ہیں۔ ان احمقوں کو جناح نے کیسے بے بس کر کے رکھ دیا، گاندھی کو دیکھو، ہمیں الو بنانے کے لیے ننگا پھر رہا ہے، چلتا پھرتا کارٹون ہے، اُس کے مقابلے میں مسلمانوں کا لیڈر ہے شکل سے، لباس سے، بات کرنے کے لحاظ سے لیڈر لگتا ہے۔ انگریز ہیں تو وہ بھی اس سے ڈر رہے ہیں ہمارے یہ نام نہاد لیڈر، ان کی تو اس کے سامنے جان ہی نکل جاتی ہے۔ کاش ہمارے پاس قائداعظم جیسا کوئی لیڈر ہوتا۔ اب کیا ہوگا ہمارا کیا بنے گا، ہم کیا ان مسلوں کے ماتحت یہاں رہیں گے۔ بہت دیر وہ اس قسم کی بے سروپا باتیں کرتے رہے۔ میں گھر سے باہر نکل آیا، لاہور شہر میں جنگل کی آگ کی طرح خبر پھیل چکی تھی۔ ہندوؤں کے چہرے لٹکے ہوئے تھے جب کہ مسلمان خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے۔ میں کچھ دیر باہر چکر لگا کر گھر واپس آیا تو دیکھا سیٹھ اور ان کا میزبان کہیں جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ سیٹھ نے مجھے کہا کہ ہم ایک بڑے لیڈر کو ملنے جا رہے ہیں تم ادھر ہی ٹھہرو۔

ہم جب گاؤں واپس آئے تو میں نے دیکھا کہ ہمارے علاقے کے ہندو بہت مضطرب تھے۔ اکثر کہتے تھے یہ بیوقوف مسلمان پاکستان بنا تو لیں گے لیکن ۶/ ماہ سے زیادہ چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، خود ہمارے سامنے ہاتھ جوڑ کر منتیں کریں گے کہ خدا کا واسطہ ہے اس کو سنبھالو۔ ایک ہندو جو گاؤں میں سکول ماسٹر تھا اور سب اسے گورو جی کہتے تھے وہ ہمیشہ یہ کہتا تھا کہ یہ ۶/ مہینے کی بات تو غلط ہے لیکن ان کا مستقبل کوئی نہیں ہے، میں نے مسلمانوں کی پوری تاریخ بہت باریک بینی سے پڑھی ہے یہ ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر سکتے، مجھے سو فی صد یقین ہے کہ ہم رہیں نہ رہیں یہ آپس میں ہی لڑ لڑ کر ختم ہو جائیں گے۔ یہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح ایک دوسرے کا گوشت نوچیں گے، یہ وحشیوں کی طرح ایک دوسرے کی گردنیں کاٹیں گے، یہ ایک دوسرے کو مار کر لاشوں پر رقص کناں ہوں گے، یہ اپنے ملک کے کئی کئی ٹکڑے کریں گے۔ ایک وقت آئے گا کہ پاکستان کا نام صرف تاریخ کی کتابوں میں رہ جائے گا۔

ہمارے گاؤں کے ہندوؤں کا یہاں سے انڈیا جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا لیکن جب انڈیا میں مسلمانوں کا قتل عام ہندوؤں اور سکھوں نے مل کر شروع کیا تو ادھر مغربی پنجاب میں بھی اُس کا ری ایکشن ہوا۔ اچانک جب ان پر حملے ہوئے تو بسے بسائے گھر اور جمے جمائے کاروبار چھوڑ کر ان کو بھاگنا پڑا۔ غالباً جولائی ۱۹۴۷ء کے آغاز میں سیٹھ نے اپنی بیوی اور بیٹیاں دلی بھیج دی تھیں جہاں اُس کا بھائی رہتا تھا، سیٹھ اکیلا ہی ادھر گاؤں میں رہتا تھا۔

ایک دن مجھے سیٹھ نے بتایا کہ میں نے پٹواری کو رشوت دے کر بڑی مشکل سے کاغذات بنوائے ہیں، میں نے تمام زمینیں اور مکانات تمہارے نام کروا دیے ہیں۔ مجھے تم پر اندھا اعتماد ہے، میری نظر میں پوری دنیا میں تم سے زیادہ مخلص اور وفادار انسان کوئی نہیں ہے، بیٹا (وہ پہلا دن تھا جب اُس نے مجھے بیٹا کہا تھا، ورنہ ہمیشہ مجھے نورا کہہ کر پکارتا تھا) یہ تمام جائیداد ۶/ مہینوں تک تم نے سنبھال کر رکھنی ہے، زیادہ سے زیادہ ۶/ مہینے میں پاکستان ختم ہو جائے گا میں پھر واپس آجاؤں گا۔ واپس آکر میں تم کو بہت انعام دوں گا اور کاروبار میں حصہ دار بھی بنا لوں گا۔ میں نے کہا سیٹھ صاحب آپ نے جو مجھ پر اعتماد کیا ہے اُس کا شکریہ لیکن مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آرہی کہ آپ نے تمام جائیداد میرے نام کیوں کروا دی ہے۔ سیٹھ نے بتایا اس کی ۲/ وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ جو مہاجر ہندوستان سے آئیں گے وہ اس کو کلیم نہیں کر سکیں گے، دوسرے یہاں کے مقامی لوگ میری جائیداد اور سامان پر قبضہ نہیں کر سکیں گے۔

www.urdudigest.pk

اگست ۱۹۴۷ء کا آغاز ہو چکا تھا، میں نے دیکھا کہ صبح سویرے سیٹھ ایک کپڑے میں کوئی چیز لپیٹے ہوئے گاؤں سے باہر جا رہا ہے۔ میں نے سیٹھ کو دیکھ لیا تھا لیکن سیٹھ نے مجھ کو نہ دیکھا۔ دو تین دن بعد سیٹھ نے مجھے بتایا کہ میں نے جتنی رقم گھر میں موجود تھی اُس کا سونا خرید لیا تھا، سوچا تھا کہ دلی جاتے ہوئے ساتھ لیتا جاؤں گا لیکن ان وحشی ظالموں نے بربریت کا جو بازار گرم کر رکھا ہے اس میں جان بچا کر چلا جانا بھی غنیمت ہوگا، ان درندوں میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ سونا گاؤں سے باہر زمین میں دفن کر دیتا ہوں جب ۶/ ماہ بعد واپسی ہوگی تو زمین سے نکال لوں گا۔ میں چار پانچ دن سے جب بھی دن یا رات کو اس کام کے لیے باہر نکلا ہوں، ہر طرف اور ہر جگہ کوئی نہ کوئی مجھے دیکھ رہا تھا، دو تین دفعہ تو زمین میں دبانے کے بعد دوبارہ جا کر سونا باہر نکال لایا کیونکہ میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ مجھے کوئی دیکھ رہا ہے۔ آج رات مجھے خیال آیا کہ جب میرا بیٹا نوردین (یہ پہلا موقع تھا کہ سیٹھ نے میرا پورا نام لیا تھا) ہی میرے گھر میں چھ ماہ تک رہے گا تو میں نے سوچا سب سے محفوظ جگہ سونا رکھنے کے لیے اپنے گھر ہی میں ہے، اسی لیے آج رات میں نے گھر ہی میں اسے دفنا دیا ہے۔

ایک دن سیٹھ نے مجھے آدھی رات کو جگایا اور چابیوں کا ایک گچھا میرے حوالے کیا اور کہنے لگا میں ابھی اسی وقت جا رہا ہوں، میرے ساتھی مجھے لینے آئے ہوئے ہیں۔ میں نے پوچھا آپ کس طرح یہاں سے جائیں گے؟ سیٹھ نے بتایا کہ گاؤں سے گھوڑوں پر سفر کا آغاز ہوگا آگے چل کر دوسری سواری کا بندوبست ہو جائے گا۔ میں نے پوچھا کہ راستے میں خرچے کے لیے پیسے آپ نے رکھ لیے ہیں؟ اُس نے کہا ہاں کافی پیسے ہیں دلی تک کا سفر ان میں مکمل ہو جائے گا۔ میں نے بہت سی منتیں مانی ہیں، مجھے یقین ہے ہم دلی بخیر و عافیت پہنچ جائیں گے۔ صبح ہوئی تو سب گاؤں والے مجھ سے پوچھنے چلے آرہے تھے کہ سیٹھ کدھر گیا۔ میں نے کہا وہ راولپنڈی گیا ہے، کچھ دن اُدھر ہی رہے گا، باقی اُس کے تمام مال و جائیداد کا مالک اب میں ہوں کسی نے بری نیت سے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو اس کی خیر نہیں۔

سیٹھ کے جاتے ہی میں نے اپنے ماں باپ اور ساتوں بہنوں کو سیٹھ کے مکان میں شفٹ کر دیا، میری دادی پرانے خیالات کی مالک تھی اس نے وہ ٹوٹا پھوٹا خستہ مکان چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ اُس کا کہنا تھا کہ میں جدی پشتی مکان کو کبھی نہ چھوڑوں گی، دوسرے یہ کہ وہ مکان پلید اور ناپاک ہے کیونکہ وہاں بتوں کی پوجا ہوتی رہی ہے۔ تیسرے یہ کہ ۶/ ماہ بعد وہ ہندو اگر دوبارہ واپس آگئے تو وہاں سے جو ذلیل و خوار ہو کر نکلنا پڑے گا اُس سے یہ بہتر ہے کہ ان محلات میں آدمی جائے ہی نہیں۔

خدایا! تیری کیا شان ہے، تُو کیا کیا انسان کو اس زندگی میں دکھاتا ہے، وہ سیٹھ جس نے ہماری چند کنال زمین پر قبضہ کر لیا تھا آج اُس کی تمام زمینوں کے کاغذات میرے پاس تھے۔ گاؤں کے تمام لوگوں نے مجھے سیٹھ صاحب کہنا شروع کر دیا تھا۔ میری بہنوں کے لیے کبھی کوئی رشتہ نہ آیا تھا لیکن اب بڑے بڑے خاندانوں سے رشتے آرہے تھے، ہماری بہنیں جن میں پہلے لوگوں کو کوئی خوبی نظر نہ آتی تھی ان میں اب کو طرح طرح کی خوبیاں نظر آرہی تھیں۔ میری بہنیں جن کے پاس سر پر اوڑھنے کے لیے چھوٹی چھوٹی پھٹی ہوئی بوسیدہ چادریں ہوتی تھیں اُن کے جہیز کے لیے کپڑے، بستر، برتن ہر چیز اللہ نے وافر مقدار

> وہ سیٹھ جس نے ہماری چند کنال زمین پر قبضہ کر لیا تھا، آج اُس کی تمام زمینوں کے کاغذات میرے پاس تھے۔

میں دے دی تھی۔ ساتوں بہنوں کی شادیاں بہت دھوم دھام سے ہوئیں۔ گاؤں کے سب سے بڑے ملک صاحب کی خواہش تھی کہ وہ مجھے اپنا بیٹا بنائیں۔ وہ روزانہ میرے والد صاحبؒ سے ملتے اور ان کے سامنے میری تعریفیں کرتے۔ باپ نے ایک دن مجھ سے اس سلسلے میں بات کی میں نے کہا ٹھیک ہے مجھے یہ رشتہ منظور ہے، آپ ہاں کردیں، اس طرح میری شادی ہوگئی۔

میں نے پوچھا ''بابا جی! وہ سونے کے بارے میں تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ وہ سونا ملا تھا یا نہیں؟''

بابا جی نے ہنستے ہوئے کہا: ''اللہ میاں کے کام اللہ ہی جانے، ہر وقت آدمی کو توبہ استغفار کرتے رہنا چاہیے میری ماں کا ایک چاندی کا معمولی سا ہار تھا، وہ ایک دن سیٹھ سے دال لینے گئی تھی تو اُس ظالم سیٹھ نے میری ماں کے گلے سے وہ ہار اتار کر اپنے پاس رکھ لیا، میں یہ منظر دیکھ رہا تھا، ماں کو یہ ہار میری نانی نے شادی کے موقع پر دیا تھا۔ یہ ایک ہار ہی ہمارے خاندان میں نسل در نسل چلا آرہا تھا۔ یہی ہمارے گھر میں ایک واحد زیور تھا، اگر اس کو زیور کہا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس ایک ہار کے بدلے ایک سیر سے زائد سونا مجھے دلا دیا۔ سونا مجھے آسانی سے گھر کے اندر ایک جگہ سے مل گیا تھا۔

میں نے کہا: ''بابا جی! کیا آپ کے سیٹھ کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔'' بابا جی بولے ''بھئی ہندو سو سال آگے کی سوچتا ہے، سیٹھ کہتا تھا مستقبل تعلیم کا ہے۔ اس نے اپنے بچے دلّی اپنے بھائی کے پاس بھیج دیئے تھے۔ وہ وہاں اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پڑھتے تھے۔ ہاں یاد آیا سیٹھ کے دونوں بیٹے اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ سن ۸۰ء میں گاؤں میں آئے تھے، انہیں اپنا آبائی مکان دیکھنے کا بہت شوق تھا، لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ مکان گرا کر دوبارہ بنایا گیا ہے تو ان کا دل بجھ گیا۔ میں نے ان بھائیوں سے پوچھا تھا کہ آپ اب کیا کرتے ہیں تو انہوں نے بتایا کے ہم دونوں ڈاکٹر ہیں۔ وہ اپنے بیوی بچوں کو گاؤں کی سیر کراتے رہے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے

سیٹھ کے بارے میں بتایا تھا کہ ہم نے ان کو بہت پیغام بھیجے تھے کہ جلد سے جلد دلّی آجائیں لیکن ان کو اندازہ نہیں تھا کہ حالات ایک دم اتنے بگڑ جائیں گے۔ ان کے ساتھ جو آدمی گاؤں سے رات کو گھوڑوں پر روانہ ہوئے تھے ان میں سے صرف ایک آدمی دلّی زندہ پہنچ سکا۔ اُس نے بتایا تھا کہ گاؤں سے چند میل کے فاصلے پر ایک برساتی نالے کے پل پر چند افراد ناکہ لگا کر کھڑے ہوئے نظر آئے، سب رُک گئے، میں اپنے ساتھیوں سے تیس چالیس قدم پیچھے تھا، اس نے خطرے کو محسوس کرتے ہوئے تیزی سے اپنا گھوڑا واپس موڑا اور ایک لمبا راستہ اختیار کر کے جہلم آگیا، آگے بھی اکیلا ہی چھپتے چھپاتے انڈیا پہنچ گیا۔ ہم کو اپنے والد کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا۔

خوب محفل جمی ہوئی تھی، بابا جی کی باتیں سننے کے لیے کچھ اور لوگ بھی ادھر آبیٹھے تھے۔ اچانک اُن کا نواسا دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا ''آپ بھی کمال کرتے ہیں اُدھر ڈاکٹر راؤنڈ پر آیا ہوا ہے اور آپ اِدھر بیٹھے ہوئے ان سے باتیں کر رہے ہیں۔'' نواسے کی بات سن کر میں اُن سے رخصت ہوکر گھر کی طرف یہ سوچتے ہوئے چل پڑا کہ آج ایک پوری تاریخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، کانوں سے سن لیا۔

اگلے دن میں ہسپتال گیا تو معلوم ہوا کہ بابا جی لان سے ہمارے پاس سے اٹھ کر ہسپتال کی عمارت کی طرف خوش خوش جارہے تھے، جب وارڈ میں داخل ہوئے تو ڈاکٹر نے کہا: بابا جی آپ بہت خوش نظر آرہے ہیں، کیا بات ہے؟ بابا جی نے کہا: ''میری چھاتی پر جو بوجھ تھا آج اتر گیا ہے، اسی بوجھ کی وجہ سے میری سانس اٹکی ہوئی تھی، آج مجھے ایک نئی نسل کا نمائندہ مل گیا تھا، میں نے اپنی یادوں کی گٹھڑی اس کے حوالے کردی ہے۔ اب اللہ جانے اور وہ جانے۔

رات کو سوئے سوئے ۱۱، ۱۲ بجے کے درمیان بابا جی کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون ■

خود سے بیگانہ

نونہالوں کی آبیاری میں مصروف
ایک جواں سال پروفیسر کا قصہ دلپذیر
اس ''کارِ سخت جانی'' نے دل خوں اور جگر پانی کر ڈالا ہے

صندل عظیم

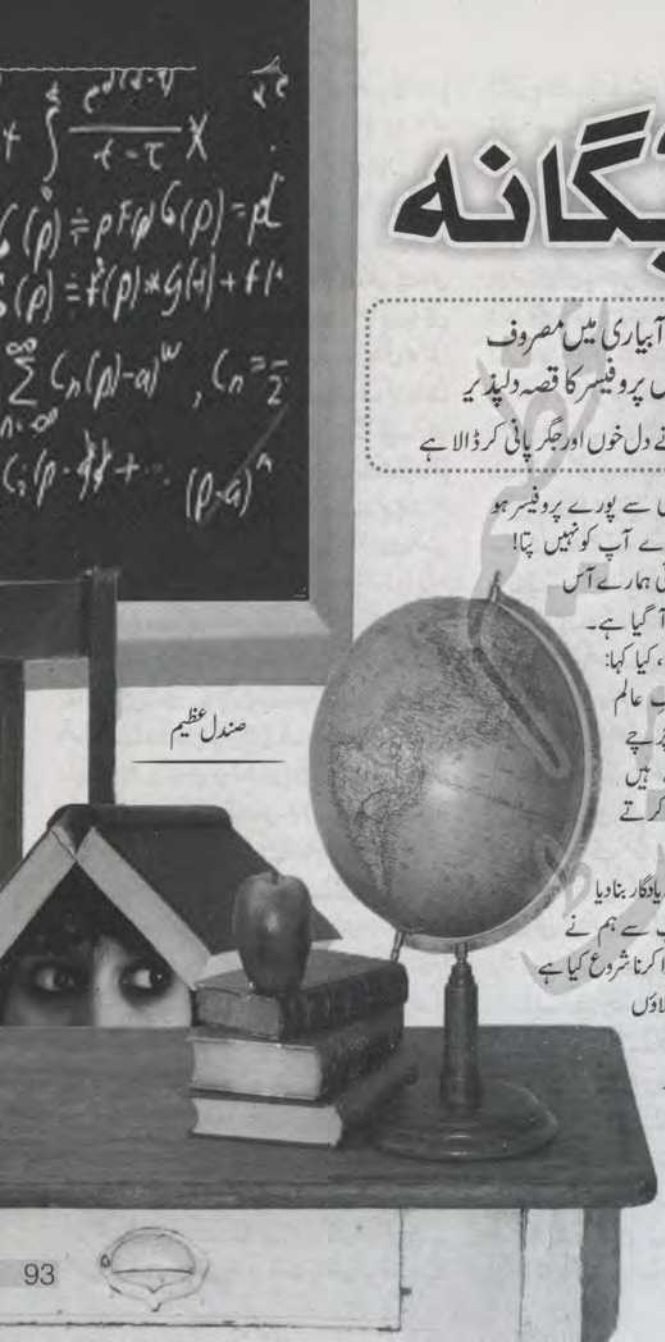

لیں جناب! ہم ابھی سے پورے پروفیسر ہو گئے ہیں۔ ارے آپ کو نہیں پتا! چلیں چھٹی ہوئی ہمارے آس پاس کی ساری دنیا کو تو یقین آ گیا ہے۔ اب آپ بھی مان جائیں ناں، کیا کہا: کیسے یقین آیا؟ بھئی چار دانگ عالم میں ہماری پروفیسری کے چرچے ہیں۔ ہم جدھر سے گزرتے ہیں اپنے منصب پر مہرِ تصدیق ثبت کرتے چلے جاتے ہیں۔

ع رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

قصہ کچھ یوں ہے کہ جب سے ہم نے نونہالانِ وطن کی آبیاری کا فرض ادا کرنا شروع کیا ہے ہم زمین کے بجائے زیادہ تر خلاؤں میں رہنے لگے ہیں۔ عقل و خرد تو ساری کی ساری ہم نے نچوڑ کر اپنی طالبات کو پلا دی۔ پولیو کے قطروں کی مہم سال میں دو مرتبہ چلائی جاتی ہے جب کہ ہماری مہم تو سارا سال جاری رہتی ہے۔ اس

www.urdudigest.pk

''کارِ سخت جانی'' نے دل خون اور جگر پانی کر دیا گیا مگر.....

اچھا تو ہم وہیں سے بات شروع کرتے ہیں جہاں سے چھوڑی تھی۔ پر چھوڑی کہاں سے تھی.....؟ ہاں یاد آیا!

ہم اپنی زندگی کے انمول واقعات و بیانات کی روشنی میں یہ ثابت کر رہے تھے کہ ہم پروفیسر ہیں۔ بھئی کیسے ناں ہوں جب کلاس لینی ہو فرسٹ ایئر کی اور ہم پہنچ جائیں سیکنڈ ایئر میں اور بڑے طمطراق سے شہادت کی انگلی کا کنڈا بنا کر دروازے پر نوک کریں اور اندر جھانک کر بڑے رعب سے فرمائیں: ''مَیم یہ میرا پیریڈ ہے۔'' ایک مرتبہ امتحانات کے دنوں میں ہم ڈیوٹی دے رہے تھے کہ ایک آیا جھاڑو دیتی دیتی تشریف لائیں اور ہم سے کچھ پوچھا۔ ہم نے بڑی خوش دلی سے جواب دیا۔ ''اللہ کا شکر ہے، سب کچھ ٹھیک ٹھاک۔''

انھوں نے ایک دو لمحوں کے لیے ہمیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھا اور پھر اپنی جھاڑو سنبھال گرد کے بادل اڑاتی آگے کو روانہ ہو گئیں۔ ان کے جانے کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ انھوں نے ہمارا حال چال نہیں بلکہ وقت پوچھا تھا۔ بھئی اب کوئی بتائے کہ ان کی آواز کی بازگشت سنائی دینے کے بجائے اگر ان کی اصل آواز ہی بخوبی سنائی دے جاتی تو غالباً کوئی مضائقہ نہ تھا۔ اور سُنیے، ہم سیکنڈ ایئر میں لیکچر دے رہے ہیں کہ ایک طالبہ دروازے میں نمودار ہوئیں اور کہا Madam! May I come in

ہم نے فوراً سر کا اشارہ دیتے ہوئے کہا وعلیکم السّلام! اب خود ہی سوچیے! ہمیں طالبات کے سامنے کتنی شرمندگی کا احساس ہوا ہو گا۔ لہٰذا ہم نے اس احساس کو زائل کرنے کے لیے کمال اشتیاق سے پوچھا: ''بیٹا! آپ نے ہمیں سلام کیا تھا؟ (ہمارا لہجہ اس سوال کے آخر میں ناں'' لگائے ہوئے تھا) وہ طالبہ بھی ایسی برخوردار واقع ہوئی تھیں کہ فوراً جواب آیا۔ ''نو میڈم''۔ اب آپ کو پتا چلا کہ اصل شرمندگی کسے کہتے ہیں؟.....نہیں؟ بھئی بڑے افسوس کی بات ہے ہمیں تو اسی وقت پتا چل گیا تھا۔ ویسے ہمیں پروفیسر بنانے میں ہماری لائق فائق طالبات کا بڑا ہاتھ ہے۔ فرسٹ ایئر اردو کے پرچے میں سبق ''اوورکوٹ'' سے سوال آیا کہ نوجوان نے اوورکوٹ کے علاوہ کیا کچھ زیب تن کر رکھا تھا؟ جواب آیا ایک پتلون جو کبھی نکلائی رہی ہو گی، پہن رکھی تھی۔ کمال ہے ایسے ایسے ماہر درزی بھی پاکستان میں موجود ہیں۔

پچھلے دنوں جو زلزلے کے جھٹکے آئے تھے ان کی اصل وجہ یہی تھی کہ یہ نادر جواب پڑھنے کے بعد ہم دیواروں سے سر ٹکرا رہے تھے۔ ایک طالبہ نے لکھا کہ ''زمین پر سانپ کے چلنے سے دراڑیں پڑ گئی تھیں۔'' ہم نے پوچھا: بھئی یہ سانپ تھا یا ہاتھی کا بچہ۔ خلاصہ لکھنا تھا سبق ''لاہور کا جغرافیہ'' کا جس میں پطرس نے پُر مزاح انداز میں ذرائع آمدورفت کی مد میں ''تانگے اور'' بنا ہنپتی گھوڑے'' کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ بس طالبہ کو یہی چند الفاظ یاد رہ گئے اور اس ذہین و فطین طالبہ نے تحریر فرمایا: ''بنا ہنپتی گھوڑے کی ٹانگوں سے گھی نکلتا ہے۔'' آپ سوچ سکتے ہیں کہ ہم نے کس رفتار سے اپنے سر کے بال نوچے ہوں گے؟ ہم ٹیسٹ چیک کر رہے ہیں فرسٹ ایئر کے، اقبال کا ایک بند نظر سے گزرا۔ بس کچھ نہ پوچھیے آنکھوں تلے اندھیرا ہی تو چھا گیا۔ ملاحظہ فرمایئے:

ہر لحظہ ہے مومن کہ نئی آن نئی شان
کردار میں گفتار میں اللہ کی برہان
مٹی بھی سوئے لال ہے خندک ہے وہ شبنم
دریا کی موجوں سے بنتا ہے مسلمان

ایک مرتبہ سیکنڈ ایئر کے طلبہ کو ہم نے گھر سے کوئی تشریح وغیرہ لکھ کر لانے کو کہا۔ اب ہم کلاس میں کھڑے باری باری ان کا کام چیک کر رہے ہیں۔ ایک طالبہ کا کام چیک کرتے کرتے غالباً ایسا ہی کوئی ''عقیدہ بیان'' نظر سے گزرا تو یہ قصے زبان پر جاری ہو گئے بیان مکمل کرنے کے بعد ہم نے قدرے خفگی سے اور کسی قدر بلند آواز میں کہا: ہم آپ لوگوں پر کتنی محنت کرتے ہیں (آواز میں غصہ اور رعب شامل کرتے ہوئے) لیکن آپ

www.urdudigest.pk

لوگ رسپانس ہی نہیں دیتے (انتہائی پُر جلال انداز میں) کیوں نہیں کیا آپ نے کام؟ جواب آیا میڈم یہ آپ میرا ہی کام چیک کر رہی ہیں۔ سوچا جا سکتا ہے کہ ہم کس برق رفتاری سے ٹھنڈے ہوئے ہوں گے۔ ابھی کی سنیے! یہ تحریر لکھتے لکھتے فرائض منصبی کا خیال اس شدت سے غالب آیا کہ لان میں بیٹھی ایک طالبہ سے فرمایا ''سیکنڈ ایئر! جاؤ بھئی سارے جیالوں کو بلا لاؤ'' کلاس کا وقت جو ہو گیا تھا۔ طالبہ نے تھوڑی دیر بعد آ کر کہا میڈم گیارہ بجے تو ہمارا ماہانہ ٹیسٹ ہے۔ اُف خدایا! یہ خیال ہمیں کیوں نہ آیا حالانکہ ٹیسٹ پر گیارہ بجے ہماری ہی ڈیوٹی تھی۔

صرف کالج ہی کا کیا مذکور۔ ہم تو گھر میں بھی پروفیسر بنے ہوئے ہیں۔ ایک بار ہم نئی چپل پہن کر بائیک پر سیٹیلائیٹ ٹاؤن چوک سے گزر رہے تھے۔ خیالوں پہ شاید فرسٹ ایئر سیکنڈ ایئر چھائی ہوئی تھی۔ خبر ہی نہ ہوئی۔ اب ہم ہیں کہ ''مجازی'' خدا کی پوجا پاٹھ میں مصروف ہیں کہ ہماری چپل لائی جائے اور چپل ہے کہ بیسیوں گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کی روشنی میں لش پش کر رہی ہے۔ خیر صاحب ''مجازی خدا'' نے ڈھیروں مزاج دکھانے کے بعد یہ ناگوار فریضہ سرانجام دیا۔ کچھ دن بعد کا قصہ سنیے! ہم صبح کے وقت روتے بسورتے بچوں کو بہلاتے، جھڑکتے جلدی کالج روانہ ہوئے۔ راستے میں اپنے پیروں پہ نظر پڑی تو پتا چلا کہ مابدولت تو آج چپلوں میں ہی کالج تشریف لے جا رہے ہیں۔ بس پھر وہی ''مجازی خدا'' کی منتیں شمتیں..... نتیجتاً کالج سے لیٹ..... نہ جانے اس ترقی یافتہ دور میں اور آزادیٔ نسواں کے نعرے لگانے والے ملک پاکستان میں برقع پوش خواتین کب موٹر سائیکل چلانا شروع کریں گی۔

ایک صبح کا واقعہ ہے ہم جلدی جلدی ناشتہ بنا رہے تھے اور اس سلائس کو ڈھونڈ رہے تھے جو ہم نے ابھی سینکا تھا۔ تلاش بسیار کے باوجود بھی ہم اس مفرور سلائس کو کھوجنے میں ناکام رہے۔ لیکن اچانک جو نظر چولھے کی طرف گئی تو پتا چلا کہ گرم توے پر اس مظلوم کی چتا کب کی جل کر خاک ہو چکی تھی۔

جمعہ کا دن تھا۔ ہم گھر پہنچے تو دیکھا ہماری بھابھی صاحبہ بچوں کو پکڑ پکڑ کر غسل خانے میں دھکیل رہی ہیں اور ساتھ ہی چاول ابالنے کی بھی شدت سے خواہش مند ہیں۔ ہم نے کمال ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات مہیا کرتے ہوئے کہا: ''لائیے ہم چاول ابالے دیتے ہیں۔'' سو ہم سُوئے کچن روانہ ہوئے۔ کوکنگ رینج پر ایک جانب دودھ گرم ہونے کے لیے رکھا اور دوسری جانب چاول ابالنے کے لیے پانی گرم ہونے کے لیے رکھا اور جلدی جلدی سارے چاول دھو کر بجائے پانی کے دودھ میں ڈال دیئے۔ پس ثابت ہوا کہ چچا چھکن تصویر ٹانک سکتے ہیں تو ہم بھی تدریسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ چاول ابال سکتے ہیں۔

بس بس آپ ہماری زیادہ تعریف نہ کریں۔ یہ سب کچھ تنہا ہمارا مذکور نہیں۔ ہماری کئی اور ساتھی بھی پروفیسر واقع ہوئی ہیں۔ ایک ساتھی بتانے لگیں کہ وہ گھر میں چائے بنا رہی تھیں جب کہ دوسری جانب سالن پکانے کا مشغلہ بھی جاری تھا۔ افراتفری میں سارا سبز دھنیا کاٹ کر چائے میں ڈال دیا۔ ایک اور ساتھی نے اپنا قصۂ جاں فزا سنایا: کہنے لگیں کہ وہ سبز رنگ کی وین پر نونہالانِ وطن کی سرسبزی و شادابی کے لیے روانہ ہوا کرتی تھیں۔ جب کہ ان کی چھوٹی بہن سفید وین پر..... ایک روز صبح کے وقت باہر ہارن سنائی دیا اور وہ اپنے تدریسی مقاصد کی فکر میں غلطاں ''سفید وین'' پر بیٹھ کر روانہ ہو گئیں۔ نہ اہل وین پر غور کیا نہ وین کی پھیکی رنگت پر۔ جب وین ڈگری کالج کی بھول بھلیوں میں داخل ہوئی تو ایک دم چونک کر اجنبی ڈرائیور کی شکل دیکھی اور چونک کر پوچھا، ہائیں! آپ کون ہیں؟ جب کہ دوسری جانب ڈرائیور بھی اسی سوال کا جواب جاننے پر مصر تھا۔

اس تحریر دلپذیر کا نتیجہ یہ ہے کہ قارئین محترم ہمارے لیے بھی دعا کیا کریں کہ ہم دل و جان سے آپ کے بچوں کو کتابوں کے تعویز گھول کر پلاتے پلاتے خود سے ہی بے گانہ ہو گئے ہیں۔

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
کہتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

دینی وعصری تعلیم کی شمع

اسے مزید روشن کرنے میں ہمارا ساتھ دیں

محترمی ومکرمی جناب!
السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

■ **کیا آپ کے پاس ایک قرآن مجید ہے؟**

تمام مسلمان بہن بھائیوں اور خصوصاً آپ سے التجا ہے کہ آپ کے پاس اگر ایک سے زیادہ مترجم قرآن مجید قاعدے، سیپارے، بخاری شریف یا حدیث کی کوئی کتاب یا دیگر اسلامی کتابیں موجود ہوں تو ضائع نہ کریں بلکہ ادارہ آمنہ جنت کی لائبریری کو عطیہ کریں۔ جب تک طالبات ان کو پڑھتی رہیں گی، ثواب آپ کو ملتا رہے گا اور یہ صدقہ جاریہ بھی ہے۔

■ **اپنے والدین اور مرحومین کے بلند درجات کے لیے؟**

ادارہ کو تفاسیر قرآن کریم، کتب حدیث اور دیگر اسلامی کتابیں خود تشریف لا کر پہنچا دیں یا ان کی قیمت بذریعہ منی آرڈر بنام ادارہ ارسال فرما دیں۔ ہم تفسیر قرآن کریم بازار سے لے کر رسید آپ کو بھجوا دیں گے ان شاء اللہ

■ **دعوت**

آپ کو دعوت دی جاتی ہے کہ آپ ماسوائے اتوار کے کسی بھی دن کسی بھی وقت جس میں آپ کو آسانی ہو ادارے کا وزٹ فرمائیں۔ ہمارے کام تعلیم القرآن وعصری تعلیم کو چیک کریں۔ اگر دل گواہی دے کہ کام احسن طریقے سے ہو رہا ہے تو پھر تفاسیر قرآن کریم وکتب حدیث عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

■ **نوٹ:**

منی آرڈر یا کتابیں بنام ادارہ ارسال فرمائیں۔ دستی دیتے وقت ادارے کی رسید وصول کریں۔ شخصی نام پر ہرگز ارسال نہ فرمائیں شکریہ۔ نیز ادارے کو دیے جانے والے عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔

رضیہ پروین
(ایم۔اے عربی، ایم۔اے اردو۔ وفاق المدارس)

آمنہ جنت فاؤنڈیشن گرلز ماڈل سکول رجسٹرڈ
چونیاں سٹی ضلع قصور (۵۵۲۲۰)
Ph: 0300-4735932 / 0333-4935205

ملاقاتیں ورپورٹیں: غلام سجاد، احمد شاہین

باپ بھی تھے، آئیڈیل اور رہبر بھی

انہیں میں نے کو سچا عاشقِ رسول ﷺ پایا

ڈاکٹر سمیعہ راحیل قاضی

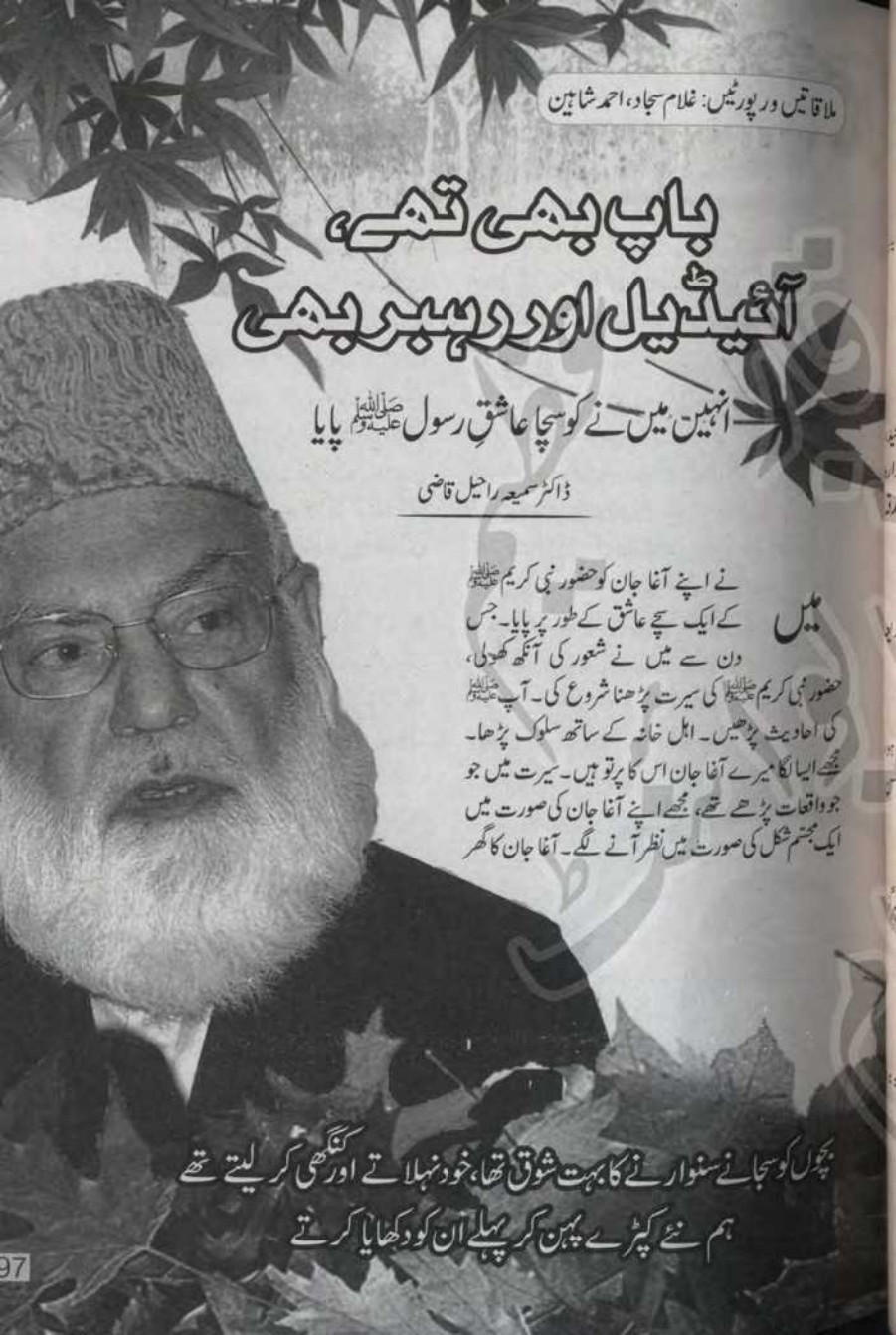

میں نے اپنے آغا جان کو حضور نبی کریم ﷺ کے ایک سچے عاشق کے طور پر پایا۔ جس دن سے میں نے شعور کی آنکھ کھولی، حضور نبی کریم ﷺ کی سیرت پڑھنا شروع کی۔ آپ ﷺ کی احادیث پڑھیں۔ اہل خانہ کے ساتھ سلوک پڑھا۔ مجھے ایسا لگا میرے آغا جان اس کا پرتو ہیں۔ سیرت میں جو جو واقعات پڑھے تھے، مجھے اپنے آغا جان کی صورت میں ایک مجسم شکل کی صورت میں نظر آنے لگے۔ آغا جان کا گھر

بچوں کو سجانے سنوارنے کا بہت شوق تھا، خود نہلاتے اور کنگھی کر لیتے تھے
ہم نئے کپڑے پہن کر پہلے ان کو دکھایا کرتے

میں سب کے ساتھ محبت اور شفقت کا رشتہ تھا۔ ان کا میری امی کے ساتھ احترام کا رشتہ تھا۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ میرے آغا جان اور امی نے نصف صدی کا جو عرصہ ایک دوسرے کے ساتھ گزارا، وہ ایک آئیڈیل جوڑے کی صورت میں گزارا۔ کامیاب ازدواجی زندگی کے گُر ہم نے اپنے ماں باپ سے ہی سیکھے۔ الحمدللہ! انھوں نے غیر محسوس طریقے سے ہماری ایسی تربیت کی اور ایسا عملی کردار پیش کیا کہ ہمیں اپنے گھروں میں جا کر کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ میں اور میری بہن نے اسی لیے اپنے گھروں میں بہت سکون کی زندگی گزاری۔ کیونکہ ہمارے سامنے ہمارے ماں باپ کی زندگیاں عملی مثال کے طور پر موجود تھیں۔ ہم نے اپنے ماں باپ کو کبھی لڑائی جھگڑا کرتے نہیں دیکھا۔ کبھی ایک دوسرے سے اونچی آواز میں بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

ہمارے گھر میں ہر وقت کوشش رہتی تھی کہ ''عزت و احترام'' کے الفاظ کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ ہمارے گھر میں آج بھی ان الفاظ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ لوگوں کا بہت زیادہ احترام کیا جاتا ہے۔ بہت زیادہ عزت افزائی کی جاتی ہے۔ چاہے وہ بیوی ہو یا شوہر، چاہے بچے ہوں یا ملازم ہوں اور چاہے قریبی رشتہ دار ہوں۔ میں سمجھتی ہوں اگر گھروں میں احترام اور محبت کا رویہ پنپنے لگے اور پروان چڑھنے لگے تو تعلقات اور معاملات خود بخود بہتر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ الحمدللہ! میں نے اپنے والدین کو اسی رشتے میں جڑے ہوئے دیکھا۔ انھیں ایک دوسرے کی محبت میں سب کچھ قربان کرتے اور ایک دوسرے پر جان نچھاور کرتے دیکھا۔ میں جب حضرت خدیجہؓ کی زندگی دیکھتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ میری امی نے حضرت خدیجہؓ کی زندگی کی مکمل پیروکاری کی۔ جس طرح حضرت خدیجہؓ نے اپنے تن من دھن سے خانہ نبوت کی آبیاری کی۔ میری امی نے حضور نبی کریم ﷺ کی اُمتی اور حضرت خدیجہؓ کی پیروکار کی حیثیت سے ان کے نقوشِ قدم پر چلنے کی بھرپور کوشش کی۔ اسی طرح آغا جان نے ایک عاشق امتی کے طور نبی کریم ﷺ کا اہل خانہ کے ساتھ سلوک کا عملی نمونہ پیش کیا۔ آغا جان گھر سے باہر قاضی حسین احمد تھے، مگر گھر میں وہ اپنی بیوی کے لیے ایک بڑے ہی شفیق شوہر اور اپنی اولاد کے لیے بہت ہی زیادہ محبت کرنے والے باپ تھے۔ وہ گھر میں اتنے عام انسان تھے کہ جس کا کوئی تصور نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی انھیں گھر میں دیکھ لیتا تو شاید یقین نہ آتا کہ یہ وہی قاضی حسین احمد ہیں جو جماعت اسلامی پاکستان کے امیر ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو خود نہلا لیتے تھے۔ اپنے بچوں کی کنگھی کرتے تھے۔ میں نے کتنی مرتبہ دیکھا کہ امی کی کمر میں درد ہے اور آغا جان بچوں کو لے کر نہلا دیتے تھے۔ مجھے تو اپنی کنگھی کرنا بہت زیادہ یاد ہے۔ آغا جان کو بہت زیادہ شوق تھا اپنے بچوں کو سجانے سنوارنے کا۔ جب ہم چھوٹے تھے تو اس وقت آغا جان ہمیں پشاور کے ایک بہت مشہور ہیئر ڈریسر کے پاس ہیئر کٹ کرانے لے جایا کرتے تھے۔ اسی طرح جب ہم نئے

کپڑے پہنتے تھے تو سب سے پہلے آغا جان کے پاس ہی جایا کرتے تھے اور انھیں دکھاتے تھے۔ وہ خوب حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ہمارے لیے اچھی شاپنگ کرتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۷۹ء میں میرے آغا جان مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب کے ساتھ دعوتی و تبلیغی دورے پر امریکا چلے گئے۔ وہاں جا کر آغا جان جب خریداری کرتے تو عموماً بیٹیوں کے لیے ہی کرتے۔ مولانا صدرالدین اصلاحی کے آٹھ بیٹے تھے کوئی بیٹی نہیں تھی۔ آغا جان کہتے تھے کہ جب میں وہاں اپنی بیٹیوں کے لیے کوئی چیز لیتا تھا تو مولانا صدرالدین کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے اور کہتے تھے: ''قاضی صاحب! تم سے حضور نبی کریم ﷺ بہت خوش ہوں گے۔ اسی لیے کہ میں نے دیکھا کہ تمھیں اپنی بیٹیوں سے بہت محبت ہے۔ انہی کے لیے خریداری کر رہے ہو۔ تمھیں ہر وقت اپنی بیٹیاں ہی یاد رہتی ہیں۔'' وہ جب یہ کہا کرتے تھے تو آغا جان کی آنکھیں نم ہو جایا کرتی تھیں اور کہتے تھے کہ اس کے بعد مجھے تم لوگوں کے لیے شاپنگ کرتے ہوئے اور زیادہ خوشی محسوس ہوتی تھی اور میں مزید خریداری کر لیتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب آغا جان امریکا کے تبلیغی دورے سے واپس آئے تو ہمارے لیے وہاں سے بے تحاشا چیزیں لے کر آئے تھے۔ میرے لیے جیولری لے کر آئے تھے۔ میری بہن کے لیے ایک کوٹ لے کر آئے تھے۔ ان میں بہت سی اشیا امور خانہ داری سے متعلق تھیں۔ کڑھائی سلائی کی چیزیں، قینچیاں، بسکٹ بنانے کی مشین، سلاد کاٹنے کی مشین اور نجانے کیا کیا چیزیں تھیں۔ آغا جان کی خواہش ہوتی تھی کہ میری بیٹیاں امور خانہ داری میں ماہر ہوں، اس لیے انھوں نے کم عمری میں ہی یہ چیزیں لا کر ہمیں اس طرف راغب کیا۔

غرض یہ کہ آغا جان بہت محبت کرنے والے تھے۔ وہ بطور شوہر ایک آئیڈیل شوہر تھے۔ وہ ہماری امی کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے اور انھوں نے گھر میں ہماری امی کو ملکہ کی حیثیت دی تھی۔ باہر آغا جان قاضی حسین احمد تھے، جو دنیا جہان کے معاملات اور فیصلے کیا کرتے تھے۔ لیکن گھر میں امی ہی تمام معاملات کو دیکھتی تھیں۔ آغا جان ان کے ہر فیصلے کو احترام کے ساتھ قبول کرتے تھے۔ چاہے وہ ہمارے رشتے ہوں، چاہے وہ گھر کے معاملات ہوں۔ آغا جان نے گھر کے تمام مالی معاملات بھی میری امی کے سپرد کر رکھے تھے۔ گھر کا سارا خرچ امی ہی کے ذمے ہوتا تھا۔ آغا جان کہتے تھے کہ تمھاری امی سگھڑ اور سلیقہ مند ہیں اور یہ اچھے طریقے سے گھر کا خرچہ چلا لیتی ہیں جب کہ مجھ سے پیسے بہت خرچ ہو جاتے ہیں۔ امی بھی بہت خوش ہوتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں، تمھارے ابو نے کبھی پوری زندگی یہ نہیں پوچھا کہ جو پیسے تمھیں دیئے تھے، وہ کہاں خرچ کر دیئے؟ یہ الگ بات ہے کہ امی کو خود بھی بہت احساس رہتا تھا اور کبھی مجھے بٹھا لیتی تھیں، کبھی بھائی سے حساب کراتی تھیں اور کہتی تھیں کہ یہ سارا حساب کتاب لکھو۔ تاکہ تم لوگوں کو اور تمھارے ابو کو پتا ہو کہ کتنے پیسے آئے تھے اور کتنے خرچ ہو گئے؟ آغا جان اس طرح حساب کتاب کرتے دیکھتے تو مسکرا کر رہ جاتے تھے۔ وہ کہتے تھے میں نے کب کہا ہے کہ مجھے حساب کتاب دو۔ لیکن امی نے بعد میں ہمیں بتایا کہ میں یہ حساب کتاب اس لیے رکھا کرتی تھی اور تم لوگوں سے کراتی تھی تاکہ میری بیٹیاں اپنے شوہروں کے ساتھ ایسے ہی معاملات رکھیں۔ میری بیٹیوں کا کوئی معاملہ اپنے شوہروں سے چھپا ہوا نہ ہو۔

غرض میرے آغا جان اور میری امی قرآن مجید کی اس آیت کے مصداق تھے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں۔ میری امی اور آغا جان بھی واقعی ایک دوسرے کا لباس تھے۔ وہ ایک دوسرے کی زینت کو بڑھانے والے تھے۔ ساری زندگی ایک دوسرے کی اچھائیوں پر ہی نظر رکھی۔ ایک دوسرے عیب کے چھپانے کی کوشش کرتے رہے۔ میں کچھ دن پہلے تاریخ جماعت اسلامی کے حوالے سے امی کا انٹرویو کر رہی تھی۔ آغا جان آ کر ساتھ بیٹھ گئے اور کہنے لگے، تمھاری امی اپنے متعلق کچھ نہیں بتائے گی، میں تمھیں بتاتا ہوں تمھاری امی کیسی تھی؟ اور ان کا ایک جملہ ہوتا تھا اور ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ''بیویاں تو ایسی ہوتی

ہیں کہ شوہر آدھا گھنٹہ بھی تاخیر سے پہنچے تو آسمان سر پر اٹھا لیتی ہیں۔ لیکن تمھاری امی کو میں نے مہینوں مہینوں اکیلے چھوڑا ہے۔'' اور یہ بات درست ہے، میرا ایک بیمار بھائی بھی تھا، ہم چاروں کی عمریں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ آغا جان بہت زیادہ دنوں کے لیے چلے جایا کرتے تھے۔ کبھی وہ الخدمت کے ٹرکوں کے ساتھ جاتے تھے۔ کبھی دعوت و جہاد کے لیے تاجر کے بھیس میں افغانستان چلے جایا کرتے تھے۔ لیکن الحمدللہ! ہماری امی نے آغا جان کے بارے میں کبھی منفی تاثر پیدا نہیں ہونے دیا۔ وہ آغا جان کے بارے میں بہت ہی خوبصورت باتیں بناتی تھیں۔ بڑی عظمت اور بڑی جمال و جلال والی کیفیت راسخ کرتی تھیں۔ جب آغا جان نہیں ہوتے تھے تو امی یہی کہتی تھیں کہ تمھارے ابو بہت بڑے مقصد کے لیے کہیں گئے ہیں۔ وہ ان کی غیر موجودگی میں اور زیادہ تعریفیں کرتی تھیں۔ وہ ہمارے ذہنوں میں ہمیشہ آغا جان کی اہمیت اور ان کے کاموں کی اہمیت راسخ کرتی تھیں۔ آغا جان کہتے تھے کہ تمھاری امی نے ساری عمر کبھی شکوہ شکایت نہیں کیا۔ وہ کہتے تھے کہ جب شوہر کہیں باہر چلے جاتے ہیں تو مائیں اپنے بچوں کے ذہنوں میں منفی باتیں بٹھاتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ تمھارا باپ پتا نہیں کہاں رہتا ہے؟ کس کے پاس جاتا ہے؟ اس لحاظ سے سے دیکھا جائے تو الحمدللہ! ہمارے خوشحال گھرانے میں جہاں میری امی کا کردار تھا، وہاں میرے آغا جان کا کمال یہ تھا کہ وہ ہمیں تھوڑا مگر بھرپور وقت دیتے تھے۔ جب ہماری گرمیوں کی چھٹیاں ہوتی تھیں، ہمیں اپنے ساتھ شمالی علاقہ جات لے جاتے تھے۔ وہاں دعوتی کام بھی ہوتا اور سیر و سیاحت بھی ہو جاتی۔ اسی طرح جب آغا جان گھر آتے تھے تو پوری طرح ہمیں اپنے حصار میں لے لیتے تھے۔ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے معاملے پر ہمارے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔ ان کی انھی شفقتوں نے ایسا اسیر بنا لیا تھا کہ آغا جان ہمارے لیے کئی حیثیتیں رکھتے تھے۔ وہ ایک باپ کی طرح بھی تھے، ایک آئیڈیل کی طرح بھی اور ایک راہبر کی مانند بھی اور تمام حیثیتوں میں ان کی عظمت ہمارے دلوں میں بیٹھ گئی تھی۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں اور امید بھی کرتی ہوں کہ میرے آغا جان نبی کریم ﷺ کے سچے عاشق اور امتی کی حیثیت سے جنت میں ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔

آغا جان کی دو نصیحتیں

آغا جان آخری دنوں میں بار بار یہی کہتے تھے: ''میں نہیں ہوں گا تو میرے بچوں کے ساتھ لوگوں کا تعلق مزید بڑھے گا۔ میرے بعد لوگ میری محبت بھی ان کے اندر ڈھونڈا کریں گے۔'' آغا جان ہمیں بار بار یہ دو نصیحتیں کرتے تھے: ''دو باتوں کا خاص خیال رکھو۔ زندگی میں کبھی شرمندگی نہیں اٹھانی پڑے گی۔

۱۔ میں نے زندگی میں کبھی کسی عورت سے اکیلے میں ملاقات نہیں کی۔ چاہے وہ میری بیٹی کی عمر کے برابر ہو یا میری ماں کی عمر کی ہو۔ اگر کہیں ملنا ضروری ہوتا اور کوئی نہ ہوتا تو میں اپنے معاون، ملازم یا کسی ڈرائیور کو ساتھ بٹھا لیتا تھا۔ میں نے اپنے دفتر میں صحافی خواتین کو انٹرویوز دیئے، مگر اس وقت میں ضرور اپنے ساتھ کسی کو رکھتا تھا۔ اس سے میری عزت میں اضافہ ہوا اور تم لوگوں کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ اس چیز کا خاص خیال رکھنا۔

۲۔ تم لوگوں کو کچھ لوگ اعتماد میں لینے کی کوشش کریں گے اور حساس معلومات میں بھی ملوث کریں گے۔ اس وقت فوراً ہی اپنے بالائی نظم کو مطلع کرنا ہے۔ جو بھی معلومات ملیں، انھیں کبھی اپنے تک محدود نہ رکھنا ورنہ اس کی ذمہ داری اکیلے ہی اٹھانی پڑ جائے گی۔''

ذات پیچھے، مقاصد آگے

آغا جان کہتے تھے کہ: ''اپنی ذات کو پیچھے رکھا کرو اور اپنے مقاصد کو آگے رکھا کرو۔ اپنی ذات کو پیچھے رکھو گے تو اللہ تعالیٰ بڑا قدر دان رب ہے۔ وہ تمھاری ذات کو آگے بڑھا دے گا۔ لیکن اگر اپنی ذات کو آگے اور مقاصد کو اولیت نہ دی تو پھر نہ ذات پنپ سکے گی اور نہ مقاصد میں کامیابی حاصل ہو سکے گی۔''

اُمید، وسیع اُفق اور جہدِ مسلسل
یہ تھے قاضی حسین احمد

عبدالغفار عزیز

قاضی صاحب سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے وارث تھے۔ سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ پوری دنیا میں اسلامی تحریکوں کے لیے راہنما کی حیثیت رکھتے تھے۔ مولانا کا لٹریچر دنیا کی ہر اہم زبان میں اس وقت موجود ہے۔ قاضی صاحب نے اپنے دورِ امارت میں جماعتِ اسلامی کو ملک کے اندر اور باہر بھی فعال کیا۔ پوری دنیا میں جہاں بھی اسلامی تحریکیں ہیں ان کے ساتھ ہماری جماعت کے روابط اور تعلقات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے امت کی پہچان تمام تر تقسیم سے بالاتر رکھی ہے کہ جس میں قوم، رنگ، نسل، سرحدیں، زبان اس کی کوئی تخصیص یا فرق نہیں ہے۔ اسی چیز کو ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے بعد قاضی صاحب لے کر چلے اور لوگوں تک منتقل کیا۔ امت کے ہر مسئلے میں قاضی صاحب خود وہاں پہنچے۔

قاضی صاحب کا دُکھ ملک کے اندر اور باہر ہر شخص نے محسوس کیا۔ خواہ وہ اپنا تھا یا پرایا۔ اختلافات رکھنے والوں نے بھی ان کی شخصیت اور مقام کا احترام کیا اور ان کی کوششوں کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ جماعتِ اسلامی اور قاضی صاحب کو شاید دنیا کا کوئی خطہ ایسا ہو جہاں کے لوگ نہ جانتے ہوں۔ قاضی صاحب اپنے بچوں کو اور ہمیں اکثر بتایا کرتے تھے کہ جماعت کے ساتھ وابستگی کتنی ضروری ہے۔ قاضی صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ جماعت اگر آپ کی ذمہ داری سڑک پر جھاڑو لگانے کی بھی لگا دے تو اسے بھی خوش دلی سے قبول کر لیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قاضی صاحب کے دل میں جماعت کے حوالے سے کتنی محبت تھی۔ قاضی صاحب اپنے زمانہ طالب علمی سے ہی جماعت سے وابستہ تھے اور ان دنوں کا ذکر اکثر ہم سے کیا کرتے تھے۔ ان کا گھر جمعیت علمائے ہند کا مرکز ہوتا تھا۔ ان کے والد صاحب جمعیت علمائے ہند کے

صدر تھے۔ قاضی صاحب اکثر بتایا کرتے کہ جب بچپن میں گھر میں ہم بہن بھائیوں کے درمیان کبھی بحث ہوتی تو والد صاحب ہمیشہ میری طرف داری کرتے۔ کیونکہ میرا تو نام ہی ان کے قائد کے نام پر تھا۔

قاضی صاحب نے جماعتِ اسلامی کے لیے پوری زندگی وقف کر دی اور پھر اللہ تعالیٰ نے بھی انھیں مقام و مرتبہ وعزت سے نوازا۔ قاضی صاحب کی جتنی بھی خدمات تھیں ان کا اول و آخر ہدف اللہ تعالیٰ کی ذات تھا۔ قاضی صاحب اپنی زندگی کے آخری لمحے تک رضائے الٰہی کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔ جیسے نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ جو بندہ اپنے اللہ سے محبت کرتا ہے اللہ پھر اپنے بندوں کے دل میں اس کی محبت ڈال دیتا ہے۔

قاضی صاحب سے میرا تعارف اتفاقاً ہوا تھا۔ ہم کچھ دوست جماعت کے ساتھ افغانستان گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے واپس آ رہے تھے تو ایک دوست نے کہا کہ میرے دوست کی شادی کا ولیمہ ہے تو سب وہاں چلتے ہیں اور ہم لوگ اُس کے ساتھ دوست کی شادی میں چلے گئے۔ وہاں ایک کمرے میں کچھ خاص مہمان آئے ہوئے تھے، بعد میں پتا چلا کہ قاضی صاحب اور ان کے ساتھ اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے کچھ مصری اساتذہ بھی موجود تھے۔ قاضی صاحب کو اُن کے ساتھ بات کرتے ہوئے تھوڑا مسئلہ ہو رہا تھا تو میں نے وہاں ترجمہ کر کے ان کی باتیں قاضی صاحب کو اور قاضی صاحب کی باتیں ان کو بتائیں۔ یہ میری قاضی صاحب سے پہلی قریبی ملاقات تھی۔

ایک مرتبہ قاضی صاحب اور میں حکمت یار صاحب کے پاس افغانستان گئے ہوئے تھے۔ ہر طرف گولا باری ہو رہی تھی اور ہم ایک غار میں محصور تھے۔ کھانے پینے کے لیے بھی کچھ نہ تھا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ ہمیں جلد ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔ وہاں کھانے کے لیے صرف کھجور، پانی اور خشک گوشت تھا۔ لیکن جو جذبہ اور سکون اس کھانے سے ملا اس کی کوئی انتہا نہ تھی۔

نوے کی دہائی میں قاضی صاحب جب بین الاقوامی کشمیری وفد لے کر آٹھ ممالک کے دورے پر گئے تو ترکی، سوڈان، کویت کے بعد تین روز کے لیے قطر بھی آئے تو وہاں بھی میں قاضی صاحب کے ساتھ رہا اور ترجمان کا کام کیا۔ قاضی صاحب جب دورے سے واپس آنے لگے تو ایئرپورٹ پر مجھے بلا کر سائیڈ پر لے گئے اور کہا کہ آپ کی تعلیم کے چھ ماہ رہ گئے ہیں۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی آپ نے پاکستان آ جانا ہے اور جماعت کے لیے کام کرنا ہے تو اس وقت قاضی صاحب کی محبت دل میں اترتی چلی گئی۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی میں پاکستان واپس آ گیا اور چار دن اپنے والدین کے ساتھ گھر میں پتوکی میں گزارے اور پھر لاہور قاضی صاحب کے پاس آ گیا اور اپنے آپ کو ان کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد آنے والے ہر دن تمام معاملات میں قاضی صاحب نے ہمیں انگلی پکڑ کے چلنا سکھایا۔

قاضی صاحب ہر صورت میں ہر حالت میں مطمئن اور پُر اُمید رہتے تھے۔ وہ نہ صرف خود پُر اُمید رہتے بلکہ دوسروں کی بھی ڈھارس بندھاتے رہتے اور اس چیز کو ایمان کا حصہ سمجھتے تھے۔ وہ اُمید کو قرآن پاک کی روشنی میں بیان کیا کرتے کہ مومن کبھی مایوس نہیں ہوتا۔

وہ نا اُمیدی اور خوف کو شرک کی علامت سمجھتے

میں اور قاضی صاحب ایک ہی غار میں محصور تھے اور گولہ باری کی تیزی سے لگ رہا تھا کہ ہمیں جلدی گرفتار کر لیا جائے گا

علامہ اقبال کے اشعار کا سہارا لے کر فرماتے کہ نا اُمیدی اور خوف شرک کی ایک علامت ہے۔ قاضی صاحب اکثر کہا کرتے کہ تم ہمیشہ اپنے سامنے ایک بڑا ہدف رکھو۔ حالات جو بھی ہوں بظاہر جو بھی وسائل اور صلاحیتیں آپ کے پاس ہوں۔ لیکن اگر آپ ایک بڑا ہدف رکھو گے تو پھر اللہ تعالیٰ اس بڑے ہدف کے مطابق آپ کو عطا کرے گا۔ اگر تمھارا ہدف دس کلو وزن اٹھانے کا ہو تو تمھارے مسلز دس کلو والے ہی بنیں گے۔ اگر آپ پالیس کلو وزن اٹھانے کا ہدف رکھو گے تو مسلز اس طرح مضبوط ہو جائیں گے۔

میں نہیں سمجھتا کہ عرب ممالک میں یا دنیا کے دیگر اسلامی ممالک میں جو تبدیلی آئی ہے اس میں جماعت اسلامی یا قاضی صاحب کا کردار نہیں ہے بلکہ اس میں ہمارا حصہ ضرور ہے۔ اسی طرح اگر پاکستان میں کوئی تبدیلی آتی ہے تو اس میں بھی جماعت اسلامی اور دوسری اسلامی جماعتوں کا کردار ہے۔ تمام اسلامی جماعتیں ایک ہیں اور ان کا مقصد بھی ایک ہے۔ بظاہر تنظیمی ڈھانچے مختلف ہیں اور حالات بھی ایک جیسے نہیں ہیں۔ حقیقت میں ساری اسلامی تحریکیں ایک ہی ہیں۔ قاضی صاحب سے ایک شخص نے پوچھا کہ اخوان المسلمون کے ساتھ آپ کے تعلقات کیسے ہیں؟ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ **ھم نحن ونحن ھم** ۔ ہم اخوان المسلمون ہیں اور وہ جماعت اسلامی ہیں۔

قاضی صاحب کی وفات پر تقریباً تمام ممالک کے سربراہان نے افسوس کا اظہار کیا۔ ترکی کے وزیراعظم طیب اردگان نے پاکستان میں موجود اپنے سفیر سے کہا کہ وہ خود منصورہ جائے اور افسوس کا اظہار کرے اور ہماری طرف سے تعزیتی خط بھی دے۔ جب نجب الدین اربکان کا انتقال ہوا تو قاضی صاحب خود وہاں پہنچے جب کہ ان کی طبیعت بھی ناساز تھی۔ وہاں تعزیتی نشست میں عبداللہ گل اور طیب اردگان نے قاضی صاحب سے کہا کہ گھر میں جیسے بعض اوقات اختلاف رائے ہو جاتا ہے اس طرح ان کے ساتھ بھی اختلاف رائے تو تھا مگر تھے تو وہ ہمارے بڑے۔ ہمارے بزرگ تھے۔ اب وہ اللہ کے پاس چلے گئے ہیں ان کے بعد اب ہم آپ کو اپنا بڑا اور بزرگ سمجھتے ہیں۔ اس طرح سے قاضی صاحب کا پیار کا اور اخلاص کا نہ صرف شہنشاہوں کے ساتھ تعلق تھا بلکہ غربا کے ساتھ بھی وہ اسی طرح پیار سے اور عزت و تکریم کے ساتھ پیش آتے۔

قاضی صاحب کی زندگی کے تین گوشے اہم تھے۔ اُمید، وسیع اُفق اور جہد مسلسل۔ وہ ہر وقت کام اور اپنے ہدف کو مکمل کرنے کے لیے کوشاں رہتے۔ ایک مرتبہ ہم امریکا میں اسلامک سرکل آف نارتھ امریکا کے کنونشن میں گئے۔ یہاں سے برطانیہ تک ساڑھے چھ گھنٹے کی فلائٹ تھی۔ وہاں ایک ڈیڑھ گھنٹے کا قیام تھا اور اتنا ہی وقت اس سے آگے کے سفر کا تھا۔ قاضی صاحب یہاں لاہور سے امریکا تک قرآن پاک کے مطالعہ میں مصروف رہے۔ مسلسل ۱۴، ۱۵ر گھنٹے کا سفر ماسوائے نماز اور کھانے کے وقفے کے انھوں نے سارا وقت قرآن کریم کے مطالعہ کرنے میں گزار دیا۔ قاضی صاحب کے ساتھ میرا تعلق عربی زبان بولنے کی وجہ سے زیادہ تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ آپ جب عربی بولتے ہو تو میں لطف محسوس کرتا ہوں۔

قاضی صاحب کی ایک اور نمایاں صفت یہ تھی کہ ہر انسان کے ساتھ محبت کرتے خواہ وہ گناہگار ہے، جماعت کا کارکن ہے یا نہیں، غریب ہے یا امیر، وہ ہر شخص کا

قاضی صاحب کے ساتھ میرا تعلق عربی زبان بولنے کی وجہ سے زیادہ تھا وہ اکثر کہا کرتے کہ آپ جب عربی بولتے ہو تو میں لطف محسوس کرتا ہوں

احترام کرتے غریب اور کمزور لوگ زیادہ قاضی صاحب کے قریب ہوتے۔ قاضی صاحب اکثر کہا کرتے کہ غفار دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں قیامت کے روز ان مخلص اور غریب کارکنان کے سامنے شرمندہ نہ کرے۔ ان کے دل میں کارکنان کا بھی مقام تھا اور آخرت کا احساس بھی، قاضی صاحب کبھی کسی قسم کی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوئے تھے۔ قاضی صاحب چاہے کسی وزیر سے ملتے یا سڑک پر پتھر کوٹنے والے سے دونوں کے ساتھ ان کا رویہ ایک سا ہوتا تھا۔

نواز شریف کے دور میں او آئی سی (O.I.C) ہوئی تھی۔ اس میں کامل شریف نے سعودی کنگ کو ریپریزنٹ (Represent) کیا تھا۔ وہ او آئی سی سمٹ میں آئے تھے۔ کامل شریف نے قاضی صاحب سے عراق، کویت تنازعے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ یہاں پر ہم صدام حسین کے آگے کمزور ہیں، ہم بات نہیں کر پاتے۔ صدام حسین کا رویہ اور انداز بھی کچھ ایسا ہے کہ ہم بات نہیں کر سکتے۔ اس لیے آپ یہاں پر بات کریں، تو قاضی صاحب نے کہا صدام سے کہ آپ اپنی تقاریر میں آزادی فلسطین کی بات کرتے ہیں۔ آزادی فلسطین پر تو پوری امت آپ کے ساتھ ہے۔ لیکن عالمِ اسلام میں ہر مسلمان پوچھتا ہے کہ آزادی فلسطین کا راستہ کویت سے کیسے گزرتا ہے جو آپ نے اپنی فوجیں کویت میں داخل کر دی ہیں۔ قاضی صاحب نے کہا کہ اگر آپ واقعی آزادی فلسطین کے لیے مخلص ہیں تو اپنی فوجیں کویت سے نکالیں اور امت جس انتشار کا شکار ہوگئی ہے اسے متحد کریں اور پھر آپ فلسطین کے حوالے سے جو بھی پالیسی طے کریں گے تو امت آپ کے ساتھ ہوگی۔

سعودی عرب میں کنگ شاہ عبداللہ سے قاضی صاحب کی جب ملاقات ہوئی تو شاہ عبد اللہ نے کہا قاضی صاحب یہ مسلمان امت تمھاری گردن پر امانت ہے اور اس کی حفاظت کرنا آپ کی اور ہماری مشترکہ ذمہ داری ہے۔ ■

خراج عقیدت
قاضی حسین احمدؒ

عزمِ صمیم پیکر، مخلص، یقین، رہبر
اک مردِ صفی صفدر، قاضی حسین احمد
اپنائیت میں گندھے، لہجے کا بانکپن
اک شجر تھا تن آور، قاضی حسین احمد
وہ پیکر خاکی تھا، الفت کا محبت کا
اک مہرباں تھا ہم پر، قاضی حسین احمد
حق گوئی و جرأت میں، سب سے نمایاں تھا
وہ مردِ جری اختر، قاضی حسین احمد
عقل و خرد سے آگے، جذبوں کی کہکشاں میں
سب مانتے قلندر، قاضی حسین احمد
صبر و رضا کا پیکر، صدق و صفا کا خوگر
اس عہد کا شناور، قاضی حسین احمد
جہانِ تازہ کی جستجو میں، جو پھر رہا تھا قریہ قریہ
وہ اک اُمید کا پیغمبر، قاضی حسین احمد
سنائی نہ دے گی اب کبھی "میرے عزیزو" کی بازگشت
دل جھومتے تھے سن کر، قاضی حسین احمد
امت کا درد لے کر، برسوں رہا وہ بے گل
سہتا رہا جو نشتر، قاضی حسین احمد
سایہ سا اٹھ گیا ہو، دل کا بیاں یہی ہے
اک سائباں تھا سر پر، قاضی حسین احمد
شاعری کے فن سے، واقف نہیں ہے ارشدؔ
دل آ گیا ہے بھر کر، قاضی حسین احمد

(ارشد احمد بیگ)

شفیق باپ بھی عظیم قائد بھی

وہ آئینے کی طرح شفاف تھے.....
جیسے گھر میں ویسے ہی باہر

آصف لقمان قاضی

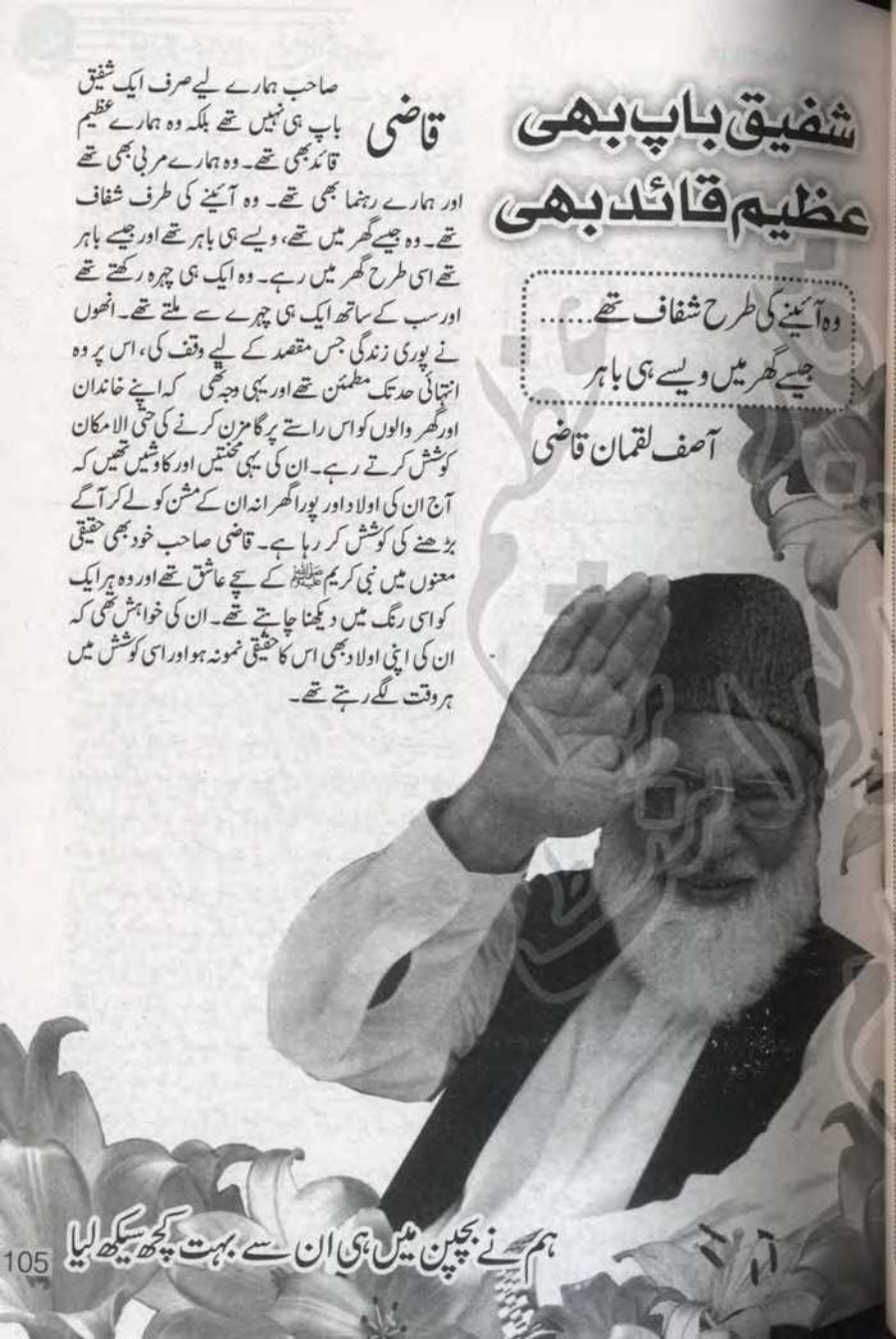

قاضی صاحب ہمارے لیے صرف ایک شفیق باپ ہی نہیں تھے بلکہ وہ ہمارے عظیم قائد بھی تھے۔ وہ ہمارے مربی بھی تھے اور ہمارے رہنما بھی تھے۔ وہ آئینے کی طرف شفاف تھے۔ وہ جیسے گھر میں تھے، ویسے ہی باہر تھے اور جیسے باہر تھے اسی طرح گھر میں رہے۔ وہ ایک ہی چہرہ رکھتے تھے اور سب کے ساتھ ایک ہی چہرے سے ملتے تھے۔ انھوں نے پوری زندگی جس مقصد کے لیے وقف کی، اس پر وہ انتہائی حد تک مطمئن تھے اور یہی وجہ تھی کہ اپنے خاندان اور گھر والوں کو اس راستے پر گامزن کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے رہے۔ ان کی یہی محنتیں اور کاوشیں تھیں کہ آج ان کی اولاد اور پورا گھرانہ ان کے مشن کو لے کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ قاضی صاحب خود بھی حقیقی معنوں میں نبی کریم ﷺ کے سچے عاشق تھے اور وہ ہر ایک کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کی اپنی اولاد بھی اس کا حقیقی نمونہ ہو اور اسی کوشش میں ہر وقت لگے رہتے تھے۔

ہم نے بچپن میں ہی ان سے بہت کچھ سیکھ لیا

www.urdudigest.pk

میں آج بھی سوچتا ہوں تو تشکر سے سر جھک جاتا ہے کہ قاضی صاحب نے بچپن سے ہماری تربیت ان خطوط پر کی، جن پر وہ نبی کریم ﷺ کے ایک سچے امتی کو دیکھنا چاہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم چھوٹے تھے تو قاضی صاحب ہم سب بہن بھائیوں کو بٹھاتے۔ فارسی اور اردو کے خوبصورت اشعار سناتے اور پھر ان اشعار کا ترجمہ اور اس کی تفسیر کرتے۔ اس کے بعد ہم سے باری باری پوچھتے اور ہم ان کے سامنے وہ اشعار اور ان کا ترجمہ دہراتے اور قاضی صاحب اسے بڑے غور سے سنتے۔ اگر کہیں ہم سے غلطی ہو چکی ہوتی تو اس کی اصلاح کرتے۔ جس طرح قاضی صاحب نے اپنے والد مکرم سے گھر پر ہی بہت سے علوم سیکھ لیے تھے، اسی طرح ہم نے بھی قاضی صاحب سے بچپن میں بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ اکثر لوگ سوال کرتے ہیں کہ قاضی صاحب کی بہت مصروف زندگی تھی، پھر انھوں نے کس طرح اپنے بچوں کو اتنا وقت دیا۔ ان کی خود تربیت کی اور انگلی پکڑ کر انھیں چلنا سکھایا۔ جب ہم اس حوالے سے سوچتے ہیں تو ہمیں بھی حیرت ہوتی ہے کہ تمام تر مصروفیات کے باوجود قاضی صاحب نے اپنے گھر اور بچوں کو وقت دیا۔ انھوں نے کبھی ہمیں یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ ہمارے والد کوئی بہت اہم شخصیت ہیں اور ہمارے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں۔ بلکہ ان کی کوشش یہ ہوتی کہ اپنے بچوں کو وقت دے سکیں اور پھر یہ بھی تھا کہ جب گھر آتے تو بالکل عام فرد کی طرح رہتے۔ جس رات کو ان کا انتقال ہوا، اس رات کو کچھ دیر پہلے تک وہ بچوں اور بڑوں کے ساتھ خوب گپ شپ کرتے رہے۔ کئی گھنٹے تک نشست جاری رہی۔ بچے ان سے اپنے انداز میں سوالات کرتے اور قاضی صاحب انھیں ان کی سمجھ کے مطابق جواب دیتے رہے۔

ہمارے گھر کے بچے قاضی صاحب کی آمد پر اتنے خوش ہوتے کہ ان کی عید ہو جاتی۔ گھر میں خوشی کا ایسا سماں بندھ جاتا جیسے عید اور خوشی کے مواقع پر ہوتا ہے۔

قاضی صاحب بھی بچوں کے ساتھ ایسے گھل مل جاتے [illegible] گپ شپ کرتے کہ بعض اوقات ایسا لگتا ہی نہیں تھا کہ [illegible] اسلامی تحریک کے عظیم قائد ہیں۔ میں یہ بات اس لیے [illegible] بار کہہ رہا ہوں کہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پاتے۔ عام زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ بالکل ہی اپنے گھر کے ہو کے رہ جاتے ہیں اور باہر کے تمام معاملات سے بے خبر رہتے ہیں، چاہے کچھ بھی ہو جائے ہو اور اسی طرح کچھ لوگ اتنے سوشل ہو جاتے ہیں کہ ان کا گھر ہی ان سے رہ جاتا ہے لیکن اللہ کا شکر ہے قاضی صاحب نے ان دونوں کے درمیان توازن برقرار رکھا اور اسے آخری وقت تک خوب نبھایا۔

اللہ تعالیٰ نے قاضی صاحب کے وقت میں برکت بھی خوب رکھی تھی۔ جس طرح انھوں نے ہمیں اپنی صحبت سے خوب سرفراز کیا، اسی طرح جماعت اسلامی اور جماعت کے علاوہ دیگر طبقات اور افراد کو بھی خوب مواقع فراہم کیے کہ ان سے استفادہ کریں۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے یہ گلہ کیا ہو کہ میں نے قاضی صاحب سے وقت مانگا اور انھوں نے انکار کر دیا۔ میں پورے وثوق سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ قاضی صاحب ہر ایک کو وقت دیتے تھے اور اس کی مرضی کے مطابق دیتے تھے۔ جب سے موبائل آیا تھا، وہ ہر ایک کا فون خود وصول کرتے، بات کرتے اور حتیٰ الامکان کوشش ہوتی تھی کہ کوئی فون ضائع نہ ہو۔ وہ موبائل پیغامات کا جواب بھی خود دیتے۔ اس میں کوئی تخصیص نہیں تھی۔ چاہے کوئی بڑا ہو یا کوئی معمولی، وہ ہر ایک کو اہمیت دیتے تھے۔ ان کی گفتگو کا ایک ہی انداز ہوتا اور وہ ہر ایک کے ساتھ مسکراتے چہرے کے ساتھ بات کرتے۔

قاضی صاحب کی ایک عادت تھی کہ وہ فجر کی نماز کے بعد گھر پر درس قرآن دیتے اور میں سمجھتا ہوں [illegible] ہماری تربیت میں اہم کردار اسی درس کا ہے۔ شاید [illegible] زندگی کا کوئی ایک ایسا گوشہ ہو جس پر قاضی صاحب [illegible] ہماری رہنمائی نہ کی ہو۔ وہ عملی زندگی کے قائل تھے۔

www.urdudigest.pk

اپنے ان دروس اور گفتگو میں بہت چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف متوجہ کیا کرتے تھے۔ انھوں نے بہت چھوٹے چھوٹے معاملات پر ہماری رہنمائی کی۔

وہ کہتے تھے کہ کبھی کسی خامی یا کمی کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ خرابیوں کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ وہ تربیت اور رہنمائی کا یہ فریضہ اس حد تک ادا کرتے کہ اگر کسی نے کاغذ کسی ایسی جگہ پھینک دیا جہاں نہیں پھینکنا چاہیے تو اس پر بھی اسے انتہائی مشفقانہ اور پدرانہ انداز سے سمجھاتے کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس سے انسان کے اندر نفاست نہیں رہتی۔

مختصر یہ کہ قاضی صاحب اپنی اولاد کو ایک آئیڈیل انسان کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے لیے انھوں نے کبھی زور زبردستی سے کام نہیں لیا، بلکہ وہ ہمیشہ ترغیب سے کام لیتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے مجھے یا میرے دیگر بہن بھائیوں میں سے کسی کو مارا ہو۔ البتہ وہ خود بتاتے تھے کہ ''میں نے ایک دن تمھیں ہلکا سا تھپڑ مارا تھا جس پر بعد میں بہت مغموم ہو گیا تھا۔'' مزید کہتے تھے کہ اس تھپڑ نے مجھے اندر سے زخمی کر دیا تھا۔ کئی دنوں تک تمھارا معصوم چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آتا رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی قاضی صاحب نے کوئی سختی کی نہ ہی کسی بات پر ہمیں زبردستی مجبور کرنے کی کوشش کی۔ عموماً شفقت اور محبت سے کام لیتے تھے۔ ہم بھی قاضی صاحب کے مزاج کو سمجھتے تھے۔ جس بات سے انھیں تکلیف ہوتی تھی، ہم اس سے دور رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ کوئی بات ناگوار گزرتی، کسی بات پر تکلیف ہوتی تو ہمیں اچھے طریقے سے سمجھا لیتے تھے۔ لیکن ڈانٹ ڈپٹ اور بے جا غصے سے کبھی کام نہیں لیا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ قاضی صاحب چھوٹی چھوٹی خرابیوں سے ہمیں بچنے کی تلقین کرتے۔ کہتے تھے کہ بظاہر یہ چھوٹی اور معمولی باتیں نظر آتی ہیں۔ لیکن انسانی شخصیت کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر قاضی صاحب کو جھوٹ سے بہت زیادہ نفرت تھی۔ وہ جھوٹ کو حد سے زیادہ ناپسند کرتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے ہمارے دلوں میں جھوٹ سے متعلق ایسی نفرت بٹھا رکھی تھی کہ تمام تر کمزوریوں کے باوجود آج بھی جھوٹ کی عادت ہم میں سے کسی بہن بھائی میں نہیں۔ ایسی تربیت ہو گئی ہے کہ چاہتے ہوئے بھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔ اس طرح دیگر اخلاقی برائیاں تھیں جن سے بچنے کے لیے انھوں نے ترغیب و ترہیب کے راستے اختیار کیے۔ ہماری تربیت کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ جو زبان بولو، خالص بولو۔ اگر پشتو بولو تو اس میں اُردو کی ملاوٹ نہ ہو۔ اگر اردو میں بات کرنی پڑے تو اس میں انگریزی کے الفاظ مت گھسیٹو۔ فارسی اور عربی پڑھنے اور استفادے کے لیے خصوصی ہدایت کرتے تھے۔

قاضی صاحب کو اللہ نے یہ خوبی بھی دی تھی کہ وہ اصلاح کے حوالے سے کسی بات پر ناراض نہیں ہوتے تھے۔ بہت سارے مواقع پر میں ان پر اعتراضات کرتا رہا کہ آپ کو یہ کام ایسا کرنا چاہیے، اس طرح کرنا چاہیے تھا۔ لیکن انھوں نے کبھی برا نہیں منایا۔ وہ پوری بات سن لیتے تھے اور اگر واقعی وہ بات قابل قبول ہوتی تو اپنی اصلاح کرتے اور اپنی غلطی کا احساس کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ اگر وہ سمجھتے تھے کہ ان کا موقف درست ہے اور ایسا ہی کرنا چاہیے تھا تو اس کے حق میں دلائل دیتے۔ آخری زمانے میں، میں ان کے ساتھ بہت کھل کر گفتگو کرتا تھا اور ہم دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے معاملات شیئر کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے قاضی صاحب کی وفات نے مجھے تنہائی کا زیادہ احساس دلایا ہے، لیکن اللہ کے فضل سے یہ تنہائی قاضی صاحب کے لاکھوں روحانی فرزندوں اور بزرگوں نے کافی حد تک کم کر دی ہے۔ قاضی صاحب نے ہمیں کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی۔ البتہ ایک صدمہ زندگی بھر رہے گا کہ کاش! قاضی صاحب اتنی جلدی نہ جاتے اور ہمیں ان کی خدمت کا مزید موقع مل جاتا۔

قاضی صاحب کے لیے

جماعت کا پیرہن چھوٹا پڑ گیا

افسوس کچھ لوگوں نے دل چھوٹے کر لیے تھے

نور اسلم خان

ملاقات: اختر عباس

قاضی صاحب سے میرا تعارف پہلی دفعہ تب ہوا جب میں اسلامی جمعیت طلبہ کا رفیق اور طالب علم تھا۔ قاضی صاحب لکی مروت، ڈیرہ اسماعیل خان کے دورے پر آئے ہوئے تھے۔ فیصلہ یہ ہو رہا تھا کہ قاضی صاحب کے ساتھ باڈی گارڈ کی ڈیوٹی کون کرے گا؟ آخر اس کام کے لیے میرا انتخاب ہوا۔ یہ ۱۹۹۳ء کی بات ہے۔ تب پہلی دفعہ مجھے قریب سے قاضی صاحب کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کا اٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا اور کارکنوں کے ساتھ ان کا ملنا یہ ساری چیزیں میں دیکھ رہا تھا۔ میں اسلامی جمعیت طلبہ میں حادثاتی طور پر آیا تھا۔ کسی سے متاثر ہو کر نہیں آیا تھا۔ قاضی صاحب کے قریب میں تین چار دن رہا۔

قاضی صاحب کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے جس طرح سے ان کے ساتھ رہتے ہوئے کام کیا، انھیں پسند آیا۔ رات کو قاضی صاحب جب اٹھنے لگے تو میں نے ان کے جوتے سیدھے کرنے چاہے۔ انھوں نے میرا ہاتھ روک دیا کہ یہ کام میں خود کر سکتا ہوں۔ وہ استری لے کے کپڑے

خود استری کرتے۔ میں نے اصرار کیا کہ میں کر دیتا ہوں مگر انھوں نے کہا کہ یہ کام میں خود کر سکتا ہوں۔

جن دنوں میں بنوں کالج میں تھا، اسلامی جمعیت طلبہ اور عوامی نیشنل پارٹی کے درمیان جھگڑا ہوا۔ جس ہاسٹل میں، میں رہ رہا تھا وہاں اسلامی جمعیت طلبہ کا ایک کمرہ تھا تو فیصلہ ہوا اور مجھے کہا گیا کہ آپ وہاں اس کمرے میں جا کر رہیں۔ میں رہنے کے لیے چلا گیا۔ عوامی نیشنل پارٹی والوں نے میرے والد صاحب کو پیغام بھجوایا کہ آپ کا ایک ہی بیٹا ہے، اسے سمجھایئے وگرنہ ہم اسے قتل کر دیں گے۔ ہاسٹل کا نام بلال ہاسٹل تھا اور کمرہ نمبر ۲۵ تھا۔ میرے والد صاحب نے پیغام بھیجا کہ وہ تو طالب علم ہے اگر زیادہ شوق ہے تو میں خود آ رہا ہوں۔ ساتھ ہی میرے والد صاحب کچھ لوگوں کو لے کر وہاں آ گئے۔

قاضی صاحب کو بھی اس واقعے کا پتا چلا کہ ایک والد نے کس طرح اپنے بچے کو سپورٹ کیا وگرنہ تو اس طرح ہوتا ہے کہ والدین ڈر کر اپنے بچوں کو ہی پڑھائی سے اٹھا لیتے ہیں۔ والد صاحب کی یہ ادا قاضی صاحب کو بہت پسند آئی۔ اس کے بعد میرا پشاور یونیورسٹی اسلامک سنٹر پشاور میں داخلہ ہوا۔ ان کا گھر قریب ہی تھا، قاضی صاحب جب بھی وہاں دورے پر آتے تو مجھے بلا لیتے اور وہ میری تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق بھی پوچھتے رہے۔ میں پڑھائی میں بھی اچھا تھا اور ٹاپ بھی کرتا رہا۔ اساتذہ کو پریشانی ہوتی کہ میرے نمبر کیسے آ گئیں۔ قاضی صاحب کو میرے گھر کے مسائل سے بھی آگہی تھی کہ نہ میری ماں ہے نہ بھائی نہ بہن، میں اکیلا تھا۔ پھر میرا کیریئر اور اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھ میری وابستگی نے ان کی دلچسپی میرے متعلق اور بڑھا دی۔

۹۸ء میں جب میں نے ماسٹر کر لیا تو قاضی صاحب نے پوچھا کہ ماشاء اللہ آپ نے ماسٹر کر لیا ہے، اب آگے آپ نے کیا کرنا ہے تو میں نے کہا کہ میں نے پولیس میں جانا ہے اور سی ایس ایس کی تیاری کر رہا ہوں۔ قاضی نے مجھے کہا کہ آپ نے گورنمنٹ ملازمت نہیں کرنی۔ پھر انھوں نے کہا کہ میں امریکا گیا تھا وہاں کچھ احباب ہمارے ملک میں غریب بچوں کے لیے جو شام کے وقت یا صبح کے وقت اسکول نہیں جا سکتے اور مزدوری کرتے ہیں، ان کے حوالے سے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے انھوں نے مجھے کچھ فنڈ دیا ہے۔ وہ ایک پراجیکٹ ہے، اس کو کرنا ہے۔ آپ نے میرے ساتھ رہنا ہے اور آپ سرکاری ملازمت سے دور رہو۔

میں نے قاضی صاحب سے کہا کہ آپ کی بات میرے لیے عزیز ہے۔ لیکن میں والد کا ایک ہی بیٹا ہوں تو آپ میرے والد صاحب سے بات کی۔ قاضی صاحب نے میرے والد سے بات کی میرے والد صاحب کا جماعت سے تعلق نہیں ہے۔ مگر قاضی صاحب کی عزت اور احترام کا عالم یہ کہ میرے والد صاحب نے کہا ”یہ تو میرا ایک ہی بیٹا ہے اگر میرے ایک درجن بیٹے بھی ہوتے تو آپ پر قربان تھے۔ آپ اس کو لے جائیں۔“

قاضی صاحب نے مجھے کہا کہ میں امریکا جا رہا ہوں اور ۲۶ مئی ۲۰۰۰ء کو واپس آؤں گا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ یہ قاضی صاحب کا امریکا کا آخری دورہ تھا۔ قاضی صاحب نے کہا کہ آپ نے مجھے ۲۶ مئی کو منصورہ میں ملنا ہے۔ قاضی صاحب کی محبت اور شفقت کا یہاں سے اندازہ لگائیں کہ جس بچے نے ایم اے کیا ہو اور سی ایس ایس کی تیار کر رہا ہو وہ ایک لمحہ کو بھی نہ سوچے کہ میں نے کیا فیصلہ کرنا ہے اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پشاور سے لاہور آ جائے۔ میری شادی بھی ہو چکی تھی اور میرا بیٹا ساڑھے چار ماہ کا تھا۔ میری بیوی نے کہا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ ۱۹۹۳ء سے آپ اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھ ہیں، اب بس کریں۔ میں نے کہا کہ میں نے جس بندے کے بلانے پر لبیک کہا ہے تو اس میں میرے لیے کچھ بہتری ہو گی۔

صبح کے وقت قاضی صاحب منصورہ پہنچے اور عصر کے

میرے والد نے کہا کہ میرا ایک ہی بیٹا ہے اگر درجن بھی ہوتے تو آپ پر قربان کر دیتا

بعد میں ان کے پاس پہنچا۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی جس میں وہ کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جاتے ہوئے میں ایک کاغذ اور پنسل ساتھ لے کر گیا کہ وہ مجھے کچھ بتائیں گے کہ تو میں لکھ لوں گا۔ قاضی صاحب نے کہا کہ اس طرح کا پراجیکٹ ہے جس میں پورے پاکستان کے غریب بچوں کو جمع کرنا ہے۔ انھیں مسجدوں میں بلانا ہے کیونکہ مسجد ایک ایسی جگہ ہے جس کا کرایہ نہیں ہے اور وہ متنازع بھی نہیں ہے اور ہم نے بچوں کی تعلیم و تربیت کرنی ہے اور جو وہاں سے اچھے لوگ ہمارے ساتھ ملنا چاہتے ہیں انھیں بھی ٹریننگ دینی ہے۔ قاضی صاحب نے کہا، تین چیزیں ہیں: ''عقائد، عبادات اور معاملات۔'' انھوں نے ایک درخت کی مثال دی تھی کہ درخت کی جڑیں عقائد ہیں، اس کا تنا عبادات اور جو اس کا پھل ہے، وہ معاملات ہیں۔ میں ان کی ہر بات کا نوٹس لیتا گیا۔ گفتگو کے آخر میں انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ڈاکٹر ساعد کے پاس چلے جائیں اور ان سے مل لیں۔ ڈاکٹر ساعد کے متعلق میں نے سنا ہوا تھا کہ وہ قاضی صاحب کے استاد ہیں۔ چار پانچ بھائی ہیں۔ ماشاء اللہ مختلف شعبوں میں اعلیٰ عہدوں پر ہیں۔ ساری پڑھی لکھی فیملی ہے۔ قاضی صاحب نے جب مجھ سے وہ کاغذ لیا جس پر میں نوٹ کر رہا تھا تو قاضی صاحب نے کہا کہ آپ نے تو میری ساری باتیں بڑے سلیقے نوٹ کر لیں۔ انھوں نے اس بات کی تعریف کی کہ میرے اندر یہ ایک بہت اچھی خوبی ہے۔

اس دن کے بعد آٹھ سال کا جو عرصہ قاضی صاحب کے ساتھ گزارا تو کبھی ایک پل بھی پشیمانی نہیں اٹھانی پڑی تھی تنخواہ بھی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ پیٹ بھر کے کھانا کھایا جا سکے نہ وسائل ایسے تھے۔ قاضی صاحب اپنے کام سے بہت محبت کرتے تھے۔ میرے ساتھ کئی دفعہ غریب بچوں کے گھر گئے، بچوں کے ساتھ بیٹھتے اور ان سے باتیں کرتے۔ پاکستان کے

تقریباً تمام اضلاع میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے [illegible] کیا۔ اس وقت نہ کوئی گاڑی تھی نہ کچھ اور سہولت۔ لیکن [illegible] صاحب کی شخصیت ایسی تھی کہ جب بھی میں ان سے ملا [illegible] ان کی محبت بڑھتی چلی جاتی تھی۔

قاضی صاحب سے میں نے ایک دفعہ کہا کہ آپ [illegible] شخص ہیں جس نے میرے گلے میں رسی ڈالی ہوئی [illegible] وگرنہ سچی بات تو یہ ہے کہ آج تک مجھے جماعت اسلامی [illegible] کوئی شخص متاثر نہیں کر سکا۔ جن جن سے میری ملاقات [illegible] ہوئی ہیں ان سے میں کم ہی متاثر ہوا۔ جن سے میری ملاقات [illegible] نہیں ہوئی ان کے متعلق کچھ نہیں کہوں گا۔ قاضی صاحب [illegible] سے میں نے کہا کہ آپ کے آگے جھکنے کو دل کرتا ہے اور [illegible] سے مجھے محبت ہے۔ مسجد مکتب اسکیم کو میں نے چلایا اور [illegible] وقت میں نے چھوڑا تو اس وقت ۱۳۰ اسکول تھے۔ ہر [illegible] میں ایک ماڈل اسکول تھا اور اس کی فنڈنگ بھی قاضی صاحب نے الگ سے کی تھی۔

ایک دفعہ ایک حادثہ ہوا تو کسی نے قاضی صاحب [illegible] میرے متعلق غلط اطلاع پہنچائی کہ میں نے کسی کو دھوکا [illegible] قاضی صاحب نے کہا کہ نور اسلم سے کہیں کہ دادا گیری [illegible] کرے۔ جب میں نے وہ جملہ سنا تو مجھے بہت دکھ ہوا۔ [illegible] قاضی صاحب پر دکھ نہیں بلکہ ان پر ہوا جنھوں نے غلط [illegible] پھیلائی۔ میں نے استعفیٰ لکھا اور ان کے سامنے رکھ دیا۔ [illegible] میں لکھا کہ مجھے آپ سے محبت ہے اور اگر یہ محبت ختم [illegible] جائے تو وہ سرمایہ ختم ہو جائے گا جو میں نے اکٹھا کیا ہوا [illegible] اس محبت کے تعلق کو قائم رکھنے کے لیے میں مزید بیان [illegible] نہیں کروں گا۔ انھوں نے میاں مقصود صاحب سے [illegible] ''بھائی اس بندے کو سمجھاؤ اور مجھے بھی خیال رکھنا چاہیے [illegible] میرے بچوں کی طرح ہے مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔'' [illegible] نے میاں صاحب سے کہا کہ وہ براہِ راست کہتے تو [illegible]

قاضی صاحب واحد آدمی تھے جنھوں نے میرے گلے میں رسی ڈالی ہوئی تھی
ورنہ مجھے جماعت کا کوئی شخص متاثر نہیں کر سکا

افسوس نہ ہوتا، انھوں نے اپنے سیکرٹری کے ذریعے کہلوایا جس پر مجھے افسوس ہوا۔

قاضی صاحب نے مجھے ایک مرتبہ دفتر بلوایا اور کہا کہ آپ جماعت اسلامی کے رکن بن جائیں۔ میں نے کہا قاضی صاحب، جماعت کا جو ایک آئیڈیل رکن ہے جو کام وہ کر سکتا ہے، وہ میں کروں گا۔ لیکن رکن میں اس لیے نہیں بنوں گا کیونکہ تنظیمی طور پر جماعت کا جو معیار ہے، میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہاں پر کچھ ارکان کا معیار ان کارکنوں سے بھی کم تر ہے جو ابھی رکنیت کے مراحل میں ہیں۔ قاضی صاحب نے مجھے کہا کہ آپ اگر جماعت میں آ رہے ہیں تو اللہ کی خاطر آ رہے ہیں۔ ان لوگوں کی خاطر نہیں آ رہے۔ مگر میں نے بڑے ادب کے ساتھ قاضی صاحب کے ساتھ اختلاف کیا اور اس کے بعد قاضی صاحب نے مجھے رکن بننے کے لیے کبھی کچھ نہ کہا۔

قاضی صاحب نے جماعت اسلامی کو ڈرائنگ روم سے اور ارکان کے اجتماع سے باہر نکالا اور اسے عوام کی آواز اور عوام کی جماعت بنایا۔ قاضی صاحب کی شخصیت اور جماعت پر وہاں بھی بحث ہوتی تھی جہاں پر لوگ جماعت کے جھنڈے کو بھی نہیں پہچانتے تھے۔ جماعت اسلامی کے بانی کا نام بھی انھیں معلوم نہیں تھا۔ قاضی صاحب کے آنے سے پہلے ہم اس بات پر بحث کیا کرتے تھے کہ آپ مودودیؒ ہیں یا مفدودی؟ مفدودیت ایک فرقہ ہے۔ قاضی صاحب کی محبت کا اندازہ لگائیں کہ ان کے آنے کے بعد ہمارے سامنے کبھی ایسی نوبت نہیں آئی کہ ہم پہلے خود کو مسلمان ثابت کریں اور پھر دین کی دعوت دیں اور یہ بہت بڑی رکاوٹ انھوں نے دور کر دی تھی۔ وہ لوگ بھی جو ووٹ کسی اور کو دیتے تھے۔ کہتے کہ قاضی صاحب واحد آدمی ہیں جن کا دامن ہر طرح کے داغ سے پاک ہے۔

جس بندے کی بھی قاضی صاحب سے ایک دفعہ ملاقات ہوتی تھی قاضی صاحب کو ان کا نام یاد رہ جاتا تھا قاضی صاحب اتنی توجہ سے کارکنان کی بات سنا کرتے تھے۔ ان کی باہیں کھلی ہوا کرتی تھیں اور سب کو ساتھ لے کر چلتے تھے۔ ان میں اخلاص ہی اتنا تھا کہ وہ لوگوں کے جب مسائل سنتے تو اتنی توجہ سے سنا کرتے تھے کہ لوگوں کے ذاتی مسائل بھی انھیں یاد ہوا کرتے تھے۔ قاضی صاحب اگر چاہتے تو جماعت پر بوجھ ڈال سکتے تھے مگر وہ اپنی جیب سے لوگوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ قاضی صاحب کے پاس ضرورت مند، غریب غرباء سبھی آیا کرتے تھے مگر قاضی صاحب نے کسی کو خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹایا تھا۔ کسی سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ جماعت کے کارکن ہو یا نہیں۔

ان کے اعتماد کا یہ عالم تھا کہ ان سے جو بھی بندہ ملا، قاضی صاحب نے کسی کے متعلق بُرا گمان نہیں کیا۔ میں نے دیکھا کہ کچھ ایسے لوگ آئے جماعت میں جن میں اخلاص تھا اور وہ قاضی صاحب کی محبت کی وجہ سے جماعت کے ہو کے رہ گئے مگر کچھ ایسے لوگ بھی آئے جو کسی خاص ایجنڈے کے تحت آئے۔ قاضی صاحب کے قریب بھی ہوئے، قاضی صاحب نے کبھی نہیں پوچھا کہ آپ میرے قریب کیوں آئے؟ جو بھی آتا گیا قریب بیٹھتا گیا۔ قاضی صاحب نے کبھی کسی سے نہیں پوچھا کہ تُو کون ہے اور تیرے باپ کا کیا نام ہے اور تُو کہاں سے آیا ہے؟ قاضی صاحب سب کو ساتھ لے کر چلے۔ قاضی صاحب سے جب میری آخری ملاقات ہوئی تو انھوں نے مجھے بتایا کہ ایک صاحب میرے بہت قریب آئے۔ میرے گھر تک بھی پہنچے، میری ذاتی معاملات میں وہ دخیل ہوئے۔ لیکن آخر میں انھوں نے مجھے دھوکہ دیا۔ مالی لحاظ سے، کاروباری حوالے سے تو میں حیران ہوں کہ کس بندے نے اسے میرے ساتھ لگایا ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے

کچھ لوگوں نے انھیں تکلیف بھی پہنچائی
ایک صاحب نے انھیں دھوکہ دیا اور بے شرمی سے ان کے لیے خریدی گئی زمین پر قابض ہو گیا

www.urdudigest.pk

کہا کہ میں جیسا ہوں سب کو ویسا ہی سمجھتا ہوں اور کہا کہ میں جس لیول پر تھا اگر میں لوگوں پر شک کرتا تو لوگ مجھ سے دور بھاگتے۔ اسی مزاج میں کچھ لوگوں نے قاضی صاحب کو تکلیف پہنچانے کی بھی کوشش کی۔ ان صاحب نے قاضی صاحب اور ان کے بچوں کے نام پر رائے ونڈ کی طرف زمین خریدی اور بے شرمی سے اس پر قابض ہوگئے۔

قاضی صاحب کی مجھے کال آئی تھی کہ میں بلوچستان جا رہا ہوں تو آپ میرے ساتھ چلیں۔ مجھے اعزاز حاصل ہے کہ قاضی صاحب کو جن لوگوں پر اعتماد تھا، میں ان لوگوں میں سے تھا۔ حفاظت تو انسان کی اللہ کرتا ہے۔ لیکن جب انسانی وسائل پر آپ اعتماد کرتے ہیں تو آپ کو کسی کا سہارا لینا ہوتا ہے۔ قاضی صاحب نے کہا کہ بلوچستان جا رہا ہوں تو آپ ساتھ آجائیے۔

ہم لاہور سے اسلام آباد بذریعہ ہوائی سفر گئے تو سلیم سیف اللہ خان جو میرے ضلع کے تھے، ان سے ملاقات ہوگئی۔ قاضی صاحب نے میرا تعارف کرایا کہ یہ لکی مروت کے رہنے والے ہیں۔ ان کا نام نور اسلم خان ہے۔ سیف اللہ خان نے مجھے کہا کہ آپ خان ہیں لیکن آپ کو کبھی دیکھا نہیں۔ میں نے کہا آپ خان ہیں۔ میں خانوں سے دور بھاگتا ہوں۔ میں خادم ہوں اور خادموں کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہوں۔ آپ پیسے والے ہیں میں پیسے والوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتا۔ میں درویشوں کے ساتھ رہنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ تو وہ مسکرائے اور کہا کہ کبھی وقت ہوا تو مل لیجیے گا۔ میں نے کہا، اللہ نے چاہا تو ضرور۔

ہم اسلام آباد گئے اور وہاں سے کوئٹہ۔ کوئٹہ سے ہم چمن گئے۔ چمن میں ہمارے ایک ساتھی تھے، حاجی امان اللہ خان صاحب۔ وہ وہاں کے خانوں میں سے ہیں اور پورا ایک قبیلہ رکھتے ہیں۔ جس محبت اور اتفاق سے قاضی صاحب استقبال ہوا مجھے یاد ہے، گھوڑے تھے، بڑی بڑی گاڑیاں تھیں، پورا قبیلہ اکٹھا ہوا ہوا تھا۔ کافی عوام قاضی صاحب سننے کے لیے آئی تھی اور لوگوں کا کہنا تھا کہ چمن کی تاریخ میں بہت بڑا جلسہ تھا، جس میں ہر پارٹی اور مکتبہ فکر کے لوگ تھے۔ تقریباً ساٹھ ستر بکرے دنبے ذبح کیے ہوئے تھے۔ پورا قبیلہ اکٹھا تھا۔ امان اللہ خان کا ایک بیٹا افغان پارلیمنٹ کا ممبر تھا تو قاضی صاحب کا ان سے آخر دم تک رابطہ رہا۔ قاضی صاحب سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کا قاضی صاحب سے براہ راست رابطہ تھا۔

قاضی صاحب جب بھی بلوچستان جاتے تو عبدالقیوم صاحب اخوندزادہ مجھے کال کرتے کہ قاضی صاحب بلوچستان آرہے تو آپ بھی آجائیں۔ مجھے قاضی صاحب کے ساتھ کئی دوروں میں ایک ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ منصورہ میں جب میں ہوتا تھا تو لوگوں کا میرے متعلق خیال تھا کہ یہ قاضی صاحب کا بندہ ہے اور کسی کی نہیں سنتا۔ میرا خیال ہے لوگوں کا یہ کہنا ٹھیک بھی تھا کیونکہ میرا تعلق بھی صرف قاضی صاحب سے تھا۔ قاضی صاحب انسانیت کے جس بلند درجے پر تھے تو میں کہتا ہوں کہ جماعت یا جماعت کی قیادت اسی درجے پر اگر خود کو پہنچا دیتی ہے تو میرے جیسے لاکھوں لوگ انھیں آسانی سے مل جائیں گے، جو بغیر کسی لالچ کے سب کچھ داؤ پر لگا کر چلیں گے۔

مگر اخلاص کا وہ لیول انھیں لانا ہوگا۔ قاضی صاحب تحریر و تقریر کے ہی دھنی نہیں تھے، سچی بات یہ ہے کہ وہ دل کو تبدیل کرتے تھے۔ وہ اتنی محبت کرتے تھے۔ جس کو دیکھا تھا کہ ہر کارکن شرط لگانے پر تیار ہوتا تھا کہ قاضی صاحب کا تعلق سب سے زیادہ میرے ساتھ ہے اور وہ

جب فرق دس ہزار ووٹوں تک پہنچا تو پتا چلا
نصیر اللہ خاں بابر نوشہرہ چھوڑ کر اسلام آباد چلا گیا

www.urdudigest.pk

سے ہی سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ آپ اندازہ لگالیں کہ ان کے پیار کی چادر اور دامن کتنا بڑا تھا۔

میں پچھلے دنوں ایک تعزیتی کانفرنس میں گیا ہوا تھا۔ کچھ دن پہلے ایک تعزیتی کانفرنس میں امین شہیدی نے ایک خوب صورت جملہ کہا کہ قاضی صاحب کے لیے جماعت اسلامی کا پیرہن چھوٹا پڑ گیا۔ ملی یکجہتی کونسل اس کی ایک مثال ہے۔ میرے بارے میں قاضی صاحب کی بیٹی باجی سمیعہ راحیل قاضی کہا کرتی تھیں کہ ایک محمد علی درانی تھے جو ہمارے گھر میں گھس آئے تھے اور اس کے بعد ایک آپ ہیں۔ محمد علی درانی کو چونکہ سیاست کا شوق تھا اور وہ اپنے ایک راستے پر چلے گئے۔ سیاست میں جھوٹ بھی بولنا پڑتا ہے، مصلحت کے طور پر لوگ جھوٹ بول لیتے ہیں یا قصداً بھی بول لیتے ہیں۔ چونکہ یہ چیزیں میرے مزاج میں نہیں ہیں۔

محمد علی درانی ایک عوامی آدمی تھے۔ ان قیود اور مصلحت کو ماننے والے آدمی نہیں تھے۔ وہ خود اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اور قاضی صاحب ایسے لوگوں کو تلاش کرتے تھے۔ پھر تنظیم کا اپنا ایک مزاج ہے، وہ کچھ پابندیاں، قیود اور رسیاں لوگوں پر ڈالتی ہے۔ کچھ لوگ ان رسیوں میں آجاتے ہیں اور کامیابی پا لیتے ہیں۔ محمد علی درانی کچھ ایسے حالات میں چلے گئے تھے کہ ان کا راستہ جدا ہوگیا۔

۲۰۰۳ء کے الیکشن میں، میں قاضی صاحب کے ساتھ تھا۔ الیکشن میں دو تین دن باقی تھے۔ قاضی صاحب کا مجھے فون آیا کہ کہاں ہیں۔ میں نے کہا کہ میں منصورہ میں ہوں۔ قاضی صاحب نے کہا کہ آپ کو تو یہاں نوشہرہ میں ہونا چاہیے تھا میرے حلقے میں، میں نے کہا آپ حکم کریں تو انھوں نے کہا کہ آپ پہنچیں۔ میں نوشہرہ روانہ ہوگیا تو راستے میں کوئی گاڑی نہیں ملی کیونکہ ساری گاڑیاں الیکشن کے حوالے سے پکڑ دھکڑ میں تھیں تو میں ٹیکسی کرا کے بڑی مشکل سے نوشہرہ پہنچا۔ قاضی صاحب نے الیکشن کے دنوں میں اپنی پوری ٹیم کو اکٹھا کر کے ایک بات کی تھی کہ الیکشن میں جیت کا مطلب ہے کہ عوام کا ہم پر کتنا اعتماد ہے۔ ہم نے کوشش یہی کرنی ہے کہ ہم کوئی ایسا ذریعہ استعمال نہ کریں جو غلط یا حرام ہے۔ اگر اللہ نے ہمارے لیے عزت لکھی ہوئی ہے تو اللہ ہمیں عزت دے گا اور اگر اللہ نے شکست لکھی ہوئی ہے تو اس میں بھی ہماری بھلائی ہوگی۔

قاضی صاحب نے کہا کہ یہ لوگ جو ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں، اس کا حکمت اور شرافت سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔

الیکشن کے رزلٹ آرہے تھے تو جب فرق دس ہزار کے قریب پہنچا تو قاضی صاحب کو کسی نے بتایا کہ ان کا حریف نصیر اللہ خان بابر اسلام آباد روانہ ہوگیا ہے تو مجھے یاد ہے کہ قاضی صاحب نے اس بات پر کوئی بھی تبصرہ نہیں کیا تھا یہاں تک کہ مسکرائے بھی نہیں تھے۔

نوشہرہ چونکہ قاضی صاحب کا آبائی حلقہ تھا، وہاں کے لوگوں سے ان کا قریبی رابطہ تھا اور وہاں کے لوگوں کے فیصلے بھی چونکہ قاضی صاحب کے آباؤ اجداد کرتے تھے۔ ان کا گھرانہ ایک علمی گھرانہ ہے ان کی فیملی نوشہرہ میں پھیلی ہوئی ہے۔

نوشہرہ میں اپنے آفس میں قاضی صاحب باقاعدگی سے جاتے اور لوگوں سے ملتے تھے۔ وہاں آفس میں انھوں نے جو اپنا بندہ بٹھایا ہوا تھا تاکہ لوگوں کے مسائل سنے اور کچہری کے معاملات حل کرے۔ یہ ساری وجوہات آپ کی جیت کا سبب بنیں۔

جماعت اسلامی کی قیادت سے پوچھنا چاہیے کہ امارت کے بعد کچھ لوگوں نے اپنے دل تنگ کیوں کر لیے تھے۔ انھیں کس بات کا ڈر تھا، بجائے اس کے کہ ان سے فائدہ اٹھاتے، ان کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں۔ ایک موقع پر میں نے دیکھا کہ قاضی صاحب سامنے بیٹھے ہیں تو جمعیت طلبہ عربیہ کا ایک سابق بندہ جمعہ کا خطبہ دے رہا تھا؟ ان کے نام ایک دعوت نامہ آیا تو ان لوگوں نے ادھر ادھر کر دیا۔ مصر سے ایک ڈیلی گیشن آیا اور قاضی صاحب کو بتایا تک نہیں گیا۔ بعد میں قاضی صاحب کو بھی پتا چل گیا، وہاں ان لوگوں نے کہا کہ شیخ کیوں نہیں آئے تو ظاہری بات ہے ان لوگوں کے پاس جواب نہیں تھا۔

قاضی صاحب سے جب ہم کوئی بات کرتے تو وہ کہتے تھے کہ جماعت اسلامی تو ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اسی میں آئے اور اسی میں جانا ہے۔

تحفہ خاص جو اردو ڈائجسٹ کے لیے قلم بند ہوا

آغا جان کی سنہری یادیں

عظیم رہنما کی دُختر کے قلم سے بیتے دنوں کا روح پرور تذکرہ

ڈاکٹر سمیحہ راحیل قاضی

سندیسہ ملا کہ آغا جان کی یادوں کا قلمی تذکرہ مطلوب ہے۔ آغا جان کے بارے میں خصوصی اشاعت کا سنا اور اس کے لیے یادوں کی ایک بارات ہے اور مہمانوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ میرے پیارے آغا جان کے آخری مہمان ہیں۔ لہٰذا آپ کی مہمان نوازی میرا فرضِ اولین ہے۔ غم کے اس موسم میں ہمارے ہاں ایک رحمت بھی آئی ہے، میرے بیٹے محمد ابراہیم قاضی کے ہاں ایک بیٹی کی ولادت ہوئی ہے۔ اس وجہ سے مصروفیت ہے۔ مگر عزیز عباس بھائی، آپ کا میرے اوپر قرض ہے۔ آپ کی وجہ سے میرے بچوں نے اچھی اُردو بولنی اور لکھنی شروع کی جب میں نے انھیں اپنے آغا جان کی طرح آپ کے پھول کلب میں لانا شروع کیا۔ آپ کی وجہ سے مجھے پتا چلا کہ میری بیٹی ریام مجھ سے کتنا پیار کرتی ہے جب آپ نے اُسے اچانک یونیورسٹی میں فی البدیہہ میرا تعارف کرانے کے لیے اسٹیج پر بلا لیا۔ سو آپ کے حکم پر کچھ یادیں تحریر کر رہی ہوں۔

اُردو ڈائجسٹ کے ساتھ ہمارا بہت پرانا تعلق ہے بلکہ جب سے شعور کی آنکھ کھولی، اُردو ڈائجسٹ کو اپنے ہاں پایا۔ ہمارے ہاں بچوں کے رسالے، اخبار، خواتین کے رسالے اور اردو ڈائجسٹ لازم و ملزوم حیثیت اختیار کیے ہوئے تھے۔ شاید اسی لیے لہجہ تو ہمارا پشتون ہے مگر امی جان اور ان کی محنت و تربیت کی وجہ سے ہم چاروں بہن بھائیوں کی اردو تحریر و تقریر بہت شستہ اور واضح ہے اور اس میں اردو ڈائجسٹ کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

آغا جان نے بچپن سے ہی نونہال، بچوں کی دنیا، تعلیم و تربیت، کھلونا، نور کو ہمارے لیے مستقل لگایا ہوا تھا۔ تھوڑے بڑے ہوئے تو نسیم حجازی کے ناول لا کر دے دیئے۔ مصر اور لبنان سے ہمارے لیے عربی میں بچوں کی کتابیں لا کر دیں۔ جن میں سے قصص النبیین وہ بڑے

شوق سے ہم بہن بھائیوں کو اپنے بستر میں کسی کو گود میں، کسی کو بغل میں، کسی کو کاندھے پر ٹکا کر اور کبھی سینے پر سلا کر بالوں میں انگلیاں پھیر پھیر کر سناتے۔ لقمان اس میں حضرت یوسفؑ کا قصہ بڑے شوق اور آغا جان سے فرمائش کر کر کے سنتا۔ اس کی سبز خوبصورت آنکھیں زار و قطار رونے سے سارے ماحول کو افسردہ کر دیتی تھیں۔

میٹرک تک انھوں نے ہمیں مولانا کی تفہیم القرآن نجر کے بعد اسکول جانے سے پہلے سبقاً سبقاً پڑھائی۔ خطبات، دینیات، سلامتی کا راستہ، شہادت حق اور ہدایات تو زبانی یاد کروا دی تھیں۔

اس میں ہماری امی کا کردار زیادہ اہم رہا ہے کیونکہ وہ باقاعدہ آغا جان سے اصرار کرتی تھیں کہ پہلے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ دو، یہ تمھارے دست و بازو بنیں گے۔ پہلی دعوت نبی کریم ﷺ کی سنت میں اپنے اہل خانہ کو دو۔ یہ سب تمھارے لیے صدقہ جاریہ بنیں گے۔ (اللہ ہمیں اپنے والدین کے لیے صدقہ جاریہ بنا دے آمین!) قرآن، حدیث، مولانا محترم کا لٹریچر اور کلیات اقبال ان کے سرہانے رکھی کتابوں کا لازم حصہ تھا جسے وہ خود بھی پڑھتے اور ہمیں بھی مطالعہ کا شیدائی بنایا تھا۔ مجھے یاد ہے، بچپن میں انھوں نے مجھے میلکم ایکس کی آپ بیتی، ایک کتاب روٹس (Roots) اور اسرائیل کی وزیر اعظم گولڈا میئر کی کتاب پڑھائی تھیں۔ ہمارے گھر دنیا جہان کے رسالے، ٹائم میگزین، نیوز ویک، ریڈرز ڈائجسٹ بھی آیا کرتے تھے۔ وہ تمام مکاتب فکر کا لٹریچر بہت شوق سے پڑھتے اور ہمیں پڑھاتے تھے۔

صوبہ خیبر پختونخواہ میں دیوبند مکتب فکر کے کُبّار علماء کے گھرانے میں پرورش پانے کی وجہ سے حضور ﷺ کے ایک عاشق امتی تھے۔ آپ ﷺ کی پیروی میں کبھی بھی بیٹے اور بیٹی میں فرق نہیں رکھا۔ بلکہ میرے بڑے ہونے کی وجہ سے مجھے زیادہ توجہ ملی۔ ویسے تو میرے آغا جان کا یہ کمال تھا کہ ہم چاروں اس بات کے دعوے دار ہیں کہ وہ سب سے زیادہ محبت ہم سے کرتے تھے۔ لیکن وہ بھی سے محبت کرتے تھے اور اتنا بے پناہ توازن رکھتے کہ کسی کو بھی احساس نہ ہوتا، دوسرے کی مجھ سے زیادہ حمایت کرتے ہیں۔ انھوں نے ہمیں اعلیٰ تعلیم دی۔ ہمیں اپنے اسلاف کی روایتوں سے جڑے رہنے کا سلیقہ بھی سکھایا اور دور جدید کے چیلنجز کے بھرپور جواب دینے کا حوصلہ بھی دیا۔

میری شروع میں بہت زیادہ حوصلہ افزائی نہ کرتے بلکہ کہتے، اقبال نے کہا کہ

؎ یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے

تو عورت جتنا زیادہ پُراسرار ہوتی ہے، وہ اتنا ہی باوقار ہوتی ہے۔ عورت جتنی زیادہ عبادت گزار ہوتی ہے، عبادت اسے اتنا ہی زیادہ اعتبار اور وقار بخشتی ہے۔

جب میں نے عملی زندگی میں قدم رکھا، تو وہ میری بڑی حوصلہ افزائی کرتے کہ راحیل اب تم نے اپنے کردار کو مستحکم کر لیا ہے۔ اب تم اعتماد کے ساتھ اپنے کام کیا کرو۔ معاشرے میں اپنے اچھے اور بھرپور کردار سے اپنی حیثیت کی پہچان کراؤ۔ بچپن سے ہی مجھے اقبال کے یہ دو فارسی اشعار سنا سنا کر یاد کرا لیے تھے:

بہل اے دخترک ایں دلبر یما
مسلماں را نہ زیبد کافر یما
منہ دل بر جمال غازہ پرور
بآموز از نگاہ غارت گری ہا

(اے (میری) ننھی بیٹی! یہ کافروں کی سی آرائش و زیبائش اور ناز و انداز دکھانے والے اطوار چھوڑ دو اور اپنے کردار کی طاقت سے دنیا کو مسخر کرنا سیکھو۔) ایک شعر تو وہ ہر خواتین کے اجتماع میں اور ہر وقت سناتے:

زشامِ ما بروں آور سحر را
زقرآں باز خواں اہل نظر را
نمی دانی کہ سوز قرآت تو
دگرگوں کرد تقدیر عمرؓ را

ترجمہ: میری امت کی تاریکی میں سے سپیدہ سحر کی نوید اور خوشخبری دلا دے۔ اہل بصیرت کو پھر سے قرآن سنانا شروع کر دو۔ کیا تجھے علم نہیں ہے کہ تیری تلاوت کا

www.urdudigest.pk

سوز ہی تو تھا کہ اس نے حضرت عمرؓ کی تقدیر پر بدل دی۔

انھوں نے مجھے فارسی کلیات اقبال میں سے عورت کے بارے تمام اشعار زبانی یاد کرا دیئے تھے۔ میں نے اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے میں ان سب اشعار کو شامل کر لیا ہے۔

میرے ڈاکٹر بننے پر اتنے زیادہ خوش تھے کہ خوشی ان کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ میری سہیلیاں مجھے کہتیں، تمھارے آغا جان کا چہرہ بہت ہی پرنور ہے۔ وہ گھر میں بھی ہمیں ولی اللہ لگتے تھے۔ ان کا ظاہر و باطن اتنا اجلا تھا کہ اس کی روشنی سے ان کا چہرہ اور زیادہ روشن ہو گیا تھا۔

میرے مقالے کی نوک پلک سنوارنے میں وہ رات گئے تک میرے ساتھ مصروف ہوتے۔ میری امی کبھی کبھی بہت حیران ہوتیں کہ تم باپ بیٹی کی کتنی باتیں ہیں جو ختم ہی نہیں ہوتیں۔ ویسے تو امی کو جلد سونے کی عادت تھی جو ساری عمر آغا جان اور ہم نے پوری نہ ہونے دی کیونکہ ہم سب دیر تک آغا جان کے ساتھ گپ شپ کرتے اور وہ ہمیں واقعات کے دلچسپ پیرائے میں مشکل اور نہ سمجھ میں آنے والی باتیں سمجھاتے رہتے۔ وہ اپنی ذات میں پوری یونیورسٹی تھے اور علم و ادب کا ایک گہرا سمندر ان کے شفیق سینے میں موجزن رہتا۔ اوپر سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ عشق نے اسے زیادہ گہرائی اور گیرائی عطا کر دی تھی۔ مگر وہ ہمارے لیے ایک عام سے درویش آغا جان تھے۔ میں اپنے آغا جان کی ایک صفت سے بہت زیادہ متاثر ہوں جسے ہم نے اپنانے کی بھرپور جدوجہد کی ہے مگر ان کی یہ صفت اتنی فطری تھی کہ بہت حیرت ہوتی تھی۔

وہ یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے تعصب سے ماورا انسان تھے۔ انھیں وقت کے جابروں اور طاغوت کے نمائندوں سے کوئی خوف اور خطرہ لاحق نہ تھا۔ وہ ظالموں اور فرعونوں سے ٹکرا جانے والے اور ان کے رعب و دبدبے کو خاک میں ملانے والے نڈر اور جی دار آغا جان تھے۔ مگر ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ کو کسی خاک نشین سے برتر نہ سمجھتے۔ گھر میں کام کرنے والوں کے لیے ایک شفیق باپ کی مانند تھے۔ منصورہ کے خاکروب ان کو یاد کر کے بلک بلک کر روتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے لیے وہ ایک بڑے پیار کرنے والے شفیق والد کی مانند تھے۔ گھر میں ان کے آجانے سے جیسے بہار آجاتی۔ ہم سب بھی ان کی خوبصورت اور گونج دار آواز میں استقبال کے انداز کو یاد کر کے ان سے ہمیشہ کہتے کہ جنت میں اچھے استقبال کا اللہ نے اسی لیے خصوصی ذکر کیا ہے کہ اس سے انسان کو بہت پذیرائی کا احساس ہوتا ہے۔ باہر سے کبھی خالی ہاتھ نہ آتے اور ہمارے لیے دنیا بھر کی چیزیں تحفے میں لاتے۔ وہ بذات خود میرے لیے کائنات کا عظیم ترین تحفہ تھے۔

میرا اپنے رحیم رب سے گمان ہے کہ ان کی مغفرت کے لیے تو ان شاء اللہ میں اور میرے دونوں بچے کافی ہوں گے۔ جس پیار، شفقت اور سب سے بڑی بات یہ کہ جس عزت اور وقار سے انھوں نے ہمیں پالا اور خاندان اور معاشرے میں ہماری عزت بنا کر رکھی وہ صرف میرے آغا جان کا خاصہ تھا۔

اسی لیے میری بیٹی، ریام قاضی نے ان کے بارے میں لکھا، "آغا جان آپ نے ساری زندگی ہمیں زمانے کی گرم ہوا سے بچائے رکھا۔ آپ کے استقبال کے انداز اور آپ کے شفیق سینے پر سر رکھ کر میں زمانے کے سارے غم بھول جاتی تھی۔ اصل میں تو میں آج آپ کے جانے کے بعد یتیم ہوئی ہوں۔"

میرا اللہ سے گمان ہے کہ وہ میری ہی وجہ سے آپ کو اگلے جہان کے تمام مرحلوں سے بہت محبت اور عزت کے ساتھ سرخروئی سے سفر طے کرائے گا اور آپ کا روشن چہرہ ان شاء اللہ قیامت کے دن اسی طرح مزید روشن ہو گا جب آپ کو یتیموں کی سرپرستی کی وجہ سے حضور ﷺ کی معیت میں بلایا جائے گا۔ کیونکہ اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ قیامت کے دن یتیموں کی سرپرستی کرنے والا حضور ﷺ کے ساتھ ایسے قریب ہو گا جیسے یہ دو انگلیاں آپس میں قریب ہیں۔

اللہ میرے آغا جان سے راضی ہو جائے۔ ان کی قبر کو جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ بنا دے اور ان پر رحم فرما کر ان کی مغفرت فرما دے۔

رَبِّ ارحَمهُما كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيراً ■

قاضی حسین احمدؒ کی آخری نامکمل تحریر

حاجی گل شہید

جماعت اسلامی کے ایک مخلص کارکن کا ذکرِ خیر جو درجہ شہادت پہ فائز ہوئے

۱۹۷۷ء میں ہری پور جیل میں سیاسی قیدیوں کی چہل پہل تھی۔ قومی اتحاد میں پیپلز پارٹی کے چیئرمین وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے منعقد کردہ انتخابات کے نتائج کے خلاف پورا ملک سراپا احتجاج تھا۔ ملک کے دوسرے جیلوں کی طرح ہری پور کا وسیع و عریض جیل بھی گنجائش سے زیادہ قیدیوں سے بھرا ہوا تھا۔ حاجی دوست محمد عرف حاجی گل اس وقت سترہ (۱۷) سالہ نوجوان تھے۔ جماعت اسلامی کے کارکن کی حیثیت سے ہمارے جیل کے ساتھی تھے۔

سرخ و سفید چہرہ، پہلوانوں کی طرح لمبا تڑنگا بھرا ہوا جسم جسمانی توانائی سے بھرپور، ایسا لگتا تھا جیسے ہر وقت کسی مہم کے انتظار میں ہوں۔ اپنی جوانی اور طاقت کے باوجود ہر وقت صلح صفائی میں مشغول رہتے تھے۔ ان کی طاقت کا مظاہرہ جیل میں قیدیوں کے درمیان کبڈی کے کھیل میں ہوتا تھا۔ لڑائی جھگڑے سے مکمل اجتناب کرتے تھے۔ میں ان دنوں صوبہ سرحد کی صوبائی جماعت کا امیر تھا۔

ہمارے بیرک میں ۴۲ رقیدی سی کلاس کے فرش پر لیٹے یا بیٹھے رہتے تھے۔ بیرک کے اندر ہم نے کیمسٹ کی اپنی دکان سے ضرورت کی ادویہ منگواتے اور جیل کے قیدیوں میں مفت تقسیم کرتے تھے۔ ان دنوں میں نے اسرائیل کی سابق وزیر اعظم گولڈا میئر کی لکھی ہوئی آپ بیتی تازہ تازہ پڑھی تھی۔ میں ان کی سوشلسٹ پارٹی کی قائم کردہ بستیوں کے اس پہلو سے بہت متاثر تھا کہ کبتز (Kibbutz) یا سوشلسٹ بستی میں جو چیز ہر قیدی کو میسر نہ ہوتی تھی، اس کے استعمال سے تمام باشندے اجتناب کرتے تھے۔ چنانچہ اشیائے

www.urdudigest.pk

ضرورت اور کھانے پینے کی ایسی چیز استعمال میں لائی جاتی تھی جو ہر قیدی کو میسر ہو سکے۔

ہم نے ۴۲ رقیدیوں کے بیرک میں ایک چھوٹے خانے پر یہ اہتمام کیا کہ کھانے پینے کی جتنی چیزیں تحفتاً یا ہدیہ کے طور پر دوست احباب یا رشتہ داروں کی طرف سے بیرک کے کسی بھی قیدی کے لیے آتیں، وہ جمع کر دی جاتیں اور پھر اجتماعی استعمال میں لائی جاتی تھیں۔ صوبائی امیر ہونے کے ناتے پشاور، ہری پور، ایبٹ آباد، مردان، صوابی اور قریبی اضلاع کے کارکن اور دوست احباب روزانہ کھانے پینے کی چیزیں لے کر آتے تھے۔ بیرک میں مردان کا ایک ہوٹل والا بھی قیدی کے طور پر آیا تھا۔ وہ اچھا باورچی تھا۔ ہر تیسرے روز جیل میں آنے والے نئے قیدیوں کی دعوت ہوتی تھی۔

مولانا مفتی محمود صاحب بھی اس جیل میں تھے۔ انھیں مخصوص دائرے میں رکھا گیا تھا۔ ان کے ساتھ بی کلاس کے بہت سے دوسرے قیدی بھی تھے جن میں بشیر احمد بلور، خیبر پختونخواہ کے موجودہ سینیٹر وزیر مولانا صبغ اللہ صاحب بھی شامل تھے۔ یہ لوگ اصرار کرتے تھے کہ میں بیرک چھوڑ کر بی کلاس میں چلا جاؤں لیکن مجھے اپنے بیرک میں جو آرام میسر تھا، وہ شاید گھر میں بھی میسر نہیں ہو سکتا تھا۔

نوجوان دوست محمد کے ساتھ والے مختلف سیاسی پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے جیل میں آئی تھی۔ جیل میں درس قرآن، ڈسپنسری کے علاوہ ایک ابتدائی اسکول بھی ہم نے قائم کر رکھا تھا۔ ہزارہ کے رہنے والوں کو پشتو سکھائی جاتی تھی اور دیر اور شمالی علاقہ جات کے قیدیوں کو اُردو لکھنا پڑنا سکھایا جاتا تھا۔ ایک دفعہ ہمارے بیرک میں اے این پی سے تعلق رکھنے والا ایک عمر رسیدہ قیدی آیا۔ بتایا کہ وہ تقریباً چودہ سال جیل کاٹ چکا ہے، اگر اس وقت جماعت اسلامی کے لوگ ساتھ ہوتے تو شاید وہ اب تک ایم اے پاس ہوتا، لیکن اے این پی کے ساتھ ہونے کے نتیجے میں وہ بدستور چٹا ان پڑھ ہی تھا۔

ایک چودہ، پندرہ سالہ نوخیز قیدی ٹوپی میں سرخ پھول لگائے ہوئے روزانہ میرے پاس آ کر بیٹھ جاتا اور مختلف سوالات پوچھا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ باتیں کرتے کرتے اپنی ٹوپی کا سرخ پھول ٹوپی سے اتارا کر زمین پر پٹختے ہوئے کہنے لگا ”آپ تو لوگوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے علاج و معالجے اور خدمت کا اہتمام کرتے ہیں۔ ہمیں تو اس سرخ رنگ ہی سے دھوکا دیا گیا ہے۔ اس کے بعد وہ پورے جوش و خروش سے جماعت اسلامی کا کام کرنے لگا۔ وہ جب جیل میں اے این پی کے کسی کارکن سے الجھ جاتا، تو دوست محمد صلح صفائی کر کے مصالحت کرا دیتا تھا۔

دوست محمد ہری پور جیل سے نکلنے کے بعد سراپا تحریک بن گیا۔ چھ بھائیوں میں سے چھوٹا بھائی تھا۔ دوسرے بھائی کاروباری ذہن کے تھے، وہ حاجی دوست محمد سے پیار کرتے تھے لیکن اس کی تحریکی سرگرمیوں سے عاجز آ گئے تھے۔ حاجی صاحب جو کماتے تھے، بے دریغ مہمان نوازی، تحریکی سرگرمیوں میں اور الیکشن میں خرچ کر دیتے۔ حاجی دوست محمد کے دوستوں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ وہ ہر حلقے میں محبوب تھے۔ انھوں نے بچیوں کے اسکول اور دینی تعلیم کی درسگاہیں قائم کیں۔ پشاور کے علاوہ چترال میں کئی تعلیمی ادارے قائم کیے۔ وہ علماء کرام کے ساتھ خاص تعلق کی بنا پر ہر مسلک کے علماء کے خادم تھے۔ اپنی محبوبیت کی بنا پر حاجی دوست محمد کے بجائے وہ حاجی گل کے نام سے معروف ہو گئے۔

میرے ساتھ ذاتی طور پر ایسی محبت کا تعلق تھا کہ جب بھی میں نظر بند ہو جاتا تھا یا بیماری کی وجہ سے ہسپتال میں چلا جاتا، حاجی گل مہمان نوازی کے لیے آتے.....

(قاضی صاحب مرحوم یہ مضمون بوجوہ مکمل نہ کر سکے۔ تاہم یاد رہے، حاجی دوست محمد عرف حاجی گل بعد ازاں)

دنیائے سیاست کا ہر دلعزیز انسان

دل موہ لینے والی شخصیت اور خوبصورت طرزِ تکلّم کے باعث قاضی صاحب بجا طور پر ہر طبقے میں مقبول ہوئے

محمد اکرم رانجھا

www.urdudigest.pk

حدیث قدسی کا مفہوم ہے کہ ''جو لوگ اللہ فی اللہ باہمی محبت کرتے ہوں گے، روزِ قیامت اللہ تعالیٰ انھیں اپنے عرش کے سائے میں پناہ دیں گے۔''

الحمدللہ کہ اللہ کے کئی نیک بندے میرے لیے دنیا ومافیہا سے بڑھ کر پیارے ہوئے اور ان سے پیار میرے لیے زندگی کا حاصل ہے۔ پیار کی بنیاد تعلق باللہ ہے۔ ان لوگوں میں سے بڑھ چڑھ کر عزیز تر ''ملک علی محمد فاروق'' تھے جنھیں جنت میں گئے کئی سال گزر چکے۔ لیکن تاحال ان کے کچے قبرستان میں کچی قبر بھلائے نہیں بھولتی۔

میں ملک علی محمد فاروق کی معیت ہی میں ۱۹۷۸ء میں قاضی حسین احمدؒ سے پہلی مرتبہ ملا۔ منصورہ میں واقع دارالاخوۃ (مہمان خانہ) کی بالائی منزل کے بائیں ہاتھ آخری کمرے کے کوارٹر کھلے تو ہم دونوں نے پلنگ نما چارپائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ایک دیدہ زیب شخصیت کو مبہوت ہو کر دیکھا۔ سفید شلوار قمیص پہنے قاضی صاحب سرخ وسفید چہرے سے مزین جس میں سفیدی زیادہ، سرخی کم، ڈاڑھی اور سر کے بال گہرے سیاہ..... آنے والے کو حیران کر دیتے۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی، جس میں ہم نے اپنے اشتیاق کو جی بھر کر ظاہر کیا۔ ہنستے مسکراتے قاضی صاحب نے ہم دو وکیلوں اور سرگودھا جماعت کے کارکنوں سے بڑی ہی خوبصورت باتیں کیں۔

واپسی پر سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے علامہ اقبالؒ کا سہارا لیا ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

ملک صاحب نے قہقہہ لگایا اور گویا ہوئے کہ بابا فریدؒ گنج شکر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سراپا مٹھاس تھے ؎

مٹھا میوہ بخش الٰہا قدرت دی گھت شیری
جو کھاوے روگ اس دا جاوے دور ہووے دلگیری

قاضی صاحب کی ڈاڑھی اور سر کے سیاہ بال کب اور کس وقت سفید ہو گئے یہ معلوم نہیں، تاہم اتنا پتا ہے کہ ہمارے رُوبرو یہ واردات ہوئی کہ جوانی بڑھاپے میں ڈھل گئی۔ قاضی صاحب میاں طفیل محمد صاحب کی جگہ جنرل سیکرٹری جماعت اسلامی پاکستان بن کر کیا آئے کہ منصورہ میں بہار آگئی۔

۱۹۸۲ء جولائی کی ۲۰ر تاریخ میں جامعہ مسجد منصورہ میں اعتکاف میں بیٹھا اور منصورہ دل کو بھا گیا۔ ۵ر شوال کو قاضی حسین احمد نے اپنے جماعتی فلیٹ کو رونق بخشی۔ یوں قاضی صاحب کے پہلے گھر میں قیام کی مجھے سعادت نصیب ہوئی۔ قاضی صاحب کے ساتھ منصورہ میں رہنا زندگی کا ایک خوبصورت دور تھا۔ جس نے گزرتے دیر نہ لگائی۔ آج یہی کہا جا سکتا ہے کہ ؎

شربت لال ہوندے
کل دے وچھڑے آج پئے عالم سال ہوندے

اس گزرے وقت کی کس کس یاد کو کھرچ کھرچ کر حافظے سے نکالا جائے؟ حد تو یہ ہے کہ بھلاتے نہیں بھولتی۔

ایک قاضی صاحب کا قرآن سے گہرا تعلق اور دوسرے کلامِ اقبال پر عبور خصوصاً فارسی کلام اور تیسری یاد جو رہ رہ کر سامنے آتی ہے، ان کے پُرجوش خطاب کا وہ انداز ہے جس میں وہ دونوں بازو ہواؤں میں لہراتے ہوئے کہتے تھے:

''میرے عزیزو! ہندوستان سے خوفزدہ نہ ہوا کرو، ہندوستان تو مسلم دنیا کے سمندر میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جو کسی وقت بھی ڈوب سکتا ہے۔ اسی طرح اسرائیل کو خاص اہمیت نہ دیا کرو کیونکہ مشرقِ وسطیٰ کے مسلم سمندر میں اس جزیرے کو ڈوبنے سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔''

میں نے قاضی صاحب کے اندر اشرافیہ کا ایک خوبصورت انسان چھپا دیکھا۔ لیکن صوبہ سرحد کا یہ انسان بے حد متقی اور خدا ترس واقع ہوا تھا۔ اس انسان کے ذہن

میں نئی نئی تجاویز جنم لیتی رہتی تھیں۔ انھیں نچلا بیٹھنا آتا ہی نہ تھا۔ وہ پیار و محبت اور خوبصورت طرزِ تکلّم کی بنا پر بجا طور پر اپنے قافلے کے سرخیل تصور کیے جاتے تھے۔ اس لیے ان کے ذہن نے کبھی کاروانِ دعوت و محبت کو متعارف کرایا اور کبھی سیاست کی دنیا میں اسلامک فرنٹ کو لے کر آموجود ہوئے۔

لوگوں سے اختلافات ہوئے اور لوگوں نے تنقید بھی کی، لیکن آپ نے کبھی پیشانی کو شکن آلود نہ ہونے دیا۔ حالانکہ ان کے اخلاص اور لوگوں کی تنقید کا آپس میں کوئی جوڑ نہ تھا۔ انھوں نے جو کہا خلوصِ نیت کے ساتھ کہا لیکن نتائج حوصلہ افزا نہ تھے۔ ان نتائج کی بنا پر لوگوں نے انگلی اٹھائی تو دردمندوں نے نقادوں کو یاد دلایا کہ ۱۹۷۰ء میں جب حوصلہ شکن نتائج نکلے تو بانی جماعتؒ نے فرمایا ''ہم نہیں ہارے قوم ہار گئی ہے۔'' لہٰذا اسلامک فرنٹ نہیں ہارا بلکہ قوم ہار گئی تھی۔ لیکن لوگوں نے دل شکن نتائج کو بھلانے سے انکار کر دیا اور یہ انکار قاضی صاحب کے لیے سوہانِ روح بنا رہا۔

حضرت میرِ کرم شاہؒ کے جنازے میں شرکت کے موقع پر جاتے ہوئے میں نے انھیں پنجابی کے اشعار سنائے جو مشہور رومانی داستان سوہنی مہینوال میں مہینوال نے کہے ہیں:

وسے بابلا بلخ دا دیس سکھی
اساں چھڈ گجرات نہ آوناں ایں
تخت بخت تے شان گمان دی ریجھ
کنڈے ککھ گجرات دے لکھ گلشن
میوہ بلخ دا تلخ نہ کھاوناں ایں

میں نے ویسے ہی سر راہے اشعار پڑھے تو قاضی صاحب کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ سرحد سے آکر پنجاب کی سرزمین کو شاداب کرنے والی شخصیت اندر اندر گھل رہی ہے اور اسے بلخ بخارا بھولا نہیں۔ یہ حقیقت مجھے اس روز ذہن نشین ہوئی

جس دن میں ان کی معیت میں کسی فوجی گورنر کے گھر تعزیت کے لیے گیا۔

یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ گورنر سرحد کے گھر واقع اسلام آباد میں پانچ، سات صد کے لگ بھگ سرکردہ اور سربرآوردہ لوگوں کا مجمع کالی واسکٹ اور قراقلی ٹوپی میں ملبوس قاضی حسین احمد کو دیکھتے ہی فوراً کھڑا ہو گیا۔ مجھے یاد آیا کہ اپنے وطن کا نامور انسان دوسرے صوبے میں جا کر اگر تنقید کا نشانہ بنے تو یہ درست بات نہیں۔

قاضی صاحب نے ۱۹۷۸ء سے لے کر آخری سانسوں تک سب کچھ تحریک کی نذر کر دیا اور کبھی ناگوار صورتحال کی وجہ سے افسوس کا اظہار نہ کیا۔

قاضی صاحب کی سیاست کا اصل نچوڑ ان کی دوہری دلعزیزی ہے جس کی بنا پر ہر محفل میں وہ محفل کی روح بن جاتے تھے۔ سیاسی لیڈروں کو قریب لانا وہ بخوبی جانتے تھے۔ اس طرح ان کا پیار و محبت ان کی سیاست کا محور بن گیا تھا۔ دوسرے اپنے موقف پر ڈٹ جانا اور پیچھے نہ ہٹنا بھی انھیں خوب آتا تھا۔

میں اُردو ڈائجسٹ میں لکھا کرتا تھا اور قاضی صاحب میری تحریریں پڑھا کرتے تھے۔ خصوصاً میرے پنجابی مضامین اور اشعار انھیں بڑے پسند تھے۔ میں نے انھیں ایک بار بتایا کہ ''رحمت اللہ'' کا پنجابی شاعر نے ترجمہ کیا جو جانفزا ہے ع

شالا ہونی وچ بہشتاں دے ڈیرے

آج جہاں میں ان کے درجات کی بلندی کی دعائیں کر رہا ہوں وہیں بار بار انھیں مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ ''شالا ہونی وچ بہشتاں دے ڈیرے۔''

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

ایک طرح دار تازہ افسانہ

روشن دان

ایک ناشکرے دل کا ماجرا،
اندھیرے میں پڑے پڑے اس پر
بہت بوجھ آگیا تھا

عفت گل اعزاز

احتشام

صاحب نے ہارن دیا، تو چوکیدار بھاگا بھاگا آیا اور جلدی سے دروازہ کھولا۔ انھوں نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور اتر کر گھر میں داخل ہوئے۔ سامنے ہی بیگم نظر آ گئی۔ انھوں نے حسبِ عادت میاں پر نظر ڈالی اور بولیں، ''آ گئے!''

''ہاں!'' انھوں نے اکتائے لہجے میں کہا اور لاؤنج میں پڑے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ڈھائی لاکھ روپے کا یہ صوفہ چند یوم قبل بیگم کی پسند پر خریدا گیا تھا۔ فرش پر دور تک خوشنما اور دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں پر انتہائی دیدہ زیب تصاویر سجی تھیں۔ بڑی اسکرین والا ایل سی ڈی سامنے والی دیوار پر آویزاں تھا۔ لاؤنج سے آگے، ڈرائنگ روم اور بیڈ روم بھی انتہائی دلکش اور مہنگے سازوسامان سے بھرے پڑے تھے۔ سامنے بیٹھی افشاں بیگم کی موٹی کلائیوں میں درجنوں کے حساب سے سونے کی چوڑیاں اور کڑے چمک رہے تھے۔ کانوں اور گلے میں ہیرے اور سچے موتیوں کے زیور تھے۔ قیمتی لباس سے ولایتی خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

غرض گھر میں وہ دھن دولت سامان عیش وعشرت سب کچھ تھا، جسے پانے کے لیے انسان سوجتن کرتا ہے۔ انھوں نے بھی جتن کیے تھے اور سب کچھ پالیا۔ ''مگر ایسا کیوں لگتا ہے جیسے خوشی جس چڑیا کا نام ہے، وہ اڑ کر کہیں دور جا چھپی؟ کچھ اچھا نہیں لگتا..... کسی چیز سے خوشی نہیں ملتی..... یوں لگتا ہے جیسے کسی اندھیرے کمرے میں بند ہو گیا ہوں۔ جہاں کوئی کھڑکی، کوئی روشن دان نہیں..... اے کاش کہیں سے کوئی روشنی کی کرن، تازہ ہوا کا کوئی جھونکا آئے۔'' احتشام صاحب خاموش اور اداس بیٹھے سوچ رہے تھے کہ افشاں بیگم کی آواز آئی ''کھانا کھالیں!''

''بھوک نہیں ہے۔''

''تھوڑا سا تو کھالیں..... اُٹھیں! ہاتھ منہ دھولیں۔'' افشاں بیگم نے کہا اور کھانا لگوانے اندر چلی گئیں۔ صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر بیٹھ گئے۔ سر بھاری ہو رہا تھا اور سینے پر جلن محسوس ہو رہی تھی۔ ملازم انھیں بلانے آیا۔ ''کھانا لگا دیا ہے صاحب!''

وہ ڈائننگ روم میں داخل ہوئے۔ میز پر طرح طرح کے کھانے سجے تھے۔ دو ملازم ہاتھ باندھے حکم کے منتظر تھے کہ صاحب کوئی چیز طلب کریں تو بہ سرعت انھیں پیش کر دیں۔ بیگم اور بچے بھی بیٹھے تھے۔ سب لوگ خوش خوش کھانا کھا رہے تھے۔

''پاپا کھائیں نا!'' نادیہ نے کہا، ''قورمہ بہت مزے کا ہے!'' اس نے سالن کا ڈونگا ابو کی طرف بڑھایا۔

انھوں نے تھوڑا سا سالن پلیٹ میں نکالا اور نوالے زبردستی کھائے۔

افشاں بیگم پلیٹ میں بریانی ڈال رہی تھیں۔ ''کھا نا!'' انھوں نے گویا حکم دیا۔ احتشام صاحب نے چمچے میں چاول لیے مگر منہ تک نہ لے جا سکے۔ چمچہ واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔ ''کیا ہوا؟'' افشاں بیگم نے حیرت اور برہمی سے انھیں دیکھ کر پوچھا۔

''دل نہیں چاہ رہا!'' احتشام صاحب بھی اپنی کیفیت سے پژمردہ تھے۔ میز طرح طرح کے کھانوں سے سجی تھی مگر ان کا کچھ بھی کھانے کو جی نہ چاہا۔ وہ سوچنے لگے ''کیا میرے نصیب سے کھانا اٹھ گیا ہے؟''

اچانک ان کی نظر کھڑکی پر پڑی، وہاں سے کوئی شخص گزرتا دکھائی دیا۔

''یہ آدمی کون ہے؟''

''شفیق مالی! برابر والی کوٹھی میں جو مالی بابا کام کرتا ہے، وہ لے کر آیا۔ کہتا تھا کہ اسے کام پر رکھ لیں، بہت ضرورت مند ہے۔'' افشاں بیگم نے بتایا، ''میں نے اسے رکھ لیا۔''

www.urdudigest.pk

بیگم گھر کے معاملات میں خود مختار تھیں، کسی نوکر کو نکال دیا، کوئی نیا ملازم رکھ لیا، یہ سب فیصلے وہی کرتی تھیں۔ احتشام صاحب کچھ نہ بولے اور آرام کرنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ بلڈ پریشر بڑھا ہوا تھا اور دل زندگی سے بیزار ہوا جا رہا تھا۔ بڑی دیر بعد نیند آئی۔ جب آنکھ کھلی تو شام ہو رہی تھی۔ طبیعت اب بھی سست اور بوجھل تھی۔ وہ باہر برآمدے میں نکل آئے۔ شفیق پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ اس نے انھیں دیکھا تو قریب آ کر سلام کیا۔

انھوں نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا، ''کیا نام ہے تمھارا؟''

''جی، محمد شفیق!'' وہ کام چھوڑ کر باادب کھڑا ہو گیا۔

احتشام صاحب نے دیکھا اس نے معمولی سی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ سر پر سفید ٹوپی تھی۔ سیاہ داڑھی تھی جو بہت بڑھ رہی تھی۔ چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ وہ زیادہ عمر کا نہیں لگتا تھا۔

''یہاں کب سے کام کر رہے ہو؟''

''جی ایک ہفتہ ہوا ہے۔''

''اچھا..... گھر کہاں ہے تمھارا؟''

''جی، مری کے پاس گاؤں ہے..... اُدھر ہی میرا گھر ہے۔''

''کہیں اور بھی کام کرتے ہو؟''

''جی، ایک اسکول میں مالی ہوں۔ دو بجے چھٹی ہو جاتی ہے۔ دو تین گھروں میں شام کو کام کرتا ہوں، یہی پودوں کی دیکھ بھال۔''

''اسکول سے تنخواہ کتنی ملتی ہے؟''

''ابھی تو تین ہزار روپے ملتے ہیں..... کچی نوکری ہے۔ پرنسپل صاحب نے کہا کہ اچھا کام کرو گے تو نوکری پکی ہو جائے گی۔ بڑا شکر ہے اللہ کا!'' اس کے چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ دیکھ کر احتشام صاحب سوچنے لگے ''کس قدر سیدھا سادہ آدمی ہے، کچی نوکری اور تین ہزار کی تنخواہ پر بھی خوش ہے۔''

''بیوی بچے ہیں؟''

''جی صاحب ہیں..... میرے والدین ہیں۔ دو چھوٹی بہنیں ہیں، بیوی ہے وہ بہت اچھی ہے، میرے امی ابا کی بہت خدمت کرتی ہے..... میرا ایک بیٹا ہے..... میرے گھر والے کہتے ہیں، تم شہر جا کر کام کرو، یہاں کی فکر نہ کرو..... صاحب مجھے اپنے گھر والے یاد آتے ہیں، مگر بیٹا سب سے زیادہ یاد آتا ہے۔ ابھی چھ مہینے کا ہے۔ محمد سلمان نام ہے۔'' وہ خوش ہو کر بتانے لگا۔

''گھر کب جاتے ہو؟''

''جی، بس پہلی تاریخ کو تنخواہ ملے گی تو جاؤں گا، اپنے گھر والوں ہی کے لیے محنت مزدوری کرتا ہوں۔''

احتشام صاحب بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔

''صاحب! میں گاؤں گیا تو آپ کے لیے اخروٹ لاؤں گا۔ وہاں اخروٹ بڑے اچھے ہوتے ہیں۔'' وہ بڑے خلوص سے بولا۔

''نہیں نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔'' احتشام صاحب نے کہا۔ انھیں شفیق اچھا لگا، سیدھا سادا اور معصوم سا۔

''تمھیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتانا۔'' انھوں نے شفقت سے کہا۔

''نہیں صاحب۔ بہت مہربانی۔'' اس نے مہذب انداز میں کہا پھر وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ احتشام صاحب پھولوں سے بھرے سرسبز باغ میں چہل قدمی کرنے لگے۔ اچانک انھیں قریب سے آواز آئی۔ ''یا اللہ! تیرا شکر ہے۔'' وہ حیران ہوئے، مڑ کر دیکھا تو یہ شفیق کی آواز تھی۔ پتا نہیں کس بات پر اللہ کا شکر ادا کر رہا ہے؟ انھوں نے سوچا اور وہیں رکھی

کرسی پر بیٹھ گئے۔

آج انھیں گزرا ہوا زمانہ یاد آنے لگا۔ والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ ماں نے مزدوری کر کے انھیں پڑھایا اور انجینئر بنایا۔ وہ نوکری حاصل کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے کہ ایک دفتر میں عارضی ملازمت مل گئی۔ انھوں نے اتنی محنت اور جاں فشانی سے کام کیا کہ فیکٹری کے مالک نے بہترین کارکردگی دیکھ کر ملازمت پکی کر دی پھر ان پر مہربانیاں کر کے انھیں آمادہ کر لیا کہ وہ اس کی اکلوتی بیٹی سے شادی کر لے۔ سانولے رنگ والی بدمزاج افشاں کو دیکھ کر ان کے احساسات پر اوس سی پڑ گئی۔ یہ وہ لڑکی نہیں تھی جس کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ مگر انکار کی صورت میں نوکری جانے کا خطرہ تھا اور پھر وہی غم روزگار اور حوادث زمانہ، ناچار ہامی بھرنا پڑی۔

وہ مالک کی بڑی سی کوٹھی میں گھر داماد بن کر رہنے لگے۔ قیمتی گاڑی، نوکر چاکر، زندگی کے عیش و آرام، سب کچھ مل گئے مگر زندگی کی خوشی کہیں جا چھپی۔ دل کی تہہ میں جامد اداسی بیٹھ گئی۔ اب ہنسنے مسکرانے کو جی نہ چاہتا۔ وہ گھنٹوں کھوئے کھوئے سے خاموش بیٹھے رہتے۔ افشاں بیگم انھیں اپنا زرخرید غلام سمجھتی۔ ان کا کام بیگم کی ہاں میں ہاں ملانا تھا۔ افشاں بیگم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ ان کی ماں اور بہنوں سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گی۔ چنانچہ وہ ماں کے ساتھ رہ سکے نہ خدمت کر سکے۔

ماں نے ان کے لیے بڑی قربانیاں دی تھیں۔ وہ انھیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔ مگر افشاں کی وجہ سے دعائیں دینے والی ماں کے ساتھ رہنے کا خواب چکنا چور ہو گیا۔ البتہ وہ مہینے دو مہینے بعد ماں بہنوں سے مل آتے۔ وقت گزرتا رہا۔ اسی دوران دونوں بہنوں کی شادی ہو گئی پھر وہ ماں بھی دنیا سے رخصت ہوئی۔ کاروبار میں انھوں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا، کامیابی

ان کے قدم چومتی گئی۔ وہ ہر وقت کاروبار میں ا[illegible] رہتے۔ فیکٹریوں کی تعداد اور ملازمین کی تعداد بڑھ گئی۔ بینک بیلنس، انکم ٹیکس کے چکر، بیرون ملک دورے، ہوائی جہازوں کے سفر نے زندگی کو بڑا پیچیدہ بنا دیا۔ دولت رکھنا اور سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

زندگی کچھ ایسے رنگ ڈھنگ اختیار کر گئی جیسے کسی سخت ڈیوٹی ہو۔ بلڈ پریشر بڑھ گیا، سر بوجھل رہتا، رات نیند نہ آتی۔ رات بھر کروٹیں بدلتے بدلتے وہ عاجز جاتے۔ آنکھیں نیند کو ترستی، طبیعت اتنی پریشان ہوتی وہ اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ کبھی لاؤنج میں جا کر ٹی وی چلا[illegible] مگر کوئی پروگرام اچھا نہ لگتا۔ اکتا کے ٹی وی بند کر دیتے۔ ڈاکٹروں نے طبیعت خراب ہونے کے باعث نمک [illegible] اور چکنائی، سب چیزوں سے منع کر دیا۔ فرج پھل، مٹھائیوں اور لذیذ کھانوں سے بھرا ہوتا مگر اشتہا ختم ہو[illegible] تقدیر نے ان کے ساتھ عجیب کھیل کھیلا، سب کچھ [illegible] کے صحت چھین لی۔ وہ اکثر سوچتے، ''میری زندگی کیا [illegible] گئی ہے؟ جیسے کوئی ٹنڈ منڈ درخت جس پر خوشی [illegible] پھول نہیں کھلتا۔ خدایا کیا کروں؟''

☆☆

رات کو نیند پوری نہ ہوئی۔ لہٰذا صبح طبیعت سست بھاری تھی۔ وہ فیکٹری نہیں گئے اور بستر پر لیٹ کر سو[illegible] کوشش کرنے لگے۔ آنکھ کھلی تو یونہی باہر نکل [illegible] سامنے شفیق نظر آیا جو سائیکل پکڑے جا رہا تھا۔ صاحب [illegible] دیکھ کر سلام کیا۔ انھوں نے خیر خیریت پوچھی۔

''جی اللہ کا شکر ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ [illegible] بولا، ''بڑی بھوک لگی ہے..... دال صبح ہی پکا کر [illegible] اب روٹی بناؤں گا۔'' پھر اخلاقاً کہا، ''صاحب [illegible] آئیں نا میرے گھر، ہم غریبوں کے گھر کی [illegible] کھائیں..... مگر آپ تو بڑے لوگ ہیں۔'' [illegible] عاجزانہ لہجے میں بولا۔

احتشام صاحب نے سوچا، ''یہ بڑا عجیب دعوت نامہ ہے..... ان جیسا بڑا سرمایہ دار، اتنی بڑی کوٹھی میں رہنے والا، عمدہ کھانوں کا عادی اور سرونٹ کوارٹر میں رہنے والے ایک عام مالی کی دعوت۔'' پھر انھیں کبھی کی سنی حدیث یاد آ گئی، ''اگر کوئی مسلمان تمھیں کھانے کی دعوت دے تو تم اسے قبول کرو۔''

''اچھا، ہم آتے ہیں۔'' انھوں نے مسکرا کر کہا۔

شفیق نے بے یقینی سے پوچھا، ''سچ؟ آپ آئیں گے میرے گھر؟''

''ہاں ہاں! ضرور آئیں گے۔ تم نے اتنی محبت سے بلایا ہے۔''

''اچھا! میں کھانا تیار کرتا ہوں۔'' شفیق اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

آدھے گھنٹے بعد احتشام صاحب نے اس کے کمرے پر دستک دی۔

''آیئے آیئے صاحب، اندر آ جائیں۔'' وہ بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔ احتشام صاحب اندر آئے تو دیکھا کہ کمرے میں بان کی ایک چارپائی پڑی ہے۔ ایک طرف فرش پر جائے نماز بچھی ہے۔ کونے میں چند برتن رکھے ہیں اور چولہے پر ہانڈی چڑھی ہے۔ بس یہی کچھ سامان تھا کمرے میں۔

''مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے، آپ کے آنے سے۔'' وہ جلدی سے چارپائی پر چادر بچھانے لگا۔ ''آپ بیٹھیں صاحب۔'' پھر وہ جائے نماز تہہ کرنے لگا۔

''تم نماز پڑھ رہے تھے؟'' انھوں نے پوچھا۔

''جی۔ پڑھ لی نماز۔ دال گرم ہو گئی، میں روٹی ڈالتا ہوں..... بس پانچ منٹ لگیں گے۔ اس نے روٹیاں بنائیں اور معمولی سے برتنوں میں کھانا نکال کے سامنے رکھ دیا۔ ''صاحب! بسم اللہ کریں۔'' وہ محبت سے بولا

احتشام صاحب نے روٹی کا نوالہ توڑا، اسے دال کے ساتھ لگایا اور منہ میں رکھ لیا۔ وہ کھانا انھیں اتنا مزے دار لگا کہ وہ کھاتے ہی چلے گئے۔ شفیق بھی کھانا کھا رہا تھا۔

''صاحب۔ اچھی طرح کھایئے۔ بس معمولی سا کھانا ہے۔''

''شفیق۔ یہ تو بہت اچھا کھانا ہے..... بہت مزے دار۔''

''بس جی..... غریب کے گھر کا کھانا ہے۔'' وہ بار بار عاجزی سے یہی بات کہے جا رہا تھا۔ ان کی پلیٹ میں دال ختم ہو گئی تو اس نے اور دال ڈال دی۔

''اللہ کا شکر ہے جی آپ کو یہ سادہ سا کھانا پسند آیا۔'' شفیق بولا۔

وہ سوچنے لگے، ''شفیق دن بھر محنت مزدوری کرتا اور تھکا ہارا گھر میں گھستا ہے۔ تب اسے سخت بھوک لگی ہوتی ہے۔ وہ خود ہی اپنے لیے کھانا تیار کرتا ہے۔ بھوک میں سادہ کھانے کا ہر نوالہ بھی مزے کا لگتا ہے۔ وہ رات کو سکون کی نیند سوتا ہے۔ کتنا مطمئن ہے اپنی زندگی سے۔ ایک میں ہوں کہ ان کا جی چاہا کہ اس سے پوچھیں، تم جو اتنے خوش، مطمئن اور غموں سے بے نیاز نظر آئے ہو، اس کا راز کیا ہے؟ مگر اتنا بڑا کروڑ پتی آدمی، ایک معمولی سے ملازم سے یہ راز بھلا کیسے پوچھے؟ وہ باہر نکل آئے۔

☆☆

چند دن بعد وہ برآمدے میں بیٹھے تھے۔ شفیق کچھ فاصلے پر بیٹھا پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ افشاں بیگم بھی لان میں آ گئیں۔ انھوں نے ملازم سے چائے لانے کو کہا، ''اب کیسی ہے تمھاری طبیعت؟'' افشاں بیگم نے پوچھا۔

احتشام صاحب کو دنیا میں سب سے بُرا کوئی لگتا تھا تو وہ بیگم ہی تھیں۔ کبھی کبھی تو ان سے بات کرنے کو بھی جی نہ چاہتا۔ اس وقت بھی انھوں نے کوئی جواب نہ دیا اور شفیق کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ کھڑا ہوا تو ہولے سے بولا، ''اللہ تیرا شکر ہے۔''

www.urdudigest.pk

یہ سن کر احتشام صاحب حیران رہ گئے اور سوچنے لگے ''بیٹھ کر اٹھنے میں شکر کی کون سی بات ہے؟'' شفیق پانی کا پائپ سنبھالے برآمدے کے کونے کی طرف چلا گیا۔ ملازم نے چائے کا پیالہ انھیں پکڑایا۔ افشاں بیگم کب اٹھ کر اندر گئیں، انھیں پتا نہ چلا۔ شفیق اب گلاب کی جھاڑیوں سے سوکھے پتے توڑ توڑ کر نیچے گرا رہا تھا۔ پھر اس نے پتے اور ٹہنیاں اکٹھی کیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر نیچے بیٹھا تو پھر اس کی آواز آئی ''اللہ! تیرا شکر ہے۔'' وہ پھر کیاری کی زمین میں گوڈی کرنے لگا۔

''شفیق!'' انھوں نے اسے پکارا۔

''جی صاحب!'' وہ فوراً متوجہ ہوا۔

''تم اٹھتے ہو تو، بیٹھتے ہو تو کہتے ہو اللہ! تیرا شکر ہے۔'' وہ تعجب سے بولے

''جی صاحب۔ یہ میری عادت ہے۔ میرے ابا جی کہتے ہیں کہ جو بندے اللہ پاک کا شکر ادا کرتے ہیں، اللہ اُن سے راضی رہتا ہے۔''

''مگر کھڑے ہونے میں کیا خاص بات ہے؟'' انھوں نے پوچھا

''اس لیے کہ انسان دو پیروں پر سیدھا کھڑا ہوتا اور چلتا ہے تو اللہ پاک کے کرم سے۔ جانور چار پیروں پر چلتے ہیں اور ان کا سر نیچے جھکا رہتا ہے۔ ہمارا سر اٹھا کر کھڑا ہونا، دو پیروں پر چلنا اور کام کرنا، یہ سب اللہ تعالیٰ کے کرم سے ہے۔ اس پر شکر ادا کرنا واجب ہے نا جی!''

احتشام صاحب نے یوں سر ہلایا گویا بات ان کی سمجھ میں آگئی۔

''ہمارے گاؤں میں اکرم چاچا رہتا ہے، وہ چل نہیں سکتا۔ اسے کچھ بیماری ہوگئی تھی۔ زہر پھیل رہا تھا، اس لیے ڈاکٹروں نے اس کی ٹانگیں کاٹ دیں..... وہ ٹانگوں سے معذور ہوگیا۔ صاحب! تندرستی بڑی نعمت ہے۔''

''بے شک!'' احتشام صاحب نے کہا

''میرے ابا جی کو پہلے ٹھیک نظر آتا تھا۔ پھر انھیں دھندلا نظر آنے لگا۔ ہم نے ڈاکٹروں کو دکھایا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا..... اب انھیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ صاحب، جن کی آنکھیں سلامت ہوں انھیں ہر وقت اپنے رب کا شکر ادا کرنا چاہیے۔''

وہ ذرا دیر خاموش رہا پھر بولا ''بندہ بڑا ناشکرا ہے..... وہ اپنے رب کی نعمتوں پر شکر ادا نہیں کرتا..... اس دھوکے میں رہتا ہے کہ جو کچھ میرے پاس ہے، وہ میں نے خود حاصل کیا۔'' وہ بولتا جا رہا تھا اور احتشام صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کے دل پر پڑے پردے اٹھتے جا رہے ہیں اور روشنی پھیل رہی ہو۔

''میرے پاس جو یہ دولت ہے، کوٹھی، گاڑیاں، بیوی بچے، یہ سب کچھ اللہ نے دیا۔ وہ بیوی جو میری پسند کی نہیں مگر میری گھر والی ہے، میرے بچوں کی ماں..... اور میری وفادار بھی ہے..... خدا نے مجھے ہر نعمت دی..... مگر میں نے کبھی اللہ کا خاص شکر ادا نہ کیا، ہمیشہ یہی سمجھا کہ یہ سب میں نے اپنے زور بازو سے حاصل کیا۔''

انھیں شفیق پر رشک محسوس ہوا۔ معمولی سی روٹی کھا کر اور پانی پی کے، بان کی چارپائی پر اطمینان کی نیند سونے والے کا دل اپنے رب کی شکر گزاری سے تڑپ سکتا ہے۔ ایک میں ہوں کہ سب کچھ ہونے کے باوجود میری زندگی میں کمی ہے..... کس چیز کی کمی؟ وہ اللہ ہے شکر کی! ہاں! جس رب نے مجھے یہ سب کچھ دیا اس کا شکر ادا کرنا چاہیے..... اے میرے رب، تیرا شکر ہے، لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلا اور انھیں یوں لگا جیسے دل کا بوجھ کہیں غائب ہوگیا۔ مدتوں سے بند روشنی دان کھل گیا، اندھیرے چھٹ گئے اور ہر طرف روشنی پھیل گئی۔

ایک محسن کا تذکرہ، وہ کوئی انسان نہیں ایک لفافہ تھا

چنوں کا لفافہ

کبھی عادتیں زندگی کا یوں بھی حسن بڑھاتی ہیں

جاوید چوہدری

پاکستان کے مقبول کالم نگار ہی نہیں ایکسپریس ٹی وی کے پروگرام ''کل تک'' کے میزبان بھی ہیں

میں نے چنوں کے آخری دانے منہ میں ڈالے، کاغذ کے لفافے کی گیند سی بنائی آگے پیچھے دیکھا، دور کونے میں ''ڈسٹ بن'' تھی۔ میں اس کی طرف چل پڑا، قریب پہنچا، کچھ سوچا اور واپس آگیا، لفافے کی گیند اسی طرح میری مٹھی میں دبی تھی۔

مجھ سے کالج اور یونیورسٹیوں کے نوجوان اکثر مطالعہ کرنے کا طریقہ پوچھتے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں ہمیں کون کون سی کتابیں پڑھنی چاہئیں، ہمیں علم کہاں سے حاصل کرنا چاہیے اور ہم پڑھی ہوئی چیزوں کو یاد کیسے رکھ سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے سوال ہمیشہ میری دلچسپی کا موضوع رہے۔ ان سے کہتا ہوں بھائیو اور بہنو، مطالعہ ایک شوق نہیں، ایک عادت، ایک لت ہوتی ہے۔ جس شخص کو یہ لت پڑ جائے اسے پھر اس قسم کے سوالوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ آپ مجھ سے یہ پوچھ سکتے ہیں۔ یہ لت پڑتی کیسے ہے؟ ہم مطالعے کو اپنی عادت کیسے بنا سکتے ہیں؟ اس کا صرف ایک طریقہ ہے کہ اپنی زندگی کا ہر اضافی پل، ہر اضافی لمحہ مطالعے کو دے دیں۔ میں نے ایک لمبی جدوجہد کے بعد مطالعے کو عادت بنا لیا ہے۔ میرے سامنے جو چیز آتی ہے میں اسے اٹھاتا ہوں اور

پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ میں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا ہوں تو پلیٹس الٹی کر کے کمپنی کا نام پڑھنے لگتا ہوں۔ چمچوں، چھریوں اور کانٹوں پر کھدے مارکے اور نشان دیکھنے لگتا ہوں۔ اخبار کا ٹکڑا مل جائے، ٹشو پیپر کا ڈبا ہو، دوا کا بروشر ہو، گولیوں کی ڈبی ہو، کوئی میگزین ہو، سامنے کوئی سائن بورڈ ہو، بیرے کے سینے پر لگی نیم پلیٹ ہو یا عینک کے فریم پر کندہ لفظ ہوں، میں فوراً پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ میری یہ عادت اس قدر پختہ ہو چکی ہے کہ میں غیر ممالک کے سفر کے دوران وہاں کے مقامی اخبارات اور میگزین تک پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ان کی زبان میرے لیے اجنبی ہوتی ہے لیکن میں تصویروں اور نقشوں کی مدد سے انھیں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک بار میں نے ہسپانوی زبان کا اخبار خریدا اور ایک دوست کی مدد سے اس کی ساری سرخیاں پڑھ گیا۔ اس مشقت کے دوران میں خود کو ہسپانوی زبان کا ٹھیک ٹھاک ''عالم'' سمجھنے لگا۔ میں جہاں جاتا ہوں وہاں کوئی نہ کوئی کاغذ تلاش کر لیتا ہوں اور گفتگو کے دوران آنے والے وقفوں میں وہ کاغذ پڑھ جاتا ہوں۔ میری جیب اور میری ڈائری میں بھی اکثر کوئی نہ کوئی تراشا، کوئی نہ کوئی مضمون پڑا ہوتا ہے۔ میں اگر ٹریفک میں پھنس جاؤں یا مجھے کسی کا انتظار کرنا پڑے تو میں فوراً وہ تراشا نکالتا ہوں اور اسے پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ رہی کتابیں اور اخبارات تو ان کے بارے میں میرا خیال ہے دنیا کی کوئی کتاب فضول اور کوئی اخبار بے کار نہیں ہوتا اور جو شخص روزانہ دو گھنٹے مطالعہ نہیں کرتا اسے خود کو پڑھا لکھا نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس کی ساری سندیں اور ساری ڈگریاں ضبط ہونی چاہئیں۔ یہ تو تھی مطالعے کی بات۔ اب میں آپ کو ایک اور دلچسپ عادت بتاتا ہوں۔

گزشتہ ۲۰ برس سے میں جب بھی بازار سے کوئی سودا خریدتا ہوں اور دکاندار مجھے یہ سودا کسی اخباری کاغذ میں لپیٹ کر دیتا ہے یا یہ سودا مجھے کسی کتاب یا اخبار کے ورق سے بنے لفافے میں ملتا ہے تو میں واپسی پر وہ لفافہ، وہ کاغذ سیدھا کرتا ہوں اور اس کا ایک ایک لفظ پڑھ جاتا ہوں۔ اس عجیب و غریب عادت کی وجہ میری عجیب و غریب سوچ ہے۔ میں سمجھتا ہوں خوراک کی طرح فقرے اور لفظ بھی آپ کا رزق ہوتے ہیں اور قدرت مختلف حیلوں اور بہانوں کے ذریعے یہ رزق آپ تک پہنچاتی ہے۔ چنانچہ یقین کیجیے آج تک وہ تمام لفظ، وہ تمام فقرے جنھوں نے میری زندگی میں بنیادی کردار ادا کیا، جنھوں نے میری سوچ، میرے عمل کے دھارے بدل دیے وہ فقرے، وہ لفظ مجھے انہی لفافوں، اخبار کے انہی کٹے پھٹے کاغذوں سے ملے چنانچہ میری زندگی میں یہ لفافے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

دیکھیے بات کہاں سے چلی اور کدھر نکل گئی۔ میں آپ سے عرض کر رہا تھا میں چنوں کا لفافہ ڈسٹ بن میں پھینکنے لگا تھا لیکن کچرے کی ٹوکری کے قریب پہنچ کر واپس آ گیا۔ مجھے اچانک یاد آیا، میں یہ لفافہ پڑھے بغیر پھینک رہا ہوں۔ میں واپس گاڑی میں بیٹھا، کاغذ کی گیند کھولی، لفافہ سیدھا کیا، اس کے کنارے کھولے اور اسے چھوٹی میں پھیلا کر پڑھنے لگا۔ نفسیات کی کسی کتاب کا ایک ورق تھا۔ اس ورق پر ولیم جیمز کا ایک نہایت خوبصورت فلسفہ درج تھا۔ میں ولیم جیمز کے بارے میں بس اتنا جانتا تھا یہ ایک معروف نفسیات دان تھا اور خود کو سگمنڈ فرائیڈ کا شاگرد کہتا تھا، باقی اس نے زندگی میں کیا کیا کام کیے میں ان سے نابلد تھا لیکن اس کاغذ پر درج وہ فلسفہ کمال

جو شخص روزانہ دو گھنٹے مطالعہ نہیں کرتا اسے خود کو پڑھا لکھا نہیں کہنا چاہیے۔

اس کی ساری سندیں اور ساری ڈگریاں ضبط ہونی چاہئیں

تھا۔ اس نے کہا ''انسان کے ہر جذبے کے ساتھ ایک فعل وابستہ ہوتا ہے۔ مثلاً اگر وہ دکھی ہو تو وہ روتا ہے، وہ خوش ہو تو ہنستا ہے، وہ غصے میں آئے تو چیختا چلاتا ہے، وہ محبت کرے تو پچکارتا ہے، بوسہ لیتا ہے، وہ خوفزدہ ہو تو بھاگتا ہے، کامیاب ہو تو چھلانگیں لگاتا ہے، تالیاں پیٹتا ہے اور بھوکا ہو تو مدیدے پن کا مظاہرہ کرتا ہے۔'' ولیم جیمز کی یہ بات یہاں تک تو عام روزمرہ کا مشاہدہ تھا لیکن آگے چل کر وہ کہتا ہے ''اگر انسان اس عمل کو اُلٹا دے، وہ کسی جذبے سے وابستہ فعل یا عمل دہرانا شروع کر دے تو تھوڑی ہی دیر میں اس میں اس عمل یا اس فعل سے وابستہ جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص بڑا ریلیکس بیٹھا ہو وہ اٹھے اور اٹھ کر ناراضی اور غصے کی ایکٹنگ شروع کر دے، چیخنے چلانے لگے تو تھوڑی دیر بعد اس کے جسم میں حقیقتاً غصہ پیدا ہو جائے گا۔ ان دنوں میری شوگر عروج پر تھی۔ شوگر کا ایک اثر انسانی مزاج پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ انسان چڑچڑا، اداس اور چڑچڑا رہنے لگتا ہے، وہ مرکیورس ہو جاتا ہے، پل میں تولہ، پل میں ماشہ، ذرا سی بات اسے بدمزاج اور کڑا کا بنا دیتی ہے۔ ان دنوں میری شوگر آؤٹ آف

> اگر کوئی شخص غصے سے بھرا بیٹھا ہو لیکن وہ اوپری دل سے خوش مزاجی اور وضع داری کی ایکٹنگ شروع کر دے، وہ ہر ملاقاتی سے اٹھ کر ملے اور ناگوار سے ناگوار بات بھی ہنس کر برداشت کر لے تو ذرا دیر بعد خوش مزاجی اس کے غصے کی جگہ لے لے گی۔ وہ حقیقتاً خوشگوار اور ہلکا پھلکا ہو جائے گا۔''

کنٹرول تھی۔ لہٰذا ان دنوں میں خود کو تنہا اور اداس محسوس کرتا تھا، لوگوں کی ہنسی، لوگوں کا مذاق گولی کی طرح میرے سینے پر لگتا تھا۔ اس وقت ولیم جیمز کے یہ الفاظ الہام کی طرح میرے اوپر اترے۔ لہٰذا اس لفافے نے میرا مقدر، میری زندگی بدل دی۔ اس کے بعد میں نے برے لمحات میں خوشی اور خوشی کے عمل کو اپنا معمول بنا لیا۔ لہٰذا میں چند ہی دنوں میں نارمل اور خوشگوار زندگی گزارنے لگا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے مجھے جب بھی غصہ آتا ہے، میں جب بھی چڑچڑے پن کا شکار ہوتا ہوں تو میں ہنسنا شروع کر دیتا ہوں۔ میں لوگوں کو لطائف سنانا شروع کر دیتا ہوں، میں جب بے زار اور اداس ہوتا ہوں، تنہائی اور اکیلے پن کا شکار ہونے لگتا ہوں تو میں دن میں دو دو بار شیو کرتا ہوں، بہترین سوٹ پہنتا ہوں، اعلیٰ خوشبو لگاتا ہوں، گاڑی کی سروس کراتا ہوں، اسے پالش کراتا ہوں اور اپنے دوستوں سے ملاقات کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہوں، لوگوں کو دعوت دیتا ہوں، نوجوان بچے اور بچیوں سے گپ لگاتا ہوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زندگی کے مثبت پہلوؤں پر لیکچر دیتا ہوں، مزاحیہ لٹریچر پڑھتا اور کارٹون فلمیں دیکھتا ہوں۔ شاپنگ کرتا ہوں، اچھی فلمیں دیکھتا ہوں، دوستوں کے ساتھ لمبی لمبی سیریں کرتا ہوں اور نیکی کے کام کرتا ہوں اور چند ہی گھنٹوں، چند ہی دنوں میں میرا مورال کہیں سے کہیں چلا جاتا ہے۔ میں اپنے اندر نئی قوت، نئی حرارت محسوس کرتا ہوں، میرے بُرے موڈ کے دنوں میں اگر گلاس ٹوٹ جاتا ہے تو میں یہ سوچ کر خوش ہوتا ہوں ''چلو اچھا ہوا، اب پرانے گلاس کی جگہ نیا آئے گا، اس سوچ کے باوجود اگر میرا افسوس ختم نہ ہو تو میں شام کو نئے گلاس لے آتا ہوں، یہ نئے گلاس، پرانے گلاس کا دُکھ دور کر دیتے ہیں۔ ان دنوں اگر بچے شور مچانے لگیں اور ان کا شور میرے مزاج پر تیزاب کی طرح گرنے لگے تو میں انھیں ڈانٹنے کے بجائے ان کے ساتھ مل کر شور مچانے لگتا ہوں، میں ان کے کھیل میں شامل ہو جاتا ہوں۔ یقین کیجیے، بچوں کے یہ کھیل میری سنجیدگی، میری اداسی کو بہا لے جاتے ہیں، میں نارمل ہو جاتا ہوں۔

چنوں کا وہ لفافہ اور ولیم جیمز دونوں میرے محسن ہیں، ان دونوں نے مجھے زندگی کا نیا رخ، نیا پہلو دکھایا۔ زندگی کے اس پہلو، اس رخ نے مجھے زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھایا۔ لہٰذا میں دن رات ولیم جیمز اور چنوں کے لفافے کا شکریہ ادا کرتا ہوں، میں اپنے رب کا شکر گزار ہوتا ہوں۔

سائنس پریشان کن سائنسی دریافتیں

سائنس و ٹیکنالوجی

عبدالہادی سید

پچھلے ۲ر سو برس میں سائنس نے بنی نوع انسان کو کئی فوائد پہنچائے ہیں۔ سائنسی دریافتوں کی بدولت ہی اب انسان آرام و آسائش کی زندگی گزار رہا ہے۔ لیکن گزشتہ چند برس میں کچھ ایسی دریافتیں بھی سامنے آئیں جو ہمارے لیے تشویش کا باعث اور خاصی پریشان کن بن گئیں۔ انھی دریافتوں میں سے ۹ر کا ذکر درج ذیل ہے:

۱۔ جراثیم ہم پر غالب آرہے ہیں

اینٹی بائیوٹک ادویہ اور ویکسین اب تک لاکھوں کروڑوں انسانوں کی جانیں بچا چکی ہیں۔ اگر جدید طب کے یہ کرشمے نہ ہوتے تو یقیناً ہزارہا بچے پولیو، چیچک، خسرہ وغیرہ کے باعث اگلے جہان پہنچ چکے ہوتے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بعض بیماریوں کے جراثیم اتنی تیزی سے افزائش پذیر ہیں کہ ابھی ایک بیماری ختم کرنے کی دوا ایجاد نہیں ہوتی کہ دوسری سامنے آجاتی ہے۔

مثال کے طور پر جنوری ۲۰۱۳ء میں انفلوئنزہ وائرس کی نئی قسم سامنے آچکی۔ چنانچہ پچھلے سال کی ویکسین عموماً اسے ختم نہیں کر پاتی۔ اسی طرح خصوصاً غریب ممالک کے ہسپتالوں میں اینٹی بائیوٹک دوا سے ختم نہ ہونے والا جرثومہ، سٹافائلوکوکس (Staphylococcus) عام ملتا ہے۔ یہ جرثومہ عام زخم میں چھوت پیدا کر کے انسانی جان خطرے میں ڈال سکتا ہے۔

مزید برآں جانوروں سے انسانوں میں نت نئی بیماریاں منتقل ہو رہی ہیں۔ مثلاً بندروں سے ایبولا (Ebola)، مشک بلاؤ سے سارس (SARS)، کترنے والے جانوروں سے ہانٹا وائرس (Hanta virus)، پرندوں سے برڈ فلو اور خنزیر سے سوائن فلو نامی بیماریاں۔

حتیٰ کہ فلسفی فریڈرک شوپن اور امریکی صدر ہنری ڈیوڈ تھیورو کی جان لینے والا دق بھی واپس آچکا۔ دراصل اس مرض کی بعض اقسام اپنے اندر اینٹی بائیوٹک ادویہ سے موافقت پیدا کر چکی ہیں۔ لہٰذا ماہرین کا خیال ہے کہ یہ بیماری اکیسویں صدی میں بھی انسانوں کو نشانہ بنائے گی۔ اسی لیے اس سائنسی دریافت نے لوگوں کو اتنا خوف زدہ کر دیا ہے

www.urdudigest.pk

کہ پالتو جانوروں کو ہاتھ لگانے سے بھی ڈرتے ہیں۔ ہر جگہ کوئی نہ کوئی بیماری ان کی منتظر ہوتی ہے۔

۲۔ چھٹی معدومی کا آغاز

ماہرین اثریات کا کہنا ہے کہ ماضی میں مختلف وجوہ (شہاب ثاقب کی گردش، آتش فشاں پھٹنے، آب و ہوا میں تبدیلیوں) کی بنا پر معدومی (Extinction) کے چھ دور جنم لے چکے۔ ان ادوار میں کرہ ارض سے جانوروں کی کئی اقسام اور نسلیں ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گئیں۔

حیاتیات ماہرین کی رو سے بیسویں صدی میں ''چھٹی عظیم معدومی'' کا آغاز ہو چکا۔ اس دور میں چرند پرند کی کئی نسلیں صفحہ ہستی سے مٹ چکی ہیں اور اب بڑے جانوروں کی باری آرہی ہے۔ مثلاً شمالی امریکا میں ممدندا (Mastodon)، آسٹریلیا میں دیوہیکل کینگرو اور یورپ میں بونے ہاتھی مٹنے کے خطرے سے دوچار ہیں۔

پہلے ۵ر ادوار میں معدومی کی وجوہ واضح نہیں، لیکن چھٹی کا باعث واضح طور پر انسان بنے ہیں۔ حد سے زیادہ شکار، جنگلات کی تباہی، امراض کے پھیلنے اور بیرونی نسلیں متعارف کرانے کے باعث دنیا بھر میں کئی حیوان معدوم ہو رہے ہیں۔

۳۔ آپ کا دماغ اپنا نہیں

گزشتہ ایک سو برس میں ماہر نفسیات سگمنڈ فرائیڈ کے کئی نظریات غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ لیکن اس کے کم از کم ایک نظریے پہ سائنس دانوں نے مہر تصدیق ثبت کر دی..... وہ یہ کہ ہمارے کئی رویے، جذبات اور یقین ان عناصر کی وجہ سے جنم لیتے ہیں جنھیں ہم نہیں جانتے۔

مثال کے طور پر اگر آپ کا مزاج خوشگوار اور امید پرستانہ ہے تو موسم کی خبر لیجیے۔ جب سورج نکلا ہو اور ماحول تروتازہ ہو تو لوگ عموماً خوش ہوتے اور مددگار بنتے ہیں۔ اسی طرح ذائقہ چکھنے کے امتحان میں جو نمونہ انسان پہلے چکھے، وہی اسے پسند آتا ہے، چاہے جتنے بھی نمونے چکھ لے۔ اسی طرح ہم جس شخص یا شے کو بار بار دیکھیں تو وہ ہمیں پسند آنے لگتی ہے۔

حال ہی میں ماہرین نفسیات نے دریافت کیا ہے کہ ہمارے دماغ میں یادیں پختہ نہیں ہوتیں اور ان میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک انسان اپنے زاویہ نگاہ کے مطابق کسی بھی واقعے کو منفی یا مثبت رنگ دے ڈالتا ہے اور حیران کن طور پر اس کی یادیں بھی اسی زاویہ نگاہ کے مطابق ڈھل جاتی ہیں۔

۴۔ ہم دنیا کی آب و ہوا تبدیل کر چکے

دنیا بھر میں عالمی گرماؤ (گلوبل وارمنگ) اور آب و ہوا کی تبدیلیوں کے حوالے سے شور برپا ہے۔ کئی لوگ اس اُعجوبے کو پیچیدہ سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بہت سادہ ہے۔ ہم جب ایندھن (پٹرول، کوئلہ، گیس) جلائیں تو کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج ہوتی ہے۔ یہ گیس فضا میں پہنچتی، زمین سے اٹھنے والی حرارت دبوچتی اور اسے واپس کرہ ارض کی طرف پھینک دیتی ہے۔

اسی غیر فطری عمل کے باعث دنیا میں گرمی بڑھ رہی ہے۔ پہاڑوں پر گلیشیئر پگھل رہے ہیں۔ پھول وقت سے پہلے کھلتے ہیں اور جانور اور پودے ٹھنڈک کی تلاش میں بلندیوں کی طرف جا رہے ہیں۔

بنی نوع انسان کے لیے خطرناک بات یہ ہے کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ آنے والے کئی سو برس تک فضا میں موجود رہے گی۔ نیز انسانوں کی پیدا کردہ آب و ہوا کی تبدیلیوں کے اثرات اب عیاں ہونے لگے ہیں۔ ماہرین

نئی دریافتوں نے انسانی سوچ کو پریشان کر دیا ہے

جو غذا جتنی مزے دار ہوگی اتنی ہی خطرناک ہوگی

خبردار کر رہے ہیں کہ آنے والی صدیوں میں خوفناک حالات حضرت انسان کے منتظر ہیں۔

۵۔کائنات کا بیشتر حصہ غیر مرئی مادے سے بنا ہے

ہماری کائنات میں مختلف اشیاء موجود ہیں مثلاً سیارے، ستارے، سیاہ سوراخ، مٹی، گیسیں وغیرہ۔ لیکن کائنات کا صرف ۴ر فیصد حصہ ہمیں نظر آتا ہے۔ بقیہ حصے کی ۲ر اقسام ہیں جو نہ دکھائی دینے والا مادہ ہے۔ پہلی قسم ''سیاہ مادہ'' (Dark Matter) کہلاتی ہے جو غیر مرئی مادے کا ۲۳ر فیصد حصہ ہے۔ دوسری قسم ''سیاہ توانائی'' ہے جو ہماری کائنات کے ۷۳ر فیصد حصے پر مشتمل ہے۔

سائنس داں سیاہ مادے کے متعلق کچھ نظریات رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ انتہائی متحرک اور چھوٹا ہوگا۔ لیکن انھیں سیاہ توانائی کی بابت کچھ خبر نہیں۔ دور جدید کے سبھی بڑے ماہرین کی یہی رائے ہے کہ سیاہ توانائی دنیائے سائنس کا سب سے پُراسرار راز ہے۔

اس وقت پوری دنیا میں سائنسی ماہرین اس کوشش میں ہیں کہ سیاہ مادے اور توانائی کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائیں۔ یوں ہم اس کائنات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے جس میں ہم رہتے بستے ہیں۔ گو وہ سیاہ مادے کے ذریعے یہ ضرور جان چکے ہیں کہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے۔

یہ جان کاری خاصی خوفناک ہے۔ کیونکہ کائنات کے پھیلاؤ کی وجہ سے چاہے اربوں سال بعد ہی سہی، ایک دن ایسا آئے گا کہ کائنات میں ہر شے ایک دوسرے سے بہت دور ہو جائے گی۔ تب وہاں زندگی کا نام ونشان نہیں ہوگا اور زمین؟ وہ تو تین چار ارب سال بعد ہی پھیلتے سورج میں غتربود ہو جائے گی۔

۶۔لذیذ غذائیں نقصان دہ ہیں

بچے ہوں یا بڑے بوڑھے، سبھی بھنا گوشت، تلے آلو، کیک بسکٹ، پیزا وغیرہ بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ لیکن سائنس دانوں نے تحقیق کے بعد دریافت کیا ہے کہ جو غذا جتنی مزے دار ہو، وہ صحت کے لیے اتنی ہی نقصان دہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برگر، تلے گوشت وغیرہ کھا کھا کر انسان موٹاپے، ذیابیطس جیسے امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

لہٰذا اگر آپ خود کو وقت سے پہلے گور (قبر) میں پہنچانا چاہتے ہیں تو لذیذ کھانے بصد شوق کھائیے۔ لیکن صحت عمدہ کرنی ہے تو سبزیاں یا پھل دسترخوان پہ سجائیے۔

۷۔انسانوں کی قربانی عام تھی

ہمارے مذہب کی رُو سے انسان دنیا میں اچھے کام اور نیکیاں کرے تو آخرت میں اسے جنت ملنا یقینی ہے۔ قدیم انسانوں کی نسبت یوں ہم خوش قسمت ہیں۔ قدیم اقوام مثلاً مصری، چینی اور بعض ہندو قبائل سمجھتے تھے کہ انسان مرنے کے بعد نئی زندگی گزارتا ہے۔ لہٰذا جب کوئی بادشاہ یا سردار مرتا تو اس کے ملازم اور کنیزیں بھی قتل کر دی جاتیں۔ مدعا یہ ہوتا کہ وہ اس زندگی میں بھی بادشاہ کی خدمت کر سکیں۔

یہ انکشاف اثریاتی تحقیق اور شہادتوں کے ذریعے ہوا ہے۔ اب دنیا بھر میں ماہرین آثار قدیمہ کی سعی سے مزید چشم کشا باتیں سامنے آئی ہیں۔ مثلاً جنوبی امریکا کی قدیم آزٹک قوم نے ٹینوچٹیلان نامی عظیم معبد کا سنگ بنیاد رکھا تو ہزارہا قیدی اس کے سامنے قربان کر دیے۔ اسی طرح جب مایا قوم میں ٹیمیں بال گیم کھیلتیں تو کئی بار ہارنے والی ٹیم دیوتاؤں کے حضور بھینٹ چڑھا دی جاتی۔

ان انکشافات سے عیاں ہے کہ قدیم انسانوں میں انسانوں کی قربانی عام دستور تھا اور بعض قبائل تو قربان کیے گئے انسانوں کا گوشت بھی چٹ کر جاتے تھے۔ قربانی تو آج بھی دی جاتی ہے۔ آج انسان خود انسانی گوشت نہیں کھاتا مگر اس کا بنایا ہوا بارود یہ کام بخوبی کرتا ہے۔ کام بھی ہوگیا نہ ہینگ لگی نہ پھٹکری۔

مایا قوم کی جو ٹیم میچ ہار جاتی اسے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا

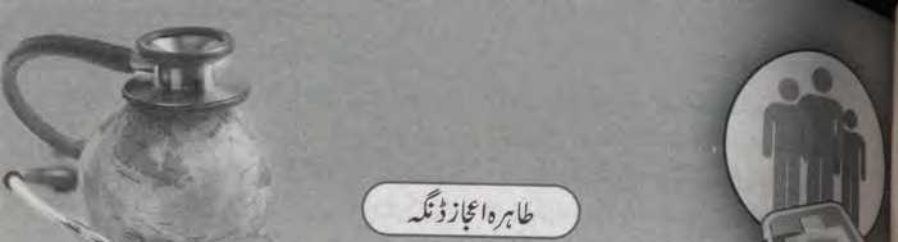

طاہرہ اعجاز ڈنگہ

طب کے نئے افق

شوگر کے مریضوں میں درد کی حساسیت کم کرنے کا طریقہ دریافت

شوگر کے مریضوں میں درد محسوس کرنے کی حساسیت بڑھ جاتی ہے اور اس طرح وہ گرمی اور سردی کو بھی زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ طبی ماہرین اب اس کا مؤثر علاج ڈھونڈنے کے قریب تر ہیں۔

جرنل نیچر میڈیسن میں ایک ملٹی نیشنل ریسرچ شائع ہوئی ہے جس کے مطابق واروِک اسکول نے برطانیہ، جرمنی، نیویارک، آسٹریلیا کی یونیورسٹیوں کے اشتراک سے طبی ماہرین نے شوگر کی وجہ سے بڑھ جانے والی درد کی حساسیت کے بارے میں اہم تحقیق کی ہے۔ Painful Diabetic Neuropathy (PDN) ایک ابنارمل اور شدید درد کی حالت ہے جس کو تقریباً ۵۰ر فیصد شوگر کے مریض محسوس کرتے ہیں۔ یہ ان کی زندگیوں پر اور ان کے روزمرّہ کام کرنے کی صلاحیت پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے۔ ابھی تک یہ واضح طور پر معلوم نہیں تھا کہ شوگر کے مریضوں میں ابنارمل گلوکوز میٹابولزم کیسے زیادہ درد پیدا کرتا ہے۔ تحقیق میں اسی کے بارے میں کافی وضاحت پیش کی گئی ہے۔ واروِک ٹیم کے طبی ماہرین ڈاکٹر نائلہ ربانی اور پروفیسر پال تھورنیلی جو ۳۰ر سال سے ایک کمپاؤنڈ میتھائل گلائیکسول (Methyl Glyoxal) (MG) پر کام کر رہے تھے جو شوگر کے مریضوں میں گلوکوز کی وجہ سے بہت زیادہ پیدا ہوتا ہے اِن کی تحقیق میں ثابت ہوا ہے کہ یہ کمپاؤنڈ شوگر کے مریضوں میں درد اور درجہ حرارت محسوس کرنے کی حساسیت کو بڑھاتا ہے۔

پروفیسر پال کا کہنا ہے کہ MG کمپاؤنڈ نسوں کے آخر میں موجود پروٹین پر حملہ کرتا ہے اور اس میں تبدیلیاں پیدا کر کے نسوں کو درد اور درجہ حرارت کے لیے شدید حساس کر دیتا ہے۔ اس وجہ سے شوگر کے مریض درد کو زیادہ محسوس کرتے ہیں اور انھیں گرمی یا سردی بھی زیادہ لگتی ہے۔ طبی ماہرین اب اس کمپاؤنڈ پر اٹیک کر کے ایسی ادویات بنا رہے ہیں جو اس کمپاؤنڈ کی کارکردگی کو کم کر کے درد کی حساسیت میں کمی لائیں گی۔ طبی ماہرین جسم میں موجود ایک انزائم (Enzyme) جس کا نام گلیکسولیز (Glyoxalase 1 یا Glo 1) ہے، کی مقدار کو زیادہ کرنے کے طریقے ڈھونڈ رہے ہیں جو MG کمپاؤنڈ کی مقدار کو جسم میں خود بخود کم کر دیتا ہے۔

سگریٹ کا دُھواں اور نظام تنفّس

تین دہائیوں سے زیادہ عرصے سے طبی ماہرین ماحول میں موجود تمباکو کے دھوئیں (Environmental Tobbaco Smoke) کے صحت پر پڑنے والے مضر اثرات سے خبردار کر رہے ہیں اور یہ مضر اثرات ان

www.urdudigest.pk

بچوں میں زیادہ خطرات پیدا کرتے ہیں جن کے والدین سگریٹ نوشی کرتے ہیں۔ یونیورسٹی آف ایریزونا یونائیٹڈ سٹیٹ کے طبی ماہرین کی حالیہ تحقیق میں یہ ثابت ہوا ہے کہ یہ مضر اثرات ان بچوں میں صرف بچپن میں نہیں رہتے بلکہ جوانی تک ان کے جسموں میں موجود رہتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے نظام تنفس کو بگاڑ سکتے ہیں اور ان میں دمہ اور دوسری ریسپائریٹری بیماریوں کے خطرات زیادہ ہوجاتے ہیں۔

Persistent Respiratory Illness نامی بیماری بچپن اور جوانی میں اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ایسے بچے آئندہ زندگی میں کرونک ریسپائیریٹری بیماریوں، دمہ یا پھیپھڑوں کے عمل میں خرابیوں کے خطرات سے دوچار ہو سکتے ہیں۔

اگرچہ پوری دنیا کے بچوں کی بڑی تعداد اپنے والدین کی سگریٹ نوشی کی وجہ سے مضر اثرات کا شکار ہو رہی ہے لیکن اس کے لمبے عرصہ تک رہنے ولے بُرے اثرات کا ابھی تک لوگوں کو زیادہ علم نہیں۔ اس تحقیق میں یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ سگریٹ کے دھوئیں سے ہونے والے مضر اثرات بچوں میں جوانی تک رہتے ہیں۔ طبی ماہرین نے دمہ اور دوسری ریسپائیریٹری بیماریوں کا مشاہدہ کیا تو پتا چلا ایسے بچوں میں یہ بیماریاں زیادہ ہیں جن کے والدین سگریٹ نوشی کرتے ہیں۔

لہٰذا سگریٹ نوشی سے نہ صرف آپ اپنی زندگی خراب کرتے ہیں بلکہ آپ کے بچوں پر بھی اس کے بُرے اثرات پڑتے ہیں۔ لہٰذا اپنی اور اپنے بچوں کو سگریٹ نوشی کے بُرے اثرات سے بچانے کے لیے سگریٹ نوشی ترک کریں اور صحت مند زندگی گزاریں۔

نئی اینٹی کینسر دوائی ایجاد

یونیورسٹی آف ہوائی میں کینسر سنٹر کے طبی ماہرین کی ٹیم نے ایک نئی قسم کی اینٹی کینسر دوائی ایجاد کی ہے جس کا نام BP-1-102 رکھا گیا ہے۔ یہ دوائی جو منہ کے ذریعے استعمال کی جاسکتی ہے، ایک ایسی پروٹین پر حملہ کرتی ہے جو مختلف قسم کے کینسر مثلاً بریسٹ، جلد اور پھیپھڑوں کے کینسر وغیرہ کی نشوونما کرتی ہے۔ اس پروٹین سٹیٹ ۳ (Stat-3) کی مالیکیولر ساخت ایسی دو گاڑیوں جیسی ہے جو بالکل ساتھ جڑ کر کھڑی ہوتی ہیں۔ پروٹین کی ایسی ساخت کینسر کے خلیوں کو پھیلانے میں مدد کرتی ہے۔ طبی ماہرین کا کہنا ہے کہ ہم نے ایک کمپیوٹر پروگرام کی مدد سے اس مؤثر دوائی کا ایسا مالیکیولر ماڈل بنایا ہے جو اس پروٹین سٹیٹ ۳ کے ساتھ جڑ جاتا ہے اور اس کی ساخت الٹا کر اس کے کینسر بنانے کے عمل کو بے کار کردیتا ہے۔

اس دوائی کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ کینسر کے خلاف منہ کے ذریعے استعمال کی جاتی ہے اور بہت مؤثر ثابت ہوتی ہے ورنہ زیادہ تر اینٹی کینسر دوائیوں کو کسی کلینک یا ہسپتال میں جا کر انجیکشن کے ذریعے استعمال کرایا جاتا ہے جس کی وجہ سے کینسر کے مریض پر جسمانی، جذباتی اور مالی دباؤ پڑتا ہے۔

اس اینٹی۔ کینسر دوائی کے کامیاب تجربے کے دوران اس نے بریسٹ اور پھیپھڑوں کے کینسر کا مؤثر علاج کیا۔ حالیہ دور میں بریسٹ اور پھیپھڑوں کا کینسر ایسے دو قسم کے کینسر ہیں جو سالانہ بہت زیادہ لوگوں کی موت کا سبب بنتے ہیں۔

اس انوکھی اینٹی کینسر دوائی کی ایجاد مختلف قسم کے کینسر کے علاج میں بہت سی آسانیاں پیدا کرے گی اور مریض کسی پریشانی یا دباؤ کے بغیر اپنا علاج کرواسکیں گے۔

وقت پر کھانا کھانے سے میٹابولک سِنڈروم کا خطرہ کم

یہ دیکھا گیا ہے کہ ہماری صحت پر ہماری خوراک کا بہت اثر ہوتا ہے۔ جتنی اچھی خوراک ہوگی صحت بھی اتنی ہی اچھی ہوگی۔ لیکن اب سائنسدانوں نے یہ تحقیق کی ہے کہ ہماری صحت پر اس بات سے بھی اثر پڑتا ہے کہ ہم خوراک باضابطہ طریقے سے کھاتے ہیں یا نہیں۔ وہ افراد

www.urdudigest.pk

جو دن میں غیر مقررہ اوقات میں کھاتے رہتے ہیں، ان میں میٹابولک سنڈروم کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ یہ تحقیق کیورنسکا انسٹی ٹیوٹ سویڈن کے طبی ماہرین نے کی ہے۔

میٹابولک سنڈروم وہ کیفیت ہے جس میں ایک انسان میں کارڈیوویسکولر بیماریوں اور شوگر کے لیے مختلف رسک فیکٹرز اکٹھے ہوجاتے ہیں۔ جیسا کہ مٹاپا، بلڈ پریشر، انسولین کے لیے مزاحمت اور کولیسٹرول کا ہائی ہونا اور خوراک ان رسک فیکٹرز کی سب سے بڑی وجہ مانی جاتی ہے۔

کیرولنسکا انسٹی ٹیوٹ کے طبی ماہرین نے پہلی دفعہ یہ ثابت کیا ہے کہ خوراک کی مقدار کے بجائے بار بار کھانا بھی میٹابولک سنڈروم پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ تحقیق جو ۶۰ ہزار بوڑھے مردوں اور عورتوں پر سروے اور ان کے میڈیکل چیک اپ کے بعد کی گئی۔ اس سے ثابت ہوا ہے کہ بے ضابطہ طریقے سے کھانا میٹابولک سنڈروم کے خطرے کو بڑھاتا ہے۔ اس تحقیق میں شامل وہ افراد جو بے ضابطہ طریقے سے ناشتا، دوپہر اور رات کا کھانا کھاتے تھے، ان میں میٹابولک سنڈروم کا خطرہ زیادہ دیکھا گیا۔

طبی ماہرین خیال کرتے ہیں کہ ان نتائج کے مطابق صحت ٹھیک رکھنے کے لیے خوراک کے بارے میں ہدایات دینے کے دوران یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ کھانے کا باضابطہ طریقہ صحت برقرار رکھنے کے لیے اہم ہے۔

اینٹی ڈپریشن دوائیوں کا فائدہ کم، نقصان زیادہ

ماہرین طب نے پورے جسم پر دوائیوں کے اثرات چیک کرنے کے بعد تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ عام طور پر استعمال ہونے والی اینٹی ڈیپریشن دوائیاں فائدے سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہیں۔

McMaster (میک ماسٹر) یونیورسٹی کینیڈا کے بائیولوجسٹ ہال اینڈریو کا کہنا ہے کہ ہمیں ان دوائیوں کے بہت زیادہ استعمال میں احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ لاکھوں افراد کو سالانہ اینٹی۔ڈیپریشن دوائیاں تجویز کی جاتی ہیں اور روایتی طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دوائیاں بہت مؤثر اور بے ضرر ہیں۔

اینڈریو اور اس کے ساتھیوں نے ان مریضوں کا چیک اپ کیا جو بہت عرصے سے ان دوائیوں کا استعمال کر رہے تھے۔ نتائج میں دیکھا گیا کہ ان دوائیوں کے اثر سے جسم کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔

اینٹی ڈیپریشن دوائیاں اس طرح ڈیزائن کی جاتی ہیں کہ وہ دماغ میں موجود ایک کیمیکل Serotonin کی مقدار کو بڑھا کر ڈیپریشن کم کریں۔

Serotonin کی مقدار جو جسم قدرتی طور پر پیدا کرتا ہے وہ بہت سے مقاصد کے لیے استعمال ہوتی ہے جیسا کہ ہاضمے، زخموں پر خون جمانے، عمل پیدائش اور نشوونما میں۔ طبی ماہرین کی تحقیق کے مطابق اینٹی ڈیپریشن دوائیاں ان تمام قدرتی عوامل پر بُرے اثرات ڈالتی ہیں جو Serotonin کو استعمال کرتے ہیں۔ ان بُرے اثرات میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

☆ شیرخوار بچوں میں نشوونما کے مسائل

☆ جنسی مسائل

☆ نظام انہضام میں مسائل جیسا کہ دست، قبض اور بدہضمی وغیرہ

☆ بوڑھے افراد میں سٹروک کا خطرہ

طبی ماہرین نے تحقیق کے دوران دیکھا کہ اینٹی ڈیپریشن دوائیاں استعمال کرنے والے افراد میں موت کی شرح زیادہ ہے بہ نسبت ان کے جو ان دوائیوں کا استعمال نہیں کرتے۔

چنانچہ مجموعی اثرات دیکھنے کے بعد یہ ثابت ہوا کہ یہ دوائیاں فائدہ سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہیں۔ لہٰذا یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے کہ ان ادویہ کے فوائد اور نقصانات کا مکمل تجزیہ کیا جائے کیونکہ ان کا استعمال بہت بڑھ چکا ہے۔

طب وصحت

کیا اس موسم کی واقعی اتنی فکر کرنی چاہیے؟

موسم سرما کے 10 سچ

معاشرے میں پھیلے کئی مغالطے دور کرتی ایک تحریر جو آپ کی سوچ بدل سکتی ہے

ڈاکٹر نصیر علی

یہ دیکھا گیا ہے کہ شدید سردی، دھند اور [illegible] وقت کے باعث مردوزن موسم سرما میں [illegible] صحت کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا واقعی اس موسم میں ہمیں اپنی تندرستی کی فکر کرنی چاہیے؟ اس سلسلے میں سردیوں سے متعلق بعض مغالطوں کا بیان درج ذیل ہے:۔

(۱) سردی میں زیادہ عرصہ باہر رہنے سے نزلہ زکام وغیرہ ہوجاتا ہے؟

حقیقت: بڑے بوڑھے موسم سرما میں اکثر بچوں کو کہتے ہیں کہ باہر نہ کھیلو، سردی لگ جائے گی۔ تاہم جدید طبی تحقیق کے مطابق یہ بات صحیح نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ نزلہ، زکام اور فلو وغیرہ وائرسوں اور جراثیم کے ذریعے ایک سے دوسرے انسان کو چمٹتے ہیں۔ لہٰذا اس قسم کی بیماریوں کا کم یا زیادہ سردی سے کوئی تعلق نہیں۔

چونکہ موسم سرما میں ہر کوئی زیادہ عرصہ گھر میں گزارتا ہے۔ لہٰذا ایک دوسرے کو وائرس یا جراثیم منتقل ہونے کا امکان دگنا تگنا ہوجاتا ہے۔ سردیوں میں انسان اگر گھر یا کمرے سے باہر رہے، تو زکام، نزلہ، فلو وغیرہ سے دور رہتا ہے۔

(۲) موسم سرما ہی میں لوگ سب سے زیادہ ڈپریشن کا نشانہ بنتے ہیں۔

حقیقت: جدید طبی تحقیق کے مطابق یہ دیومالا ہے۔ کیونکہ ڈپریشن کا تعلق موسم سے نہیں جذبات و احساسات سے ہے۔ دراصل موسم سرما آتے ہی اکثر مردوزن ایک طبی خلل ''موسمیاتی اثر پذیر خلل'' (Seasonal Affective Disorder) کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ اس خلل میں مبتلا لوگ بے چینی، گھبراہٹ، نیند اور ارتکاز توجہ میں کمی وغیرہ محسوس کرتے ہیں۔ اسی خلل کو عموماً افسردگی سمجھ لیا جاتا ہے۔

یہ خلل موسمیاتی تبدیلیوں سے وابستہ ہے۔ ان میں سب سے بڑی تبدیلی سردیوں میں دھوپ کی کمی ہے۔ دھوپ انسانی جسم میں توانائی و چستی پیدا کرتی ہے۔ لیکن سردیوں میں کہر یا دھند کے باعث چند دن انسان کو دھوپ نہ ملے، تو اس کا جسم کسل مند و سست ہوجاتا ہے۔ تبھی موسمیاتی اثر پذیر خلل اس پر حملہ کرتا اور اُسے نفسیاتی و جسمانی طور پر اچھا خاصا بیمار کر ڈالتا ہے۔

خوش قسمتی سے یہ خلل طویل عرصہ تک نہیں رہتا۔ انسان سرد موسم سے ہم آہنگ (Acclimatize) ہو جائے، تو تندرست ہوجاتا ہے۔ اس کا ایک عارضی علاج یہ ہے کہ صبح سویرے انسان کچھ عرصہ تیز روشنی پھینکنے والے بلب کے سامنے گزارے۔ روشنی سفید ہو یا پیلی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(۳) یہ بات غلط ہے کہ موسم سرما میں مرغی کی یخنی پینے سے جسم کو قوت ملتی ہے اور وہ شدید سردی کا مقابلہ کرلیتا ہے۔

حقیقت: جدید طبی سائنس انکشاف کرتی ہے کہ یہ غلط بات نہیں بلکہ واقعتاً مرغی کی یخنی (سوپ) ہمیں غذائیت اور توانائی فراہم کرتی ہے۔ اس عمل کی سائنسی تشریح یہ ہے کہ یخنی ''نیوٹروفل جارحیت'' (Neutrophil Aggregation) پیدا کرکے ہمارے نظام مامون پر بہت مثبت اثر ڈالتی ہے۔ اسی عمل کے ذریعے ہمارے جسم میں خون کے سفید خلیے اکٹھے ہوجاتے ہیں۔

ہمارے بدن میں سفید خونی خلیے چھوت کے حملے روکتے اور اُسے مار بھگاتے ہیں۔ انہی کے باعث ہم جلد صحت یاب ہوتے ہیں۔ سائنس دانوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ گرم مشروبات مثلاً چائے اور (گوشت کا) شوربا فلو و زکام کی شدت کم کرتے، نیز حلق و سینہ کھولتے ہیں۔

(۴) سردیوں میں جسمانی حرارت زیادہ تر سر کے راستے نکلتی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ موسم سرما میں ہر وقت ٹوپی پہنی جائے۔

حقیقت: بڑے بوڑھے اکثر بچوں کو یہ تاکید کرتے ہیں کہ (سردیوں میں) ٹوپی پہن کر باہر جاؤ۔ لیکن ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس بات میں کوئی صداقت نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ موسم سرما میں انسانی جسم کے ہر حصے سے یکساں مقدار میں حرارت خارج ہوتی ہے۔ لہٰذا سر ہو یا ہاتھ، چہرہ ہو یا پیر، جو جسمانی حصہ سردی میں برہنہ ہوگا، وہیں سے بدن کی حرارت خارج ہوگی۔

لہٰذا سردی میں آپ جب بھی باہر نکلیں تو ہر حصہ جسم ڈھانپ کر اور اگر اتفاقاً آپ گھر میں ٹوپی بھول جائیں تو فکر کی بات نہیں، بس کوٹ یا جیکٹ موٹی ہونی چاہیے تاکہ

وہ آپ کو گرم رکھے۔

(۵) سردی میں ورزش کرنا نقصان دہ ہے۔

حقیقت: کئی لوگ موسم سرما میں صبح سویرے یا شام کو ورزش نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک یوں صحت کو نقصان پہنچتا ہے۔ تاہم جدید تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ سردی میں ورزش کرنا درست ہے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ ورزش سے قبل انسان خود کو گرم کرلے۔

مثال کے طور پر بھاگنے دوڑنے اور وزن اٹھانے سے قبل وارم اپ ہونا۔ یوں جسم درجہ حرارت سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے۔ موسم سرما میں اچانک ورزش شروع کر دینے سے قلب کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ پہلے ہلکی پھلکی جسمانی سرگرمی اپنا لی جائے۔

(۶) ہمیں سردیوں میں زیادہ نیند کی ضرورت ہوتی ہے۔

حقیقت: موسم سرما میں خصوصاً صبح سویرے کسی کا دل نہیں چاہتا کہ وہ گرم رضائی چھوڑ کر ٹھنڈے ٹھار غسل خانے میں پہنچ جائے۔ چنانچہ بہت سے مرد و زن گرمیوں کی نسبت زیادہ عرصہ بستر پر لیٹے گزارتے ہیں۔ اسی امر سے اس غلط فہمی نے جنم لیا کہ لوگ سردیوں میں زیادہ سوتے ہیں۔

ماہرین طب کا کہنا ہے کہ کمیِ دھوپ کے باعث بہت سے لوگ جلد بستروں میں گھس جاتے ہیں۔ اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن زیادہ سونے سے باز رہیے کیونکہ عموماً جو مرد وزن زیادہ نیند لیں، وہ پھر دن کے وقت بھی اونگھتے رہتے ہیں۔

(۷) موسم سرما میں سن اسکرین کی ضرورت نہیں ہوتی۔

حقیقت: کئی لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ سردیوں میں دھوپ کی تپش کم ہوتی ہے، لہٰذا سن اسکرین سے پرہیز کیا جائے۔ کیا یہ بات درست ہے؟ جی نہیں۔ ماہرین جلد کا کہنا ہے کہ سردی ہو یا گرمی، بہار ہو یا خزاں، کرنوں کی تپش ایک جیسی رہتی ہے۔ لہٰذا جہاں دھوپ کے ساتھ کسی بھی قسم کا مسئلہ ہے، وہ سن اسکرین استعمال جاری رکھیں۔

(۸) انسان بمشکل ہی پالا ماری کا نشانہ بنتا ہے۔

حقیقت: عام خیال یہ ہے کہ کوہ پیما یا اسکی انگ کرنے والے ہی ''پالا ماری'' (Frostbite) کا شکار ہوتے ہیں لیکن یہ کیفیت کسی بھی انسان کو خاصی آسانی سے چمٹ سکتی ہے۔

پالا ماری اس وقت چمٹتی ہے جب جسم کا کوئی حصہ خصوصاً ہاتھ پیروں کی برہنہ انگلیاں تادیر شدید ٹھنڈ میں رہیں۔ اگر یہ حصہ جسم گیلا ہو تو پالا ماری جلد حملہ کرتی ہے۔ اس حالت میں متاثرہ حصہ بدن پہلے نرم ہوتا ہے پھر اس میں آبلے جنم لیتے ہیں۔ بعدازاں وہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔

ڈاکٹر جالمین ڈسکین امریکا کے مشہور ماہر جلد ہیں۔ ان کا کہنا ہے ''اگر انتہائی سردی ہو یا موسم نم ہو تو انسان کو صرف ۳۰ منٹ میں پالا ماری جا چمٹتی ہے۔ تب مستقبل میں وہ حصہ جسم بے حس ہوجاتا ہے اور اُس پر سردی، گرمی، کچھ اثر نہیں کرتی۔ انگلیاں تادیر اس کیفیت

www.urdudigest.pk

میں رہیں، تو اس کی نسیں شدید متاثر ہوتی ہیں۔ تب وہ کاٹنی پڑتی ہیں تاکہ ان میں پھیلا زہر پورے بدن میں نہ پھیل سکے۔''

ڈاکٹر جالمین کا یہ بھی کہنا ہے ''یہ ضروری نہیں کہ بہت بلند درجہ حرارت ہی میں پالا ماری حملہ کرے۔ اگر جلد گیلی ہے اور طویل عرصہ عام سردی میں رہے تو تب بھی انسان اس خطرناک حالت میں گرفتار ہو سکتا ہے۔''

لہٰذا پنجاب، بلوچستان اور خیبرپختون خواہ کے لوگ موسم سرما میں یہ احتیاط کریں کہ اپنی جلد نم نہ ہونے دیں اور نہ ہی اُسے زیادہ عرصہ برہنہ رکھیں۔

(۹) موسم سرما میں خشک جلد ہونا ایک عام کیفیت ہے۔

حقیقت: سردیوں میں اکثر جلد خشک ہو کر سکڑ جاتی ہے۔ تب وہ چٹخ جاتی بھی ہے۔ اکثر خارش بھی جنم لیتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی حالت نقصان دہ تو نہیں؟ کیونکہ بہت سے لوگ اسے موسم سرما کا تحفہ سمجھ کر نظرانداز کر دیتے ہیں۔

ماہرین جلد کا کہنا ہے کہ جلد خشک ہونے کو معمولی حالت نہ سمجھیے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان اسی کے ذریعے چھوت کا نشانہ بن سکتا ہے۔ لہٰذا جلد کو معمول کی حد تک نم رکھنا ضروری ہے۔ دراصل سردی ہو یا گرمی، جلد خشک ہو تو اس میں ننھے منے خلا جنم لیتے ہیں۔ جراثیم یا وائرس ان کے ذریعے جسم میں داخل ہو کر غل مچا سکتے ہیں۔

اسی لیے ماہرین کہتے ہیں کہ موسم کوئی بھی ہو، اپنے بدن کے وہ حصے نم رکھیے جو روزمرہ اشیا سے ٹکراتے ہیں۔ مثلاً ہاتھ اور پیر۔ خصوصاً دن میں چند بار ہاتھ ضرور دھوئیے۔ یوں وہ نہ صرف نم ہوتے بلکہ صاف بھی ہوجاتے ہیں۔

(۱۰) الرجی سردیوں میں زیادہ چمٹتی ہے۔

حقیقت: موسم سرما الرجی کا نشانہ بننے کے لیے اچھی اور بُری، دونوں اقسام کی خبریں لاتا ہے۔ جو لوگ زرگل (Pollen) سے الرجک ہوتے ہیں، وہ سردیوں میں تندرست رہتے ہیں کیونکہ ماحول میں زرگل (پھولوں کے نرعضو) بہت کم ہوجاتے ہیں۔

لیکن کئی لوگ پالتو جانوروں، دھول مٹی، مختلف اقسام کے دھوئیں وغیرہ سے الرجی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی مشکلات بڑھ جاتی ہیں کیونکہ وہ طویل عرصہ گھر یا دفتر میں گزارتے ہیں۔ چنانچہ الرجک شے سے رابطہ ہوتے ہی انھیں چھینکیں وغیرہ آنے لگتی ہیں اور الرجی شدید ہو تو وہ بیمار بھی ہوجاتے ہیں۔

پلاسٹک سرجری

ہرنام سنگھ کے چہرے پر زخم آیا تو بدنما سا نشان بن گیا۔ کسی نے کہا کہ پلاسٹک سرجری کرالو نشان مٹ جائے گا۔ وہ پلاسٹک سرجن کے پاس گیا جس نے ہرنام سنگھ کو یقین دلایا کہ نشان مٹ جائے گا۔ ہرنام سنگھ نے فیس پوچھی تو ڈاکٹر نے کہا ''پچاس ہزار''

ہرنام سنگھ کچھ سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا'' ڈاکٹر صاحب! اگر میں پلاسٹک اپنا لے آؤں تو پھر کتنی فیس ہوگی؟''

سرجن جل کر بولا'' سردار جی! پلاسٹک لے کر میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں بس گھر میں چولہے پر گرم کرنا اور منہ پر چپکا لینا!!''

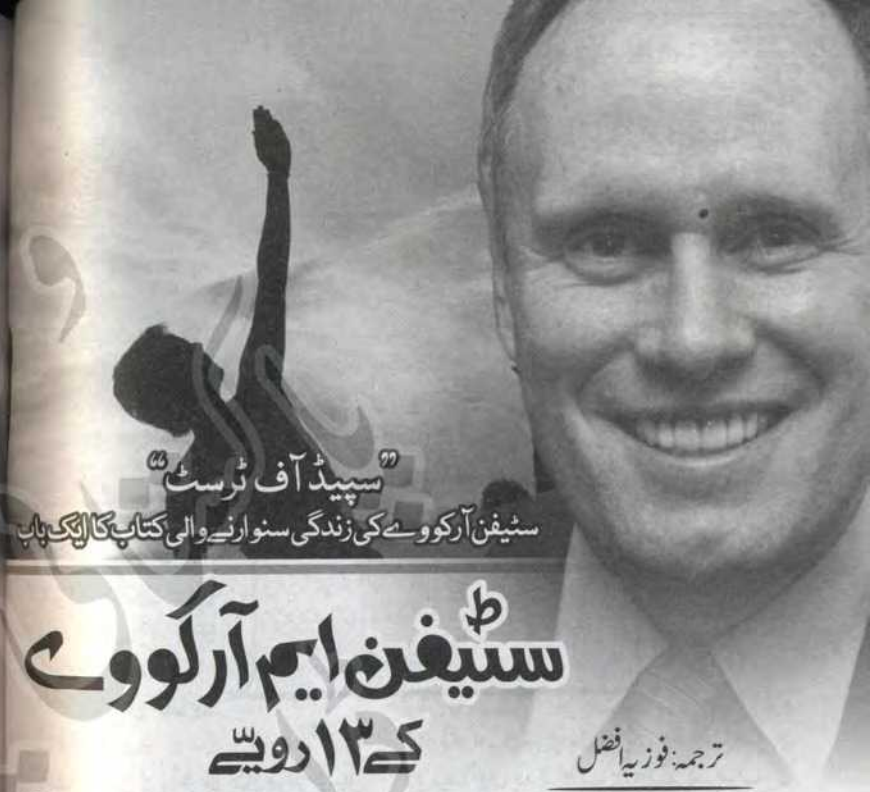

"سپیڈ آف ٹرسٹ"

سٹیفن آرکووے کی زندگی سنوارنے والی کتاب کا ایک باب

سٹیفن ایم آرکووے کے ۱۳ رویّے

ترجمہ: فوزیہ افضل

ساکھ، اعتماد یا اعتبار ایک ایسی بنیادی اہمیت کی حامل خصوصیت ہے جسے کسی بھی حوالے سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اپنی ساکھ بنانا اور پھر قائم رکھنا نہ صرف افراد اور اداروں کے لیے بلکہ سب کے لیے بھی ضروری ہے۔ اس کے بغیر نہ تو رشتے پروان چڑھتے ہیں اور نہ ہی کاروبار ترقی کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا بنیادی عنصر ہے جو ہر شے کو تبدیل کر دیتا ہے۔ کوئی شخص اس کی بنیادی حیثیت سے انکار نہیں کرتا لیکن حیرت انگیز بات ہے کہ ہماری نظر سے کوئی ایسی کتاب نہیں گزری جو ان معاملات کا سائنسی انداز میں احاطہ کرتی ہو جو اعتماد کو بڑھاتے ہیں یا کم کرتے ہیں۔

Speed of Trust نامی اپنی کتاب میں سٹیفن ایم آرکووے نے جو کہ آنجہانی سٹیفن آرکووے کا بیٹا ہے، اعتماد کو بڑھانے کی ایسی Step by Step حکمت عملی مرحلہ بہ مرحلہ بتائی ہے جو کسی بھی ادارے یا کاروبار کو تیزی سے ترقی کی منازل طے کرنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ جس رفتار سے ہم اپنے اعتماد کا دائرہ کار بڑھاتے جاتے ہیں۔ اسی تیزی کے ساتھ ہمارا کاروبار ترقی کرتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ بات ہمارے باہمی تعلقات پر بھی بڑا مثبت اثر ڈالتی ہے۔ دنیا بھر میں اپنی فروخت کا ریکارڈ قائم کرنے والی اس کتاب کا ایک باب اُردو ڈائجسٹ کے باذوق قارئین کی نظر۔ اس باب میں ان رویوں کا ذکر ہے جو اعتماد بڑھانے میں انتہائی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

پہلا رویّہ: صاف گوئی سے کام لینا

مجھے ہمیشہ اُن لوگوں سے کام کرانے میں دِقت پیش آئی جو پوری بات کرنے یا مکمّل معلومات دینے سے ہچکچاتے ہیں۔ مرضی سے اپنی کہانی کو رنگ دیتے اور حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں۔ یوں نہ صرف اپنے بلکہ دوسروں کے لیے بھی مشکل کا سبب بنتے ہیں۔ بعض اوقات لوگ ذاتی مفاد کی وجہ سے سچ نہیں بولتے۔ مگر ایسا رویہ دیرپا نہیں ہوتا۔ ہوسکتا ہے وقتی طور پر لوگوں کو آپ کی سچی بات ناگوار گزرے، لیکن آخر کار سچ کا ہی بول بالا ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسروں پر اپنا اچھا تاثر چھوڑیے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ جو بات کریں، وہ اتنی واضح ہو کہ اس کا غلط مطلب نہ لیا جائے۔

صاف گوئی کی بدولت دوسروں کی نگاہوں میں آپ کا مقام و مرتبہ بڑھ جاتا ہے۔ کئی لوگ عموماً آنکھیں بند کرکے دوسروں کی میٹھی میٹھی باتوں میں کھو جاتے ہیں۔ آنکھیں کھلنے تک پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔ تب سمجھ آتی ہے کہ میٹھے لوگوں کی نسبت کڑوے کسیلے لوگ اچھے ہیں۔ پھر بھی کوشش کرنی چاہیے کہ سچ سلیقے سے بولا جائے اور کسی کے جذبات مجروح نہ ہوں۔

گھریلو زندگی میں بھی صاف اور سیدھی بات بہت اہمیت رکھتی ہے۔ مزید برآں اپنی اچھی نیت اور ارادے سے وقتاً فوقتاً دوسروں کو بھی آگاہ کیجیے۔

مثال کے طور پر والدین کا رویہ اپنے بچوں کے ساتھ بہت دوستانہ ہونا چاہیے جب وہ انھیں زندگی کے حقائق سے آگاہ کریں، یا پھر کچھ اُلجھے معاملات زیرِ بحث ہوں، جیسے منشیات، دوستوں کا انتخاب یا پھر جنسیات.....

دوسرا رویّہ: دوسروں کی عزت کرنا

ایک انسان کا کردار یہ دیکھ کر بھی پرکھنا ممکن ہے کہ وہ لوگوں سے کیسا سلوک کرتا ہے؟ جنھوں نے اس سے حسن سلوک کیا یا بدسلوکی کی، ان کے ساتھ کیسا رویہ رہا۔ یہ ضروری ہے کہ ہم ہر کسی سے محبت، شائستگی اور نرمی سے پیش آئیں۔ اس حوالے سے مندرذیل مثالیں ذہن میں رکھیے۔

☆ اسلام کے مطابق:

ہم میں سے کوئی بھی اُس وقت تک سچا مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ دوسروں کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے کرتا ہے۔

☆ عیسائیت کے مطابق:

دوسروں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں جیسا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے ساتھ کیا جائے۔

☆ ہندومت کے مطابق:

اپنے ہمسائے کے ساتھ ایسا سلوک نہ کریں جو آپ خود اپنے لیے پسند نہیں کرتے۔

☆ بُدھ مت کے مطابق:

کسی کے ساتھ ایسا سلوک نہ کریں جو آپ کے اپنے لیے تکلیف کا باعث ہو۔

☆ سِکھ ازم کے مطابق:

دوسروں کے ساتھ ایسے پیش آئیں، جیسے آپ اپنے ساتھ پیش آتے ہیں۔

☆ ارسطو کے مطابق:

ہمیں اپنے دوستوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنا چاہیے جیسی ہم خواہش کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ کریں۔

اس سلوک کا طریقہ کار یہ ہے کہ اپنے دوستوں اور رشتے داروں کو فون کیجیے۔ کوئی مدد کرے تو شکریہ ادا کریں۔ کارڈ وغیرہ بھیجیں۔ دوسروں کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیرنے کی کوشش کریں۔ نئے تعلقات بنانے سے قبل پچھلے تعلقات مضبوط بنائیے۔ دوسروں کی جانب سے کچھ بھی اچھا لگے، اُس کا کھل کے اظہار کریں۔ اس سے بہت اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔

www.urdudigest.pk

تیسرا رویّہ: ایک جیسا ظاہر و باطن

زندگی کے نشیب و فراز میں صداقت کا دامن کبھی نہ چھوڑیے۔ بعض اوقات سچ بولنا بہت مشکل لگتا ہے۔ لیکن یاد رکھیے، سچ نجات دلاتا اور جھوٹ ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے۔ سچ سے خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے۔ آپ گھر پر ہیں یا دفتر میں، بطورِ لیڈر کام کر رہے ہیں یا ماتحت..... اپنی باتوں کو عملی جامہ پہنائیے۔ اپنی باتوں پہ عمل کرنے سے آپ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کریں گے۔

چوتھا رویّہ: معذرت کرنا سیکھیں

''یہ جان لینا کہ درست راہ کون سی ہے، پھر بھی وہ راستہ اختیار نہ کرنا..... یہ بدترین بزدلی ہے۔''

کئی لوگوں سے غلطی سرزد ہو تو وہ معذرت کرنے کے بجائے اسی کو درست ثابت کرنے کے لیے دلائل دینے لگتے ہیں۔ یہ سراسر زیادتی ہے، نہ صرف دوسرے فریق بلکہ اپنے آپ سے بھی! ہمارا ضمیر ہمیں کبھی معاف نہیں کرتا، لیکن ڈھٹائی کی حد ہے کہ ہم اسے نظر انداز کیے جاتے ہیں، صرف اپنی انا اور غرور کی خاطر..... یہ رویہ ترک کیجیے۔ اگر آپ بڑے بھی ہیں اور آپ سے غلطی سرزد ہو جائے تو معذرت کیجیے۔ یوں آپ کی عزت میں کمی نہیں آئے گی بلکہ یقین جانیے، اس میں اضافہ ہوگا۔

ایک بار میں اور میرا ۱۴/سالہ بھتیجا میچ دیکھنے گئے۔ ۲/یونیورسٹیوں کے درمیان مقابلہ تھا۔ میری ہمدردی کالج یونیورسٹی کے ساتھ تھی جب کہ میرے بھتیجے کا دل فل یونیورسٹی کی خاطر دھڑک رہا تھا۔ مقابلہ بہت سخت تھا۔ میچ تقریباً اختتام کو پہنچنے والا تھا کہ فل یونیورسٹی والوں نے دھڑا دھڑ ۲/رگول کر کے میچ جیت لیا۔ میں افسردہ سا ہو گیا، جب کہ میرا بھتیجا خوشی سے ناچ رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں بوتل تھی، میں نے غصے سے ساری بوتل اُس کے سر پہ انڈیل دی۔ یکدم وہ خاموش ہو گیا کیونکہ وہ مجھ سے ایسی توقع نہیں رکھتا تھا۔ مجھے بھی فوراً غلطی کا احساس ہوا اور میں بہت شرمندہ ہو گیا۔ میں نے اس سے معذرت کی اور چپ چاپ اپنے گھر چل دیے۔ پھر میں ہر اتوار اپنے بھتیجے کو اپنے گھر بلواتا، تحفے دیتا اور بار بار معذرت کرتا۔ وہ ہر بار کہتا ''میں نے آپ کو معاف کر دیا۔'' لیکن مجھے اپنے ضمیر کو بھی تو مطمئن کرنا تھا۔ یوں ہم دونوں کا تعلق مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔

پانچواں رویّہ: ہر معاملے میں ایمانداری

آپ گھر میں رہیں یا دفتر میں کام کریں، ایمانداری کا دامن نہ چھوڑیں۔ ایمانداری محض رقم یا اشیا کے لین دین تک محدود نہیں، اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ دوسروں کو اچھا مشورہ دینا، کسی کے راز چھپائے رکھنا اور کسی کی برائی نہ کرنا بھی ایمانداری ہے۔

کئی سال پہلے کی بات ہے، میں ایک کمپنی میں ملازمت کرتا تھا۔ ہم ۱۲/لوگ مل کر دوپہر کا کھانا کھایا کرتے۔ جو شخص کھانے سے فارغ ہو کر جاتا، باقی اسے زیرِ بحث لے آتے۔ میں اِس ڈر سے آخر تک بیٹھا رہتا کہ کہیں موضوعِ گفتگو نہ بن جاؤں۔

اس قسم کی حرکات سے لوگ اپنا اعتماد کھو دیتے ہیں۔ جب کوئی موجود نہ ہو تو اس کے متعلق یوں بات کیجیے جیسے وہ کہیں آس پاس ہے اور آپ کی بات سن رہا ہے۔ اگر اتنا حوصلہ نہیں کہ آپ اُس کے منہ پر کچھ کہہ سکیں تو پھر پیٹھ پیچھے بھی مت کہیے۔ جب آپ کسی پر کیچڑ نہیں اُچھالیں گے تو آپ کا من طمانیت سے بھرا رہے گا۔ آپ پہ لوگوں کا اعتماد بھی بڑھے گا۔

علاوہ ازیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر دوسروں کا شکریہ ادا کرتے رہیے۔ اُن کے اچھے افعال کو اور دوسروں کے ذاتی معاملات زیرِ بحث نہ لائیے۔

www.urdudigest.pk

چھٹا رویّہ: نتائج دیکھیے

کچھ لوگ صرف باتوں کے فن سے آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ عموماً زندگی کے کسی بھی میدان میں کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو پاتے۔ کیونکہ کامیابی کے لیے کام کرنا اور اچھے نتائج تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔ اگر آپ سیلز مین ہیں تو کب تک لوگوں کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے متاثر کرتے رہیں گے؟ ایک دو بار گاہک آپ کی باتوں کا یقین کر کے سودا سلف لے جائے گا۔ لیکن جب بھی اس نے باتوں اور معیار میں بہت زیادہ تضاد پایا، یقیناً اگلی بار وہ آپ کے پاس نہیں آئے گا۔ کیونکہ آپ نے اس کا اعتماد پارہ پارہ کر دیا۔ یہ بہت ضروری ہے کہ آپ جو بات کریں، وہ سچ ہو۔

دوسری طرف اگر آپ کے پاس معیاری سامان ہے اور گاہک اسے لے جاتا ہے تو آپ کو یہ کہنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی ''آئندہ بھی میرے پاس آیئے۔'' تب لوگ خود آپ کی طرف چلے آئیں گے۔

اگر آپ کسی سکول، فیکٹری، ہسپتال یا کہیں بھی ملازمت کر رہے ہیں تو لوگ نتائج دیکھیں گے اور یہ کہ آپ نے کتنا کام کیا؟ بطور سکول استاد آپ سو فیصد نتیجہ دیتے ہیں تو آپ کو منہ سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ میں بہت اچھا کام کرتا یا کرتی ہوں۔ آپ کے نتائج خود بولتے ہیں۔ آپ ملازمت میں اسی وقت کامیابی سے ہمکنار ہوں گے، جب مالکان کو بار بار اچھے نتائج دیں۔

چنانچہ اچھے نتائج دینے کے لیے منصوبہ بندی کیجیے۔ جس شخص یا ادارے میں آپ کام کر رہے ہیں، اپنے سے وابستہ ان کی توقعات کو اچھی طرح سمجھیے۔ ایسا مت سوچیے کہ جو آپ سوچ رہے ہیں، وہ بالکل ٹھیک ہے۔ بلکہ آپ کو یہ دیکھنا ہے کہ دوسرے آپ سے کس قسم کی توقعات رکھتے ہیں۔ اور کیا آپ ان پر پورا اتر رہے ہیں یا نہیں!

ساتواں رویّہ: بہتر سے بہترین کی طرف

امریکا کے مشہور فلسفی ایلون ٹوفلر نے کہا تھا:

''اکیسویں صدی کے ان پڑھ ایسے نہیں ہوں گے کہ وہ لکھنا پڑھنا نہ جانتے ہوں، بلکہ ایسے ہوں گے جو ان سیکھی چیزوں کو سیکھ نہ پائیں اور بار بار سیکھنے کی کوشش بھی نہ کریں۔''

میں بہت چھوٹا تھا جب میں نے برفیلی چوٹیوں پر اترنا چڑھنا سیکھا۔ روزانہ مشق نے مجھے اس کام کا ماہر بنا دیا۔ کئی بار میں لڑکھڑایا، گرا اور زخمی بھی ہوا، لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ آخر کار میں نے ۱۸/سال کی عمر میں ایک چوٹی بھی سر کر لی۔ پھر میں نے سوچا کہ اپنی ٹانگیں تڑوانا صحیح نہیں، لہٰذا یہ کام چھوڑ دینا چاہیے۔ میرے پاس اور بہت کچھ کرنے کے لیے ہے۔ واقعی میں نے کئی کام کیے، لیکن میری وہ مہارت آج بھی اتنی ہی ہے۔ بلکہ کچھ کمی ہی ہو گئی۔ وہ بہتری کی طرف نہیں جا سکی۔ میرے نزدیک نہ سیکھنے کی ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگ ناکامی سے ڈرتے ہیں۔ بہادری سے چیلنجوں کا مقابلہ کرنا چاہیے نہ کہ خوف سے کہ ہم سب کچھ چھوڑ دیں۔

''جو بھی شخص سیکھنے کا عمل چھوڑ دے وہ بوڑھا ہو جاتا ہے۔ چاہے وہ ۲۰/برس کا ہو یا ۸۰/سال کا۔ سیکھنے سے نہ صرف آپ جوان رہتے ہیں بلکہ معاشرے میں بھی آپ کی قدر بڑھتی ہے۔''

چنانچہ بہتر سے بہترین کی طرف جایئے، سیکھنے کا عمل کبھی نہ چھوڑیے۔

☆ آٹھواں رویّہ: حقائق کا سامنا کرنا

آپ نے کبھی ایسے مباحثوں میں حصہ لیا جن میں ہر طرح کے موضوع زیرِ بحث آئیں لیکن اصل مسئلے سے آنکھیں چرائی جائیں؟ بعض اوقات گھروں میں بھی ایسے

مباحثے ہوتے ہیں۔ ہر کوئی معاملے کی نزاکت سمجھتا لیکن کہنے کی جرأت نہیں کرتا۔ بعض اوقات آپ خود بھی خواہش کرتے ہیں کہ کاش اصل معاملے کی طرف آیا جائے، تاکہ وقت ضائع نہ ہو۔ حقائق کا سامنا آپ اُسی وقت کر سکتے ہیں جب آپ کے اندر جرأت، ذمہ داری معاملے کی نزاکت سے آگاہی اور دوسروں کے لیے احترام کا جذبہ ہو۔ خصوصاً ایک لیڈر میں اس خوبی کا ہونا بہت ضروری ہے۔

خوشیوں کو بانٹنا بہت آسان ہے، جب کوئی پریشانی آئے تو اس کی ذمہ داری کوئی قبول نہیں کرتا۔ جیسے کہا گیا ہے:

''فتح سیکڑوں باپ رکھتی، جب کہ شکست یتیم ہوتی ہے۔''

اگر آپ سے کوئی غلطی سرزد ہو اور اس سے غلط نتائج برآمد ہوں تو انھیں کھلے دل سے قبول کیجیے۔ نامساعد حالات کا مقابلہ بہادری سے کیجیے۔ اَن کہی باتوں کو بھی تسلیم کرنے کا حوصلہ پیدا کریں۔ جب کوئی موضوع زیرِ بحث ہو تو بلا خوف و خطر اپنی رائے کا اظہار کریں۔ دوسروں کے ہاتھوں سے تلواریں گرادیں اور اپنا سر مٹی میں نہ دبائیے۔

نواں رویّہ: واضح توقعات

چند ماہ پہلے ایک رات میری بیوی جیری نے اپنی ۱۶رسالہ بیٹی میک کنلی سے کہا ''اگر آج تم اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے جانا چاہتی ہو تو اس سے پہلے اپنا کمرہ اور غسل خانہ اچھی طرح صاف کرلو۔''

بچی نے ماں سے وعدہ کرلیا کہ وہ ایسا ہی کرے گی۔ بعد میں جیری میرے پاس بھاگتی ہوئی آئی اور بولی ''اس نے اپنا وعدہ توڑ دیا، وہ بغیر صفائی کیے دوستوں کے ساتھ چلی گئی۔''

میں نے بیٹی کو فون کیا اور پوچھا کہ اس نے اپنا عہد پورا کیوں نہیں کیا؟ اس نے معصومیت سے جواب دیا ''میں تو سارا کام ختم کر آئی ہوں۔'' جب وہ گھر واپس لوٹی تو ہماری میٹنگ ہوئی۔ تب انکشاف ہوا کہ ماں اور بیٹی، دونوں کے معیار صفائی میں بہت فرق ہے۔ ماں کی توقعات کچھ اور تھیں جنھیں بیٹی سمجھ نہ پائی۔ کیونکہ اسے واضح طور پر نہیں بتایا گیا کہ کہاں کہاں اور کیسے صفائی کرنی ہے۔ یوں دونوں کے درمیان غلط فہمی پیدا ہوگئی۔ عام زندگی میں بھی کئی مسائل اپنی غیر واضح توقعات سے جنم لیتے اور آہستہ آہستہ ہمارا اعتماد کھو دیتے ہیں۔ واضح توقعات کا مطلب ہے کہ ایسا معاہدہ طے پانا جو ہمیں سونپی گئی ذمے داری روز روشن کی طرح عیاں کر پائے یا پھر وہ جو ہم دوسروں کے کندھوں پر ڈالیں۔

ذرا رکیے اور سوچیے کہ دفاتر اور گھروں میں ہمارا کتنا وقت ضائع ہوتا ہے اور ہمیں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، صرف اس وجہ سے کہ ہمیں ایک دوسرے سے وابستہ توقعات کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔

مختصر یہ کہ ہمیں دوسروں کے حوالے سے جو توقعات ہوں، انھیں زیرِ بحث لائیں تاکہ ان پر عمل ہو سکے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اگر ضرورت محسوس ہو تو ان پر نظرِ ثانی کیجیے۔ آپ خود بھی دوسروں کی امیدوں پر پورا اترنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

خود ہی یہ مت سوچیے کہ دوسرا فریق خود ہی بات سمجھ جائے گا یا اسے سمجھ لینی چاہیے۔

دسواں رویّہ: خود احتسابی

خود احتسابی کا عمل ذمہ داری کا احساس رکھتا ہے، اگر ہم اس کا دوسرا رخ دیکھتے ہیں تو وہ یہ ہے:

''یہ میری غلطی نہیں''

''یہ میری ذمہ داری نہیں''

''میری وجہ سے ایسا نہیں ہوا''

لیکن جب خود احتسابی کا عمل ہمارے اندر ہل جائے، تو نہ صرف ہم اپنی غلطیوں، کوتاہیوں کا اعتراف کرتے بلکہ انھیں درست کرنے کی سعی بھی کرتے ہیں۔ میرا ایک دوست ٹام درآمدات اور برآمدات کی شپنگ

چلاتا ہے۔ کچھ ملازمین اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ کمپنی کا اصول ہے کہ اگر کسی گاڑی کا حادثہ ہو تو فوراً پولیس میں رپورٹ درج کرائی جائے۔ نقصان کے تمام اخراجات کمپنی برداشت کرے گی۔ ٹام نے ایک نیا ملازم رکھا، اسے اصول کا علم نہیں تھا۔ اتفاقاً جب گاڑی کو حادثہ پیش آیا تو اس نے کوئی رپورٹ درج نہ کرائی۔ ٹام کے پوچھنے پر ملازم نے بتایا کہ وہ اس اصول سے ناواقف ہے۔ ٹام نے تمام نقصان کی ذمہ داری کمپنی پر لی اور ایک نوٹ لکھ کر جرم کو بھجوایا کہ غلطی تمھاری نہیں بلکہ میری ہے کیونکہ میں نے تمھیں مکمل معلومات بہم نہیں پہنچائیں حالانکہ یہ میری ذمہ داری تھی۔ یہ نوٹ میں نے خود احتسابی سیکھنے کے لیے اپنی ڈائری میں بھی لکھ لیا۔

مشہور امریکی کاروباری آرنلڈ گلاسناؤ کہتا ہے:

''ایک اچھا لیڈر وہ ہے جو ناکامی کی ذمہ داری اپنے سر پر لے اور کامیابیوں کا سہرا دوسروں کے سروں پر بھی سجنے دے۔''

جہاں آپ خود کو خود احتسابی کے عمل سے گزاریں، وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ آپ دوسروں کا احتساب کریں۔ ساتھ ساتھ دوسروں کو اجازت دیں کہ وہ آپ کے معاملات کی بھی جانچ پڑتال کریں۔

گیارھواں رویّہ: پہلے سنیے، پھر بولیے

آخر میں تین اصولوں کا تذکرہ جو ہماری شخصیت متوازن بناتے ہیں۔

پہلے سننے کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے شخص کی بات نہ صرف سنیے بلکہ خود کو اس کی جگہ رکھ کے اس کے احساسات مکمل طور پر سمجھنے کی کوشش کیجیے۔

ایک بار میں نے تقریری مقابلے میں حصہ لیا۔ میرے ایک دوست سامنے براجمان تھے۔ میں نے ابھی تقریر شروع کی تھی کہ انھوں نے تیزی سے اپنا ہاتھ ہلانے کی شکل میں ہوا میں لہرایا۔ میں سمجھا وہ کہہ رہے ہیں، یہی الفاظ دہراؤ، بہت زبردست ہیں۔ میں نے انھیں دہرا دیا۔ دو تین بار ایسے ہی ہوا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ کہہ رہے تھے، تم بالکل ٹھیک جا رہے ہو۔ مجھے نہ صرف شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا بلکہ میں ہار بھی گیا۔ وہ تو داد دے رہے تھے جب کہ میں کچھ اور سمجھا..... یوں مجھے علم ہوا کہ ہمیں خود ہی کچھ اندازہ نہیں لگانا چاہیے۔

یہ ایک الگ معاملہ ہے کہ ہم بات سمجھ نہ پائیں۔ اکثر ہم دوسروں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ جان بوجھ کر کسی کی بات کو اہمیت نہیں دیتے کیونکہ ہم اسے نظروں سے گرانا چاہتے ہیں۔ یوں درحقیقت ہم خود ہی گر جاتے اور کم ظرفی کا مظاہر کرتے ہیں۔ یہ ہماری کم علمی کی نشانی ہے۔ ایک لیڈر کے اندر سننے اور پرکھنے کا مادہ بدرجۂ اتم موجود ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کے بغیر اعتماد کا پروان چڑھنا ناممکن ہے۔ نہ صرف آپ اپنے کانوں سے سنیں بلکہ آنکھوں سے اور دل سے بھی.....

بارھواں رویّہ: قول و فعل میں تضاد نہ ہو

ایک مفکر، ربیو مارش کا کہنا ہے:

''معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، جو بات درست ہے، آپ اس کے ساتھ چپک جائیے اور جو زبان سے کہیں، اسے پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔''

اعتماد حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ اپنے قول پر پورا اترنا اور وعدہ وفا کرنا ہے۔ سوچ سمجھ کر بولنا اور پھر کہے کو پورا نہ کرنا بداعتمادی کی سب سے بڑی مثال ہے۔ مثلاً ہمارے وزیر آئے دن عوام سے وعدے کرتے ہیں کہ لوڈشیڈنگ ختم ہو جائے گی۔ لیکن آج تک ایک بھی ایفا نہیں ہوا۔ پورا کرنے کی نوبت آنے سے پہلے ہی وعدے کی مدت میں توسیع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ عوام کیونکر حکومت پر اعتماد کریں؟ بالکل ٹھیک سوچا، اعتماد پہ صرف وہی پورا اترتا ہے جو اپنا وعدہ ایفا کرے۔ کسی کو آپ جھانسا ایک یا دو بار ہی دے سکتے ہیں، لمبے عرصے کے لیے شیشے میں نہیں اتار پاتے۔ لہٰذا اپنے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائیے اور سوچ سمجھ کر بات کیجیے۔ پھر اس پر پورا

اتریئے۔ آپ کو ہمیشہ اچھے لفظوں سے یاد کیا جائے گا۔

تیرھواں رویّہ: اعتماد بڑھانا

اس اصول کی بنیاد یہ امر ہے کہ ہم جان لیں، کئی لوگ اعتماد کیے جانے کے قابل ہیں۔ جب ہم کسی کو پُراعتماد جذبات سے نوازیں تو اکثر ہمیں دوسری طرف سے اعتماد ہی ملتا ہے۔ دوسروں پر اعتماد نہ کرنے سے عموماً انسان کو نقصان ہی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جب اداروں کے سربراہ اپنے ملازمین پر اعتماد نہیں کرتے تو وہ بھی انھیں چکمہ دینے لگتے ہیں۔ یوں آہستہ آہستہ کمپنی تباہی کے دھانے پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ کئی کمپنیاں افسر کی موجودگی میں ہی ملازمین کو اوور ٹائم کرنے دیتی ہیں۔ دراصل یہ سمجھا جاتا ہے کہ ملازمین کام نہیں کرتے بلکہ گپ شپ لگا کر چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ مسئلہ فریقین کا اعتماد بحال کرنے سے حل کرنا ممکن ہے۔ کچھ ٹارگٹ بھی رکھے جا سکتے ہیں کہ آج یا فلاں دن ہم نے انھیں ضرور حاصل کرنا ہے۔ جب ملازمین اس منزل تک پہنچ جائیں تو مالکان کو خوش ہونا چاہیے۔ یوں وہ آہستہ آہستہ بداعتمادی والے ماحول سے نکل آئیں گے۔

آپ اپنی زندگی میں جس کامیاب انسان سے متاثر ہوں، اسے ''رول ماڈل'' کے طور پر ہمیشہ سامنے رکھیے۔ اب آپ کو کسی نگرانی کی ضرورت نہیں بلکہ آپ اپنے نگران خود ہیں۔ آپ نے بھی کامیابی کی وہ منزل حاصل کرنی ہے جس پر آپ کا رول ماڈل کھڑا ہے۔ جب آپ کے قدم مضبوط ہوئے تو راستے خود بخود سہل ہو جائیں گے۔

.....

(لاہور میں مقیم ترجمہ نگار فوزیہ افضل ایم اے انگلش، ایم اے اُردو کے علاوہ ایم ایڈ بھی ہیں۔ انھیں اچھی کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔)

■

www.urdudigest.pk

اقوال زریں

پرانی لکڑی جلنے میں، پرانے دوست بھروسے میں اور پرانے ادیب پڑھنے میں بہترین ہیں۔ (فرانسیسی بیکن)

جو شخص اچھی کتابیں پڑھنے کا شوق نہیں رکھتا وہ معراج انسانی سے گرا ہوا ہے۔ (جارج برنارڈشا)

کپڑے چاہے پرانے ہوں، مگر نئی کتابیں ضرور خریدو۔ (آسٹن فلپس)

کتابیں وہ جہاز ہیں جو وقت کے وسیع سمندر میں چلتے ہیں۔ (لیو)

آدمی مطالعہ سے بیدار ہوتا ہے، مکالمے سے اس میں تمیز آتی ہے اور لکھنے سے اس کی شخصیت نکھر جاتی ہے۔ (راجر بیکن)

اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمھارے مرنے کے بعد لوگ تم کو بھول نہ جائیں تو کچھ ایسی چیزیں لکھو جو پڑھی جائیں یا ایسے کام کرو جو لکھنے کے قابل ہوں۔ (فرینکلن)

خیالات کی جنگ میں کتابیں ہتھیاروں کا کام دیتی ہیں۔ (البیرونی)

جس گھر میں کتابیں نہیں وہاں نیکی خاموش ہے، انصاف اونگھ رہا ہے، سوچ گونگی ہے اور زندگی بے معنی ہے۔ (بارہومین)

کتاب وہ متحرک پارک ہے جسے تم اپنے ہاتھوں میں تھامے جہاں چاہے لے جا سکتے ہو۔ (حافظ فتح محمد قادری)

ادیب قوم کی پونجی ہیں، اس پونجی کی حفاظت اور نگہداشت قوم کا مقدم فرض ہے۔ (بابائے اُردو مولوی عبدالحق)

(ثمینہ سکندر۔ اوکاڑہ)

سعید انصاری

امریکہ میں جرنیلوں کی عزت کیوں کی جاتی ہے؟

جرنیلوں کا ٹوٹتا سحر

جنسی آزادی کے علمبردار ملک کے باسی اپنے جرنیلوں اور حکمرانوں سے اعلیٰ اخلاقی کردار اور خاندان سے وفاداری سے کم پر راضی نہیں

چند ماہ قبل امریکی فوج کا سابق فور سٹار جرنیل اور سربراہ سی آئی اے ڈیوڈ پیٹریاس خاصی ذلت اٹھا کر گھر واپس گیا۔ امریکیوں کی نظر میں وہ واقعہ نائن الیون (9/11) کے بعد سامنے آنے والا سب سے نمایاں جرنیل تھا جس نے عراق میں خانہ جنگی کی شدت کم کر کے شہرت پائی۔ کئی امریکی دانشوروں کا خیال تھا کہ پیٹریاس ۲۰۱۲ء کے صدارتی انتخابات جیت کر صدر بن سکتا ہے لیکن بے راہ روی کا شکار ہو کر اس نے اپنا مستقبل تباہ کر لیا۔

جنرل پیٹریاس کے اسکینڈل نے خصوصاً

امریکی قوم کو بہت دھچکا پہنچایا۔ گو امریکا میں آزادی جنس کافی زیادہ ہے لیکن آج بھی امریکی عوام اپنے راہنماؤں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ دیانت دار اور اپنے خاندان سے مخلص رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی سیاستدان ہو، سرکاری افسر یا جرنیل، کسی مشہور شخصیت کا جنسی اسکینڈل سامنے آئے تو وہ عموماً ہمیشہ کے لیے منظر عام سے غائب ہو جاتا ہے۔

پیٹریاس اسکینڈل نے امریکا میں دانشوروں اور عوام کے درمیان ایک دلچسپ بحث بھی چھیڑ دی۔ وہ یہ کہ آخر امریکی اپنے اعلیٰ جرنیلوں کو اندھا دھند کیوں پوجتے ہیں؟ اور جب شخصی طلسم ٹوٹ جائے تو امریکی عوام پر کس قسم کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

جرنیلوں سے محبت دراصل امریکی عوام کے خمیر میں رچ بس چکی ہے۔ امریکا کا بارہواں صدر زچاری ٹیلر اتنا غیر سیاسی تھا کہ سیاست میں آنے سے قبل اس نے کبھی ووٹ ہی نہیں ڈالا۔ تاہم ۱۸۴۰ء میں وگ (ریپبلکن) پارٹی نے اسے اپنا صدارتی امیدوار بنا لیا اور وہ انتخابات جیتنے میں کامیاب رہا۔

دراصل زچاری ٹیلر سابق جرنیل تھا۔ اس نے امریکا۔ میکسیکو جنگ کے دوران کارہائے نمایاں دکھائے تھے۔ یوں وہ امریکی عوام میں مقبول ہو گیا۔ وگ پارٹی نے یہی مقبولیت دیکھتے ہوئے اسے ٹکٹ دیا اور وہ وائٹ ہاؤس پہنچنے میں کامیاب رہا۔

ممتاز امریکی جرنیل اور پہلے صدر جارج واشنگٹن پر کئی سوانحی کتب لکھنے والا امریکی مورخ، ران چرناؤ بتاتا ہے ''امریکی جرنیلوں نے ہمیشہ قومی سیاست میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس فرقے کی پوجا جارج واشنگٹن اور نو آبادیاتی فوج (Continental army) کے دور ہی میں شروع ہو گئی تھی۔ برطانیہ میں تو جرنیل نمایاں کارکردگی دکھانے پر محض ''سر'' کا خطاب پاتے ہیں۔ لیکن امریکا میں حکومت میں اعلیٰ سیاسی عہدے دے کر انھیں بھاری انعام و کرام سے نوازا جاتا ہے۔

جنرل پیٹریاس کے علاوہ افغانستان میں اتحادی افواج کا امریکی سربراہ، جنرل جان ایلن بھی ایک خاتون سے ''غیر مناسب'' رشتہ رکھنے کا مرتکب نکلا۔ یہ دونوں جرنیل شادی شدہ، بچوں والے اور معاشرے میں بلند مقام رکھتے تھے۔ ان کے زوال سے عام امریکی اب اپنے حکمران طبقے سے یہ اہم اور سنجیدہ سوال پوچھنے لگے ہیں۔ ''ہم نے اپنی قیادت کن لوگوں کو سونپ رکھی ہے؟''

ماضی کے جھروکوں سے

امریکی عوام میں جرنیلوں سے اندھی عقیدت کا چلن تین سو سال قبل شروع ہوا۔ تب امریکی فوجیوں ہی نے برطانوی غاصبوں اور ریڈ انڈینز..... دو دشمنوں سے مقابلہ کیا اور عام امریکیوں کو محفوظ رکھا۔ اسی جدوجہد کے دوران امریکی فوج کے کمانڈر اور بعدازاں پہلے امریکی صدر جارج واشنگٹن امریکا کو آزادی دلانے میں کامیاب رہے۔

اس زمانے میں امریکا کا قومی اتحاد کمزور تھا۔ وہ بھی بعض پاکستانیوں کے مانند وفاق کے بجائے ریاستوں یا صوبوں کو اولیت دیتے اور خود کو انہی کا شہری سمجھتے تھے۔ جارج واشنگٹن کی فوج پہلا وفاقی ادارہ تھا جس نے امریکیوں کو قومی وحدت و اتحاد کا شعور بخشا۔ اسی لیے امریکی اس ادارے کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

جرنیلوں سے رغبت رکھنے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ امریکیوں کی بہت بڑی تعداد سیاست دانوں کو ناپسندیدگی بلکہ نفرت سے دیکھنے لگی حتیٰ کہ جمہوریت سے شغف رکھنے والے امریکی بھی اپنے کئی سیاسی راہنماؤں کی حرکات سے نالاں رہتے ہیں۔

امریکی جرنیلوں کی ایک خاصیت یہ ہے کہ ان میں سے کئی غریب خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنی محنت اور ذہانت کے بل بوتے پہ انھوں نے ترقی کی اور بام عروج پر پہنچے۔ مثلاً امریکی خانہ جنگی میں فاتح یونین افواج کا کمانڈر، جنرل الائیز گرانٹ چمڑا رنگنے والے کا بیٹا تھا۔ وہ بعدازاں امریکی صدر بھی بنا۔

اسی طرح مشہور امریکی صدر اینڈریو جیکسن

ایکاٹ لینڈ آنے والے غریب مہاجر کا بیٹا تھا۔ اسے شہرت ۱۸۱۲ء میں ملی جب اس نے بحیثیت جنرل نیو اورلینز میں برطانویوں کو شکست دی۔ یونیورسٹی آف شمالی کیرولینا سے وابستہ مشہور امریکی مورخ رچرڈ کوہن کہتا ہے ''ماضی کے جرنیلوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کی وجہ سے عوام میں شہرت و عزت پائی۔ یوں انھیں لوگوں کا اعتماد بھی حاصل ہوا۔''

جرنیل جنگی چالیں چلنے کے ماہر ہوتے ہیں۔ نیز فوجی اداروں میں بھی اچھے عہدے حاصل کرنے کی خاطر کچھ کھینچا تانی ہوتی ہے۔ تاہم خصوصاً امریکا میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ جرنیل سیاست دانوں کے مانند شاطر، منافق اور پس پشت سازشیں کرنے کے ماہر نہیں ہوتے نیز ان کا اخلاقی کردار بھی بلند ہوتا ہے۔

پروفیسر جیمز میکفرسن مشہور امریکی مورخ اور پلٹزر انعام یافتہ کتاب ''خانہ جنگی کی تاریخ'' کا مصنف ہے۔ وہ کہتا ہے ''امریکی تاریخ کے آغاز ہی میں امریکیوں کی اکثریت سیاست سے بیزار ہو گئی۔ دوسری سمت جرنیلوں کو خاص سمجھا گیا جو عموماً سیاسی آلودگیوں سے پاک رہتے تھے۔ حتیٰ کہ جرنیل معاشرے کی دیگر غیر سرکاری ہستیوں، تاجروں اور کاروباریوں سے بھی ممتاز ہو گئے۔ وجہ یہی ہے کہ امریکا میں جرنیل بے غرض اور بے لوث سمجھے گئے۔''

پہلی اور خصوصاً دوسری جنگ عظیم میں امریکی جرنیل بڑے سرگرم رہے، یوں امریکہ میں ان کی مقبولیت مزید بڑھ گئی۔ تب یہ مشہور ہو گیا کہ وہ اپنے ملک و قوم کی خاطر اپنی جانیں خطرے میں ڈالتے ہیں۔ چنانچہ ان کا مرتبہ دوچند ہو گیا اور وہ امریکی معاشرے میں ہیرو سمجھے جانے لگے۔

یہی وجہ ہے کہ جب کوئی سابق جرنیل امریکی سیاست میں آتا ہے تو لوگ اسے خوش آمدید کہتے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دیگر مغربی ممالک مثلاً برطانیہ میں جرنیلوں کو یہ بلند مقام حاصل نہیں حالانکہ ماضی میں انگریزوں نے بھی کئی جنگیں لڑی ہیں۔ مثال کے طور پر امریکا میں ۱۰ رسابق جرنیل صدر بننے میں کامیاب رہے۔ برطانیہ میں صرف ایک سابق جرنیل، ڈیوک آف ویلنگٹن ہی وزیر اعظم کا عہدہ پا سکا۔ ایک برطانوی مورخ کہتا ہے: ''اگر امریکی سیاست میں کوئی جرنیل داخل ہو تو وہ بہت جلد اعلیٰ عہدوں تک پہنچ جاتا ہے۔ برطانوی سیاست میں ایک جرنیل اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب وہ اپنی سیاسی جماعت کو وقت دے، کام کرے اور نمایاں خدمات انجام دے۔

جنرل ٹیلر کے مانند جنرل گرانٹ بھی کوئی سیاسی پس منظر نہیں رکھتا تھا بلکہ خانہ جنگی سے قبل وہ ایک ناکام کاروباری اور فوج میں جونیئر فوجی افسر تھا۔ لیکن جنگ کے بعد اس کی شہرت بام عروج پر جا پہنچی۔ حتیٰ کہ ۱۸۶۸ء میں ریپبلکن پارٹی نے اسے اپنا صدارتی امیدوار بنایا اور ''قصر سفید'' تک پہنچا دیا۔

فوج کو دھچکا

بیسویں صدی میں عوامی سطح پر امریکی فوج کو پہلا دھچکا ویت نام جنگ کے ذریعے لگا۔ وجہ یہی ہے کہ آزادی اور جمہوریت کی چیمپین امریکی حکومت اب خود ایک استعماری طاقت بن گئی۔ لہٰذا پوری دنیا میں ویت نام پر امریکی حملے کی مذمت ہوئی۔ خود امریکا میں لاکھوں لوگوں نے اسے ناپسند کیا۔ اسی لیے ویت نام جنگ لڑنے والے امریکی جرنیلوں کے نام آج کوئی نہیں جانتا۔ انھیں سیاسی سطح پر بھی کامیابیاں نہیں ملیں۔

ویت نام جنگ کے مانند عراق اور افغانستان میں لڑی گئی امریکی جنگیں بھی متنازع ہیں۔ کئی امریکی انھیں امریکی استعمار کی تباہ کن سرگرمی سمجھتے ہیں۔ تاہم انہی جنگوں میں بعض جرنیلوں مثلاً ڈیوڈ پیٹریاس نے شہرت بھی پائی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ویت نام جنگ کے بعد امریکی

امریکا میں ۱۰ رسابق جرنیل صدر بننے میں کامیاب رہے

www.urdudigest.pk

قوم جرنیلوں کی انفرادی کارکردگی، بہادری یا صلاحیتوں کو سراہنے لگی۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ کو بہت کم امریکی ایک اہم فوجی کارنامہ سمجھتے ہیں لیکن اس جنگ میں شامل ایک جرنیل کولن پاول نے اپنے کارناموں کی بدولت امریکیوں میں شہرت پائی۔ وہ بعدازاں وزیرخارجہ بھی رہا۔ اسی طرح ایک اور جرنیل نارمن شوارزکوف بھی عالمی سطح پر مشہور ہوا۔

واقعہ نائن الیون کے بعد امریکا میں فوج کو دوبارہ عروج حاصل ہوا۔ وجہ یہی ہے کہ امریکی قوم فوجیوں کو اپنا محافظ اور نجات دہندہ سمجھنے لگی۔ چنانچہ فوج کے جرنیل دوبارہ قومی سطح پر نمودار ہوئے اور ہیرو بن گئے۔ جرنیلوں کے حالیہ اسکینڈلز طشت ازبام ہونے سے قبل امریکا میں فوج ہی وہ سرکاری ادارہ تھا جسے عوام سب سے زیادہ عزت واحترام دیتے تھے۔ مثلاً ۲۰۱۱ء کے گیلپ پول کی رو سے ''۷۸ رفیصد'' امریکی فوج پر اعتماد رکھتے تھے۔

جدید دور میں ایک عجوبہ یہ سامنے آیا کہ امریکی حکومت میں شامل بہت کم سیاستدان فوج میں رہے ہیں۔ چنانچہ عوام میں جرنیلوں کی مقبولیت سے متاثر ہوکر وہ ان کی اطاعت کرنے لگے۔ جرنیلوں کی ''جی حضوری'' صدر رونالڈ ریگن کے دور سے شروع ہوئی، بعدازاں صدر بش جونیئر نے تو اسے چلن بنا دیا۔ اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں بعض جرنیلوں کی مقبولیت نے اس چلن کو تقویت پہنچائی۔ ان میں سب سے نمایاں نام جنرل ڈیوڈ پیٹریاس کا تھا۔

۲۰۰۷ء کے عراق میں خانہ جنگی عروج پر تھی۔ کئی گروہ آپس میں یا اتحادیوں سے نبرد آزما تھے۔ تب صدر بش نے جنرل پیٹریاس کو اتحادی فوج کا کمانڈر بنایا۔ پیٹریاس نے عراق میں فوجیوں کی تعداد بڑھائی اور خانہ جنگی پر قابو پانے میں کامیاب رہا۔ اسی کارنامے کے باعث امریکا میں اسے ہیرو کا درجہ مل گیا۔

خاص بات یہ کہ امریکی حکومت اسی ارفع کردار (Heroism) کی آڑ میں وہ ناکامیاں اور خامیاں چھپانے میں کامیاب رہی جن کا سامنا اُسے عراق وافغانستان جنگوں میں کرنا پڑا۔ لیکن اب اس کا (جعلی) سحر ٹوٹ چکا۔ لہٰذا امریکی عوام اپنی حکومت سے سوال کر رہے ہیں کہ گزشتہ ۱۱ برس میں اربوں ڈالر جنگوں میں کھپ چکے لیکن ایک جنگ بھی جیتی نہ گئی، اس کی کیا وجہ ہے؟ یوں پیٹریاس اسکینڈل نے کم ازکم عام امریکی کی آنکھوں پر پڑا پردہ ہٹا دیا۔ اب وہ زیادہ شعور کے ساتھ جائزہ لے سکتے ہیں کہ ان کی حکومت اپنا دفاع کر رہی ہے یا دنیا میں نوآبادیاں بنانا اس کا مطمحِ نظر ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ وطن عزیز میں پاکستانیوں کی کثیر تعداد فوج کو پسند کرتی ہے۔ ان کے نزدیک جرنیل ہر لحاظ سے سیاست دانوں سے بہتر ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ پاکستانی جرنیلوں میں شاید کچھ اخلاقی برائیاں پائی جاتی ہوں، وہ (ماسوا جنرل یحییٰ اور ایک آدھ دوسرے جرنیل کے) امریکی جرنیلوں کی طرح جنسی اسکینڈلوں میں ملوث نہیں ہوئے۔

جرنیلوں کے ستارے کیا بتاتے ہیں؟

ایک ستارہ.....☆.....بریگیڈئر جنرل جو ایک ڈویژن فوج کا نائب کمانڈر ہوتا ہے۔ ایک ڈویژن میں ۱۰ تا ۱۵ ہزار فوجی ہوتے ہیں۔

دو ستارے.....☆☆.....میجر جنرل جو ایک ڈویژن فوج کا کمانڈر ہوتا ہے۔

تین ستارے.....☆☆☆.....لیفٹیننٹ جنرل جو ایک کور کا سربراہ ہوتا ہے۔ ایک کور میں دو تین ڈویژن شامل ہوتے ہیں۔

چار ستارے.....☆☆☆☆.....جنرل جو ایک ملک کی بری فوج کا کمانڈر ہوتا ہے۔

پانچ ستارے.....☆☆☆☆☆.....جنرل آف دی آرمی۔ یہ عہدہ صرف جنگ میں تخلیق ہوتا ہے تاکہ بری فوج کا سب سے برتر کمانڈر بن جائے۔ امریکی فوج کا آخری جنرل آف دی آرمی، جنرل عمر بریڈلے تھا۔

تاریخ کی ایک ایسی جھوٹی دلچسپ کہانی جس پہ سب کو یقین ہے

میراتھن کی تاریخ

میراتھن میں ایسا کیا جادو ہے کہ صدیوں سے سر چڑھ کر بول رہا ہے

کلیم اللہ فاروقی

بعض کہانیاں جھوٹی ہونے کے باوجود اتنی دلچسپ ہوتی ہیں کہ لوگ ان پر یقین کر لیتے ہیں لیکن میراتھن دوڑ کی کہانی کے متعلق معلوم ہو جانے کے بعد بھی کہ یہ سرتاپا جھوٹی ہے، لوگ اس پر یقین ہی نہیں کرتے بلکہ اس کہانی کے سحر میں کھوئے ہوئے ہیں اور اب اگر انھیں کوئی کہے بھی کہ یہ جھوٹی ہے اور انھیں یقین بھی آجائے کہ یہ واقعی جھوٹی کہانی ہے پھر بھی وہ میراتھن دوڑ نا نہیں چھوڑیں گے۔ شاید جس طرح خدا کے متعلق گوئٹے کے مشہور عالم ڈرامے فاؤسٹس میں ڈاکٹر فاؤسٹس کہتا ہے کہ ''اگر کوئی خدا نہ ہوتا تو (نظام حیات چلانے کے لیے) ایک خدا کا تخلیق کرنا ضروری ہو جاتا۔'' کیونکہ خدا کے وجود پر یقین کیے بغیر کاروبار حیات چلانا تقریباً ناممکن ہو جاتا۔ اسی طرح میراتھن کی کہانی جھوٹی

www.urdudigest.pk

بھی ہے تو اس پر یقین کر لینا لوگوں کے لیے فائدہ مند ہے۔ نہ صرف مالی بلکہ جسمانی طور پر بھی۔ دنیا بھر میں ہر عمر کے لاکھوں لوگ میراتھن رننگ سے فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔

میراتھن کے متعلق ایک غلط فہمی

دراصل میراتھن یونان کے ایک گاؤں کا نام تھا جہاں ۴۹۰ ق م میں اہل ایتھنز نے حملہ آور پرشین فوج کو زبردست شکست دی تھی۔ قصہ مشہور ہے کہ اس فتح کی خوش خبری اہل ایتھنز کو سنانے کے لیے ایک سپاہی دوڑایا گیا جس کا نام فائیڈی پیڈیز تھا۔ یہ سپاہی ایتھنز پہنچا اور اہل شہر کو فتح کا مژدہ سنایا، ''جشن مناؤ، ہم جیت گئے۔'' یہ کہہ کر وہیں زمین پر گرا اور مر گیا۔ اسی کی یاد میں میراتھن دوڑ کو اولمپکس میں شامل کیا گیا۔

حقیقت کیا ہے؟

یہ قصہ دراصل جدید اولمپکس کے بانی ڈی کوبرٹن کے ایک دوست مائیکل برئیل کے ذہن کی اختراع ہے جو بیرن کے ساتھ یونان گیا تھا۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ پہلی اولمپکس میں کم از کم دو ایسے مقابلے ضرور شامل کیے جائیں جو قدیم یونان میں کھیلے جاتے تھے۔ چنانچہ مائرن کے مشہور عالم قدیم مجسمے ڈسکوبولس کو دیکھ کر ڈسکس تھرو کو اولمپکس میں شامل کیا گیا اور میراتھن کی جنگ کا حال تاریخ کی کتب میں پڑھ کر اور مراتھن سے ایتھنز تک کا فاصلہ دیکھ کر میراتھن کے پیغام رساں والا افسانہ تراشا گیا اور یوں میراتھن دوڑ اولمپکس مقابلوں کا حصہ بن گئی۔

مذکورہ بالا واقعہ کا تاریخ کی کتب میں کوئی ذکر نہیں۔ اگر اس واقعے میں کچھ حقیقت ہوتی تو ہیروڈوٹس جیسا محقق اور ذمہ دار تاریخ نویس اس واقعے کو اپنے اہل وطن سے پوشیدہ نہ رکھتا۔ بلاشبہ تاریخ کی کتب میں فائیڈی پیڈیز نامی پیغام رساں کا ذکر ملتا ہے لیکن وہ جنگ میراتھن کے ۴۰۰ سال بعد کے زمانے میں پیغام رسانی کرتا تھا اور ایک پیشہ ور پیغام رساں تھا اور یہ شخص میراتھن سے نہیں بلکہ ایتھنز سے اسپارٹا تک تقریباً ۱۳۶ میل دوڑا تھا۔ میراتھن کے پیغام رساں کا افسانہ پہلی مرتبہ جنگِ میراتھن کے ۵۶۰ سال بعد پلوٹارک نے تراشا تھا اور قدیم یونانی شاعر ہومر یا ورجل میں سے بھی کسی ایک نے بھی اپنی نظموں میں فائیڈی پیڈیز نامی پیغام رساں کا ذکر نہیں کیا تھا۔ مذکورہ پیغام رساں کی موت کا واقعہ یوں بھی قرین قیاس نہیں کہ اس زمانے میں سفر عموماً پیدل یا دوڑ کر ہی کیا جاتا تھا اور ذاتی بقا کے لیے، خواہ وہ دشمن سے بچاؤ ہو یا خوراک کے لیے، جانوروں کا شکار کرنے کے لیے انسان کو دوڑنا پڑتا تھا۔ اور زندگی آج کی طرح اتنی آسان اور سہل نہ تھی اور نہ ہی مشینوں کی محتاج اور دوڑنا ایک قدرتی فعل تھا۔ لہٰذا صرف ۲۶ میل دوڑ کر کسی پیشہ ور پیغام رساں کا مر جانا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔

اگرچہ میراتھن کے پیغام رساں کا واقعہ سراسر فرضی ہے لیکن اس دوڑ میں حصہ لینے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ تاریخ کا حصہ ہو اور اس فرضی پیغام رساں کے نقوش پا پر دوڑ رہا ہو اور یہ احساس دنیا میں اور کسی مقام پر میراتھن دوڑ کر پیدا نہیں ہوتا۔

میراتھن کا فاصلہ بڑھانے کی وجہ

۱۹۰۸ء میں اولمپکس لندن میں منعقد ہونے تھے اور ونڈسر کیسل میں شاہی خاندان قیام پذیر تھا۔ ایک شہزادی نے خواہش ظاہر کی کہ وہ میراتھن کا آغاز اپنے محل کی کھڑکی میں سے دیکھنا چاہتی ہے اور شہزادہ نے یہ بھی خواہش کی کہ وہ میراتھن کا اختتام اسٹیڈیم میں دیکھنا چاہتی ہے۔ لہٰذا میراتھن دوڑ کا آغاز ونڈسر کیسل سے کیا گیا جہاں سے اسٹیڈیم تک کا فاصلہ

www.urdudigest.pk

پورے ۲۶ میل تھا۔ اسٹیڈیم میں داخل ہو کر شاہی خاندان کے بیٹھنے کی مخصوص نشستوں کے سامنے مقامِ اختتام تک کا فاصلہ ۳۸۵ گز تھا۔ چنانچہ فاصلہ مزید ۳۸۵ گز تک بڑھا دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر میراتھن دوڑ کے آخری ڈھائی کلومیٹرز میں جب اتھلیٹ بہت تھک چکے ہوتے ہیں اور ان کے عضلات میں ناقابل برداشت درد ہوتا ہے تو وہ بے ساختہ مذکورہ شہزادی کی روح کو بے نقط مغلظات سناتے ہیں بددعائیں دیتے ہیں۔

۱۸۹۶ء سے ۱۹۲۴ء تک مختلف فاصلوں کی دوڑیں منعقد ہوتی رہیں۔ لیکن ۱۹۲۴ء میں ہمیشہ کے لیے یہ فاصلہ ۲۶ میل اور ۳۸۵ گز (۴۲٫۱۹۵ کلومیٹر) مقرر کر دیا گیا۔ ۱۸۹۶ء سے ۱۹۲۴ء تک اولمپکس میں میراتھن دوڑ کے فاصلوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

سال	میراتھن کا فاصلہ
۱۸۹۶ء	۴۰ کلومیٹر
۱۹۰۰ء	۴۰٫۲۶ کلومیٹر
۱۹۰۴ء	۴۰ کلومیٹر
۱۹۰۸ء	۴۲٫۹۵ کلومیٹر
۱۹۱۲ء	۴۰٫۲ کلومیٹر
۱۹۲۰ء	۴۲٫۷۵ کلومیٹر
۱۹۲۴ء	۴۲٫۱۹۵ کلومیٹر

اولمپکس میں سب سے آخر میں میراتھن ریس کا اختتام ہوتا ہے۔ آغاز مختلف مقامات سے کیا جاتا ہے لیکن اختتام اسٹیڈیم کے اندر ہی ہوتا ہے تاکہ تماشائی محظوظ ہوسکیں۔ ۲۰۰۴ء کی سمر گیمز کے موقع پر میراتھن ریس کا آغاز میراتھن کے تاریخی میدانِ جنگ سے ہوا اور اختتام ایتھنز کے پناتھینیکو اسٹیڈیم میں ہوا۔

پاکستان میں بھی تین تین میل کی دوڑوں کو میراتھن کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ دوڑوں کے منتظمین کو لفظ میراتھن کے معانی ہی معلوم نہیں۔ کبھی ۷ میل کی دوڑ کو منی میراتھن کا نام دیا جاتا ہے۔ خود منتظمین کو بھی معلوم نہیں کہ اس دوڑ کے انتظامات کیسے کیے جاتے ہیں۔ نہ موسم کا خیال رکھا جاتا ہے اور نہ اتھلیٹس کو تیاری کے لیے مناسب وقت دیا جاتا ہے۔ حالانکہ میراتھن دوڑنے والوں کے لیے کم از کم ۶ ماہ قبل اطلاع دینا ضروری ہے تاکہ وہ تیاری کر سکیں۔ ہر شخص کو حصہ لینے کی اجازت ہوتی ہے حالانکہ لمبے فاصلے خصوصاً میراتھن دوڑنے میں شرکت کے لیے ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ لازمی ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ عالمی معیار کے مطابق ضروری شرائط کو پورا کیے بغیر کسی اتھلیٹ کو میراتھن میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دینا چاہیے۔

پہلی لاہور انٹرنیشنل میراتھن مذاق سے کم نہ تھی

پاکستان میں منعقد ہونے والی پہلی انٹرنیشنل میراتھن کے موقع پر ان باتوں کا خیال نہ رکھا جا سکا جس کی وجہ سے صرف چند اتھلیٹس ہی دوڑ مکمل کر سکے کیونکہ ماسوائے دو چار اتھلیٹس کے کسی کو لمبے فاصلوں کی دوڑوں میں حصہ لینے کا تجربہ نہ تھا۔ پاکستانیوں میں اوّل آنے والے اتھلیٹ نے جو کہ ''تجربہ کار'' اتھلیٹ ہے، یہ دوڑ ۲:۳۹ گھنٹے میں مکمل کی۔

حکومت، عوام اور مختلف اداروں کی طرف سے داد و تحسین کے اظہار کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ ۶ کلومیٹرز کی دوڑ میں حصہ لینے والے ہزاروں بچے، نوجوان، بوڑھے مرد و خواتین کے اذہان پر منفی اثرات مرتب ہوئے کیونکہ وہ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ راقم نے بیسیوں اتھلیٹس سے گفتگو کی اور ان میں سے ہر ایک نے غصے اور رنج کا اظہار کیا۔ اس لیے لمبی دوڑوں کے منتظمین کو یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ دوڑیں منعقد کروانا نہیں بلکہ ان دوڑوں سے کھلاڑیوں کے شوق کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔

چھتے کی زندگی

دنیا میں ہونے والے ایک تخلیقی کام کا حیرت انگیز تذکرہ
جہاں ننھی جانیں اس مہارت سے ایسے پیچیدہ کام کرتی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے

دلچسپ بات یہ کہ نوزائیدہ مکھیوں کی دیکھ بھال پہ مامور مکھیاں انہیں پتلا شہد ہی پلاتی ہیں

کیا آپ کو کبھی خود خیال آیا ہے کہ لذیذ شہد اور اس کے بنانے والی شہد کی مکھی کی پیچیدہ کہانی کے بارے میں سوچیں؟

قرآن کی سورۃ ''النحل'' یا شہد کی مکھی نامی سورۃ ہمیں آگاہ کرتی ہے کہ یہ چھوٹا سا جانور اپنے اندر تخلیق کے بہت سے راز رکھتا ہے۔

شہد کی مکھیاں شہد نامی حیرت انگیز غذا سردی کے مہینوں کی تیاری میں ذخیرہ کرتی ہیں جب ان کے لیے پھول ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا ہے۔ عام طور پر جانور خود استعمال کرنے کی اصل مقدار سے زیادہ ذخیرہ کرنے کی تکلیف نہیں کرتے۔ تاہم شہد کی مکھیاں

ہارون یحییٰ
(مترجم) ڈاکٹر فردوس رانی

اپنی اصل ضرورت سے بہت زیادہ مقدار میں شہد بناتی ہیں۔ یہ بالکل مرغی کے غیر ضروری طور پر ہر روز انڈہ دینے یا گائے کے اپنے چھوٹے بچے کی ضرورت سے کہیں زیادہ دودھ دینے کی طرح ہے۔ یقیناً پہلا سوال جو ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے ''یہ ہزاروں سال سے جاری پیداوار کی بہتات'' ختم کیوں نہیں ہوئی؟ اس سوال کا جواب قرآن کی آیت میں ہے جو واضح کرتی ہے کہ کس طرح شہد کی مکھی کو شہد بنانا سکھایا گیا ہے۔

شہد کی مکھیوں کے چھتے میں زندگی اور ان کا شہد بنانے کا عمل بہت دلچسپ ہے۔ آئیے شہد کی مکھیوں کی اجتماعی زندگی کی بنیادی خصوصیات کے بارے میں تحقیق کریں۔

نمی کی مقدار کو متناسب رکھنا

سال میں ۱۰ر مہینے چھتے میں انڈوں کے سینے کے مرحلے میں درجہ حرارت ۳۲ر درجے سینٹی گریڈ ہونا چاہیے۔ نمی کا تناسب جو شہد کو محفوظ رکھنے کی صفت کے حصول میں خصوصی اہمیت رکھتا ہے، ایک خاص حد کے اندر رکھنا پڑتا ہے۔ اگر یہ حد تجاوز کر جائے تو شہد خراب ہو جاتا ہے اور اپنی حفاظتی اور غذائی صفات کھو دیتا ہے۔ چھتے میں درجۂ حرارت اور نمی کا خاص حدود میں تناسب برابر قائم رکھنے کی غرض سے مکھیوں کا ایک گروپ خصوصاً اس کام کے لیے مقرر کیا جاتا ہے جو ہوا کا انتظام برقرار رکھتا ہے۔

ائیر کنڈیشننگ

شہد کی مکھیاں چھتے کو ٹھنڈا کرنے اور صحیح مقدار میں نمی والا شہد بنانے کے لیے ہوا کا انتظام کرتی ہیں۔ یہی انتظام چھتے کو دھوئیں اور فضا کی آلودگی سے بچاؤ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گرم دن میں مکھیوں کو چھتے میں ہوا کا انتظام کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ داخل ہونے کی جگہ گھیرا بنا لیتی ہیں اور لکڑی کے فرش سے چمٹ کر اپنے پروں سے چھتے کو ہوا دیتی ہیں۔ ایک معیاری چھتے میں اندر آنے والی ہوا کو دوسری طرف سے نکالنے کے لیے عمل کیا جاتا ہے۔ چھتے میں زائد ہوا کا انتظام بھی ہوا کو چار مختلف سمتوں میں دھکیلتا ہے۔

چھتے میں نمی کی مقدار کو متناسب رکھنے اور ائیر کنڈیشننگ کا طریقِ عمل انتہائی حکمت اور شعور کا متقاضی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ان جانوروں کے اندر اس قابلیت کا ہونا ممکن نہیں۔ پھر اس حکمت اور شعور کا اصل منبع تلاش کرنا چاہیے۔

نظامِ صحت

شہد کی خاصیت محفوظ رکھنے کے لیے شہد کی مکھیوں کی کوششیں صرف نمی کے تناسب کی باقاعدگی اور ائیر کنڈیشننگ تک ہی محدود نہیں ہیں۔ چھتے میں ایک شاندار نظامِ صحت کام کرتا ہے جو ان تمام واقعات کو کنٹرول کرتا ہے جو بیکٹیریا کے پیدا ہونے کا باعث بنیں۔ اس نظام کا پہلا مقصد ہر اس وجہ کو تباہ کرنا ہوتا ہے جو بیکٹیریا کے پیدا ہونے کا ذریعہ بن سکتی ہو۔ اس نظام صحت کا بنیادی اصول چھتے میں اجنبی چیزوں کے داخلے کو روکنا ہے۔ اس وجہ سے چھتے میں داخل ہونے کی جگہ پر ہمیشہ دو نگہبان پائے جاتے ہیں۔ اگر کوئی اجنبی چیز یا کیڑا مکوڑا تمام حفاظت کے باوجود چھتے میں داخل ہو جائے تو تمام مکھیاں اسے چھتے سے باہر نکالنے کے لیے سرگرم ہو جاتی ہیں۔

ایسے تمام عظیم الجثہ اجنبی مادے جن کا باہر نکالنا مشکل ہو تو ایک اور حفاظتی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ شہد کی مکھیاں ایسی تمام صورتِ حال کے لیے ایک مادہ بناتی ہیں جسے پروپولس یا شہد کی مکھی کا گوند کہا جاتا ہے۔ وہ چیڑ، پاپولر اور

کیکر جیسے درختوں سے گوند اکٹھا کر کے اسے بناتی ہیں پھر اس میں خاص رطوبتیں ملا دیتی ہیں۔ پروپولس کا بنیادی استعمال بیکٹیریا کے حملہ کے خلاف مزاحمت ہے۔ خطرناک قسم کے مادے، ۵ء۱ ملی میٹر موٹی پروپولس کی تہہ کے نیچے چھپا دیے جاتے ہیں اور چھتے سے الگ کر دیے جاتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ کہ یہی گوند چھتے میں ہونے والے کسی شگاف کو پُر کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ گوند جلد ہی سوکھنے کے بعد ہوا کے ساتھ عمل کر کے سخت سطح بنا دیتا ہے۔ اگر ہم یہ بھی جان لیں کہ شہد کی مکھیاں یہ مادہ شعوری طور پر خارج کرتی ہیں جس سے وہ اجنبی ذرات کو ڈھانپتی ہیں تو ہم مکھیوں کی اس رطوبت کی اینٹی بیکٹیریا صفت کو کیسے واضح کر سکتے ہیں؟ کیا ہم جو شہد کی مکھی سے عقل مند ہیں، اپنے جسم کی کسی رطوبت کو اینٹی بیکٹیریا صفت دینے کے قابل ہیں؟

چنانچہ یہ بالکل واضح ہے کہ شہد کی مکھیوں کا جسم اور اس کی رطوبتیں ٹھیک ٹھیک تدبیر شدہ اور تخلیق کردہ ہیں۔

صفائی

شہد کی مکھیاں اپنا فضلہ کبھی چھتے میں نہیں چھوڑتیں۔ وہ اُڑتے ہوئے یا چھتے سے دُور اس کا اخراج کرتی ہیں۔

خانے

شہد کی مکھیاں چھوٹے چھوٹے موم کے کمرے ترتیب دیتی ہیں اور ایسا چھتا تیار کرتی ہیں جن میں ۳۰ر ہزار مکھیاں اکٹھا رہتی اور کام کرتی ہیں۔ چھتا موم کی دیواروں سے بنا ہوا ہوتا ہے۔ جس کی سطح پر بے شمار چھوٹے خانے ہوتے ہیں۔ تمام خانے جن سے مل کر چھتا بنتا ہے، بالکل ایک ہی سائز اور رُخ کے ہوتے ہیں۔ یہ انجینئرنگ کا معجزہ ہے۔ ہزاروں مکھیوں کے

www.urdudigest.pk

اجتماعی طور پر کام کرنے سے چھتا کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ شہد کی مکھیاں یہ خانے، غذا سٹور کرنے اور چھوٹی مکھیوں کی پرورش کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

شہد کی مکھیاں چھتے کی تیاری میں کروڑوں سال سے چھ کونی ساخت استعمال کرتی رہی ہیں۔ انھوں نے آٹھ کونی، گول یا پانچ کونی ساخت کے بجائے چھ کونی ساخت ہی کیوں منتخب کی؟ ریاضی دانوں نے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے بہت سی کوششیں کیں اور تحقیق سے ثابت کیا کہ چھ کونی ساخت ہی سب سے زیادہ موزوں اور مفید اقلیدسی (Geometric) شکل ہے، جس سے چھتے میں اکائی رقبے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جا سکے۔ اگر چھتے کے خانے کسی اور ساخت میں بنائے جاتے تو بغیر استعمال کی فالتو جگہ بچ جاتی۔ اس طرح کم شہد ذخیرہ ہو سکتا۔ اسی طرح شہد کی مکھیوں کی آبادی بھی کم ہوتی۔ چھ کونی ساخت کے خانوں کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ اس کے بنانے میں کم سے کم موم خرچ ہوتا ہے۔

چھتا، تعمیر سازی کا معجزہ

چھتے کی تعمیر اوپر کی طرف سے شروع کی جاتی ہے اور دو یا تین علحدہ قطاروں میں ایک ساتھ نیچے کی طرف جاری رکھی جاتی ہے۔ جبکہ چھتا دو مختلف سمتوں میں بڑھتا ہے۔ اس کی ۲ر قطاروں کے نیچے کے سروں کو جوڑا جاتا ہے۔ یہ کام زبردست تعاون اور باقاعدگی کے ساتھ ذہن نشین کیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ بتانا کبھی ممکن نہیں کہ چھتا شروع میں ۳ر الگ حصوں سے بنا۔

مختلف نقطوں سے شروع ہونے والے علحدہ حصے انتہائی مہارت سے جوڑے جاتے ہیں کہ اگرچہ اس کی ساخت میں کئی سو زاویے ہوتے ہیں، یہ سب ایک ہموار بغیر جوڑ کے ہوتا ہے۔

جو خانے ان ۲ر قطاروں کو ملاتے ہیں ان کی شکل

www.urdudigest.pk

بالکل صحیح چھ کونی ساخت ہوتی ہے اور باقی تمام خانوں کی طرح وہی پیمائش ہوتی ہے۔ ایک خانہ بھی دوسرے سے مختلف نہیں ہوتا۔ سائنس دان اس بات پر بہت حیران ہیں کہ ہزاروں مکھیوں کا کام کس طرح اتنے باضابطہ حساب سے انجام پاتا ہے۔

سمت کا تعین

شہد کی مکھیوں کو عموماً غذا اور وسیع میدان ڈھونڈنے کے لیے لمبے فاصلوں تک اُڑنا پڑتا ہے۔ وہ پھولوں کے ذرات اور شہد کے اجزا چھتے سے تقریباً آٹھ سو میٹر کی حد (Range) میں اکٹھے کرتی ہیں۔ جو مکھی پھول ڈھونڈ لیتی ہے، باقی مکھیوں کو اس مقام کے بارے میں اطلاع دینے کے لیے واپس آتی ہے۔ لیکن وہ اپنی ساتھیوں کو کس طرح جگہ کے بارے میں سمجھائے؟ واپس آنے والی مکھی ایک خاص قسم کا ڈانس کرتی ہے۔ یہ ڈانس دوسری مکھیوں کو پھولوں کے مقام کے بارے میں بتانے کا طریقہ ہے۔ یہ ڈانس جو کئی بار دہرایا جاتا ہے، اس میں سمت اور فاصلے کے بارے میں معلومات ہونے کے ساتھ دوسری تفصیلات ہوتی ہیں جو باقی مکھیوں کو نشانے تک پہنچنے کے قابل بناتی ہیں۔ یہ ڈانس دراصل ہوا میں "8" کا ہندسہ بناتے ہوئے کیا جاتا ہے۔

مکھی ۸ر کا درمیانی حصہ اپنی دُم ہلا کر اور زِگ زیگ بناتے ہوئے ظاہر کرتی ہے۔ زِگ زیگ کے درمیانی زاویے اور سورج اور چھتے کے درمیان لکیر، مختلف ذریعے کے بارے میں صحیح سمت بتاتی ہے۔ تاہم صرف سمت کے بارے میں جان لینا کافی نہیں۔ کارکن مکھیوں کو جانے سے پہلے چھتے سے پھولوں تک فاصلے کے بارے میں بھی معلومات درکار ہوتی ہیں۔ اس لیے واپس آنے والی مکھی فاصلہ بتانے کے لیے اپنے جسم کو کئی بار ہلاتی ہے۔ مثلاً ۲۵۰ر میٹر کا فاصلہ سمجھانے کے لیے وہ آدھے منٹ میں اپنے جسم کے نچلے حصے کو ۵ر دفعہ ہلاتی ہے۔ اس طرح فاصلہ اور زاویہ کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کرتی ہے۔

اگر چھتے سے پھولوں تک کا سفر زیادہ وقت لے رہا ہو تو مکھی کے لیے نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ سورج ہر منٹ میں ایک درجہ حرکت کرتا ہے۔ غذائی مقام کے بارے میں تفصیل بتاتے ہوئے شاید مکھی ۴ر منٹ کے پیچھے ایک درجے کی غلطی کرے گی، وہ وقت جو وہ چھتے کی طرف آتے ہوئے لگائے گی۔

لیکن مکھی کو بالکل کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ مکھی کی آنکھ بہت سے چھوٹے چھ کونوں والے عدسوں سے بنی ہوتی ہے۔ ہر عدسہ دوربین کی طرح چھوٹے سے مقام پر فوکس کرتا ہے۔ جب مکھی دن میں سورج کی طرف اُڑتی ہے تو وہ ہر وقت اپنی صحیح پوزیشن جان لیتی ہے۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ مکھی سورج کی چمک کے ذریعہ دن کے وقت کا اندازہ لگاتی ہے۔ چنانچہ اس طرح وہ دوسری مکھیوں کی طرف اپنی سمت کو درست کر لیتی ہے تاکہ غلطی کا امکان باقی نہ رہے۔

شہد کا معجزہ

آیئے اللہ کے تخلیق کردہ اس چھوٹے سے جانور کی تیار کردہ ناقابلِ یقین غذا کی تفصیلات دیکھتے ہیں۔

شہد گلوکوز، فرکٹوز اور میگنیشیم، کیلشیم، سوڈیم، کلورین، سلفر، آئرن اور فاسفیٹ جیسی معدنیات سے مل کر بنا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ، شہد میں وٹامن بی ۱، بی ۲، بی ۳، بی ۶، بی ۵ اور وٹامن سی شامل ہیں۔ ان کی مقدار زرگل (Pollen) اور پھولوں کے رس کے منبع کے مطابق فرق سے ہوتی ہے۔ تانبا، آیوڈین، فولاد اور جست بھی تھوڑی مقدار میں اور بہت سی اقسام کے ہارمون بھی پائے جاتے ہیں۔

"عالمی نحل پروری کانفرنس" ۲۰ سے ۲۶ر ستمبر ۱۹۹۳ء میں چین میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں شہد سے

اخذ شدہ مصنوعات کے ذریعے علاج پر بحث ہوئی۔ امریکی سائنس دانوں نے اس بات پر زور دیا کہ شہد، رائل جیلی، زرگل اور پروپولس (شہد کی مکھی کا گوند) بہت سی بیماریوں کے علاج کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ رومانیہ کے ایک ڈاکٹر نے کہا کہ وہ اپنے سفید موتیے کے مریضوں میں علاج کے طور پر شہد استعمال کرتا تھا اور ۲۰۹۴ء میں سے ۲۰۰۲ء مکمل طور پر صحت یاب ہوگئے۔ تجربہ کار ڈاکٹروں نے پروپولس (ایک قسم کا موی مادہ) کی بواسیر، جلدی بیماریوں، نسوانی بیماریوں اور دوسری بہت سی بیماریوں کے لیے شفائی خصوصیات کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔

آج کل ترقی یافتہ ملکوں میں نحل پروری اور شہد کی مکھیوں کی مصنوعات کے متعلق تحقیق ہو رہی ہے۔

سائنس دان اس حقیقت پر متفق ہیں کہ صرف ایک چمچہ شہد بھی جسم کے لیے انتہائی فائدہ مند ہے کیونکہ شہد میں پائے جانے والے شکر کے سالمے دوسری قسم کی شکر میں تبدیل ہو سکتے۔ (جیسے فرکٹوز سے گلوکوز) اور اس میں پائی جانے والی تیزابیت کی بڑی مقدار کے باوجود حساس ترین معدے بھی اسے بآسانی ہضم کر لیتے ہیں۔ یہ گردوں کی کارکردگی کو بھی بہتر بنانے میں معاون ہے۔ شہد کے بارے میں ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جب اس کا موازنہ اتنی ہی مقدار کی چینی سے کیا جائے تو یہ ۴۰ فیصد کم حرارے جسم کو دیتا ہے۔ شہد کی یہ خصوصیت وزن بڑھنے سے روکتی ہے۔

خون میں جلد شامل ہو جاتا ہے۔

شہد نیم گرم پانی میں لیا جائے تو صرف ۷ منٹ میں نظام دورانِ خون میں داخل ہو جاتا ہے اور ۲۰ منٹ میں جب اسے ٹھنڈے پانی کے ساتھ پیا جائے۔ اس میں پائے جانے والے شکر کے آزاد سالمے دماغ کی کارکردگی کو آسان بناتے ہیں۔

www.urdudigest.pk

خون پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے

شہد نیا خون بنانے میں توانائی کے ذخیرے کا کردار ادا کرتا ہے اور خون کی کمی کے مریضوں میں اس عمل کو تیز کرنے میں معاون ہے۔ یہ خون کی صفائی اور اس کے مقوی ہونے میں بھی مدد دیتا ہے۔ اس سے خون کی گردش باقاعدہ ہوتی ہے۔ یہ خون کی چھوٹی نالیوں کے عوارض میں بھی مفید ہے۔

معدے کا دوست

شہد تیزابیت یا تخمیر کا باعث نہیں بنتا کیونکہ یہ جلد ہضم ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر موجود آزاد ذرات چکنائی کو ہضم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ ماں اور گائے کے دودھ میں فولاد کے نہ ہونے کو بھی پورا کر دیتا ہے۔ آنتوں کے عمل کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ یہ اندرونی سکون کا بھی باعث ہے اور بھوک میں اضافہ کرتا ہے۔

رائل جیلی

رائل جیلی چھتے کے اندر کارکن مکھیوں کا بنایا ہوا سفید سیال مادہ ہے۔ اس قوت بخش مادے میں شکر، لحمیات، چکنائی اور بہت سے حیاتین پائے جاتے ہیں۔ یہ جسم کی کمزوری اور بڑھاپے کے جسمانی اثرات جیسے مسائل میں استعمال ہوتا ہے۔

جراثیم کش خصوصیات

شہد کی یہ خصوصیت مزاحمتی اثر (Inhibition Effect) کہلاتی ہے۔ شہد پر کیے گئے تجربات نے ثابت کیا ہے کہ جراثیم کش اثرات، شہد کو پانی میں ملا کر پتلا کرکے پہلے سے دوگنے ہو جاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شہد کی مکھیاں جو نوزائیدہ مکھیوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں، وہ بھی ان کو پتلا شہد ہی پلاتی ہیں۔

گوشۂ خاص

۶۶ برس بعد گھر واپسی

شاعر، افسانہ نگار، فلمی کہانی نویس اور ہدایت کار سمپورن سنگھ گلزار المعروف گلزار ۱۸ اگست ۱۹۳۶ء کو دینہ، ضلع جہلم میں پیدا ہوئے۔ اس کثیر الجہت شخصیت نے کار مکینک کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر فلمی دنیا میں چلے آئے اور خوب نام کمایا۔ بھارت حکومت نے پدم شری اعزاز سے نوازا۔ ۲۰۰۹ء میں اکیڈمی ایوارڈ حاصل کیا اور عالمی شہرت پائی۔

گلزار تقسیم ہند کے سمے بھارت چلے گئے تھے۔ پچھلے دنوں کراچی ادبی میلے میں شرکت کرنے پاکستان چلے آئے۔ اس موقع پر وہ ۶۶ برس بعد اپنی جنم بھومی، دینہ بھی گئے۔ بلکہ مٹی کی کشش انہیں کھینچ کر لے گئی۔

دینہ جاتے ہوئے ممتاز شاعر اور ٹی وی پروڈیوسر، ایوب خاور اور نوجوان شاعر وصی شاہ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ایوب صاحب نے ٹی وی پہ خواجہ اینڈ سن، فشار اور دن جیسے مقبول ڈراموں کی ہدایات دے کر شہرت پائی۔ آج کل جیو ٹی وی سے وابستہ ہیں۔ منفرد شاعر بھی ہیں اور شاعری کے مجموعے طبع ہو چکے۔ اسی طرح وصی شاہ کی شاعری نوجوان نسل میں بڑی مقبول ہے۔ عمدہ ڈرامہ نگار اور کالم کار بھی ہیں۔

واپسی پر دونوں شعرا نے جذبات انگیز پیرائے میں گلزار کی دینہ یاترا کا احوال لکھا اور افشا کیا کہ ایک حساس انسان اپنی جائے پیدائش پہنچ کر کیسے غیر معمولی احساسات و جذبے محسوس کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان جس جگہ جنم لے، اُسے پاتال پہنچ کر بھی نہیں بھول پاتا۔ جنم بھومی کے متعلق کسی دانش مند نے خوب کہا ہے: ''انسان کو اسی جگہ محبت ملتی ہے۔ اُسے ہمارے پیر تو چھوڑ سکتے ہیں، دل نہیں۔''

جناب ایوب خاور کے مضمون سے عیاں ہے کہ دینہ ہی میں گلزار صاحب کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ جذبات کی فراوانی نے ان کا دل مٹھی میں لیا اور اُسے بے قابو کر ڈالا۔ اسی لیے وہ اچانک لاہور روانہ ہوگئے۔ ان کی طبیعت پھر سنبھل نہ سکی، حتیٰ کہ وہ واپس بھارت چلے گئے۔

ادبی میلے میں شرکت کے بغیر فوری روانگی نے افواہوں کو جنم دیا۔ یہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ سیکورٹی مسائل کے باعث بھارتی سفارت خانے نے انہیں واپس بھیج دیا۔ حالانکہ سچ یہ ہے کہ ناسازیٔ طبیعت نے گلزار کو پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ وہ دوست احباب کے ہمراہ کسی سیکورٹی کے بغیر دینہ چلے گئے تو کراچی جانا کون سا مشکل تھا؟

جب پاکستانیوں نے بڑی تشویش ظاہر کی تو گلزار نے اپنی فنکارانہ اپج سے ان کے نام ایک خط ''مجھ سے ناراض نہ ہوں'' تحریر کیا۔ اس میں انھوں نے یہ حقیقت اجاگر کی کہ وہ طبیعت کی خرابی کے باعث بھارت چلے گئے، ورنہ سیکورٹی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یوں ساری افواہیں دم توڑ گئیں۔ اب ایوب خاور اور وصی شاہ کی خوبصورت تحریریں پڑھ کر دل شاد کام کیجیے۔

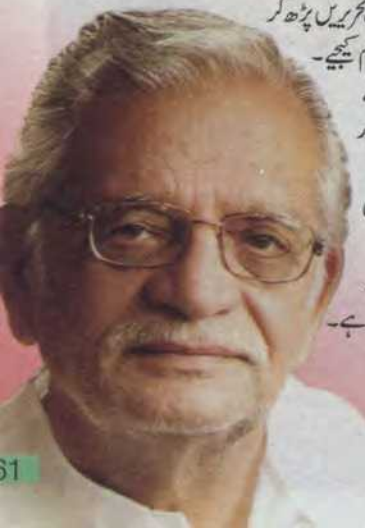

انہوں نے دلفریب اور اچھوتے انداز میں گلزار کا دورہ دینہ قلمبند کیا ہے۔

موضوعِ سخن

شرارتیں، تتلیاں، محبّتیں اور خواب

مرا بچپن یہیں کہیں تھا

برسوں کی جدائی کے بعد جب گلزار اپنی جنم بھومی پہنچے تو مصنّف نے اس یادگار سفر کو جذبات بھرے الفاظ میں محفوظ کرلیا

وصی شاہ

برصغیر کے معروف فلم ڈائریکٹر، رائٹر اور شاعر گلزار صاحب لاہور میں میرے قریبی دوست حسن ضیاء کے مہمان تھے۔ منگل کی صبح جب ناشتے کی ٹیبل پر گلزار صاحب سے ملاقات ہوئی تو ہمیشہ کی طرح انہوں نے اسی گرم جوشی سے گلے لگایا جو ان کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ گلزار صاحب سے ملتے ہوئے ہمیشہ مجھے یہی احساس رہا کہ جیسے میں برگد کے کسی انتہائی شفیق اور قدیم درخت سے مل رہا ہوں جس کی آنکھوں میں گزرے ہوئے ماضی کی کہانیاں ہیں، ایسی کہانیاں جنہیں اس برگد کی چھاؤں میں بیٹھ کر صدیوں بغیر پلکیں جھپکے سنا جا سکتا ہے۔ ہماری پہلی ملاقات برسوں پہلے اس وقت ہوئی تھی جب گلزار صاحب احمد ندیم قاسمی کی عیادت کو پہلی بار پاکستان تشریف لائے تھے اور آخری ملاقات کچھ عرصہ پہلے قہقہہ مشاعرے میں ہوئی۔ گلزار صاحب کی شخصیت کا یہ خاصہ ہے کہ ان سے ملاقات پر ان کی شخصیت کا سحر اور خوشبو دیر تک ملنے والے کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہے اور اگلی ملاقات تک پچھلی ملاقات کا ذائقہ جسم و جاں کو معطر کیے رکھتا ہے۔

منگل کی صبح 7 بجے کے قریب ہمارا قافلہ جس میں گلزار صاحب کے ساتھ معروف فلم اور میوزک ڈائریکٹر وشال بھردواج اور ان کی اہلیہ معروف سنگر ریکھا بھردواج بھی شامل تھیں، ہوٹل سے گلزار صاحب کی جنم بھومی دینہ کے لئے روانہ ہوا۔ گلزار صاحب کو میرا دوست حسن ضیاء ''بابا'' کہتا ہے اور گلزار صاحب کے پاکستان میں ''بابا'' احمد ندیم قاسمی مرحوم تھے۔ لہٰذا ان کی خواہش کے مطابق طے یہی ہوا ہے کہ سب سے پہلے مرحوم احمد ندیم قاسمی صاحب کی قبر پر جایا جائے اور برصغیر پاک و ہند اور اردو دنیا کے اس عظیم شاعر اور افسانہ نگار کی قبر پر فاتحہ خوانی کے بعد ''دینہ'' کا سفر اختیار کیا جائے۔ مال روڈ کے فائیو سٹار ہوٹل سے جب یہ قافلہ قاسمی صاحب کی آخری آرام گاہ پر حاضری کے لئے روانہ ہوا تو میں نے گلزار صاحب کو مال روڈ کی تاریخ سے آگاہ کرنا شروع کیا۔ آنکھوں میں ماضی کے چراغ روشن رکھنے والے گلزار صاحب کی آنکھیں ماضی کے مال روڈ کے مناظر کا تصور کر کے چمک اٹھیں آج کے ٹریفک کے بے ہنگم شور کے بجائے مال روڈ پر ماضی میں جو پرسکون زندگی تھی، جس طرح شاعر، موسیقار، فنکار، مصور آکر مختلف چائے خانوں اور ٹی ہاؤس میں بیٹھا کرتے تھے، جس طرح

ناصر کاظمی مال روڈ پر آوارہ گردی کرتے ہوئے اداس کر دینے والے شعر کہا کرتے تھے، اس سب کا ذکر ہوا۔

گلزار صاحب کی پاکستان سے محبت تو سمجھ میں آتی ہے کہ آج تک دینہ اور پاکستان اُن کی آنکھوں اور دل میں بستا ہے مگر جس طرح وشال بھردواج کی بیگم معروف شکر دیکھا بھردواج مال روڈ سے گزرتے ہوئے لارنس گارڈن جو اب باغ جناح کہلاتا ہے، کا ذکر کر رہی تھیں اور اردو کے بورڈز جس دلچسپی سے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں، وہ مجھے حیران کر دینے کے لئے کافی تھا۔ جب لارنس گارڈن کا ذکر آئے تو کیسے ممکن ہے کہ گفتگو میں راجہ گدھ کا اور پھر بانو آپا کا ذکر نہ آئے..... مجھے حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی کہ باہمی رابطے نہ ہونے کے باعث دونوں ممالک کے بڑے اور نامور ادیب بھی پوری طرح ایک دوسرے کے کام اور شخصیت سے آگاہ نہیں ہیں۔ میں نے جب گلزار صاحب کو راجہ گدھ کے بارے میں اور بانو آپا کی شخصیت، عظمت اور منفرد اسلوب کے بارے میں بتایا تو گلزار صاحب نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ضرور راجہ گدھ پڑھنا چاہیں گے۔ مال روڈ سے ماضی کی یادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے شہر کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے قافلہ احمد ندیم قاسمی مرحوم کی قبر پر جا پہنچا۔ کچھ دیر گلزار صاحب اپنے مرحوم "بابا" کو یاد کرتے ہوئے گم سم کھڑے رہے۔ پھر یوں جھکے کہ ان کے دونوں گھٹنے قاسمی صاحب کی قبر کی مٹی چھو رہے تھے۔ گلزار صاحب نے قبر کی گیلی مٹی پہ دونوں ہاتھ رکھ دیے جیسے قبر میں مدفون قاسمی صاحب کے لمس کو محسوس کر رہے ہوں پھر انھوں نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پہ رکھے جیسے اپنے بابا کو گلے سے لگا لیا ہو..... انہیں پیچھی ڈال لی ہو..... میں نے پھول ڈالتے ہوئے پھولوں جیسے گلزار کی آنکھوں میں دیکھا دور کہیں ایسی نمی جھلملا رہی تھی..... جسے دیکھا ہی نہیں محسوس بھی کیا جا سکتا تھا۔ گلزار صاحب نے کچھ دور کھڑے وشال کو پاس بلایا اور ریکھا بھردواج کے کاندھے پر شفقت بھرا ہاتھ رکھ کر قاسمی صاحب کی قبر کے کتبے پر درج شعر پڑھ کر سنایا جس پر مجھے غالب یاد آ گئے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

میرے شعر پڑھنے پر گلزار صاحب نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی مگر آنکھوں میں احمد ندیم قاسمی کی یاد بھری اداسی۔ قبرستان سے نکل کر قافلہ بذریعہ موٹروے ہوتا ہوا دینہ کی طرف چل پڑا..... ایوب خاور تو پہلے ہی ہمارے ہمراہ تھے، گوجرانوالہ سے ہمیں معروف فلم ڈائریکٹر شہزاد رفیق اور گل شیر بٹ نے بھی جوائن کر لیا۔ رستے میں کئی جگہ رکتے رُکاتے آخر کار یہ قافلہ جہلم کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ دینہ کی سرحد میں داخل ہونے سے پہلے جہاں دینہ کا بورڈ لگا ہے، گلزار صاحب نے وہاں کچھ دیر قیام کی خواہش کا اظہار کیا اور خاص طور پر اردو میں لکھے ہوئے ایک بورڈ کے سامنے تصویر بنوائی۔ صاف لگ رہا تھا کہ گلزار صاحب اُس ساری فضا سارے ماحول کو اپنے جسم و جاں میں اتار لینا چاہتے ہیں۔ اس دھرتی پر لگے ایک ایک درخت ایک ایک پودے ایک ایک نقش کو اپنے حافظے میں محفوظ کر لینا چاہتے ہیں۔ یہاں میری بیٹی دُعا نے گلزار صاحب کو غالب، میر، بلھے شاہ کے اور خود ان کے اشعار سنائے تو گلزار صاحب بہت دیر تک دُعا سے باتیں کرتے رہے۔ ان کے ہونٹوں پہ مستقل ایک مسکراہٹ تھی مگر جوں جوں دینہ قریب آ رہا تھا

ان کے دونوں گھٹنے قاسمی صاحب کی قبر کی مٹی کو چھو رہے تھے
انھوں نے گیلی مٹی پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے جیسے قبر میں مدفون قاسمی صاحب
کے لمس کو محسوس کر رہے ہوں

ایک ایسی بے نام سی کیفیت ان کے چہرے پر پڑھی جا سکتی تھی جو نہ پریشانی تھی نہ بے چینی نہ اداسی نہ خوشی نہ مسرت بلکہ اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا، لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کیفیت کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اپنی جائے پیدائش سے برسوں دور رہنے پر مجبور رہے ہوں اور برسوں بعد اس سرزمین پر قدم رکھ رہے ہوں جہاں ان کا بچپن گزرا ہو۔ عام انسان تو عام انسان عظیم پیغمبر بھی جن علاقوں میں پلے بڑھے ہوتے ہیں، انہیں ہمیشہ یاد کرتے رہتے ہیں۔ میرے آقا سرکار دو عالم ﷺ جب ہجرت پر مجبور کیے گئے اور مدینے میں قیام پذیر تھے تو اپنا رُخِ انور مکہ کی طرف کر کے اس جانب سے آنے والی ہوا کو اپنے چہرۂ مبارک اور وجود پر محسوس کیا کرتے تھے۔

دینہ میں سب سے پہلے ہم دینہ اسٹیشن پر پہنچے جس سے گلزار صاحب کی بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ وہاں موجود احباب سے جذبات میں ڈوبے ہوئے گلزار صاحب وہاں آنے جانے والی ٹرینوں اور اس سے جڑی اپنی شرارتوں اور یادوں کا تذکرہ کرتے رہے..... دینہ اسٹیشن پر گلزار صاحب کے محلے کے کچھ لوگوں کے علاوہ اور بھی کافی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ حساس شاعر اور انسان گلزار صاحب نے تو اس کا قطعی اظہار نہیں کیا مگر مجھے شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ گلزار صاحب کو وہاں کچھ وقت اکیلے بھی فراہم کرنا چاہیے..... کہ صرف گلزار صاحب ہوں دینہ ہو اور گلزار صاحب کی یادیں ہوں۔ میں نے اپنے دوست حسن ضیاء سے اس کا اظہار کیا تو حسن نے بڑی مشکل سے لوگوں کو قائل کر کے کچھ دیر کے لیے اپنے "بابا" کو تنہائی فراہم کی۔ دینہ اسٹیشن پر لگے بورڈ کے پاس کھڑے گلزار صاحب بہت دیر تک دور تک جاتی خالی ریل کی پٹریوں کو اور ارد گرد کی فضا کو دیکھتے رہے۔ اس دوران میں نے گلزار صاحب کو اپنی شہادت کی انگلی سے آنکھوں میں آئے ہوئے کھارے پانی کو بھی صاف کرتے دیکھا۔ دینہ اسٹیشن سے یہ قافلہ اس اسکول میں پہنچا جہاں گلزار صاحب بچپن میں پڑھا کرتے تھے۔ سکول کے میدان میں کھڑے میں نے گلزار صاحب کو ان کی وہ نظم یاد کرائی جس میں وہ تختی لے کر بھاگتے ہیں تو گلزار صاحب نے نظم کے اس ٹکڑے کا ذکر کیا جس میں تختی پر گاچی ملی جاتی ہے اور کوئی لڑکی ان سے وہ گاچی لے لیا کرتی تھی۔ وقت نہیں تھا۔ ہجوم تھا ورنہ میں گلزار صاحب سے اس لڑکی کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا اور مجھے لگا کہ گلزار صاحب بھی اس وقت اس لڑکی کے بارے میں بہت سی باتیں کرنا چاہ رہے تھے مگر لوگوں کے ہجوم میں یہ ممکن نہ تھا۔

شہرت کا ایک المیہ یہ بھی ہوا کرتا ہے کہ انسان بعض اوقات جہاں تنہائی چاہ رہا ہوتا ہے وہاں ہجوم اسے تنہائی نہیں دیتا اور جہاں بظاہر ہجوم میں ہوتا ہے وہاں بھی دراصل اکیلا اور تنہا ہی ہوتا ہے۔ گلزار صاحب وہاں موجود لوگوں سے بچپن کے دوستوں اور اساتذہ کی باتیں کرتے رہے۔ ان

کے سکول والوں نے بلڈنگ کا ایک بلاک گلزار صاحب کے نام کیا اور اسے گلزار کا لڑہ بلاک کا نام دیا۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ ستر سالوں کا ہجر وصل میں تبدیل ہونے جا رہا تھا۔ اگلی منزل تین سے چار فٹ کی وہ تنگ و تاریک گلی تھی جس کے ایک چھوٹے سے آنگن میں گلزار جیسے مہکتے ہوئے کشادہ انسان کا بچپن گزرا تھا۔ جب ہم گلزار صاحب کی گلی میں پہنچے تو پھولوں کے ہار اور مٹھائی کے ڈبے لیے ہوئے لوگ ان کے منتظر تھے۔ گلزار صاحب بہت حسرت سے انتہائی محبت سے دیوار پہ لگی ایک ایک اینٹ کو دیکھتے اور محسوس کرتے رہے۔ گھر میں داخل ہو کر چھوٹے سے صحن میں محلے والوں سے ماضی کے لوگوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اپنے والد اور اپنے دادا کے قصے سناتے رہے۔ ان کے آباؤاجداد دودھ کے کاروبار سے منسلک تھے اور چرواہے بھی تھے پھر کس طرح ان کے بڑوں نے تعلیم حاصل کی اور تجارت شروع کی۔ جو جو یاد آتا جا رہا تھا گلزار صاحب وہ سب شیئر کر رہے تھے۔ آنکھوں میں حسرت و یاس مسرت و خوشی وصل و ہجر کے ملے جلے دیے جل رہے تھے۔ ہونٹوں پہ اداسی بھی تھی اور مسکراہٹ بھی۔ شام اپنے پَر تولے ہوئے اس گلی اس گھر اور گلزار کے دل پر اتر رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ گلزار صاحب وہاں کچھ اور دیر قیام کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ ان کے پرانے محلے داروں میں سے کچھ لوگ ان سے دیر تک پرانے لوگوں کا اور ان کے آباؤاجداد کا تذکرہ کرتے رہے اور گلزار صاحب سے عقیدت کے طور پر اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ وہ اس گلی کو گلزار صاحب کے نام سے منسوب کرنا چاہتے ہیں۔

دل بھی اشکوں کے تعاقب میں بہا جاتا ہے
ایک صحرا سا ہے سیلاب کے پیچھے پیچھے

مختصر سے وصل کے بعد جدائی کی گھڑی آ پہنچی تھی سمندروں سے گہرے دلوں کا حال تو خالقِ کائنات ہی جانتا ہے مگر کیا کیجیے کہ دلوں پہ گزرنے والے موسموں کی باس اور رنگ، چہروں پر آ کر صدیوں سے دلوں کے پوشیدہ رازوں کا احوال بیان کرتے رہے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اپنے چھوٹے سے گھر کے صحن میں کھڑے گلزار صاحب نے الوداعی نظروں سے ان دروازوں کو دیکھا جن پہ آج بھی مانوس دستکوں کے نشان باقی تھے۔ ان کھڑکیوں پہ نگاہ ڈالی جن کے پٹ کھول کر بیلیوں سے باتیں کیا کرتے ہوں گے۔ ہاتھ لہرا لہرا کر گاچی ملی ہوئی گیلی مٹی سکھایا کرتے ہوں گے۔ ان چھتوں کو دیکھا جن پہ دوڑتی ہوئی چھپکلیاں شاید کبھی گلزار کو بچپن میں ڈراتی ہوں گی دیر تک جگاتی ہوں گی اور اس رتجگے کی وجہ سے صبح سکول جاتے ہوئے گلزار کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتی ہوں گی۔ ان دیواروں کو دیکھا جن پہ شاید کبھی گلزار صاحب نے قلم سے لکیریں کھینچی ہوں گی اپنی پہلی ادھوری نظم لکھی ہو گی۔ شاید ان کی ماں نے کبھی اسی آنگن میں توے پہ روٹی ڈالتے ہوئے غصے میں انہیں جھڑکا ہو گا۔ کوئی فرمائش نہ پوری ہونے پر ان کے والد نے ان کے گال تھپتھپاتے ہوئے ان کے ہاتھوں میں کھلونے کی جگہ کوئی وعدہ تھمایا ہو گا۔ کسی ضد پہ اڑ جانے پہ ماں نے اپنے سمپورن سنگھ کو سینے سے لگایا ہو گا..... اب وہاں نہ ماں کی گود تھی نہ والد کی چھاؤں نہ ہتھیلی پر رکھے ہوئے وعدے۔ نہ گلزار کو ڈراتی ہوئی چھپکلیاں نہ دیواروں پہ لکھی ہوئی ابتدائی ادھوری نظمیں نہ وہ ہنسی نہ وہ شرارتیں جو بچپن کے ساتھ ہی کہیں کھو جایا کرتی ہیں۔ وہاں یادوں کے سوا کچھ نہیں تھا..... کچھ بھی نہیں..... میں جانتا تھا کہ وہاں موجود کوئی بھی شخص ان قہقہوں کو نہیں سن سکتا ہو گا۔ نہ ان آنسوؤں کی چاپ محسوس کر سکتا ہو گا جنہیں گلزار صاحب ستر سال سے کانوں میں پہنے ہوئے ہیں۔ مجھے لگا کہ اس گھر میں ستر

یہاں میری بیٹی دُعا نے گلزار صاحب کو غالب، میر، بلھے شاہ کے اور خود ان کے اشعار سنائے تو گلزار صاحب بہت دیر تک دُعا سے باتیں کرتے رہے۔

یہاں سے انتظار کرتی ہوئی یادیں اور آوازیں گلزار کو خدا حافظ کہہ رہی ہیں۔ گلی کا آخری موڑ مڑتے ہوئے گلزار صاحب نے مڑ کر پیچھے رہ جانے والے اپنے ماضی اور گھر کے ان کواڑوں پر آخری نگاہ ڈالی۔ جنہوں نے آج تک گلزار سے چوٹیں چھپائی تھی اور ان کواڑوں کے بازو ستر سال سے گلزار کی راہ دیکھتے ہوئے یوں پھیلے ہوئے تھے کہ شل ہو گئے تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ نظر نہ آنے والی یادوں اور آوازوں نے ان کا دامن تھام رکھا ہے گلزار کے لیے اپنے گھر سے نظریں چھڑانا مشکل ہو رہا تھا۔ دل کا سارا کرب گلزار صاحب کے چہرے پر سردیوں کی اداس شاموں کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ستر سال کے سفر کے بعد اپنی جنم بھومی پہ پہنچنے والے گلزار کو اچھی طرح خبر تھی کہ وہ شاید زندگی میں دوبارہ کبھی اپنی جنم بھومی سے ملاقات نہیں کر پائیں گے۔ اسی لیے گلزار آخری مرتبہ اپنے گھر اپنی گلی کو جی بھر کر دیکھ لینا چاہتے تھے۔ مگر پل بھر میں، جی بھر کر، کچھ کیسے دیکھا جا سکتا ہے۔ سو بھرے بھرے جی اور بوجھل قدموں کے ساتھ گلزار نے اپنے گھر سے بندھے ہوئے اپنی نظروں کے تار توڑے..... ایسی آواز آئی جیسی کسی پھول کے شاخ سے ٹوٹنے پہ آیا کرتی ہے..... یہ آواز سن کر پاس کہیں بوڑھے گھر پہ بیٹھے ہوئے برسوں پرانے پرندے کبھی نہ واپس آنے کے لیے اڑ گئے۔ پھر میں نے دیکھا کہ اپنی گلی کے آخری موڑ سے لے کر گاڑی تک گلزار صاحب کے قدم انتہائی تیز اٹھتے تھے۔ گاڑی کے پاس پہنچنے تک انہوں نے نہ دوبارہ پیچھے مڑ کر دیکھا نہ قدموں کی تیزی میں کوئی کمی آئی۔ جیسے انہیں ڈر ہو کہ اب اگر مڑ کے دیکھیں گے یا آہستہ چلیں گے تو پتھر کے ہو جائیں گے۔ لوگ انہیں ہاتھ ہلا کر ان کے لیے دعائیں باندھ کر انہیں الوداع کہہ رہے تھے۔ ''دینے'' سے رخصت ہوتے ہوئے گاڑی میں بیٹھے ہوئے گلزار کو تو دیکھ سکتے تھے۔ مگر نہیں جانتے تھے کہ گلزار صاحب اپنا وجود تو ''دینے'' کی اس گلی سے اٹھا کر لے آئے تھے مگر اپنی روح اسی گلی کے ایک چھوٹے سے گھر میں منتظر سمپورن سنگھ کے ساتھ کھیلنے کے لیے چھوڑ آئے تھے تاکہ ستر سال سے اس گھر میں اکیلے زندگی گزارتے ہوئے سمپورن سنگھ کی تنہائی دور ہو سکے۔ ''دینے'' کے اس گھر میں تو اب شاید سمپورن سنگھ کو گلزار میسر آ گیا ہو گا مگر واپسی کے سفر میں خاموش بیٹھے ہوئے گلزار کو سمپورن سنگھ کے بغیر ہی ہندوستان جانا تھا۔ یوں لگا کہ ستر سال بعد گلزار ''دینے'' میں اپنے ''سمپورن سنگھ'' کو واپس لے جانے آئے تھے مگر جاتے ہوئے ''گلزار'' کو بھی ''سمپورن سنگھ'' کے پاس چھوڑ گئے۔

واپسی کے سفر میں، میں سوچ رہا تھا کہ میں لاہور میں رہتا ہوں اور میرا شہر سرگودھا مجھ سے صرف ڈھائی گھنٹے کے فاصلے پر ہے مگر میں ڈھائی دن سے زیادہ اس کی دوری برداشت نہیں کر پاتا کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اپنے شہر کی خاک چومنے پہنچ جاتا ہے تو جو شخص ستر سال بعد اپنی جنم بھومی سے مل رہا ہو وہ بھی انتہائی مختصر وقت کے لیے اور اس مختصر وصل میں بھی اسے وہ تنہائی میسر نہ ہو وہ اپنی دیواروں گلیوں، چھتوں سے کھل کر باتیں تک نہ کر پائے جن درختوں سے اس کی یادوں کے گھونسلے لٹک رہے ہوں ان درختوں کو گلے تک نہ لگا پائے اس کے دل پر کیا بیت رہی ہو گی۔ ستر سال کے فراق کے بعد گلزار کو اپنے ''دینے'' کا ایسا وصل نصیب ہوا جو بمشکل ۷ر گھنٹوں سے بھی کم دورانیے کا..... کہاں ۷۰ر سال کا فراق..... کہاں ۷ر گھنٹے سے کم کا وصل..... اور اس میں بھی وہ نہ جی بھر کر اپنے ''دینے'' کو دیکھ پائے نہ اس سے وہ باتیں کر پائے جو برسوں سے گلزار کے دل میں ناگفتہ رہی ہوں گی۔ وہ خوشیاں نہ شیئر کر پائے جنہوں نے یہاں سے جانے کے بعد سمپورن سنگھ کو گلزار بنایا۔ در و دیوار سے وہ دکھ نہ کہہ پائے جو ''دینے'' کی جدائی کے بعد ان کے حساس دل کو زخمی کرتے رہے

وہ خوشیاں نہ شیئر کر پائے جنہوں نے یہاں سے جانے کے بعد سمپورن سنگھ کو گلزار بنایا۔
در و دیوار سے وہ دکھ نہ کہہ پائے جو ''دینے'' کی جدائی کے بعد ان کے حساس دل کو زخمی کرتے رہے

سے وہ دکھ نہ کہہ پائے جو ''دینے'' کی جدائی کے بعد ان کے حساس دل کو زخمی کرتے رہے..... بملدا، مینا کماری، مدھو بالا کسی کے بارے میں بھی تو بات نہیں کر سکے اپنے ''دینے'' سے..... نہ ''دینے'' سے کچھ پوچھ سکے نہ ''دینے'' کے خاموش سوالوں کا جواب دے سکے.....

یہ جو چہرے سے تمہیں لگتے ہیں بیمار سے ہم
خوب روئے ہیں لپٹ کر در و دیوار سے ہم

افسوس ستر سال کے ہجر کے بعد ''دینے'' کا جو وصل گلزار کو نصیب ہوا اس میں وہ دینے سے مل کر نہ کھل کے ہنس پائے..... نہ کھل کے رو پائے.....

لاہور واپس پہنچنے پر ہوٹل میں بانو آپا کا ناول راجہ گدھ گلزار صاحب کو تھماتے ہوئے جب میں نے آخری بار انہیں گلے لگایا تو یوں لگا کہ جیسے ان کا اداس دل میرے دل سے سرگوشی میں کہہ رہا ہے کہ ''دینے'' سے ملاقات کی خواہش تو ضرور پوری ہوئی مگر جوان کہی ان سنی باتوں کی نئی حسرتوں نے جنم لیا ہے شاید گلزار کی وہ حسرتیں کبھی نہ پوری ہو پائیں ''دینے'' سے گلزار کی ملاقات تو ہوئی مگر مجھے لگا کہ ایک تشنگی آئندہ ساری عمر حساس دل رکھنے والے گلزار کو تڑپاتی رہے گی۔ گلزار کے دل پر تو جو بیتے گی سو بیتے گی مگر ان کے پڑھنے والوں کو ہوسکتا ہے کچھ بہت عمدہ نظمیں ضرور مل جائیں۔ ایسی نظمیں جو دل کو مٹھی میں بھینچ کر اس سے رستے ہوئے خون سے کشید کی جاتی ہیں۔ آخر میں اپنی ایک نظم جو میں نے اپنے شہر سرگودھا کے لیے کہی تھی ہر اس شخص کے نام جو کسی بھی وجہ سے اپنی جنم بھومی سے دور رہنے پہ مجبور ہے اور گلزار صاحب کے نام.....

Nostalgia
(سرگودھا کے نام)

یہیں پہ تھا مرا بچپن یہیں کہیں پر تھا
یہیں ہنسا تھا
یہیں پر کہیں پہ رویا تھا
یہیں درختوں کے سائے میں
تھک کے سویا تھا
تھے رتجگے مری آنکھوں میں، یار بیلی تھے
یہیں پہ عشق کے موسم دھمال ڈھالتے تھے
یہیں پہ کھیل تھے میرے یہیں گھروندے تھے
یہیں پہ چوڑیوں سے نام کاڑھ لیتے تھے
یہیں پہ تتلیوں سے رنگ چھان لیتے تھے
یہیں پہ جگنوؤں سے اپنی بات چلتی تھی
کوئی ہنسی تھی جو ہر وقت ساتھ چلتی تھی
یہیں پہ تھا وہ لڑکپن، یہیں کہیں پر تھا
یہیں پہ ماں مجھے سینے لگائے رکھتی تھی
یہیں پہ پاپا نے اِک بار کان کھینچے تھے
یہیں بنایا تھا استاد نے مجھے مُرغا
شرارت اور نے کی تھی سزا مجھے تھی ملی
میں کتنی دیر کھڑا دھوپ میں رہا تنہا
تمام یار مرے، خوش مری سزا پر تھے
مرا وجود تھے کمبخت، کتنے پاجی تھے
یہیں پہ تھا وہ لڑکپن یہیں کہیں پر تھا
یہیں کہیں پہ تو ریتیں اُبھر رہی تھیں مری
انہی جھروکوں سے کچھ چاند جھانکتے تھے مجھے
یہیں کہیں پہ وصی خواب دیکھنا سیکھا
اور اپنے لوگوں کے بارے میں سوچنا سیکھا
میں جو بھی کچھ ہوں یہیں ہوں
اِسی جگہ سے ہوں
یہیں پہ تھا مرا بچپن یہیں کہیں پر تھا

(بشکریہ نئی بات) ■

دینہ اسٹیشن پر لگے بورڈ کے پاس کھڑے گلزار صاحب بہت دیر تک دور تک جاتی خالی ریل کی پٹریوں کو اور اردگرد کی فضا کو دیکھتے رہے

گذر گئے ہیں جو خوشبوئے رائیگاں کی طرح
وہ چند روز میری زندگی کا حاصل تھے

دوسری ہجرت

ایوب خاور

ان سہانے لمحوں کا قصہِ شوق جب گلزار یادوں کے کارِرواں من میں بسائے اور دیدہ دل وا کیے اپنے عزیز از جاں قصبے جا پہنچے

پاکستان اور بھارت کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا تسلسل سے عالمی ادبی کانفرنسوں میں آنا جانا کوئی نئی بات نہیں ۔ یہ دونوں طرف کے تخلیقی فنکاروں کا ایسا باہمی خوشگوار سلسلہ ہے جو طویل عرصے سے چل رہا ہے۔ دوحہ، نیویارک، لندن، اٹلی، دبئی، دلی، کلکتہ، علی گڑھ، لدھیانہ، چندی گڑھ اور دیگر مقامات پر پاکستانی و بھارتی شاعروں اور ادیبوں کا ایک دوسرے سے ملنا جلنا، جان پہچان کا دوستی میں بدلنا اور باہمی دلچسپی کے امور پر کھل کر بات چیت کرنا خاص اہمیت کا حامل ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں کراچی اور لاہور میں جاری عالمی ادبی سرگرمیوں نے ان روابط کو مضبوط بنا دیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر شمیم حنفی اور کئی بھارتی عمائدین ادب سے ملنے کا تصور ہماری نئی نسل کے ادیبوں، شاعروں کے لیے بیس پچیس سال

www.urdudigest.pk

پہلے ایسا خواب تھا جو کسی سراب سے کم نہ رہا۔ مگر پاکستان میں ہونے والی ادبی کانفرنسوں نے ان شخصیات سے ملنے کا خواب شرمندۂ تعبیر کر دیا۔ بقول شمیم حنفی ''اب آمدورفت کے تواتر کا یہ عالم ہے، لگتا ہے، میں یہاں (پاکستان) سے گیا ہی نہیں تھا۔''

گلزار صاحب بھارتی فلم انڈسٹری کی مقبول شخصیت ہیں۔ وہ اپنی فلموں کی کہانیوں، ہدایتکاری اور منفرد نغمہ نگاری کی وجہ سے پاکستانی شائقین میں جس قدر مقبول ہیں اتنا کوئی اور نہیں۔ انڈین فلم انڈسٹری کی کئی مشہور معروف شخصیات کا آبائی تعلق پاکستان کے کسی نہ کسی شہر، قصبے یا گاؤں سے ہے۔ شوبز کے پاکستانی شائقین شوق سے اس امر کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ لیکن گلزار صاحب کو وہ اپنی ذات کا حصہ سمجھتے اور اُن سے محبت ہی نہیں بلکہ عشق کرتے ہیں۔ دراصل یہ شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کی فلم کاری اور نغمہ نگاری کی انفرادیت کا جادو ہے جس نے ہمارے دلوں میں ان سے روبرو ملنے کی تمنا کو برسوں سے جگا رکھا ہے۔ مگر دوسری بات زیادہ اہم ہے۔

۱۹۹۰ء کی دہائی میں پاکستان کے ادبی حلقے میں گلزار صاحب کا تعارف ''فنون'' کے ذریعے ہوا۔ احمد ندیم قاسمی پاکستان کی ایک بلند قامت ادبی شخصیت ہیں۔ ''فنون'' کے مدیر ہونے کی حیثیت سے بھی ان کی الگ پہچان ہے۔ انھوں نے آج کے کئی معروف افسانہ نگاروں اور شاعروں کو اپنے جریدے کے ذریعے مقبولیت کے زینے طے کرنے میں مدد دی۔ انہوں نے گلزار صاحب کو بھی افسانہ نگار اور منفرد نظم گو کے طور پر اپنے جریدے فنون کے ذریعے قارئین ادب سے متعارف کروایا۔ پھر رفتہ رفتہ گلزار صاحب کی تخلیقی اُپج کی انفرادیت پاکستان کے ادبی حلقوں کی رگوں میں نئی اور حیرت انگیز خوشبو کی طرح شامل ہونے لگی۔ ان کی نظموں اور کہانیوں میں جس شے نے پاکستان کے عوام اور خواص کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی سرزمین پاکستان خصوصاً اپنے آبائی علاقے دینہ اور جہلم سے شدید وابستگی تھی۔

ذکر جہلم کا ہے، بات ہے دینہ کی

ان کے شعری اظہار کے نئے پن کے ساتھ ساتھ دینہ اور جہلم سے وابستگی، بچپن کی معصومیت اور ہجرت کا دکھ ان سب چیزوں سے عوام اور خواص ان کے ہجر میں مبتلا ہوتے چلے گئے۔ ''چاند پکھراج کا'' میں درج ان کی نظم ''ریفیوجی'' کی آخری سطریں ملاحظہ کریں جو دینہ سے ان کی ہجرت کا خون کے آنسوؤں سے تر منظر نامہ ہے:

وہیں اُسی دن پھینک آیا تھا اپنا بچپن
لیکن میں نے
سرحد کے سناٹوں کے صحراؤں میں
اکثر دیکھا ہے
ایک ''بھمبیری'' اب بھی ناچا کرتی ہے
اور اک ''لاٹو'' اب بھی گھوما کرتا ہے

کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ ستر پچھتر سال کا ایک بوڑھا شخص اب بھی اپنے بچپن کو اپنے بازوؤں میں جھولا جھلا رہا ہے؟ جس بچپن کو وہ سرحد کے اس طرف چھوڑ گئے تھے، ان سارے برسوں میں ہر روز اُس سے ملنے آتے رہے ہیں، بے آواز قدموں سے، گرمیوں کی دوپہروں میں گاؤں کے چھپڑ میں اس کے ساتھ تاری لگانے کے لیے، سردیوں کی شام میں ٹاہلی کے خشک پتے جمع کر کے ساتھ لائی ہوئی ماچس کی تیلی سے جلا کر آگ

ان کی نظموں اور کہانیوں میں جس شے نے پاکستان کے عوام اور خواص کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی سرزمین پاکستان خصوصاً اپنے آبائی علاقے دینہ اور جہلم سے شدید وابستگی تھی۔

www.urdudigest.pk

تاپنے کے لیے، پٹھو اور گیٹیاں کھیلنے کے لیے اور صبح اذانوں کے سائے میں ایک خوشبو کی طرح خاردار تاروں سے الجھے بغیر وہ اپنے بستر پر دراز ہو جاتے۔

ان کی شاعری، فلموں کے منظر ناموں اور گیتوں کے مصرعوں میں گاؤں، کھیت کھلیان، بیری کے بیر، گلیاں، محلے، سکول، بستہ، تختی اور پنجابی زبان کا تڑکا اور پھر کسی نہ کسی طرح دینہ اور اس کے آس پاس کے چھوٹے بڑے قصبوں اور شہروں کی آب و ہوا کا ذائقہ اس قدر ملتا ہے کہ جیسے وہ یہاں سے گئے ہی نہیں۔

ہر دو طرح سے مقبول ترین گلزار صاحب سے میں جب بھی پاکستان آنے کی فرمائش کرتا تھا تو وہ ٹال جاتے مگر یہ ضرور کہتے: ''اگر آؤں گا تو پیدل آؤں گا، اپنے پاؤں پر چل کر، ننگے پاؤں اس زمین کو چھوؤں گا۔'' لیکن ۲۰۰۴ء میں جب اچانک احمد ندیم قاسمی کی طبعیت خراب ہوئی تو پتا چلا کے گلزار صاحب کل آرہے ہیں۔ میرا دل اچھل کر میرے سینے سے باہر آ گیا۔ انہیں کینیڈا سے قاسمی صاحب کی بیماری کا پتا چلا تھا۔ وہ ہفتے کا دن تھا۔ انھوں نے فوراً دلی فون کیا اور اپنے سفارتخانے سے لاہور پہنچنے کی درخواست کی۔ دوسرے دن اتوار تھا مگر گلزار صاحب کے لیے چھٹی والے دن بھی لاہور پہنچانے کا انتظام کیا گیا۔ ایمرجنسی اس قدر تھی کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق واہگہ کی طرف سے پیدل نہ آسکے۔

اس بار پندرہ، سولہ اور سترہ فروری ۲۰۱۳ء کو کراچی ادبی میلے میں ان کی آمد کا چرچا بھی اچانک ہوا۔ میں نے فون کر کے تصدیق چاہی تو انہوں نے کہا، ہاں میں نے اپلائی کیا تو ہے۔ دیکھو اگر ویزہ مل جائے گا تو آؤں گا۔

میں نے کہا: لاہور بھی آئیں گے نا؟ کہنے لگے: ''لاہور بھی اور اس بار دینہ میں اپنا گھر بھی دیکھوں گا۔ مگر ابھی کسی کو مت بتانا، ویزا ملے گا تو پھر بتاؤں گا۔ تمھارے اور حسن ضیا کے ساتھ پروگرام بناؤں گا۔'' پھر کئی ہفتوں تک میں، حسن ضیا اور امجد اسلام امجد ان کے پاکستان آنے کے بارے میں ایک ایسے خواب پہ گفتگو کرتے رہے جو اب تک ہمارے لیے سراب سے کم نہ تھا۔ ان کے آنے کے دن جیسے جیسے قریب آئے، ہمارے سیل فون پر ان کے عاشقوں کی کالز کی بھرمار ہوتی رہی۔ اسی دوران حسن ضیا نے یہ بھی بتایا کہ وشال اور ان کی بیگم ریکھا بھردواج بھی اپنی ٹیم کے ساتھ آرہی ہیں۔ وشال بھردواج بھارتی فلم انڈسٹری کے معروف میوزک ڈائریکٹر ہی نہیں بلکہ بڑے فلم کار بھی ہیں۔ ان کی فلمیں مثلاً مقبول، ایمبریلہ، اومکارا اور کمینے، یہاں کے شائقین میں بہت مقبول ہو چکی ہیں۔ ریکھا بھردواج، گلزار صاحب اور وشال کی البم ''عشقا عشقا'' گا کر پاکستانی سامعین کے دلوں میں اپنی جگہ بنا چکی ہیں۔

اس گلوکار اور موسیقار جوڑے کے ساتھ پہلی ملاقات ۲۰۰۵ء میں اس وقت ہوئی جب میں ''جیوٹی وی'' کی طرف سے بمبئی پہلی بار گیا تھا۔ گلزار صاحب، وشال بھردواج اور ریکھا بھردواج، دونوں کو اپنے بچوں کی طرح پیار کرتے ہیں۔ ان دونوں کے پاکستان آنے کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو انہوں نے گلزار صاحب کا ''دینہ'' اور دینے میں ان کا آبائی گھر دیکھنا تھا۔ دوسرا مقصد لاہور میں ہمارے مشہور قوال مہر علی، شیر علی اور ہمنواؤں کی آواز میں اپنی آنے والی فلم کی قوالی ریکارڈ کرنا تھا۔ اس مختصر قافلے کی آمد کے حوالے سے فون کالز کی بھرمار میں اضافہ ہو

> گلزار صاحب سے میں جب بھی پاکستان آنے کی فرمائش کرتا تھا تو وہ ٹال جاتے مگر یہ ضرور کہتے: ''اگر آؤں گا تو پیدل آؤں گا، اپنے پاؤں پر چل کر، ننگے پاؤں اس زمین کو چھوؤں گا۔''

گیا۔ اُدھر میں اپنے ڈرامے کی اسکرپٹنگ میں مصروف تھا چنانچہ میں نے حسن ضیا کے ساتھ مل کر فیصلہ کیا، سارے معاملات حسن ضیا ہی ڈیل کرے۔ گلزار صاحب کی بھی خواہش تھی کہ میں ان معاملات میں نہ پڑوں، سنبھال نہیں پاؤں گا۔ چنانچہ حسن ضیا نے ان کی آمد سے قبل ہی ناراضگیاں سمیٹنا شروع کر دیں۔

۱۰ فروری کو میں نے کراچی سے لاہور آنا تھا۔ پروگرام کے مطابق ۹ فروری کی صبح حسن ضیا فیصل آباد کے لیے روانہ ہو گیا تا کہ مہر علی، شیر علی قوال سے رابطہ کر کے قوالی کی ریکارڈنگ کا شیڈول فائنل کر لے۔ کیونکہ ۱۰ فروری کو سیماب نے جو وشال بھائی کا بہت ذہین اسسٹنٹ میوزک ڈائریکٹر ہے، واہگہ کے راستے لاہور میں داخل ہونا تھا۔ حسن ضیا نے اسے لاہور سے فیصل آباد لے کر بھی جانا تھا تا کہ وہ مہر علی، شیر علی کو ابتدائی ریہرسل کرا سکے۔

جب ۱۱ فروری کو وشال بھردواج اور بھابھی ریکھا بھردواج نے پہلی بار پاکستانی کی سرزمین پر اپنا قدم رکھا، میں اور ظفر حسن صاحب دینہ کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ دراصل کراچی ہی میں حسن ضیا اور میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ گلزار صاحب کے آنے سے پہلے ایک بار دینہ کا دورہ کر لینا چاہیے۔ اس کے لیے میں نے ظفر حسن صاحب سے رابطہ کیا کہ وہ بھی گلزار صاحب کی آمد پر نہ صرف خوش بلکہ ان سے ملنے کو بے تاب تھے۔

ظفر حسن صاحب معروف فوجی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انگریزی زبان میں گلزار صاحب کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھ چکے، جسے پڑھنے والوں نے اس قدر پسند کیا کہ وہ آج کل اس کے دوسرے ایڈیشن کے لیے کتاب میں ترمیم و اضافے کا کام کر رہے ہیں۔ اس کتاب کے حوالے سے وہ آٹھ سال پہلے گلزار صاحب کے آبائی گاؤں ''کرلاں'' میں گلزار صاحب کے دادا جان کے گھر اور دینہ میں ان کے گھر کی تصویریں بنانے کے لیے بھی جا چکے تھے۔

دینہ جانے کے لیے جب میری ان سے بات ہوئی تو کہنے لگے کہ آٹھ سال پہلے وہاں جو صورت حال تھی، اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں، جا کر دیکھتے ہیں۔ اس دوران مجھے اسلام آباد سے ڈاکٹر انور نسیم صاحب کا فون آیا۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ کیا گلزار صاحب دینہ آئیں گے؟ میں نے ان سے کہا کہ آپ کی ملاقات ضرور ہو گی کیونکہ گلزار صاحب دینہ جانے کا پروگرام بنا چکے ہیں۔ میں ایک دن پہلے جا کر ان کا آبائی گھر، ان کے والد صاحب کی دکانیں اور دینہ ہائی سکول جہاں گلزار صاحب نے کچی، پہلی جماعتیں پڑھیں اور پھر ان کا قدیمی گاؤں کرلاں..... یہ سب دیکھنا چاہتا ہوں تا کہ جب وہ ہمارے ساتھ وہاں

پہنچیں تو کوئی کنفیوژن نہ ہو۔

ڈاکٹر صاحب نے میری اور ظفر حسن صاحب کی مشکل کو آسان کر دیا۔ اپنے بھتیجے ندیم اشرف صاحب کا نمبر دیا کہ اس سے آپ فوراً رابطہ کریں، اُسے ہر جگہ کا علم ہے۔

دینہ روانگی سے پہلے میں نے ندیم اشرف سے رابطہ کرلیا۔ اس کے والد صاحب دینہ کی میونسپل کمیٹی میں ایک اہم عہدے پر فائزرہ چکے ہیں۔ جب میں اور ظفر حسن صاحب دریائے جہلم کا پل عبور کر رہے تھے تو وہ کہنے لگے: ''دریائے جہلم پر کئی پل بن گئے ہیں۔ پہلے صرف دو پل تھے۔ ایک پر ریلوے کی پٹڑی تھی اور دوسرے پر سے جی ٹی روڈ گزرتی تھی۔'' مجھے یاد آیا کہ بچپن میں کراچی جاتے ہوئے جب ریل اس پل پر سے گزرتی تھی، کنارے پر ایک مسجد تھی جس کی سیڑھیاں پانی میں اترتی تھیں۔

ظفر صاحب کہنے لگے: ''اس مسجد کے آس پاس گلزار صاحب کے مطابق وہ اپنے بچپن میں بڑے بڑے تربوزوں کا سہارا لے کر اپنے دوستوں کے ساتھ پانی میں تیرا کرتے تھے۔'' ہم نے اس مسجد کو دیکھنے کی بہت کوشش کی مگر وہ ہمیں نظر نہیں آئی۔ دریا کے دوسری طرف پہنچتے پہنچتے گل شیر بٹ صاحب کا فون آیا ''سر آپ کہا ہیں؟''

''ابھی ابھی دریائے جہلم عبور کیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''گلزار صاحب آگئے؟'' گل نے پوچھا۔

''ہاں وہ رات کو آگئے۔ میں اور ظفر صاحب دینہ جا رہے ہیں۔ تم کہاں ہو؟'' میں نے کہا۔

کہنے لگا: ''میں گوجرانوالہ میں شہزاد رفیق صاحب کے پاس ہوں، کیا پروگرام ہے؟''

میں نے کہا ''تم شہزاد سے رابطے میں رہو، واپس آ کر بتاوں گا۔''

پچھلے دنوں کئی بار شہزاد رفیق سے بات ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی نئی آنے والی فلم کی ایڈیٹنگ کا کام کچھ دنوں کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ گل شیر بٹ وہ نوجوان ہے، جس نے پاکستان میں پہلی بار ''آواز میں لپٹی ہوئی خاموشی'' کے نام سے گلزار صاحب پر ایک کتاب لکھی۔ اس سوانحی ناول میں گل شیر نے بالکل ایک انوکھا ڈکشن اختیار کیا تھا جو مجھے ہی نہیں خود گلزار صاحب کو بھی بہت اچھا لگا۔ گلزار سے محبت کرنے والوں کا ایک ایسا حلقہ تھا جنہیں اس ناول کے مختلف کرداروں کے روپ میں دکھایا گیا اور انہی کرداروں کے ذریعے گل نے گلزار صاحب کی سوانح، ان کی شاعری، فلمیں، گیت اور ہدایتکاری کی پرتیں کھولنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ بعد میں اس کے سب سے قریبی دوست، عثمان علی نے اسے انگریزی زبان میں ڈھالا اور گل نے اُسے بھی شائع کروادیا۔ میں نے اسے بتایا: ''گل! گلزار صاحب نے جن جن لوگوں سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے، ان میں ایک تم ہو۔ دوسرے تسطیر والے نصیر احمد ناصر ہیں... تم دینہ کے سفر میں ہمارے ساتھ ہو گے۔'' فون بند ہوا تو نصیر احمد ناصر صاحب کا فون آگیا۔ میں نے انہیں بھی اگلے دن کا پروگرام بتایا اور طے ہوا کہ وہ ڈاکٹر انور نسیم کے ساتھ صبح دینہ پہنچ جائیں گے اور گلزار صاحب کا دینہ اسٹیشن پر استقبال کریں گے۔ میں نے پھر ندیم اشرف کو فون کر کے بتایا، جو بڑی شدت سے ہمارا انتظار کر رہا تھا کہ ہم دینہ پہنچنے والے ہیں۔

کچھ دیر بعد اس کے بتائے ہوئے پتے پر ہم غلہ منڈی میں اس کی دکان پر پہنچے۔ چائے پینے کے بعد ہم دینہ کے بازار میں داخل ہوئے تو ظفر صاحب کہنے لگے، آٹھ سال میں تو یہ بازار بالکل بدل گیا ہے۔ کئی شاپنگ سنٹر بن گئے ہیں۔ ندیم اشرف کہنے لگا: ''ہم بچپن ہی سے گلزار صاحب کے گھر کو جانتے ہیں۔ گلزار صاحب کے والد مکھن سنگھ سے جن صاحب نے پانچ روپے مہینے پر دوکان کرائے پر لی تھی، وہ آج بھی زندہ ہیں۔''

دینہ کا وہ بازار جس میں گلزار صاحب کا بچپن گزرا تھا، اگر آپ راولپنڈی اسلام آباد سے دینہ میں داخل ہوں، تو

وہ شروع ہی میں آتا ہے۔ اس میں داخل ہونے کے لیے آپ کو الٹے ہاتھ مڑنا پڑے گا۔ آپ فوراً ہی اس بازار میں داخل ہو جائیں گے۔ اسی بازار میں آگے جا کر گلزار صاحب کا گھر ہے۔ اگر آپ اس سے گزر کر شہر سے باہر نکل جائیں تو بمشکل ڈیڑھ دو کلو میٹر پر ان کا آبائی گاؤں کرلاں واقع ہے۔

یہ معلومات دیتے ہوئے ندیم اشرف نے گاڑی بازار کی طرف موڑی تو ظفر حسن صاحب پریشان ہو گئے۔ انہیں وہ بازار نظر نہ آیا کیونکہ مین روڈ جو منگلا ڈیم کی طرف جاتی ہے، وہ خریداروں اور آنے جانے والوں کے ہجوم اور گاڑیوں سے اٹی ہوئی تھی اور دونوں طرف بڑے بڑے شاپنگ سنٹر آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ یوں اصل بازار کا راستہ گم سا ہو گیا۔ ندیم اشرف نے بازار کو زیرو کی سپیڈ سے عبور کرتے ہوئے بائیں طرف ایک گلی میں گاڑی کو موڑ لیا جہاں سینٹری کی دکانیں تھیں۔ یہ بازار بھی گاڑیوں، ویگنوں، موٹر سائیکلوں اور پیدل چلنے والوں سے اٹا ہوا تھا۔

مجبوراً ایک جگہ رک کر ندیم اشرف نے کہا کہ پیدل چلنا زیادہ بہتر ہے ورنہ گاڑی پھنس جائے گی۔ کچھ دیر میں ہم اس قدیم بازار والی گلی میں داخل ہو گئے جس کی نکڑ پر داہنے ہاتھ گلزار صاحب کا گھر اور دکانیں تھیں۔ نقشہ کچھ یوں ہے کہ سامنے ایک ساتھ تین دکانیں اور ان کے ساتھ ہی اندر جاتی ہوئی ایک چھوٹی سی گلی جو سامنے سے بند ہے۔ ندیم اشرف نے کہا: ''یہ ہیں وہ تین دکانیں جو گلزار صاحب کے والد کی ملکیت تھیں اور اس گلی میں دائیں ہاتھ پہلا گھر گلزار صاحب کا تھا۔'' میرا دل چاہا کہ میں لپک کر گلی میں داخل ہو جاؤں اور گلزار صاحب کے بچپن کو گود میں اٹھا لوں۔ لیکن اس خواہش پر میں نے اپنی پُرتجسّس کیفیت کو اوڑھ لیا۔ ندیم اشرف مجھے شیخ امین صاحب سے ملوانے اس دکان کی طرف بڑھا جسے انھوں نے گلزار صاحب کے والد ماجد، مکھن سنگھ سے پانچ روپے مہینہ پر کرائے پر لیا تھا۔

شیخ صاحب اُٹھے اور مجھ سے گلے ملے۔ ان کے چہرے کی جھریوں میں وقت سانس لے رہا تھا۔ شیخ صاحب نے بتایا، مکھن سنگھ ایک کاروباری اور بہت حلیم الطبع آدمی تھے۔ ان کا بڑا بیٹا جسمیر سنگھ پڑھنے لکھنے کا بہت شوقین تھا۔ جسمیر سنگھ اور اس کی بہن دونوں کی شادیاں ہمارے سامنے اسی جگہ ہوئی تھیں۔

گفتگو چائے کی طرف مڑ گئی تو میں نے دکان کا جائزہ لیا۔ شیخ صاحب اس عمر میں بھی چاولوں کا کاروبار کرتے ہیں حالانکہ ان کا ایک بیٹا ایڈیشنل سیکرٹری داخلہ ہے اور دوسرا بیٹا ریٹائرڈ کرنل۔ مگر یہ دکان شیخ صاحب نے چھوڑی نہیں بلکہ جب مکھن سنگھ ہجرت کرنے لگے تو شیخ صاحب نے خرید لی۔ شیخ صاحب جس محبت سے ان کا ذکر کر رہے تھے، مجھے لگا جیسے مکھن سنگھ کی محبت نے انہیں اس دکان سے اب تک جوڑ رکھا ہے چاولوں کا کاروبار تو اس تعلق کو قائم رکھنے کا بہانہ ہے۔ میں نے آنکھ اُٹھا کر اوپر دیکھا تو چھت کی کڑیوں اور دیواروں کے مسام جیتے جاگتے محسوس ہوئے۔ دل کی کیفیت عجیب تھی۔

دکان میں داخل ہوئے تو بائیں ہاتھ پر سیڑھیاں اوپر

اس گلی میں دائیں ہاتھ پہلا گھر گلزار صاحب کا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں لپک کر گلی میں داخل ہو جاؤں اور گلزار صاحب کے بچپن کو گود میں اٹھا لوں۔ لیکن اس خواہش پر میں نے اپنی پُرتجسّس کیفیت کو اوڑھ لیا

چھت کی طرف جاتی دکھائی دیں، شیخ صاحب کہہ رہے تھے کہ خاور صاحب، وہ زمانہ بہت اچھا تھا۔ مکھن سنگھ نے اپنے بیٹے گلزار ہی کی عمر کے ایک مسلمان بچے، اللہ دتہ کھوکھر کو بھی پالا تھا۔ وہ انہی کے ساتھ رہتا تھا۔ اسے بھی جسمیر سنگھ کی طرح سکول میں پڑھایا۔ پھر وہ بھی ممبئی چلا گیا۔ وہاں کاروبار کیا اور پھر سنا ہے کہ کراچی واپس آ کر اس نے اپنے کاروبار کو پھیلایا۔

دوسری دکان دودھ دہی کی تھی اور تیسری گوشت کی۔ ہم نے ان تینوں دکانوں اور بازار کی تصویریں اُتاریں۔ ظفر صاحب بھی خاص کیفیت میں میرے ساتھ ساتھ تھے۔ پھر ہم اس گلی میں داخل ہوئے جس میں گلزار صاحب کا گھر تھا۔ تنگ سی بہ مشکل چالیس میٹر لمبی اور آگے سے بند۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک قدیم دروازے پر میری نظر پڑی۔ دروازے پر تالا پڑا تھا۔ شیخ صاحب نے بتایا کہ یہ بھی مکھن سنگھ کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ ساتھ ہی وہ گھر ہے جس کی دیواریں اور دروازہ دیکھ کر ظفر صاحب کہنے لگے کہ جب آٹھ سال پہلے میں یہاں آیا تھا تو یہ گھر اپنی اصلی حالت میں تھا۔ اب تو یہ پہچان میں نہیں آرہا۔ پتا چلا کہ جو لوگ اس گھر میں رہ رہے ہیں، انہوں نے اسے ازسرِنو تعمیر کرایا ہے۔

گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے۔ اسی لیے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ سامنے والا گھر بالکل اپنی اصلی حالت میں وقت کے ایک نڈھال ٹکرے کی طرح سر نیوڑھائے کھڑا تھا۔ ہم نے بہت تفصیل سے گلی اور بازاروں کی تصویریں اتاری جیسے نئے وقتوں میں پرانے وقت کو قید کر رہے ہوں۔ وقفے وقفے سے ڈاکٹر انور نسیم صاحب کا فون بھی آتا رہا۔ وہ ایک بار گلزار صاحب سے بمبئی میں مل چکے تھے۔ ان کی محبت میں بار بار مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ سب ٹھیک ہے نہ؟ کل کا پروگرام بتائیں۔ وہ بے تاب تھے کہ کب اگلے دن کا سورج طلوع ہو اور وہ گلزار صاحب کو اپنے سینے سے لگائیں۔

گلی سے باہر نکلے تو ندیم اشرف ہمیں گلزار صاحب کے اسکول میں لے گیا۔ اسکول بہت وسیع و عریض تھا اور وہ عمارت جس میں گلزار صاحب نے الف، بے، پے اور اک دونی دونی، دو دونی چار سیکھا تھا، اب وہ جگہ پارکنگ کے لیے مختص تھی۔ اسکول کے احاطے میں داخل ہوتے ہوئے ہمیں تقریباً ساڑھے تین بج چکے تھے۔ اسکول کے پرنسپل چودھری جاوید نے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا۔ وہ کافی دیر سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

اسکول کا معائنہ کرتے کرتے میں نے پرنسپل صاحب سے کہا کہ کیا ایسا ممکن ہے، اسکول کے پرانے ریکارڈ میں گلزار صاحب کا نام تلاش کیا جائے؟ اگر مل جائے تو یہ ایک نایاب دستاویز ہوگی۔ ندیم اشرف نے کہا کہ میں یہ سوال کر چکا ہوں، بلکہ کوشش شروع ہو چکی ہے۔ باتوں باتوں میں پرنسپل صاحب سے میں نے فرمائش کر دی کہ اگر آپ اپنے اسکول کے کسی بلاک کو گلزار صاحب کے نام منسوب کر دیں تو میں تہہ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں گا۔ کہنے لگے: ''کل جب گلزار صاحب تشریف لائیں گے تب تک ان شاء اللہ ایک بلاک گلزار صاحب کے نام منسوب ہو جائے گا۔'' ان سے رخصت ہو کر ہم واپسی پر شیخ امین صاحب کے بھائی شیخ قیوم سے ملے جو پیشے کے اعتبار سے وکیل ہیں۔ قیوم صاحب نے کہا کہ میں اور گلزار صاحب کم و بیش ہم عمر ہی ہیں۔ مجھے ان کی شکل تو یاد نہیں لیکن سمپورن سنگھ کا لڑا مجھے یاد ہے۔ میں یقین سے تو نہیں

، وہ زمانہ بہت اچھا تھا۔ مکھن سنگھ نے اپنے بیٹے گلزار ہی کی عمر کے ایک مسلمان بچے، اللہ دتہ کھوکھر کو بھی پالا تھا۔ وہ انہی کے ساتھ رہتا تھا۔ اسے بھی جسمیر سنگھ کی طرح سکول میں پڑھایا۔

کہہ سکتا کہ سمپورن سنگھ میرا کلاس فیلو تھا یا نہیں، لیکن اتنا یقین ہے کہ مکھن سنگھ کا لڑکا اسی اسکول میں پڑھتا تھا۔ شیخ قیوم صاحب نے ہمیں زبردستی بوتل پلوائی اور بڑی محبت سے رخصت کیا۔

بازار سے باہر نکل کر ندیم اشرف نے ہمیں کھانا کھلایا اور کل تک کے لیے رخصت کر دیا۔ ظفر صاحب نے مجھے میرے گھر، جوہر ٹاؤن (لاہور) تقریباً ساڑھے آٹھ بجے چھوڑا اور خود اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ گھر آتے ہی سب سے پہلے میں نے حسن ضیا سے رابطہ کیا۔ پتا چلا کہ گلزار صاحب رات تقریباً ساڑھے بارہ بجے لاہور ایئرپورٹ پر اتریں گے اور وہ انھیں سیدھا میکال کے اسٹوڈیو لے جائے گا۔ میں نے کہا کہ پھر میں ایئرپورٹ آجاؤں؟ کہنے لگے کہ آپ سارا دن سفر میں رہے ہیں، فکر نہ کریں میں بندوبست کر لوں گا۔ رات تقریباً دو بجے پھر پوچھا کہا کہ میں اسٹوڈیو آجاؤں؟ میرا دل گلزار صاحب کو دیکھنے کے لیے بہت بے تاب تھا۔ مگر اس نے کہا کہ پروگرام یہ ہے، صبح نو بجے ہم دینہ کے لیے روانہ ہوں گے۔ آپ سو جائیں اور صبح ساڑھے سات آٹھ بجے پی سی ہوٹل کی لابی میں آجائیں۔ میں مطمئن ہو کر سو گیا۔

صبح ساڑھے سات پونے آٹھ بجے مجھے ظفر صاحب کا فون آیا: ''آپ کہاں پہنچ چکے؟'' میں نے کہا: ''میں راستے میں ہوں۔'' دس منٹ بعد میں پی سی کے مارکو پولو لاؤنج میں داخل ہوا۔ میرے بالکل عین سامنے سفید کرتے پاجامے میں ملبوس کاندھے پر ہلکے براؤن رنگ کی شال لیے گلزار صاحب ناشتہ کر رہے تھے۔ میری نظر ان پر سے اس وقت تک نہ ہٹی جب تک میں نے انہیں اپنے بازوؤں میں بھر کر گلے نہ لگا لیا۔ بغل گیر ہوتے وقت ان کے جسم کی وہ پہلے والی مہک بھی میرے ساتھ تھی جب میں نے احمد ندیم قاسمی کو گلے لگایا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب میں اس لمحے کے اثر سے نکلا تو پوری نظر وشال بھائی اور ریکھا بھابھی پر پڑی۔ وشال بھائی بہت محبت سے ملے۔ بعد میں میری نظر ظفر حسن صاحب پر پڑی، وہ گلزار صاحب کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ناشتے سے فارغ ہو کر ہم لابی میں آئے تو رات قوالی کی ریہرسل کے دوران مہر علی، شیر علی قوال نے گرہ لگانے کے لیے جن چند اشعار کی فرمائش کی تھی، گلزار صاحب وہ اشعار مجھے سنانے لگے۔ جب تک ہم سب اکٹھے ہوئے وشال صاحب وہ اشعار اپنے اسسٹنٹ سیماب کو بھجوا چکے تھے۔ اس دوران وصی شاہ اپنی بیٹی دعا کے ساتھ آ گیا۔

پروگرام کے مطابق ہم نے گلزار صاحب کو سب سے پہلے سمن آباد کے قبرستان لے جانا تھا جہاں ہمارے بابا احمد ندیم قاسمی صاحب دفن ہیں۔ گلزار صاحب اپنے بابا سے ملنے کے بعد دینہ جانا چاہتے تھے۔ میں نے ناہید قاسمی کو پہلے سے ہی اس پروگرام کے بارے بتا رکھا تھا۔ ناہید قاسمی، احمد ندیم قاسمی کی بیٹی اور اپنی طرز کی بہت ہی اچھی نظم گو ہیں۔ بابا کے بعد وہ اپنے بیٹے نیر حیات کے ساتھ مل کر پچھلے چند برسوں سے فنون نکال رہی ہیں۔ نیر حیات اپنے ماموں نعمان قاسمی کے ساتھ قبرستان میں ہمارا منتظر تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم قاسمی صاحب کی آخری آرام گاہ کے سامنے تھے۔ کتبہ دیکھ کر میرے ذہن میں ۱۹۷۱ء سے لے کر ان کی وفات تک کا وقت نظروں کے سامنے پھر گیا۔

''بی اے کے ایک طالبعلم کے ہاتھ میں ''فنون'' کا تازہ شمارہ ہے۔ شاعری کے حصے میں سقوط ڈھاکہ پر چھپی

نظموں میں وہ اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنی نظم کو غیر یقینی نظروں سے پڑھتے سوچ رہا ہے کہ اپنے وقت کے مقبول ترین ادبی جریدے میں ایک گمنام شاعر کی نظم احمد ندیم قاسمی صاحب نے کیونکر شائع کردی۔ اس طالبعلم نے فنون کا وہ شمارہ پورے کالج اور اپنے اساتذہ کو دکھایا اور پھر رفتہ رفتہ فنون کے صفحات میں اسے نمایاں جگہ ملنے لگی۔'' نعمان قاسمی نے اپنے باپ کی قبر پر نچھاور کرنے کے لیے کچھ پھول میرے ہاتھ پر رکھے تو میں یک لخت لحہ موجود میں آیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا، گلزار صاحب گھٹنوں کے بل پر اپنے بابا کے قدموں میں بیٹھے تھے۔ ان کی آرام گاہ پھولوں کی پتیوں سے بھر چکی تھی۔ میں نے بھی ان کے دامن میں وہ پھول رکھ دیے جو نعمان قاسمی نے مجھے دیے اور فاتحہ پڑھی۔ وشال اور ریکھا بھی ہاتھ باندھے اپنے ان دیکھے گرو کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے۔ وقت ٹھہر گیا تھا۔ خاموشی اتنی تھی کہ ہم سب ایک دوسرے کو دلوں کی دھڑکنیں بھی سن رہے تھے۔ کچھ دیر بعد میں نے گلزار صاحب کو کاندھوں سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی تو مجھے لگا جیسے ان کے گھٹنے قاسمی صاحب کے قدموں میں پیوست ہوگئے۔ آخر کار وہ اپنی عمر بھر کی قوت مجتمع کر کے اٹھے اور اپنے دل کی دھڑکنیں بحال کرنے کے لیے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

پکی ٹھٹھی کے ممتاز سینما کے پاس گاڑی میں بیٹھتے وقت گلزار صاحب نے کہا کہ میں اور ایوب' ظفر حسن کی گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں۔ میں ایوب سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ظفر صاحب، آپ آگے بیٹھ جائیں اور حسن ضیاء، وصی شاہ کی گاڑی ڈرائیو کرے گا اور پیچھے میرے بچے' وشال اور ریکھا کے ساتھ دعا بیٹھ جائے گی۔ میں نے اپنی گاڑی واپس بھجوادی۔ میری زندگی کا یہ دوسرا خوبصورت' نایاب اور یادگار سفر تھا۔ گلزار صاحب میرے پہلو میں مسلسل تین ساڑھے تین گھنٹے بیٹھے مجھ سے بے شمار باتیں کرتے رہے۔

پہلا نایاب' یادگار اور خوبصورت سفر محترم شمس الرحمن فاروقی کے ساتھ نصیب ہوا تھا۔ تب تین دن تک وہ مسلسل اگلی سیٹ پر میرے پہلو میں بیٹھے رہے تھے۔ جب وہ کراچی آرٹس کونسل کی عالمی ادبی کانفرنس میں آئے تھے اور میں ان کی خدمت پر مامور تھا۔

گوجرانوالہ بائی پاس پر گل شیر بٹ اور شہزاد رفیق ہمارے منتظر تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو شہزاد رفیق نے دونوں گاڑیوں کی ڈکیاں فاسٹ فوڈ' سیبوں اور کنوؤں سے لدے لفافوں سے بھر دیں۔ گل شیر بٹ سے وہ بہت محبت سے ملے۔ گل نے ان کے گھٹنوں کو چھوا اور گلزار صاحب نے انھیں گلے لگا لیا۔ پیار کیا اور پھر تینوں گاڑیاں آگے پیچھے دینہ روانہ ہوئیں۔

دریائے جہلم قریب آیا تو گلزار صاحب نے فرمائش کی، وہ دریا کے پل پر کچھ دیر رکنا چاہتے ہیں۔ ہم نے گاڑیاں روک لیں۔ میں اور ظفر حسن انھیں جہلم کے پل پر لے گئے۔ کچھ دیر بعد حسن ضیاء کی گاڑی پہنچ گئی' وہ پیچھے کسی پٹرول پمپ پر رک گئے تھے۔ ہم سب دریا کے کنارے کھڑے ان کی تصاویر بنانے لگے۔ لاہور سے

> میں نے گلزار صاحب کو کاندھوں سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی تو مجھے لگا جیسے ان کے گھٹنے قاسمی صاحب کے قدموں میں پیوست ہوگئے۔ آخر کار وہ اپنی عمر بھر کی قوت مجتمع کر کے اٹھے اور اپنے دل کی دھڑکنیں بحال کرنے کے لیے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

کچھ وقت سے دریائے جہلم کے کنارے پہنچنے تک گلزار صاحب مجھے درجنوں بار یہ کہہ چکے تھے کہ اتنے سارے سائن بورڈ اور بل بورڈ انہوں نے اردو رسم الخط میں کبھی نہیں پڑھے۔ وہ اردو زبان کے عاشق ہیں۔

وہ یار مرا
ہے جس کی زبان
اردو کی طرح

ہم نے ایک سائن بورڈ کے سامنے خاص طور پر ان کی تصویر بنائی۔

ڈاکٹر انور نسیم کا فون آیا کہ کتنی دور ہیں؟ میں نے کہیں دیر ہونے کی وجہ بتائی اور تھوڑی دیر میں ہم دینہ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر تھے۔ ڈاکٹر انور نسیم' نصیر احمد ناصر اور ندیم اشرف دو چار لوگوں کے ساتھ استقبال کے لیے بہت دیر سے کھڑے تھے۔ گلزار صاحب' وشال اور ریکھا کو انھوں نے پھول پیش کیے اور ہم دینہ اسٹیشن کے ویران پلیٹ فارم پر آگئے۔ مال گاڑی کے چند ویران ڈبے خاموشی میں لپٹی پٹریوں پر ساکت تھے۔

اسٹیشن کے گرد و پیش کو گلزار صاحب یوں دیکھ رہے تھے جیسے ابھی چھک چھک کرتی ہوئی کوئی مال گاڑی پلیٹ فارم پر تھوڑی دیر کے لیے رکے گی اور مکھن سنگھ مسافروں والے ڈبے سے اتر کر تیزی سے سمپورن سنگھ کے پاس آکر کہیں گے: ''جلدی سے مال والے ڈبہ نمبر ۵ میں جا کر پلیٹ فارم کی دوسری طرف مال اتارو۔ ریل نے صرف تین منٹ رکنا ہے۔'' اور سمپورن سنگھ چھوٹے چھوٹے قدموں سے بھاگتا ہوا ڈبہ نمبر ۵ میں گھس جاتا ہے..... تین منٹ کیا' کئی منٹ گزر جاتے ہیں' نہ سگنل ڈاؤن ہوتا ہے نہ سبز جھنڈی لہراتا دکھائی دیتا ہے' نہ گاڑی کی سیٹی گونجتی ہے اور نہ چھک چھک کی آواز آتی ہے۔

بس ایک بچہ ہے جو اس ویران اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بیری کے پیڑ کے نیچے اپنے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے سفید کرتے پاجامے میں ملبوس ایک گورے چٹے شخص کے بڑھاپے کی smartness کو دیکھ رہا ہے۔ گلزار صاحب بیری کے اس درخت کے پاس گئے' نم آلود آنکھوں اور زیر لب مسکراہٹ سے سمپورن سنگھ کو دیکھا' جھک کر اسے اٹھایا اور سینے سے لگالیا۔ سمپورن نے گلزار صاحب کے سینے میں منہ دے کر سسکی لی'' میں اس بیری کے نیچے ستر سال سے اسی طرح بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تم میرے کیسے دوست ہو' اب آئے ہو۔'' ہم نے اپنے اسمارٹ بوڑھے دوست کو بیری کے نیچے سمپورن کے پاس چھوڑ دیا تاکہ جی بھر کر وہ اپنے بچپن سے مل سکے۔

دینہ اسٹیشن سے نکلے تو ڈاکٹر انور نسیم کہنے لگے: ''پہلے کھانا کھالیتے ہیں۔'' مگر گلزار صاحب اپنے گھر کو دیکھنے کے لیے بیتاب تھے۔ چنانچہ گاڑیوں کا رخ دینہ کے بازار کے داتا چوک کی طرف موڑ دیا گیا جس کے کونے پر گلزار صاحب کا گھر اور دکانیں واقع ہیں۔ ہمارے علاوہ اس بھرے بازار میں کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ان گاڑیوں سے اترنے والا سفید پوش کون ہے؟ پھر بھی ہم دس بارہ لوگوں کو دیکھ کر بازار میں آنے جانے والے تھوڑی دیر کو رک ضرور گئے۔

گلزار صاحب آہستہ روی سے دکانوں کی طرف بڑھے۔ شیخ امین صاحب سے ملے تو ان کے چہرے کی جھریاں کپکپا سی گئیں۔ سمپورن سنگھ کی جگہ ان کے سامنے گلزار صاحب کھڑے تھے اور سمپورن سنگھ ان کی انگلی تھامے ساتھ ساتھ تھا۔ گلزار صاحب اشک بار آنکھوں

> میں نے دیکھا کہ گلزار صاحب ہوا میں لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے پل کے اس طرف جہلم شہر کو دیکھے جا رہے ہیں اور ہوا میں سے اپنے بچپن کی خوشبو کو چُن چُن کر اپنے سینے میں بھر رہے ہیں۔

www.urdudigest.pk

سے ان دکانوں کے در و دیوار کو دیکھ رہے تھے۔ ندیم اشرف کا ایک فوٹو گرافر دوست مختلف زاویوں سے ان کی تصاویر لے رہا تھا۔ آج سے پینسٹھ ستر برس پہلے کے نہ جانے کتنے ہی فلیش بیک ہوں گے جو ان کی آنکھوں کے سامنے پھلجڑیوں کی طرح جل بجھ رہے ہوں گے۔ شہزاد رفیق اور حسن ضیاء، گلزار صاحب کی زندگی کے ان لمحوں کو اپنے کیمروں کے الیکٹرونک فیتے میں ایک تسلسل کے ساتھ منتقل کر رہے تھے۔

جب وہ اپنے گھر کی گلی میں داخل ہوئے تو مجھے ایسا لگا، جیسے وہ خواب میں چل رہے ہوں۔ ان کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے۔ شیخ قیوم صاحب کو میں نے ان کے ساتھ کر دیا کہ وہ گھر جو پہلے جیسا نہیں رہا تھا، اس کے بارے میں گلزار صاحب کو بتاتے رہیں۔ گھر کی دیواریں تازہ تازہ پلستر کی ہوئی تھیں۔ اس پلستر کی تہہ کے پیچھے اصل دیواریں گھٹی گھٹی سانسیں لیتی ہوئی اپنی بوڑھی آنکھوں سے گلزار صاحب کو پہچاننے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ سمپورن کو تو یہ دیواریں پچھلے پچھتر سال سے جانتی تھیں۔ وہ ہر روز ان سے گلزار کی باتیں کرتا تھا۔

اس گھر کی دیواروں کو چھوتے چھوتے گلزار صاحب مرکزی دروازے پر رکے تو تالا دیکھ کر ایک لمبی سانس لی اور پھر آگے بڑھتے گئے۔ گلی آگے سے بند تھی، پرانی اینٹوں سے ..... میں سمجھ نہ سکا کہ گلزار صاحب بند گلی کے اس طرف کیا دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں؟ انھوں نے شیخ قیوم صاحب سے آخر پوچھ ہی لیا ''یہ دیوار'' وہ رکے اور بولے ''جب میں یہاں تھا تو گلی بند نہیں تھی۔''

شیخ قیوم نے فوراً کہا: ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں..... یہ گلی باہر کھیتوں میں نکلتی تھی۔''

ان باتوں سے پتا چلا کہ وہ گنجان بازار جہاں اب تل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی تھی، وہاں دور تک کھیت ہی کھیت ہوتے تھے۔ اور فلم ''پہیلی'' میں جن بیری کے پیڑوں کا ذکر ہے، وہ انہی کھیتوں میں ہوا کرتے ہوں گے۔ میں سن رہا تھا اور شہزاد رفیق سے اس کا فون لے کر اس گفتگو کو ریکارڈ کرنے لگا کیوں کہ اب تک شہزاد رفیق پسینہ پسینہ ہو چکا تھا۔ گلزار صاحب پوری طرح اپنے بچپن میں پہنچ چکے تھے۔ بولے: میں اپنے گھر سے نکل کر اپنے دوستوں کے ساتھ اسی گلی سے باہر نکل جایا کرتا تھا۔ مجھے لگا کہ اچانک وہ اینٹوں کی دیوار اچانک فضا میں تحلیل ہو گئی اور سمپورن سنگھ، گلزار صاحب کو لیے گلی ڈنڈا پکڑے اپنے دوستوں کے ساتھ بھاگتا ہوا کھیتوں میں کہیں گم ہو گیا۔ میں بھی شاید اس کے پیچھے چلا گیا تھا۔ میرے ذہن میں ماچس فلم کے گیت کا مکھڑا گونجنے لگا:

چھوڑ آئے ہیں ہم وہ گلیاں

میں پلٹ کر آیا تو گلزار صاحب، اے ڈی کھوکھر کو یاد کر رہے تھے اور شیخ قیوم صاحب انھیں یاد دلا رہے تھے کہ مکھن سنگھ نے اسے اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا۔ پھر آس پاس کے گھروں میں رہنے والوں کے بارے میں انھیں بتایا گیا کہ اتنی دیر میں ندیم اشرف نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ گھر کی چابی منگوا چکا تھا۔ کیمرہ چلاتے چلاتے میری نظر ندیم اشرف پر پڑی تو وہ میرے سامنے گھر کی چابی لہرا رہا تھا۔ پھر اس نے گھر کا دروازہ کھولا اور آواز لگائی کہ چابی مل گئی ہے۔ گلزار صاحب کو اندر لے آئیں۔ ندیم نے کمال کر دیا تھا، اگر چابی نہ ملتی تو گلزار صاحب اندر سے گھر کا نقشہ نہ دیکھ پاتے۔ ہم سب اندر آ گئے۔ میں نے شیخ قیوم صاحب سے پوچھا کہ شیخ صاحب، کیا اس وقت گھر کے اندر کا نقشہ پہلے بھی ایسا تھا؟ انھوں نے بتایا کہ گھر کی بنیادوں کو نہیں چھیڑا گیا، صرف دیواریں دوبارہ اٹھائی گئی ہیں۔ ظفر صاحب کہنے لگے، چھت پر یہ جو جنگلہ لگا ہے، آٹھ سال پہلے ایسا ہی ایک جنگلہ نصب تھا لیکن اس کا طول و عرض بڑا تھا۔ اچانک میری نظر فرش میں دھنسے ہوئے لکڑی کے ایک قدیم دروازے پر پڑی۔ ساتھ ہی کسی نے بتایا کہ یہ دروازہ تو اسی وقت کا ہے۔ شیخ صاحب نے بتایا کہ مکھن سنگھ اسی دروازے کے ذریعے باہر اپنی دکانوں پر جایا کرتے تھے۔

وقت کی دلدل میں دروازہ آدھے سے زیادہ ڈوب

www.urdudigest.pk

چکا اور کنڈی اسی طرح لگی ہوئی تھی جیسے ہجرت کرتے وقت لگا دی گئی ہوگی۔ گلزار صاحب بہت دیر تک اس بند ہوئے دروازے کو دیکھتے رہے۔ مگر واپس تو جانا تھا، گلزار صاحب ان پچھتر برسوں میں دوسری بار گھر سے نکل آئے۔ مگر ان کے قدم من من کے ہو رہے تھے۔ آنکھیں سرخ تھیں اور ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست۔ منیر نیازی کے اس شعر کی طرح ؎

آواز دے کے دیکھ لو، شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائگاں تو ہے

باہر نکلتے ہوئے انھوں نے پیچھے مڑ کر ایک بار پھر گلی کو دیکھا۔ سامنے کی دیوار اپنی جگہ دوبارہ کھڑی ہو چکی تھی۔ اور سورج اسلام آباد کی پہاڑیوں کو چھونے کی کوشش کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم مختلف گلیوں میں پیدل چلتے چلتے گورنمنٹ ہائی اسکول، دینہ میں پرنسپل چودھری جاوید صاحب اور ان کے اسٹاف سے گلزار صاحب کو ملوا رہے تھے۔ پارکنگ والی جگہ پر رک کر شیخ قیوم صاحب نے بتایا کہ ہم جس اسکول میں پڑھتے تھے، وہ اب نہیں ہے۔ جہاں ہم کھڑے ہیں، وہ اسی جگہ تھا۔ یہ جگہ اب ڈرائیور کے لیے مخصوص ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس جگہ کھڑے گلزار صاحب کی سوچتی آنکھوں نے اس لمحے سے اسکول کی عمارت کو پل بھر میں اپنے سامنے موجود کر لیا ہوگا۔

ندیم اشرف نے مجھے بتایا کہ آپ نے جو فرمائش کی تھی پرنسپل صاحب نے وہ پوری کر دی۔ وہ آپ لوگوں کو لینے گئے ہیں۔ اونچائی پر بنے ایڈمن بلاک اور فاطمہ جناح ہاسٹل کے آگے سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ہاسٹل کی شان سامنے جو بلاک ہے، اس کی پیشانی پر بہت خوبصورت انداز میں گلزار کا لڑا بلاک لکھا جا چکا۔ اس بلاک کے سامنے کئی گروپ فوٹو بنائے گئے۔ جب پرنسپل صاحب اور ان کے اسٹاف کے ساتھ گلزار صاحب کی تصاویر بنائی جانے لگی تو گلزار صاحب نے مجھے آواز دی ''ایوب، تم بھی تو اسٹاف کے ساتھ شامل ہو جاؤ نا۔ یہ چودھری صاحب کا اور تمہارا ہی تو کارنامہ ہے کہ میرے اسکول کا ایک بلاک میرے نام لگ گیا ہے۔'' اور میں ندیم اشرف کا ممنون تھا کہ میری غیر موجودگی میں اس نے اپنی نگرانی میں صبح صبح یہ کام چودھری جاوید کے زیر اہتمام کروا لیا۔

کھانا ڈاکٹر انور نسیم صاحب کی بہن کے گھر میں ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ باہر نکلتے نکلتے گلزار صاحب کے آبائی گاؤں کرلاں جانے کا پروگرام کھٹائی میں پڑتا دکھائی دے رہا تھا۔ دوسرا مسئلہ یہ سر اٹھا رہا تھا کہ اگر واپسی میں دیر ہو گئی تو قوالی کی فائنل ریکارڈنگ مکمل نہ ہو پائے گی جس کے لیے وشال بھردواج آئے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ غم اور خوشی کی ملی جلی کیفیت سے گلزار صاحب بوجھل ہو رہے ہیں۔ وہ ضبط کی ٹوٹتی ہوئی ڈوریوں کو مضبوطی سے پکڑے رکھنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔

گاڑیوں تک آتے آتے ہم سب کم و بیش بکھر گئے۔ مجھے اور ظفر حسن صاحب کو ''کرلاں'' ہی سے تعلق رکھنے والے دو نوجوان جو اسی اسکول میں پڑھاتے تھے، اپنی گاڑی میں بٹھا کر ظفر حسن صاحب کی کار تک ساتھ لائے۔ ہم جب تک اپنی گاڑی میں بیٹھ کر باہر سڑک پر آئے، حسن ضیاء والی گاڑی میں گلزار صاحب، وشال اور ریکھا بھابھی واپسی کے لیے مڑ رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ڈاکٹر انور نسیم صاحب نے ہمیں لے کر کس طرف جانا ہے۔

ظفر حسن صاحب کا ڈرائیور بھی جاتی ہوئی گاڑی کے پیچھے جانے لگا تو میں نے ڈاکٹر انور نسیم کے چہرے پر ہوائیاں اڑتے دیکھیں۔ اسی وقت ساتھ ہی کھڑے وصی شاہ کو دیکھا۔ دعا بھی وہیں کھڑی تھی۔ ہمارے پاس ظاہر ہے اب ایک ہی گاڑی تھی۔ وصی نے مجھے کہا کہ ہمیں بھی بٹھا لیں تو ڈاکٹر صاحب نے کہا: ''آپ بھی جا رہے ہیں؟'' مجھے کچھ سمجھ نہ آیا۔ میری نظر نصیر احمد ناصر صاحب پر پڑی۔ ان کی گاڑی سڑک کی مخالف سمت سرک رہی تھی

اور ان کے چہرے پر بھی میں نے سوال ہی دیکھا۔ میں نے حسن ضیاء کو فورا فون کیا۔ اس نے بتایا: ''اس سارے وقت میں گلزار صاحب اپنی جذباتی کیفیت کو سنبھالتے سنبھالتے بے قابو ہو چکے ہیں۔'' انھوں نے کہلوایا ہے کہ ڈاکٹر صاحب سے معذرت کر لینا۔ بس مجھے یہاں سے فورا لے چلو۔ چند لمحوں کے سناٹے کے بعد میں نے طے کیا کہ ہم رک جاتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہم ڈاکٹر انور نسیم کی رہنمائی میں ہم اس گھر میں اتر رہے تھے جہاں کھانا اور کئی میزبان ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے ڈاکٹر صاحب کو سمجھایا۔ وہ اور نصیر احمد ناصر، جن کا گلزار صاحب سے پرانا تعلق ہے، صورتحال کو بہت جلد سمجھ گئے۔

میں نے پھر وصی شاہ، دعا، نصیر احمد ناصر، ندیم اشرف اور ظفر صاحب کے ساتھ مل کر تسلی سے کھانا کھایا۔ ہمارے سامنے مختلف انواع کے کھانے سجے ہوئے تھے۔ ہم نے گلزار صاحب، وشال، ریکھا بھابھی، گل شیر بٹ، شہزاد رفیق اور حسن ضیا کو بہت یاد کیا۔ کھانے میں جو چیز مجھے بھا گئی، وہ باجرے کی روٹی، سرسوں کا ساگ، مکھن اور چاٹی کی لسی تھی۔ بچپن کا ذائقہ زبان پر عود کر آیا اور یہ بھی خیال نہ رہا کہ میں نے زیادہ کھا لیا۔ اوپر سے میٹھا اور پھر چائے... غرض میرے اندر کے بچے نے سردیوں کی اس شام کو کھل کر لطف اٹھایا۔ واپس جاتے ہوئے میں نے ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اور ڈاکٹر انور نسیم صاحب کو اپنی چوتھی تخلیق ''محبت کی کتاب'' پیش کی اور پھر جی ٹی روڈ پر تیز رفتاری سے نکلے تاکہ ہم حسن ضیاء کو جا لیں۔ آخر کار ہم نے میاں کے ہوٹل سے پہلے پہلے ان کو جا لیا۔ حسن ضیا، گلزار صاحب سے ضد کر رہا تھا کہ خدا کے لیے کچھ تھوڑا سے کھا لیں۔ آپ نے دن بھر صرف ایک کینو کھایا ہے۔ آپ نے ساری رات ریکارڈنگ میں رہنا ہے۔ آخر کار ریکھا بھابھی نے انھیں منا لیا اور آدھے گھنٹے کے اندر اندر دوبارہ ہم جی ٹی روڈ پر تھے۔

لاہور کا ٹول پلازہ کراس کرنے کے بعد حسن ضیاء

www.urdudigest.pk

نے اپنی گاڑی روکی۔ مجھے، شہزاد اور گل شیر سے کہا: گلزار صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ ہم ان کے پاس پہنچے تو میرے پاس ان کی شال تھی، وہ میں نے انھیں اوڑھا دی تو کہنے لگے: ''اب اسٹوڈیو آنے کی ضرورت نہیں۔ تم اور ظفر صاحب دو دن سے سفر میں ہو، کل دوپہر ساڑھے بارہ بجے ملیں گے۔'' ہم پھر تینوں گاڑیاں آگے پیچھے لاہور کی طرف چل پڑیں۔

ظفر صاحب نے مجھے میرے گھر چھوڑا۔ پھر وصی شاہ کو اس کے گھر چھوڑتے ہوئے اپنے گھر چلے گئے۔ میں اور ظفر صاحب واقعی تھکن سے چور تھے۔ بستر پر گرتے ہی نیند نے دبوچ لیا۔ صبح ہی صبح میرے فون پر میرے دوست صحافیوں کی کالز آنا شروع ہو گئیں۔ پھر ایک گھنٹا اپنی صفائی پیش کرنے میں لگا۔ اس دوران امجد اسلام امجد کا فون آیا کہ اب تمہاری ذمہ داری ہے کہ ایک بجے تک گلزار صاحب کو ڈیفنس کے شیزان میں لے آؤ گے۔ دس منٹ بعد حسن ضیاء کا فون آیا کہ گلزار صاحب واہگہ کے راستے پیدل واپس چلے گئے۔ میرے دل میں ایک چھناکا ہوا..... پوچھا ''کیوں''

کہنے لگا ''وہ جو آپ کہہ رہے تھے نا کہ گلزار صاحب ضبط کی ڈوریوں کو پکڑے رکھنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں، وہی ہوا کہ وہ ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گئیں۔''

میں اور حسن جب انھیں دینہ آنے کو کہتے، وہ یہی جواب دیتے ''آؤں گا..... لیکن پیدل..... میں اپنے پیروں کے تلووں سے پاکستان کی سرزمین کو چھونا چاہتا ہوں۔''

اور اب میں دل ہی دل میں ان سے سوال کر رہا ہوں کہ گلزار جی، آپ نے تو واہگہ کے راستے اپنا آبائی گھر دیکھنے آنا تھا..... جب آئے تو ہوا میں اڑ کر اور گئے تو اپنے پیروں پہ چل کر.....'' پھر دل مجھے سمجھاتا ہے کہ آج سے ستر برس پہلے بھی تو وہ پیدل ہی گئے تھے۔ یہ ان کی اس گھر سے دوسری ہجرت تھی، انھیں پیدل ہی جانا تھا۔ مگر اب لوٹنے میں وہ ستر برس نہیں لگائیں گے۔ بہت جلد آئیں گے۔

یہ سن کر احتشام صاحب حیران رہ گئے اور سوچنے لگے ''بیٹھ کر اٹھنے میں شکر کی کون سی بات ہے؟'' شفیق پانی کا پائپ سنبھالے برآمدے کے کونے کی طرف چلا گیا۔ ملازم نے چائے کا پیالہ انھیں پکڑایا۔ افشاں بیگم کب اٹھ کر اندر گئیں، انھیں پتا نہ چلا۔ شفیق اب گلاب کی جھاڑیوں سے سوکھے پتے توڑ توڑ کر نیچے گرا رہا تھا۔ پھر اس نے پتے اور ٹہنیاں اکٹھی کیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر نیچے بیٹھا تو پھر اس کی آواز آئی ''اللہ! تیرا شکر ہے۔'' وہ پھر کیاری کی زمین میں گوڈی کرنے لگا۔

''شفیق!'' انھوں نے اسے پکارا۔

''جی صاحب!'' وہ فوراً متوجہ ہوا۔

''تم اٹھتے ہو تو، بیٹھتے ہو تو کہتے ہو اللہ! تیرا شکر ہے۔'' وہ تعجب سے بولے

''جی صاحب۔ یہ میری عادت ہے۔ میرے ابا جی کہتے ہیں کہ جو بندے اللہ پاک کا شکر ادا کرتے ہیں، اللہ اُن سے راضی رہتا ہے۔''

''مگر کھڑے ہونے میں کیا خاص بات ہے؟'' انھوں نے پوچھا

''اس لیے کہ انسان دو پیروں پر سیدھا کھڑا ہوتا اور چلتا ہے تو اللہ پاک کے کرم سے۔ جانور چار پیروں پر چلتے ہیں اور ان کا سر نیچے جھکا رہتا ہے۔ ہمارا سر اٹھا کر کھڑا ہونا، دو پیروں پر چلنا اور کام کرنا، یہ سب اللہ تعالیٰ کے کرم سے ہے۔ اس پر شکر ادا کرنا واجب ہے نا جی!''

احتشام صاحب نے یوں سر ہلایا گویا بات ان کی سمجھ میں آگئی۔

''ہمارے گاؤں میں اکرم چاچا رہتا ہے، وہ چل نہیں سکتا۔ اسے کچھ بیماری ہوگئی تھی۔ زہر پھیل رہا تھا، اس لیے ڈاکٹروں نے اس کی ٹانگیں کاٹ دیں..... وہ ٹانگوں سے معذور ہوگیا۔ صاحب! تندرستی بڑی نعمت ہے۔''

''بے شک!'' احتشام صاحب نے کہا

''میرے ابا جی کو پہلے ٹھیک نظر آتا تھا۔ پھر انھیں دھندلا نظر آنے لگا۔ ہم نے ڈاکٹروں کو دکھایا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا..... اب انھیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ صاحب، جن کی آنکھیں سلامت ہوں انھیں ہر وقت اپنے رب کا شکر ادا کرنا چاہیے۔''

وہ ذرا دیر خاموش رہا پھر بولا ''بندہ بڑا ناشکرا ہے..... وہ اپنے رب کی نعمتوں پر شکر ادا نہیں کرتا..... اس دھوکے میں رہتا ہے کہ جو کچھ میرے پاس ہے، وہ میں نے خود حاصل کیا۔'' وہ بولتا جا رہا تھا اور احتشام صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کے دل پر پڑے پردے اٹھتے جا رہے ہیں اور روشنی پھیل رہی ہو۔

''میرے پاس جو یہ دولت ہے، کوٹھی، گاڑیاں، بیوی بچے، یہ سب کچھ اللہ نے دیا۔ وہ بیوی جو میری پسند کی نہیں مگر میری گھر والی ہے، میرے بچوں کی ماں..... اور میری وفا دار بھی ہے..... خدا نے مجھے ہر نعمت دی..... مگر میں نے کبھی اللہ کا خاص شکر ادا نہ کیا، ہمیشہ یہی سمجھا کہ یہ سب میں نے اپنے زور بازو سے حاصل کیا۔''

انھیں شفیق پر رشک محسوس ہوا۔ معمولی سی روٹی کھا کر اور پانی پی کے، بان کی چارپائی پر اطمینان کی نیند سونے والے کا دل اپنے رب کی شکر گزاری سے کتنا سکھی ہے۔ ایک میں ہوں کہ سب کچھ ہونے کے باوجود میری زندگی میں کمی ہے..... کس چیز کی کمی؟ وہ کمی ہے شکر کی! ہاں! جس رب نے مجھے یہ سب کچھ دیا، اس کا شکر ادا کرنا چاہیے..... اے میرے رب، تیرا شکر ہے، لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلا اور انھیں یوں لگا جیسے دل کا بوجھ کہیں غائب ہوگیا۔ مدتوں سے بند روشن دان کھل گیا، اندھیرے چھٹ گئے اور ہر طرف روشنی پھیل گئی۔

www.urdudigest.pk

ناقابل فراموش سچا واقعہ

مائی لنڈی

گاؤں سے تعلق رکھنے والے ایک مسافر کا ماجرا
وہ اپنے تئیں خود کو بڑا چالاک سمجھتا تھا

میرے نانا جی سیدھے سادھے کھرے انسان تھے۔ اُن کا ضمیر شفاف تھا۔ معمولی سی غلطی پر بھی وہ اپنے ضمیر کی سرزنش کو محسوس کر لیتے تھے۔ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاتے تھے جس سے اُن کو کسی بے چینی سے دوچار ہونا پڑے۔ ہر انسان کی اپنی طبیعت، اپنی فطرت ہوتی ہے۔ مزاج اور عادات میں بڑا تضاد پایا جاتا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے جو میں اِن صفحات میں لکھنے لگا ہوں۔ یہ سادگی پر مبنی کہانی ہے۔ آج سے ۵۰، ۶۰ سال قبل کے دور پر ہم تصوراتی نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اُس دور میں سیدھے سادھے خوش خلق باضمیر انسانوں کی بہتات تھی۔ جبکہ آج کے دور میں یہ چیز دیکھنے کو نہیں ملتی۔ کہیں کوئی ایک انسان ایسا نظر آجائے تو ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ اس جدید مشینی دور میں یہ سادگی کیونکر ممکن ہے۔

بشیر احمد بھٹی

آج کے بچے بھی بلا کے ہوشیار ہیں۔ یہ جدید دور ہے۔ سادگی، شرافت، بھائی چارہ، حسن اخلاق، محبت، اخوت، یہ سب دم توڑتے نظر آ رہے ہیں۔ نفسانفسی کا عالم ہے۔ پرانے دور میں یہ سب کچھ عام دیکھنے کو ملتا تھا۔ ٹریفک کا اتنا اژدھام بھی نہیں ہوتا تھا۔ جدید قسم کی گاڑیاں نہیں تھیں۔ ٹرین کا سفر ہوتا تھا یا کھٹارہ قسم کی بسیں ہوتی تھیں۔ لوگ اِدھر اُدھر سفر بہت کم کرتے تھے۔ جب سفر کرنے کا موقع آتا تو لطف اٹھاتے تھے۔ منزل پر پہنچنے کی جلدی نہیں ہوتی تھی۔ دوران سفر کھڑکی کے قریب بیٹھنے کو ترجیح دیتے تھے کہ باہر کے مناظر دیکھے جائیں۔ ہمارا سفر بہاول پور سے خان پور تک محدود تھا۔ کراچی کا صرف نام سنا تھا۔ مختلف افواہیں مشہور تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ ٹرین تین، چار دن بعد کراچی پہنچتی ہے۔ کراچی پرستان کی طرح مشہور تھا۔ لوگ دل میں تمنا رکھتے تھے کہ کراچی شہر دیکھا جائے مگر وہاں جانے کے وسائل کسی کے پاس نہ تھے۔ کئی بوڑھے ویسے گاؤں یا گوٹھ تک تمام عمر محدود رہے۔ گھر سے نکلنا، کھیتوں میں کام کرنا اور گھر چلے جانا، یہ تھی زندگی۔ ہمارے گاؤں سے ۳ میل دور گڑھی اختیار خان واقع ہے۔ ہمارے پھوپھا کا نام نظام دین تھا۔ نظام دین اپنی پوری زندگی میں گڑھی اختیار خاں تک نہ جا سکا۔ یہ تھی زندگی۔ نانا جی کبھی کبھار خان پور سے بہاول پور آتے اور چند روز رہ کر چلے جاتے تھے۔ سفر تفریح کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک بار نانا جی بہاول پور آئے۔ چند روز ہمارے پاس رہے۔ پھر واپس جانے کی تیاری کر لی۔ میرے چچا جی ذرا جلد باز اور غصے والے انسان تھے۔ انھوں نے بھی ہمارے نانا کے ہمراہ خان پور جانے کا ارادہ کرلیا۔ اُن دنوں ریلوے اسٹیشن تک جانے کے لیے تانگے ہوتے تھے یا پھر پیدل ہی یہ معمولی سفر کرلیا جاتا تھا۔ روپے پیسے بہت کم ہوتے تھے۔ بچت اسکیم پر عمل کیا جاتا تھا۔ میرے نانا جی میرے چچا کے چچا تھے۔ دونوں نے صبح کو تیاری کی اور رومال میں روٹیاں، اچار باندھ کر پیدل ہی اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئے۔ دو ڈھائی میل کی مسافت تھی۔ یہ سفر ان کے لیے معمولی بات تھی کیونکہ وہ ۱۰، ۱۲ میل تک کا سفر بھی پیدل کرنے کے عادی تھے۔ خان پور سے گڑھی اختیار خان دس، بارہ کوس میل دور ہے۔ اس سے آگے ہمارا گاؤں جسے بستی ڈھکڑاں کہتے ہیں، ۳ میل دور ہے۔ یہ کل اٹھارہ، بیس میل کی مسافت تھی۔ یہ مسافت بھی وہ کبھی کبھار پیدل ہی طے کر لیتے تھے۔ پیدل سفر سے وہ گھبراتے نہیں تھے۔ یہ دونوں جب اسٹیشن پہنچے اس وقت لنڈی پسنجر اسٹیشن پر آچکی تھی اور جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ ٹکٹ گھر پر ٹکٹ لینے والوں کی لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ اگر یہ ٹکٹ لینے کے لیے قطار میں کھڑے ہو جاتے تو پسنجر ٹرین چلی جاتی۔ یہ ہاتھ ملتے رہ جاتے۔ پھر دوسرے دن تک سفر ملتوی کرنا پڑتا۔ ان کو یہ پسنجر ٹرین تیز رفتار ٹرینوں سے زیادہ پسند تھی۔ کیونکہ یہ ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر رکتی تھی۔ اس کا رکنا، چلنا اور پھر جنکشن اسٹیشن پر زیادہ دیر کھڑے رہنا نانا جی کو پسند تھا۔ وہ ٹرین کے سفر سے بہت زیادہ محظوظ ہوتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ میرا جی چاہتا ہے ٹرین میں بیٹھا رہوں، نیچے نہ اتروں۔ خان پور کٹورہ سے بہاول پور آتے ہوئے جب کبھی لنڈی لیٹ ہو جاتی تو نانا جی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے دعا کرتے کہ اللہ کرے سمہ سٹہ جنکشن پر اس کو رات ہو جائے۔ تاکہ بوگیوں کے بلب جل اٹھیں اور میں روشن ڈبوں میں بیٹھ کر ٹرین کے سفر کا صحیح لطف اٹھا سکوں۔ سردیوں میں دن چھوٹے ہوتے تھے۔ اکثر لنڈی مغرب کے وقت سمہ سٹہ پہنچتی اور پھر پون گھنٹہ ٹھہرتی۔ جس سے تاریکی ہو جاتی۔ بوگیوں کے بلب جل اٹھتے۔ نانا جی بچوں کی طرح جلتے بلب دیکھ کر خوش ہوتے۔ پھر چھت میں نصب بلبوں کو تکتے رہتے۔ یہ لنڈی ٹرین روہڑی سے چل کے خان پور دن کے ڈھائی بجے پہنچتی۔ پھر ساڑھے تین بجے وہاں سے چلتی تو نانا جی کی رات ہونے کی دعا رنگ لاتی۔ ہاں البتہ بہاول پور سے جب جاتے دعا قبول نہ ہوتی کیونکہ یہ ٹرین خانیوال سے چل کے صبح ۹ بجے بہاول پور آجاتی تھی۔ پھر دن کے دو ڈھائی بجے تک خان پور پہنچ جاتی تھی۔ اس طرح دن کی روشنی میں ٹرین سے اترنا نانا جی کو پسند نہ تھا۔ بہاول پور سے خان پور تک کل ۱۴ اسٹیشن تھے۔ نانا جی چاہتے تھے کہ ہر اسٹیشن پر ٹرین رکتے چلتے منزل کی طرف بڑھے تو مزہ آتا ہے۔ اُن کو اِن تمام اسٹیشنوں کے نام بھی یاد ہو گئے تھے۔ جو وہ تفصیل سے ہمیں بتا دیتے تھے بہاول پور، سمہ سٹہ، کلانچ والا، مبارک پور، ٹبی عزت، ڈیرہ نواب صاحب، کلاب، چنی گوٹھ، میتلا، تنواری، فیروزہ، لیاقت پور، جیٹھی بُٹھہ، خان پور جنکشن۔ نانا جی کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ لنڈی پسنجر سب ٹرینوں سے زیادہ چلتی ہے۔ اس کا مقابلہ ڈاک میل یعنی تیز گام بھی نہیں کر سکتی۔

کیونکہ وہ لنڈی کے مسافر تھے۔ اس لیے اسی کے کن گاتے رہتے تھے۔ ایک اور گاڑی آتی تھی جس کا نام وزیر آباد تھا۔ کبھی لنڈی خانیوال سے آتے ہوئے لیٹ ہو جاتی تو نانا جی وزیر آباد ٹرین میں سوار ہو جاتے۔ جس کی بوگیوں میں سیدھی سبز رنگ کی پھٹیاں لگی ہوتی تھیں اور برتھوں میں زنجیر لگے ہوتے تھے۔ ان پھٹیوں کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ دیار کی لکڑی ہے۔ دیار کی لکڑی کو کافی مضبوط مانا جاتا تھا۔ وزیر آباد گاڑی بہاول پور سے چل کے اگلے اسٹیشن سمہ سٹہ جنکشن پر ختم ہو جاتی تھی۔ نانا جی لنڈی کے آنے تک وزیر آباد کے ڈبوں میں مختلف جگہوں پر بیٹھ کر دل پشوری کرتے رہتے تھے۔ ٹرین سے عشق کا یہ عالم تھا۔"

ویسے ریل کی پٹڑی پر کئی ڈبوں کا ایک ساتھ چلنا سب کو پسند تھا۔ لوگ کھڑکی سے سر نکال کر ٹرین کی لمبائی سے خوب محظوظ ہوتے تھے۔ درختوں کا پیچھے دوڑنا، کھمبوں کا پیچھے رہ جانا، نہروں کے اوپر سے گزرنا، دریا کے پل سے گزرنا، یہ سب ریل کے سفر میں دیکھنے کو ملتا تھا۔ لوگ ریل کا سفر بڑے شوق سے کرتے تھے۔ لمبے سفر سے بور نہیں ہوتے تھے۔ اس وقت لوگ ریل کے قصیدے پڑھتے تھے۔ آج کی طرح نہیں کہ دو چار جگہ رک گئی تو فوراً مسافر چلا اٹھتے ہیں۔ یہ ٹرین ہے یا چھکڑا۔" میرے چچا مولوی صادق صاحب نے بھانپ لیا کہ اگر ہم ٹکٹ کے چکر میں پڑے تو لنڈی چلی جائے گی۔ انھوں نے میرے نانا سے کہا آؤ میرے ساتھ۔ ٹی ٹی کو پیسے دے کر ٹکٹیں بنوا لیں گے۔ وقت کم ہے، گاڑی نکل جائے گی۔

سردیوں کے دن تھے۔ وہ دونوں تیزی سے پلیٹ فارم پر پہنچے۔ گاڑی رینگنے لگی تھی۔ وہ دونوں بھاگ کر ایک بوگی میں سوار ہو گئے۔ بوگی میں لمبی سیٹیں خالی پڑی تھیں۔ وہ ایک سیٹ پر بیٹھ گئے۔ میرے چچا نے اپنا کمبل تہہ کر کے نیچے رکھ لیا تا کہ سیٹ آرام دہ ہو جائے۔ میرے نانا جی کھڑکی کی طرف بیٹھ گئے اور باہر کے نظاروں میں کھو گئے۔ ٹرین چلتی، رکتی خان پور کے قریب پہنچ گئی۔ کوئی بھی ٹکٹ چیکر بوگی میں نہیں آیا۔ جب منزل قریب آ گئی تو نانا جی کو بغیر ٹکٹ سفر کرنے کا افسوس ہونے لگا۔ ان کے ضمیر نے ملامت شروع کر دی۔ ضمیر کی

www.urdudigest.pk

حلس سے تنگ ہو کر انھوں نے جیب سے کچھ رقم نکالی اور اپنے بھتیجے کی نظر بچا کر سیٹ کے کونے پر رکھ دی۔ کھڑکی کے قریب دیوار پر ہاتھ رکھ کر نانا جی آہستہ سے گاڑی سے نیچے اتر ہوئے، مائی لنڈی!..... ناراض نہ ہونا، ہم نے ٹکٹ نہیں لیے تیرا کرایہ میں نے سیٹ پر رکھ دیا ہے۔

ٹرین رک چکی تو وہ دونوں عجلت میں نیچے اترے۔ نانا جی مطمئن تھے کہ انھوں نے مائی لنڈی کو کرایہ دے دیا ہے۔ انھوں دونوں کے پاس نہیں تھے۔ مین گیٹ سے وہ باہر نہیں جا سکتے تھے۔ چچا جی نے کافی دور جا کر ایک جگہ جنگلے میں خلا دیکھا۔ دونوں وہاں سے باہر نکلے اور لمبا چکر کاٹ کر مین گیٹ کے سامنے ایک ہوٹل میں جا بیٹھے۔ میرے چچا نے دو پلیٹ دودھ کا آرڈر دیا تا کہ دودھ کے ساتھ روٹی کھائی جا سکے۔ ویسے تو اچار بھی تھا مگر وہ ذائقہ تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ ہوٹل سے اُن کو لنڈی ٹرین اسٹیشن پر کھڑی صاف نظر آ رہی تھی۔ ان کو کھانا کھاتے ہوئے آدھا گھنٹہ لگا۔ اس دوران لنڈی نے اپنا وقت پورا کیا اور روہڑی کی طرف چلی گئی۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو اپنی جگہ سے اٹھے۔ اچانک میرا چچا پریشان ہو گیا۔ نانا جی نے پوچھا کیا بات ہے۔ تب چچا جی بولے۔ جلدی میں میں اپنا کمبل تو ٹرین کی سیٹ سے اٹھانا بھول ہی گیا۔

تب میرے نانا جی بول اٹھے۔ "بھئی ضرور تم نے مائی لنڈی کا کرایہ چکتا نہیں کیا ہوگا۔ اس لیے وہ تجھ سے ناراض تھی۔ تیرا کمبل ساتھ لے گئی۔"

میرے چچا نے اپنے چچا یعنی میرے نانا جی سے کہا "ٹکٹ تو تو نے بھی نہیں لیا تھا وہ تیرے ساتھ تو ناراض نہیں ہوئی۔"

میرے نانا جی نے کہا میں نے ٹکٹ نہیں لیا تھا لیکن ٹکٹ کی رقم مائی لنڈی کی سیٹ پر رکھ کر میں نے اسے کہہ دیا تھا، مائی لنڈی یہ رہا تیرا کرایہ۔ میں نے تو مائی لنڈی کو کرایہ ادا کر دیا تھا۔ تو نے کرایہ نہیں دیا۔ اس لیے ناراض ہو کر وہ تیرا کمبل کرائے کے بدلے میں ساتھ لے گئی۔ نانا جی کی بات سن کر چچا جی لاجواب ہو گئے اور انھوں نے عہد کر لیا کہ آئندہ وہ ناراض مائی لنڈی میں بغیر ٹکٹ سفر نہیں کریں گے۔ خدا جانے وہ اپنے عہد کو کب تک نبھائیں گے۔

23 سال کے بعد بھی وہ ایک دوسرے کو بھول نہ پائی تھیں
یہ افریقہ کی نہیں امریکا کی بات ہے

ہومن ویلڈ کی
دو سہیلیاں

1100 ھیکٹر پہ پھیلی ایک انوکھی جگہ
جہاں سرکس کے سدھائے اور ظلم کے ستائے ہاتھیوں کو
پوری آزادی اور خوشی سے جینے کی آزادی ہے

اینڈی سائمنز/ترا کینہ قاضی

ہاتھیوں

کی اس خلوت گاہ میں داخل ہونے کے لیے ایک لمبے چوڑے بلند و بالا دروازے سے گزرنا پڑتا جو موٹی تاروں کی باڑ میں واقع تھا۔ یہ باڑ اتنی بلند اور اتنے وسیع و عریض رقبے کا احاطہ کیے ہوئے تھی کہ اس میں ڈائنوسار تک پالے جاسکتے تھے۔

خلوت گاہ میں رنگارنگ چھوٹے چھوٹے پرندے اڑتے دکھائی دیتے اور وہاں ایسا غیر معمولی سکوت پھیلا ہوا تھا جو دنیا کے سب سے بڑے جانور کے لیے واقعی سکون بخش تھا۔

خلوت گاہ آگے بڑھنے پر لمبی گھاس، جھاڑیوں، درختوں، اونچے نیچے ناہموار اور تقریباً ناقابلِ عبور راستوں اور پانی کے قطعات کے ساتھ ایک حیران کن اُعجوبے کا منظر پیش کرتی ہے۔ اس میں میٹھی گوند اور شیشم کے جنگل نیچی پہاڑیوں کے سلسلے تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ پھر سوانا گھاس کے میدانوں کے سلسلے شروع ہوجاتے ہیں۔ یہ جگہ بلاشبہ ہاتھیوں کے رہنے کے لیے ایک مثالی جگہ ہے۔ لیکن حیرت انگیز طور پر یہ جگہ میانمار یا افریقہ نہیں بلکہ امریکا کے مقام ہومن ویلڈ، ٹینیسی میں واقع ہے۔

اس خلوت گاہ کی بنیاد ۱۹۹۵ء میں کیرول بکلے اور سکاٹ بلیر نے رکھی۔ دونوں نے سرکسوں اور چڑیاگھروں میں بحیثیت ہاتھیوں کے تربیت کنندگان، ان کے ساتھ بے رحمانہ اور ناروا سلوک ہوتے دیکھا تھا۔ چنانچہ انھیں ہاتھیوں کے لیے ایک ایسا گھر بنانے کا خیال آیا جہاں وہ آرام و سکون سے رہ سکیں۔ اس گھر میں بکلے کے خیال کے مطابق ہاتھیوں کو وہ ۳ر بنیادی سہولتیں مہیا ہوسکتی تھیں جو انھیں سرکسوں یا چڑیاگھروں میں کبھی حاصل نہ ہوتیں..... ماتحتی اور جبر سے آزادی، گھومنے پھرنے کی آزادی اور اپنے ہم نسلوں سے آزادانہ میل جول۔

۱۱۰۰ر ہیکٹر کے رقبے پر پھیلی اس خلوت گاہ میں ۱۹ر کے قریب افریقی اور ایشیائی ہاتھی آزادانہ طور پر یوں گھومتے پھرتے ہیں گویا آبائی جنگلوں میں گھوم پھر رہے ہوں۔ سرکسوں اور چڑیاگھروں میں ہاتھیوں کو باہم ہتھیار، آنکس کے ذریعے ہانکا جاتا ہے۔ لیکن اس خلوت گاہ میں اس ہتھیار کا استعمال قطعاً ممنوع ہے۔ یہاں ہاتھی اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ کسی کے بلانے پر وہ چاہیں آئیں یا نہ آئیں، انھیں کوئی مجبور نہیں کرسکتا۔

جب ایک اخباری نمائندہ اس خلوت گاہ کے دورے پر گیا تو اس نے فوراً یہ بات محسوس کرلی۔ بکلے اور بلیر ہاتھیوں کی طرف لپکے نہ گئے اور نہ ہی انھوں نے انھیں متوجہ کرنے کے لیے کوئی گھاس بھوسہ وغیرہ زمین پر بکھیرا۔ بلکہ اپنے پاس آنے نہ آنے کا فیصلہ انھی پر چھوڑ دیا۔ خوش قسمتی سے شرلے اور بنّی نامی دو ہتھنیاں، ان کی طرف آنکلیں۔ انھوں نے دوستانہ انداز میں اپنی سونڈیں ان کی طرف لہرائیں اور ہلکی سی چنگھاڑیں بھی منہ سے نکالیں۔

بکلے کا کہنا ہے کہ ہاتھی آپس میں بے حد محبت کرتے اور ایک دوسرے کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ جن ہاتھیوں کے ساتھ وہ کام کرتی ہے، وہ چڑیاگھروں اور سرکسوں میں بدسلوکی، بے رحم اور احساسِ محرومی و تنہائی کا کرب بھگت چکے ہیں۔ اس لیے ان میں باہمی محبت، ہمدردی و یگانگت کے جذبات اپنے عروج پر پہنچے ہوئے ہیں۔ وہ ایسے کئی واقعات کی عینی شاہد ہے جن میں ہاتھیوں نے ایک دوسرے کے لیے بے پناہ ہمدردی، محبت اور جذبۂ ایثار و قربانی کا بے مثال مظاہرہ کیا تھا۔ ایسے ہی واقعات میں سے ایک واقعہ درج ذیل ہے۔

جینی نامی ایک ہتھنی کو ۲۳ر گھنٹے سرکس میں کام کرنے کے بعد ٹرک میں بند کرکے ایک سے دوسرے شہر سفر کرنا پڑتا تھا۔ پھر ٹانگ میں زخم کے سبب اسے کتوں اور بلیوں کے لیے مخصوص ایک علاج گاہ بھیج دیا گیا۔ وہاں ایک ہاتھی کی دیکھ بھال اور علاج معالجہ کے لیے کوئی خاطر خواہ انتظامات نہیں تھے۔ چنانچہ اس کی حالت بگڑنے لگی۔ انجمن تحفظ حیوانات والوں کو اس امر کا علم ہوا تو انھوں نے بکلے سے رابطہ کیا۔ وہ پھر جینی کو ہومن ویلڈ لے آئی۔

آزادی ایک حیرت انگیز چیز ہے اور جینی اس کا تجربہ کرنے کی مشتاق تھی۔ زخم کے سبب اسے پورا دن ایک ہاتھی میں تنہا رکھا گیا۔ پھر اسے ہاتھیوں کے ریوڑ میں بھیج دیا گیا۔ وہیں اس کی اپنی ماضی کی ایک عزیز سہیلی سے ملاقات ہوئی۔

جینی بچھیا تھی جب اسے ایک سرکس میں کام کرنے کے لیے لایا گیا۔ شرلے بھی وہاں کام کرتی تھی۔ ان میں جلد گہرے دوستانہ روابط استوار ہوگئے۔ وہ ہر جگہ اکٹھی دکھائی دیتیں اور ایک دوسرے کی دوستی کا دم بھرتی دکھائی دینے لگیں۔ پھر چند ماہ بعد جینی ایک دوسرے سرکس بھجوا دی گئی۔ اب ۲۳ر سال گزرنے کے بعد جینی کی شرلے سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے فوراً پہچان گئی۔ شرلے بھی اپنی عزیز سہیلی کو نہ بھولی تھی۔ اس ملاقات پر دونوں سہیلیوں نے خوب پُرمسرت چنگھاڑیں بلند کیں۔ سونڈوں میں سونڈ ڈال کر رقص کیا اور اچھل پھاند کی۔ دیکھنے والے ہاتھیوں کی زبردست یادداشت پر انگشت بدنداں رہ گئے۔ ۲۳ر سال کی مدت کوئی کم نہیں ہوتی لیکن ان سہیلیوں نے پھر بھی ایک دوسرے کو فوراً پہچان لیا۔

اب دونوں سہیلیاں ہر جگہ اکٹھی دکھائی دینے لگیں۔ پھر چند سال گزرنے کے بعد رفاقت ختم ہونے کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ دراصل جینی ٹانگ کے پرانے زخم کے سبب بیمار رہنے لگی۔ باوجود علاج معالجے اور دیکھ بھال کے اس کی حالت روز بہ روز بگڑنے لگی۔ ایک دن وہ ایک ہری بھری وادی میں جاکر گھنے درخت تلے لیٹ گئی۔ شرلے نے بھی قریب ہی ٹھکانا بنا لیا اور اسے بہلانے، تسلیاں دینے اور اس کی ہمت بندھانے لگی۔ جلد ہی شیرا اور بنّی نامی دو ہتھنیاں اور وہاں آن پہنچیں۔ اب تینوں نے مل کر جینی کو خوش رکھنے کے لیے گانا بجانا شروع کردیا۔ اپنے پاؤں زمین پر مارتے ہوئے ہم آہنگ چنگھاڑوں سے گائے جانے والے گیتوں کی نغمگی سے خلوت کی فضا معمور رہنے لگی۔ بکلے نے اپنی زندگی میں کبھی جانوروں کو اپنے ہم جنس کی زندگی بچانے کے لیے یوں محفلِ موسیقی برپا کرتے نہ دیکھا تھا۔

یہ محفلِ راگ و موسیقی کئی دنوں تک جاری رہی۔ لیکن پھر شرلے محسوس کرنے لگی کہ ان کی جدائی کا وقت قریب آرہا تھا۔ جینی اب ہرگز جانبر نہ ہوسکتی تھی۔ انتہائی مایوسی اور دل گرفتگی کے عالم میں وہ ایک قریبی پہاڑی کی طرف چلی تاکہ اپنا دکھ تنہا جھیل سکے۔ اس کی عدم موجودگی میں شیرا اور بنّی جینی کے پاس رہ کر اس کی خبرگیری کرتے، بہلاتے اور خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک شام ۳۶ر سال کی عمر میں جینی موت کی وادی میں اُتر گئی۔

جینی کی موت نے شرلے پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ کندھے جھک گئے۔ آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی رہنے لگیں۔ چلتے ہوئے سونڈ زمین پر گھسٹنے لگی۔ وہ اب بالکل خاموش رہنے لگی تھی۔ اس نے چنگھاڑنا اور اپنی ساتھیوں سے باتیں کرنا بھی چھوڑ دیا۔ یہ حالت دیکھ کر بنّی اسے اپنے ساتھ ایک پہاڑی پر لے گئی۔ چند دن گزارنے کے بعد دونوں وہاں سے اپنے باڑے میں واپس آگئیں۔ وہاں اس وقت ایک نئی زندہ دل اور خوش باش ہتھنی آچکی تھی۔

اس نئی ہتھنی کا نام مسٹی تھا۔ وہ ہر دم خوش رہتی اور اپنی شگفتہ مزاجی سے دوسرے جانوروں کو بھی خوش رکھتی۔ اسے گانے بجانے اور اچھل کود کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس کی صحبت نے شرلے پر بڑا خوشگوار اثر مرتب کیا۔ وہ اپنا غم بھولتی گئی اور زندگی، زندہ دلی کی طرف لوٹ گئی۔ وہ اس خلوت گاہ کے ہاتھیوں سے عمر اور قد و قامت دونوں میں زیادہ تھی۔ مگر اب وہ بھی ان کے ساتھ مل کر مسرور چنگھاڑیں بلند کرنے، گانے بجانے اور اچھل کود کرنے لگی۔

آپ اگر سرکس میں ہاتھیوں کو مختلف قسم کے کرتب کرتے دیکھیں تو کیا آپ کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اللہ! یہ کوہ قامت مخلوق اپنے اندر ایسا حساس دل رکھتی ہے؟ کیا یہ ایسی ذہین و فہیم اور جذبات سے بھرپور ہوسکتی ہے جو بخوبی سمجھتی ہے کہ خاندانی اکائی ہی سب کچھ ہے؟ خوش قسمتی سے ان کے لیے ٹینیسی میں ایسی ایک جگہ موجود ہے جو دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آتی۔ ■

منزہ اکرم

مدوجزر

تازہ افسانہ

ایک نواسی کے دل پر بیتے لمحات کی کہانی، اسے اپنی نانی کی بیماری نے ایک عجیب سوچ سے ہمکنار کر دیا تھا

جب میں بہت چھوٹی تھی، یہی کوئی برس ڈیڑھ برس کی تو بہت بیمار ہوگئی۔ اتنی بیمار کہ مجھے ہسپتال میں داخل کرانا پڑا اور میرے زندہ بچنے کی کوئی امید نہ رہی۔ میرے بابا اور میری امی بہت پریشان ہوئے۔ بابا نے سہارے اور تسلی کی خاطر میرے نانا جان اور نانی جان کو بھی امی کے پاس بلوا لیا۔ صورتِ حال دیکھ کر وہ دونوں بھی بہت گھبرا گئے۔ میری امی مضبوط سائبان کی طرح مجھے سنبھالے ہوئے تھیں مگر جب انھیں خود سہارا ملا تو کمزور پڑ گئیں۔ انھوں نے ساری پریشانی نانی جان کے کندھے پر سر رکھ کر آنکھوں سے آنسوؤں کے ذریعے بہا دی۔

وہ روتے روتے تھوڑے وقفے سے ایک ہی نامکمل

www.urdudigest.pk

جملہ بولتیں: ”اماں میری بچی.....“ پھر روتے روتے کہتیں ”اماں! میری ایک ہی بیٹی ہے.....“ میرے ننھے سے دل میں لگی ڈرپ انھیں اپنے دل میں پیوست خنجر کی طرح چبھ رہی تھی۔ وینٹی لیٹر دیکھ دیکھ کر دم گھٹنے لگتا۔ جب وہ روتیں تو میری نانی جان کی تڑپ انھیں دیکھ کر دو آتشہ ہو جاتی۔ ایک بار امی کو گلے لگا کر ان کے منہ سے نکل گیا ”بچی تو بچ جائے گی، پر اس نے رو رو کے مر جانا ہے“

میری امی بھی تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہیں۔ نانا جان بھی بہت فکر مند تھے مگر مرد تھے، اس لیے حوصلے کا مظاہرہ کرتے رہے۔ جب انھوں نے بیوی اور بیٹی کو یوں بلکتے دیکھا تو نانی جان سے ناراض ہو کر کہنے لگے ”تم اپنی بیٹی کے لیے رو اور وہ اپنی بیٹی کے لیے! رب سے دعا نہ کرنا کہ بچی ٹھیک ہو جائے۔“ نانا جان کی عادت تھی کہ جب وہ زیادہ پریشان ہوتے، تو نانی جان سے الجھنے لگتے۔ خاندان بھر میں جس کو بھی پتا چلا، وہ میری عیادت کرنے آیا۔ آخر سب کی دعائیں رنگ لائیں۔ تین دن کے بعد میری حالت سنبھل گئی اور میں رفتہ رفتہ زندگی کی طرف لوٹنے لگی۔

جب میں ہسپتال سے فارغ ہوئی تو نانی جان نے شکرانے کے طور پر دیگیں پکوا کر غرباء میں تقسیم کیں۔ میرے لیے ڈھیروں کپڑے اور کھلونے خریدے گئے جن میں ایک واکر بھی تھا۔ میں نے پھر اسی واکر میں چلنا سیکھا۔

امی نے وہ واکر طویل عرصہ تک سنبھال کر رکھا۔ قومی تاریخ میں کوئی واقعہ اتنا اہم ہوتا ہے کہ اپنے سے پہلے اور بعد میں وقوع پذیر واقعات کے لیے معیار بن جاتا ہے، بالکل اسی طرح میرا ہسپتال میں داخل ہونا خاندانی تاریخ کا انوکھا واقعہ بن گیا۔

پھر پتا ہی نہ چلا کہ بیس بائیس برس کیسے اُڑن چھو ہوئے اور میں بڑی ہوگئی۔ میری نانی جان پر ضعف طاری ہوا۔ نانا جان کے ہاتھ میں دستے والی چھڑی آ گئی۔ امی فربہ ہوگئیں اور بابا کے چہرے کی داڑھی کھچڑی سی ہونے لگی جس سے وہ واقعی پروفیسر لگنے لگے۔ میں نے اس عرصے میں سب سے بہت لاڈ پایا اور ناز اٹھوائے۔ نانا اور نانی جان کے آس پاس کسی بھونرے کی طرح منڈلاتی اور ان کے تجربات سے اپنی زندگی سنوارنے کی خاطر رس چوستی۔ مگر وہ دن جو میں نے ہسپتال میں گزارے تھے، کسی کو نہیں بھولے۔ جب بھی چار لوگ اکٹھے ہوتے، ان دنوں کا تذکرہ ضرور ہوتا۔ جو بھی مجھے دیکھتا، ہنس کر ضرور کہتا ”اے اوہی کڑی اے جیہڑی مر کے بچی سی“ (یہ وہی بچی ہے جو مرتے مرتے بچی) ہنسوڑ طبیعت کے مالک میرے نانا، نانی کو ان دنوں کی یاد دلا کر چڑاتے اور ہنسا کرتے۔ میں بھی مسکرا دیتی اور سوچتی کہ مشکل وقت نقصان پہنچائے بغیر ٹل جائے تو وہ بھی کتنا رنگین ہو جاتا ہے۔

زندگی کی گاڑی خوشیوں بھرے راستے پر گامزن تھی۔ ایک دن ہم ابھی سو رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میرے بابا نے فون سنا تو دوسری طرف ماموں تھے۔ انھوں نے بتایا کہ نانی جان پر فالج کا شدید حملہ ہوا ہے، یہ سنتے ہی میری تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ امی تو سنتے ہی رونے لگیں۔ ہمارے بس میں نہیں تھا کہ ہم اڑ کر ان تک پہنچ جاتے۔ دو گھنٹے کا سفر دو صدی پر محیط لگا۔ جب ہسپتال پہنچے تو وہ انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں وینٹی لیٹر پر تھیں۔ ان کے پاس جانے کی اجازت بھی نہ تھی۔ امی تو سارے سفر میں روتی آئی تھیں۔ جب انھوں نے ماں پر نظر ڈالی تو چکرا کر گریں اور بے ہوش ہوگئیں۔ میری تو چیخیں ہی نکل گئیں۔ پھر انھیں ہوش میں لانے کی تدابیر ہوئیں۔ جب حواس بحال ہوئے تو میں امی کے ساتھ لپٹ کر رونے لگی۔ انھیں دلاسا دیتے دیتے بابا کی طرف دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا:

”نانی جان تو ٹھیک ہو جائیں گی مگر مجھے ڈر ہے،

انھیں نہ کچھ ہو جائے۔'' یہ سننا تھا کہ نانا جان کی تیوری چڑھ گئی اور چھڑی کے دستے پر ان کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ وہ جھلا کر مجھے کہنے لگے۔ ''تو اپنی ماں کے لیے رو اور وہ اپنی ماں کے لیے، رب سے دعا نہ کرنا۔''

امی نے یہ جملہ سنا، تو روتے روتے مسکرا دیں اور نانا جان سے کہنے لگیں: ''ابا! یاد ہے جب زارا ہسپتال میں تھی تو آپ نے اماں سے بھی یہی جملہ کہا تھا۔''

میرے بابا بھی مسکرا دیے اور کہنے لگے، ''یہ خون کی کشش اور فطری محبت ہے، یہ جتنی شدت سے ایک کو کھینچے، تو اتنی ہی شدت سے دوسری طرف بھی کھینچتی ہے۔''

یہ سن کر میں نے کہا، ''ابا! یہ چاند اور سورج کے ایک ہی سمت میں ہونے کی طرح ہے جو مل کر سمندر کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ یہ محبت کا مدو جزر ہے..... وہ دو ماؤں کا رویہ تھا، یہ دو بیٹیوں کا ہے۔'' پھر ہم سب نے نانی جان کی صحت یابی کی دعا کے لیے جائے نماز سنبھال لیے اور تب ہی اٹھے جب ان کے مفلوج ہاتھ میں جنبش ہوئی۔ انھوں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو سب کی جان میں جان آئی۔ نانا جان نے دیگیں پکوا کر غربا میں تقسیم کیں اور کپڑے بھی دیے۔

ڈاکٹروں نے کچھ ادویہ تجویز کیں۔ چند دن مسلسل فزیوتھراپی کے بعد جب نانی قدم قدم چلنے لگیں تو انھیں ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ معالج نے مشورہ دیا کہ انھیں ضرور واکر سے صبح شام چہل قدمی کرائیں تا کہ حرکت میں رہنے سے معذوری نہ ہو۔ ایک دن نانی اماں کو واکر پکڑاتے اور سہارا دیتے مجھے لگا جیسے وقت کا دائرہ گھوم رہا ہو۔ میں پھر دونوں واقعات کا موازنہ کرنے لگی..... ان کے بڑھاپے اور میرے بچپن میں بہت مماثلت تھی۔ میں نے واکر سے چلنا سیکھا تھا، اور وہ بھرپور اور باوقار زندگی بسر کرنے کے بعد اب واکر کے سہارے چل رہی تھیں۔ یہی مثال مجھے مدوجزر کا فلسفہ بھی بخوبی سمجھا گئی۔ ■

www.urdudigest.pk

ایڈمرل مظفر حسن کا حیران کن کردار

سابق صدر یحییٰ خان کے دور کے ایڈمرل مظفر حسن پاکستان کے غالباً وہ پہلے اور آخری بحری سربراہ تھے جو نہ صرف پنج وقتہ نمازی تھے بلکہ شراب سے مکمل اجتناب بھی کیا کرتے تھے۔ ایک نجی محفل میں، جس میں ان کے ساتھ راقم بھی موجود تھا، انہوں نے یہ ایمان افروز واقعہ سنا کر ہمیں حیران کر دیا کہ حکومت ترکیہ کی دعوت پر وہ ایک بار اپنا وفد لے کر ترکی گئے تھے جہاں ترک بحریہ کے سربراہ نے ان کا استقبال کیا اور وفد کے اعزاز میں ایک پُر تکلف عشائیہ دیا۔ روایتی طور پر محفل میں مختلف قسم کی اعلیٰ شرابیں بھی پیش کی گئی تھیں کیونکہ اعلیٰ سرکاری دعوتوں کا وہ ایک لازمی جزو ہوا کرتی ہیں۔ ایڈمرل صاحب نے بتایا کہ قدرتی طور پر مجھے شراب سے کراہت رہتی تھی اس لئے میں نے اس سے اجتناب کیا۔ لیکن میرے اس طرزِ عمل نے تو وہاں گویا سب کو بے چین کر دیا کیونکہ اس سے پہلے انہوں نے کبھی ایسا ماجرا نہیں دیکھا تھا۔ تشویش کے طور پر ترکیہ کے بحری سربراہ خود میرے قریب آئے اور ذاتی طور پر مجھے مے نوشی کی دعوت دی۔ تاہم میں اس سے بھی معذرت ہی کرتا رہا۔ چنانچہ پیہم انکار پر اس نے مجھے اپنی نوجوان بیٹی کو میرے پاس بھیجا تا کہ اپنے عشووں سے وہ مجھے شراب کی جانب مائل کرے۔ ایڈمرل مظفر حسن مرحوم کہتے ہیں ''الحمدللہ ان ساری ترغیبات کے باوجود میرے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہیں آئی اور میں اس سرکاری عشائیہ سے جیسا خشک گیا تھا ویسا ہی خشک لوٹ آیا۔'' ایڈمرل مظفر جیسے لوگ حقیقتاً پاکستان کا قابل فخر اثاثہ تھے۔

رضی الدین سید۔ کراچی

رازِ ہستی

104 سالہ بزرگ کے بارے چھپی اس خبر کا قصہ جس نے ایک دل کو بے چین کر دیا تھا

اعجاز احمد ڈنگہ

''۱۰۴ سالہ بابا دانت اور نظر سلامت'' اخبار کے آخری صفحے پر مختصر مگر دلچسپ خبر چھپی تھی۔ میں نے تفصیل پڑھی تو پتا چلا کہ فیصل آباد کے ایک نواحی چک میں بابا نور دین نامی بزرگ شخص رہتا ہے جس کی عمر ۱۰۴ سال ہے۔ اس عمر میں بھی بابا جی صحت مند اور تندرست و توانا ہیں۔ دانت ٹھیک ہیں اور نظر بھی ٹھیک ہے۔ اس عمر میں بھی زمینداری کے سارے کام بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ اس قسم کی خبروں سے مجھے خصوصی دلچسپی ہے۔ پیشے کے لحاظ سے میں فارماسسٹ ہوں اور ساتھ ہی ایک قومی روزنامہ سے بطور نامہ نگار منسلک

www.urdudigest.pk

ہوں۔ اپنے فارمیسی کے علم کی بدولت میں ادھر ادھر سے طب وصحت کے متعلق خبریں اکٹھی کرتا اور اپنے اخبار کو بھیجتا ہوں جہاں وہ بڑے اہتمام سے چھپتی ہیں۔ خبروں کی دنیا میں یہ میری انفرادیت ہے اور یہ ڈیوٹی ادا کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے۔

خبر کی تلاش اور بابا جی سے ملاقات کے لیے میں نے اپنی کاروباری مصروفیت سے وقت نکالا اور صبح ۸ر بجے ڈرائیور کی معیت میں بابا جی کے چک کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہمارے شہر سے فیصل آباد ۴ر گھنٹوں میں پہنچا جا سکتا ہے۔ بابا جی کا چک ڈھونڈتے مزید آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ ساڑھے ۱۲ر بجے ہم چک پہنچ گئے۔ بابا نور دین کے گھر کا پوچھتے پوچھتے ہم بابا جی کے مکان تک پہنچے۔ وہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا مکان تھا۔ ہم نے مکان کے بیرونی دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے ایک نوجوان باہر نکلا۔ اس نے ہم سے ہاتھ ملایا اور بڑی شائستگی سے ہم سے ہماری آمد کا مقصد پوچھا۔ ہم نے بتایا کہ ہم بابا نور دین سے ملنے آئے ہیں۔ ہماری بات سن کر نوجوان مسکرانے لگا۔ اس نے گھر کا بڑا گیٹ کھولا ہماری گاڑی کو صحن میں کھڑا کیا اور ہمیں لے جا کر بیٹھک میں بٹھا دیا۔ نوجوان جلدی جلدی شربت اور چائے بنا لایا۔ ہم نے بابا جی کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ بابا جی کا بھتیجا ہے۔ بابا جی کے پاس مہمان آیا ہوا ہے۔ بابا جی کے ۲ر بیٹے ہیں۔ وہ قریبی شہروں میں ملازمت کرتے اور وہیں رہائش رکھتے ہیں۔ بابا جی اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ انھوں نے مزارعین رکھے ہوئے ہیں لیکن نگرانی خود کرتے ہیں اور اس وقت بھی وہ اپنے کھیتوں پر ہیں۔ ہم نے نوجوان سے پوچھا کہ کیا بابا جی واقعی ۱۰۴ر سال کے ہیں اور ان کی طویل العمری کا راز کیا ہے؟ نوجوان نے تصدیق کی کہ بابا جی واقعی سو سال سے زائد عمر کے ہیں لیکن ان کی طویل العمری کا راز وہ نہیں جانتا، یہ صرف بابا جی ہی بتا سکتے ہیں۔ نوجوان نے بتایا کہ اخبار میں خبر چھپنے کے بعد کئی لوگ ان سے ملاقات کے لیے آ چکے ہیں۔

ہم چائے پانی پینے کے بعد نوجوان کے ہمراہ بابا جی کے کھیتوں کی طرف روانہ ہوئے۔ کھیتوں میں گاڑی نہیں جا سکتی تھی۔ ہم گاڑی گھر میں ہی چھوڑ کر پیدل ہی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے بابا جی کی طرف گئے۔ گرمی کا موسم تھا اور دوپہر کا وقت تھا۔ ہمیں بابا جی کے پاس پہنچتے پہنچتے پسینے نے بھگو دیا۔ میں سوچنے لگا ہم جوانی میں یہ ایک میل کی مسافت طے نہیں کر سکتے بابا جی سو سال کے ہو کر ان پگڈنڈیوں پر کیسے گھوم پھر لیتے ہیں؟

میں گھر سے چلا تو سوچ رہا تھا اور اب تک سوچے چلا جا رہا تھا کہ بابا جی نے زندگی کا اتنا طویل سفر کیسے طے کر لیا؟ میں اپنے مطالعہ کی بنا پر جانتا تھا کہ امیر صنعتی ممالک میں جہاں لوگوں کی آمدن بہت زیادہ ہے، لوگ تعلیم یافتہ، صحت کے اصولوں سے واقف ہیں۔ متوازن غذا کھانے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ انھیں صاف پانی، خالص غذا اور ورزش کے لیے خوبصورت پارک اور بہترین ساز و سامان سے آراستہ جم میسر ہیں یوں وہاں کے لوگوں کی زندگی کا دورانیہ تو کافی بڑھ گیا ہے۔ وہاں کے لوگوں کی اوسط عمر ۸۰ر سال کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ امریکا کی ۴۰ر کروڑ کی آبادی میں سے ۶ر ہزار لوگ ایک صدی سے زائد دنیا دیکھ چکے ہیں۔ جاپان میں ہزاروں طویل عمر لوگ موجود ہیں۔ خود پاکستان میں وادی ہنزہ کے لوگ جہاں صاف ہوا، صاف پانی اور خالص غذا میسر ہے، طویل عمر پاتے ہیں۔ لیکن پنجاب کے دیہی ماحول میں جہاں یہ سب سہولتیں مہیا نہیں، وہاں کسی شخص کا سو برس زندگی پانا اور پھر صحت مند ہونا واقعی معجزہ ہے۔

www.urdudigest.pk

ہم بابا جی کے پاس پہنچے تو ظہر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ بابا جی اپنے ڈیرے پر بنی ہوئی چھوٹی سی مسجد میں نماز کی امامت کر رہے تھے۔ اُن کے پیچھے ان کے چند مزارعین اور اردگرد کے کھیتوں کے مالک زمیندار نماز پڑھ رہے تھے۔ ہم برگد کے درخت کے نیچے بچھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھ کر بابا جی کے نماز سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ میں نے اردگرد نظر دوڑائی، ہر طرف ہریالی تھی۔ چاروں طرف سرسبز فصلیں اور بلند قامت درخت تھے۔ ۳ر کمروں پر مشتمل ڈیرہ تھا۔ ڈیرے کے صحن اور اردگرد درختوں کے نیچے بیسیوں جانور بندھے تھے۔ ڈیرہ پر اگرچہ بجلی کی سہولت موجود تھی لیکن بابا جی تازہ ہوا میں برگد کے نیچے بیٹھ کر یا لیٹ کر نگرانی کے فرائض انجام دیتے تھے۔

نماز سے فارغ ہوتے ہی بابا جی ہمارے پاس آئے۔ ہم نے اُٹھ کر بابا جی کو سلام کیا۔ سارے نمازی بھی ہم سے آ کر ملے۔ انھیں پتا چل گیا کہ ہم مہمان ہیں، بابا جی سے ملنے آئے ہیں۔ انھوں نے اخلاقاً ہم سے ملنا اور خیریت دریافت کرنا ضروری سمجھا۔ بابا جی چارپائی پر بیٹھ گئے تو ہم ان کے سامنے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ بابا جی نے ہم سے شفقت سے پوچھا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ ہم نے بتایا کہ ہم گجرات کے قصبہ ڈنگہ سے ان کی طویل العمری کا راز دریافت کرنے آئے ہیں۔

ہماری بات سن کر بابا جی مسکرانے لگے۔ انھوں نے ایک مزارع کو ہمارے لیے دودھ لانے کو کہا۔ ہم نے بابا جی کو بتایا کہ ہم اُن کے گھر سے شربت اور چائے پی کر آئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ تو اُن کے گھر والوں نے ہماری مہمان نوازی کی تھی، اب ان کا فرض ہے کہ اپنے پاس آئے مہمانوں کی خاطر مدارت کریں۔ دودھ آ گیا۔ گرم، گرم چائی کا دودھ، ہم نے بڑی مشکل سے دودھ کا گلاس پیا۔ اس دوران ہلکی پھلکی گفتگو جاری رہی جب بابا جی نے محسوس کیا کہ میں نے اور میرے ڈرائیور نے دودھ کا گلاس ختم کر لیا ہے تو وہ مجھ سے مخاطب ہوئے کہ میں اپنے آنے کا مقصد بیان کروں۔

میں نے کہا کہ بابا جی ہم تو آپ کی طویل العمری کا راز دریافت کرنے آئے ہیں۔ آپ کیا کھاتے ہیں کیا پیتے ہیں؟ کن کن چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ آپ نے کیسے اور کہاں زندگی گزاری ہے؟ بابا جی نے پوچھا کہ میں ان سے یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہا ہوں؟ میں نے انھیں بتایا کہ یہ سب کچھ میں اپنے اخبار میں لکھوں گا، لوگ اسے پڑھیں گے۔ ان باتوں پر عمل کریں گے اور فائدہ اٹھائیں گے۔ بابا جی نے اُلٹا مجھ سے سوال کیا کہ میں ان کو اچھا خاصا پڑھا لکھا اخبار نویس لگتا ہوں میرے خیال میں طویل العمری اور اچھی صحت کا راز کیا ہے؟ میں نے بابا جی سے عرض کیا کہ آج کل کے ماہرین طب کا خیال ہے کہ الکوحل اور تمباکو نوشی سے پرہیز، متوازن غذا اور ورزش اور موٹاپے پر کنٹرول اچھی صحت اور طویل العمری کے لیے ضروری ہیں۔ بابا جی نے کہا کہ وہ میری چند باتوں سے متفق ہے اور چند باتیں ایسی ہیں جو میں نے بیان نہیں کیں۔ بابا جی نے کہا کہ میں اگر سب کچھ جاننا چاہتا ہوں تو اس کے لیے کافی وقت درکار ہو گا۔ میں نے کہا کہ بابا جی میں ۲ر سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے سب کچھ دریافت کرنے ہی آیا ہوں۔ اس کے لیے جتنا بھی وقت لگے میں سننے کے لیے تیار ہوں۔ بابا جی میرا جواب سن کر دور خلاؤں میں دیکھنے لگے جیسے وہ سب کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ جیسے اُفق کوئی کتاب ہو اور اس کتاب پر لکھی ہوئی وہ اپنی داستان حیات پڑھ کر ہمیں سنانے والے ہوں۔

''بیٹا ہم مہاجر ہیں۔ ہم مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں سے ہجرت کر کے پاکستان آئے ہیں۔''

www.urdudigest.pk

بابا جی نے اپنی داستانِ حیات شروع کی اور ہم سب بڑے غور سے سننے لگے۔

''ہم اپنے گاؤں کے چھوٹے سے زمیندار اور تقریباً ۲/مربع زمین کے مالک تھے۔ زندگی ہنگامہ آرائی سے پاک اور پُرسکون تھی۔ انگریز کی حکومت تھی اور ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ اس لیے ہم بھی اور دیگر مسلمان بھی بڑی احتیاط، ڈر اور جھجک سے زندگی گزارتے تھے کہ کہیں اقلیت اور کمزور ہونے کی وجہ سے ہم اپنا نقصان نہ کر بیٹھیں۔ تحریکِ پاکستان شروع ہوئی تو بھی ہمارے گاؤں میں کوئی ہلچل نہ مچی، نہ کوئی جلسہ نہ کوئی جلوس نہ کوئی تقریر نہ کوئی ہنگامہ۔ میں اُس وقت ۴۰/برس کا جوان تھا۔ اپنے ۳/بھائیوں میں سے سب سے بڑا، مڈل پاس لیکن دیہی علاقے میں ہونے کی وجہ سے سیاست کی زیادہ اونچ نیچ نہیں سمجھتا تھا۔ صرف اتنا جانتا تھا کہ قائداعظم اور مسلمان ہندوستان کے ۲/حصے کرنا چاہتے ہیں۔ ایک حصہ میں وہ مسلمانوں کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات ہمارے گاؤں کے سب مسلمانوں کو پسند تھی۔ ہم دعائیں مانگتے تھے کہ پاکستان بن جائے لیکن اس کے لیے کوئی عملی جدوجہد ہم نے نہ کی لیکن جب پاکستان بن گیا تو ہندو ہمارے دشمن بن گئے۔ وہ زیادہ تھے ہم کم، وہ طاقتور تھے ہم کمزور۔ ہم نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا۔ ہندوؤں سے ہماری جھڑپیں شروع ہوگئیں اور ایک جھڑپ میں میرے والد زندگی کی بازی ہار گئے۔ میں بڑا بیٹا تھا۔ میں تھوڑی دیر کے لیے پریشان ہوا لیکن پھر میں نے سوچا کہ میں نے اپنی ماں اپنے دو بھائیوں، اپنی بیوی اور اپنے ننھے بچے کو سنبھالنا ہے۔ میں ہمت، جرأت اور اللہ کی مدد سے اپنے خاندان کو مزید جانی نقصان سے دو چار کیے بغیر پاکستان لے آیا۔

ہم نے مہاجر کیمپ میں بڑی تکالیف برداشت کیں لیکن پھر خود کو سمجھایا کہ یہ نئے اسلامی وطن کے حصول کے لیے چھوٹی چھوٹی قربانیاں ہیں لہٰذا پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ کچھ ماہ بعد ہم لاہور منتقل ہوگئے۔ ایک چھوٹا سا مکان ہمیں مل گیا ہم تینوں بھائی محنت مزدوری کرنے لگے اور زندگی کے دن گزارنے لگے۔ میں نے کبھی نہ سوچا کہ ہندوستان میں ہم زمیندار اور چودھری تھے اور پاکستان میں آکر مزدور بن گئے۔ ۲/برس ہم ہندوستان میں چھوڑی ہوئی زمین کے بدلے پاکستان میں زمین حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن ہمیں کامیابی نہ ہوئی۔ ہر جگہ رشوت اور سفارش کا زور تھا اور یہ دونوں چیزیں ہمارے بس سے باہر تھیں۔ ہم اللہ کی مدد کے منتظر رہے اور اللہ نے ہماری سن لی۔ ہمیں فیصل آباد جسے پہلے لائل پور کہا جاتا تھا، کے نواح میں زرعی زمین الاٹ ہوگئی۔ ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اس چک میں چلے آئے۔ ہم ۳/بھائیوں نے محنت مشقت کی، زمین آباد کی اور زندگی آگے بڑھنے لگی۔ ہم نے چھوٹا سا مکان بنا لیا۔ دونوں بھائیوں کی شادی کر دی۔ ہم سب کو اللہ نے اولاد دی۔

میرا بڑا بیٹا ۲۰/برس کا ہوا۔ وہ میٹرک کر کے کھیتی باڑی میں ہمارا ہاتھ بٹانے لگا کہ اسے ایک مہلک مرض نے آن گھیرا۔ اسے ٹی۔ بی ہوگئی اس کے پھیپھڑوں میں پانی بھر گیا۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ اسے پلوری کا مرض لاحق ہوگیا ہے۔ اس مرض کا علاج اُس وقت صرف لاہور یا کراچی میں ممکن تھا۔ یہ علاج مہنگا بھی تھا اور تکلیف دہ بھی۔ ہم نے لائل پور کے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا، سرنج کے ذریعہ پانی بھی نکلوایا، سڑپٹومائی سین کے ٹیکے بھی لگوائے لیکن مرض بڑھتا گیا۔ میرا بیٹا مجھے چھوڑ کر اللہ کے پاس چلا گیا۔ یہ میری زندگی کا بہت بڑا صدمہ تھا لیکن اللہ نے مجھے توفیق دی میں بہت جلد اس صدمہ سے باہر نکل آیا، میں نے پریشان ہونے کے

www.urdudigest.pk

بجائے اپنی توجہ اپنے چھوٹے بیٹوں کی طرف مبذول کر دی۔ میں نے سوچا کہ میں اپنے دونوں بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاؤں گا۔ میری آمدن کم تھی، تعلیم کا خرچہ زیادہ تھا۔ میں نے اپنے حصے کی زمین کا ایک ٹکڑا اپنے ایک بھائی کے ہاتھوں فروخت کر دیا اور وہ رقم اپنے بچوں کی تعلیم پر لگا دی۔ میرے دونوں بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے سرکاری ملازمت میں چلے گئے اور افسر بن گئے۔ ہم تینوں باپ بیٹوں نے محنت اور بچت کر کے اپنی فروخت کی ہوئی زمین سے زیادہ بڑا زمین کا ٹکڑا خرید لیا۔ میں سوچتا ہوں کہ اللہ نے میرا ایک بیٹا عین جوانی میں مجھ سے واپس لے لیا لیکن میرے ۲/بیٹوں کو اچھی تعلیم سے نواز کر بڑا آدمی بنا دیا۔ زندگی اسی اُلٹ پھیر کا نام ہے۔ کبھی دکھ کبھی سکھ، کہیں دھوپ کہیں چھاؤں۔ کچھ عرصہ بعد ایک اور حادثہ ہوا۔

میرے گھر ڈاکہ پڑ گیا۔ ۳/ڈاکو بیرونی دیوار پھلانگ کر داخل ہوئے۔ میرے پاس بندوق تھی، اپنی جان، اولاد اور مال کی حفاظت کرنا فرض ہوتا ہے۔ میں نے ڈاکوؤں پر گولی چلا دی۔ جوابی فائرنگ سے ایک گولی میری ران میں پیوست ہوگئی۔ فائرنگ کی آواز سن کر گاؤں والے بیدار ہو گئے، ڈاکو بھاگ کھڑے ہوئے۔ لوگوں نے تعاقب کر کے انھیں پکڑ لیا۔ ڈاکو قریبی گاؤں کے بیکار نوجوان تھے جو پہلی واردات میں ہی پکڑے گئے۔ پولیس نے خوب پھینٹی لگائی، مقدمہ چلا۔ لواحقین نے معافی مانگی۔ میں نے معاف کر دیا۔ میں ۱۵/دن ہسپتال رہا پھر میں ٹھیک ہوگیا۔ میں نے اس حادثہ کو بھی اپنے ذہن پر سوار نہ ہونے دیا۔ میں نے سوچا کہ یہ تو دنیا ہے، یہاں ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ پریشان ہونے سے کیا حاصل، یہ میری زندگی کے چند بڑے حادثات ہیں۔ چھوٹی چھوٹی پریشانیوں میں تو انسان ہر وقت گھرا رہتا ہے۔ کبھی کوئی بھائی ناراض ہو جاتا ہے کبھی کوئی دوست۔ کبھی فصل تباہ ہو جاتی ہے، کبھی کوئی بیمار ہو جاتا ہے۔ ذاتی پریشانیوں کے علاوہ قومی اور دینی پریشانیاں ہوتی ہیں۔ پاکستان دولخت ہوا تو مجھے صدمہ ہوا۔ میں نے سوچا کہ میرا باپ اور دیگر لاکھوں مرد، عورتیں اور بچے اس لیے اپنی جان پر کھیلے تھے کہ بدبخت سیاستدان ملک کے ۲/ٹکڑے کر دیں؟ زلزلہ آیا تو میں پریشان ہوا۔

حالیہ سیلاب نے مجھے پریشان کیا۔ ملک میں غربت، بے روزگاری، بدامنی، کرپشن مجھے پریشان کرتی ہے لیکن میں ہر پریشانی ذہن سے جھٹک دیتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ مجھے محض پریشان ہونا چاہیے یا ملک وقوم کے لیے کچھ کرنا چاہیے؟ میں اپنے ملنے جلنے والوں کو اپنے مزارعوں اور اپنے بیٹوں کو اپنے پوتے پوتیوں کو بتاتا ہوں کہ ہمارا ملک کیسے مضبوط اور طاقتور ہوسکتا ہے۔ میں انھیں بتاتا ہوں کہ ہمارے ملک میں سب کچھ موجود ہے صرف اچھے لیڈروں کی کمی ہے۔ پڑھے، لکھے، ایماندار افراد کو ووٹ دو اور نتیجہ اللہ کے سپرد کر دو۔ اللہ بہتر ہی کرے گا۔''

بابا جی مسلسل بولے چلے جا رہے تھے اور ہم خاموشی سے اُن کا چہرہ دیکھ رہے تھے جس پر سچائی کا نور پھیلا ہوا تھا۔ ان کی باتیں سن رہے تھے جو ہمارے دل و دماغ کو مسخر کیے جا رہی تھیں۔ بابا جی ایک لمحہ کے لیے رُکے تو میں نے پوچھا۔ ''بابا جی آپ نے پریشانیوں سے بچنا کیسے اور کہاں سے سیکھا؟''

''اپنے مذہب'' اپنے اللہ اور اپنے رسول ﷺ سے۔ بیٹا! اپنے اردگرد نظر دوڑاؤ، سوچو ہم کیا ہیں؟ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ ہمیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟ ہم نے کہاں جانا ہے؟ یہ دنیا کیا ہے؟ یہ زندگی کی ہے؟ کیا ہم نے ہمیشہ یہیں رہنا ہے؟ کیا موت کے بعد زندگی ختم ہو جاتی ہے یا نئی اور اصل زندگی شروع ہوتی ہے؟'' بابا جی نے جواب دیا۔

''بابا جی! آپ کو کس بات، کس واقعہ نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟ آپ نے پریشان نہ ہونا کس سے سیکھا'' میں نے سوال کیا۔

''میرے بیٹے، رسول ﷺ، اللہ کے سب سے زیادہ برگزیدہ بندے ہیں۔ جب ان کی زندگیاں دکھوں اور پریشانیوں سے بھرپور ہیں تو پھر ہماری کیا اوقات ہے، ہم پریشانیوں سے کیسے بچ سکتے ہیں؟

''نبی پاک ﷺ کا ایک ہی بیٹا تھا۔ بچپن میں فوت ہو گیا۔ آپؐ کی پیاری بیٹی کو ہجرت کے وقت کافر نے تیر مار کر شہید کر دیا، انھیں ۳؍برس ایک گھاٹی میں محصور رہنا پڑا۔ اپنا پیارا شہر چھوڑنا پڑا۔ ساری عمر حالتِ جنگ میں بسر کرنا پڑی۔ اکثر فاقہ کرنا پڑا، بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھنے پڑے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے ساتھ کیا ہوا؟ لوگوں نے تو اپنے خیال میں انھیں پھانسی پر چڑھا دیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو قتل کا الزام سر پر لیے وطن چھوڑنا پڑا۔ حضرت نوح علیہ السّلام کو اپنے بیٹے کے کافر ہونے اور ڈوبنے کا صدمہ سہنا پڑا۔ ہمارے جدِ امجد حضرت آدم علیہ السّلام کو جنت یعنی ابدی سکون کی جگہ چھوڑ کر پریشانیوں سے بھری اس دنیا میں آنا پڑا۔''

''میرے عزیز! ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ یہ دنیا دکھوں کا گھر ہے۔ ہمیں دکھ سہہ کر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں مقابلہ کرنا چاہیے، ہمیں اس نسخہ پر عمل کرنا چاہیے جو ہمیں ہمارے رب، ہمارے خالق نے بتایا تھا۔''

''بابا جی وہ نسخہ کیا ہے؟'' میں نے بابا جی کو ٹوکا۔

''صبر اور صلوٰۃ'' بابا جی نے جواب دیا۔

''ہمارے خالق نے بتایا کہ اگر ہم صبر اور صلوٰۃ سے کام لیں تو زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ پریشانیاں ہمارا پیچھا چھوڑ جاتی ہیں۔ ذہن پُرسکون ہو جاتا ہے۔ ذہن پُر سکون ہو گا تو جسم بیماریوں سے محفوظ رہے گا۔ جسم تندرست ہو گا تو زندگی لمبی ہو گا۔ ہم غریب ملک کے غریب لوگ ہیں، ہمیں تو متوازن غذا کے معنی بھی نہیں آتے۔ ہم مچھلی اور پھلوں کے روزانہ استعمال کے لیے رقم کہاں سے لائیں؟ الکوحل ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ میں تمباکو بھی حرام سمجھتا ہوں۔ تمباکو ایک ایسا پودا ہے جسے گدھے بھی کھانا پسند نہیں کرتے۔ جو لوگ تمباکو کھاتے یا اس کا دھواں نگلتے ہیں، میں انھیں احمق اور ظالم سمجھتا ہوں۔ میرے بیٹے تم اتنی دور سے میری طویل العمری کا راز جاننے آئے ہو، میرا خیال ہے کہ زندگی موت اللہ کے ہاتھ ہے، وہ جسے چاہے طویل زندگی دے اور جسے چاہے مختصر۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اچھی صحت اور لمبی عمر کا تعلق ذہنی سکون سے ہے۔''

بابا جی اپنی داستانِ حیات سنا کر اور اپنا فلسفہ زندگی بیان کر کے خاموش ہو گئے۔ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ ہم نے بابا جی کی امامت میں نماز پڑھی۔ بابا جی سے اجازت لی اور واپسی کا سفر اختیار کیا۔ ■

www.urdudigest.pk

پیالہ

پچھلے دنوں ایک سمعی بصری پروگرام میں ۲۲، ۲۳؍سال کے ایک خوش لباس ٹوٹا شخص کو دیکھا جسے گلوکاری کا دعویٰ بھی تھا۔ وہ پورے یقین سے کیمرے کے آگے اپنا گھونسا لہرا کر کہہ رہا تھا، I am the best، میرا ہم سر کوئی اور نہیں..... مجھے خیال گائیکی کے استاد خاشق علی خاں بے طرح یاد آئے۔ ان کی تعریف ہوتی (اور تعریف بھی کون کر رہا ہوتا۔ رفیق غزنوی جیسا واقفِ حال) تو استاد کی آنکھیں بھیگ جاتیں، کہتے، ''ننگِ اسلاف ہوں۔ بڑوں نے بہت کچھ عطا کرنا چاہا تھا۔ میں ٹوٹا پھوٹا پیالہ بس اتنا ہی سنبھال پایا۔''

(اسد محمد خان کی تحریر سے اقتباس، تعاون: احمد بن محمد)

خوش قسمت

ایک بے زبان بہو کا ماجرا
اسے اچانک زبان مل گئی تھی

ڈاکٹر زاہدہ پروین

جاوید سارا راستہ لب بھینچے، بنا کوئی بات کیے، گاڑی چلاتا رہا۔ اس کے ساتھ بیٹھی تحریم بے آواز روتی اور دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھتی رہی۔ پچھلی نشست پر ۵؍سالہ فہد ڈرا سہما بیٹھا رہا۔ وہ پریشان تھا۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ گھر پہنچتے ہی نانی جی کو پوری بات بتائے گا۔

بات تو معمول کی تھی مگر اس کا غیر معمولی ردعمل سامنے آیا، شاید ان واقعات کی وجہ سے جو گزشتہ چند روز میں پیش آئے۔ تقریباً دو ہفتے قبل جاوید کی والدہ بچپن کی سہیلی کے بیٹے کی شادی میں شرکت کرنے گئیں۔ دلہن کا جہیز دیکھ کر ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اتنا سامان اور سب کچھ اعلیٰ..... وہ بار بار ان اشیا کو دیکھتیں اور پھر اس کا موازنہ اپنی بہو کے سامان سے کرتیں۔ ہر دفعہ ان کا دل تاسف سے بھر جاتا۔

گھر لوٹیں تو ایک دن خاموش رہیں پھر اگلے ہی دن سے اٹھتے بیٹھتے اپنی سہیلی کی بہو کے قصے چھیڑنے لگیں۔ مقصد تحریم کو سنانا تھا۔ وہ بھی ۵؍برس میں ساس کا مزاج سمجھ گئی تھی، سو خاموشی سے سنے جاتی، دل میں بُرا تو لگتا مگر پلٹ کر جواب دینا اس کی عادت نہ تھی۔ مگر اُس دن

www.urdudigest.pk

وہ اپنے کمرے میں آکر خوب روئی جب ساس نے ایک پڑوسن سے اس عزم کا اظہار کیا ''فہد کی شادی تو میں وہاں کروں گی جہاں سے دو ٹرک بھر کر جہیز کے آئیں گے جاوید کی طرح فقیروں میں نہیں بیاہوں گی کہ کوئی ڈھنگ کی شے بھی نہ دے سکیں۔''

رو دھو کر تحریم چُپ تو ہوگئی مگر دل میں جمع ساس کے خلاف شکایتیں مزید بڑھ گئیں۔ ابھی یہ ملال کم نہ ہوا تھا کہ اسے موسمی بخار نے آلیا۔ اس دن جیسے تیسے کر کے ناشتہ بنایا۔ فہد کو اسکول بھیجا اور جاوید کے دفتر جاتے ہی دوا کھا کر سوگئی۔ بعد میں جاوید کی خالہ آئیں اور کافی دیر بہن سے گپ شپ کرتی رہیں۔ اب نجانے اماں نے تحریم کو جگانے کی کوشش کی یا یونہی دروازے سے پلٹ گئیں، جب وہ جاگی تو خالہ جا چکی تھیں اور اس کے خلاف فردِ جرم تیار تھی۔ جیسے ہی جاوید گھر لوٹا، اماں نے روتے دھوتے بتایا ''طویل عرصے بعد میری بہن آئی اور تمھاری بیوی نے اٹھ کر چائے تک بنانے کی زحمت نہ کی۔''

تحریم حیران پریشان ان کی شکل دیکھے گئی۔

''اماں! اسے بخار تھا، اسی لیے چائے نہ بنا سکی۔''

اماں رونا بھول کر تحریم کے پاس آئیں اور اس کا ماتھا چھو کر طنزیہ بولیں ''یہ کون سا بخار ہے جس میں جسم ٹھنڈا ہوتا ہے؟''

زِچ ہو کر جاوید نے تحریم کو کمرے میں جانے کا اشارہ کیا اور اماں کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کرنے لگا۔ کھانا وہ باہر سے لے کر آیا اور تحریم سے اماں کے رویے کی معذرت بھی کی۔ اس نے بارہا اعتراف کیا تھا کہ اماں طبیعت کی سخت ہیں۔ مگر تحریم کا بڑا پن ہے کہ ان کے ساتھ بخوبی گزارا کر رہی ہے۔ تحریم مطمئن تھی کہ جاوید بہت اچھا اور خیال رکھنے والا شوہر ہے۔ گلاب کے ساتھ کانٹے تو ہوتے ہیں، عقلمندی یہی ہے کہ کانٹوں سے بچ کر رہا جائے۔

تیسرا واقعہ تین روز بعد پیش آیا۔ تحریم کی سہیلی نجمہ کا بیاہ کراچی میں ہوا تھا۔ اب اس کے شوہر کا تبادلہ تحریم کے شہر میں ہوگیا۔ فون پر تو رابطہ رہتا ہی تھا، اب ملاقات بھی ممکن ہوگئی۔ سہیلی کے آنے سے تحریم بہت خوش ہوئی اور خوب گپ شپ رہی۔ باتوں باتوں میں اس نے اپنی ساس کے سخت رویے کا ذکر کیا اور حالیہ واقعات سنائے۔ نجمہ نے بات سن کر تحریم کو ہی موردِ الزام ٹھہرایا اور کہا، اس نے ساس کو اتنا موقع دیا ہی کیوں کہ وہ اس پر سختی کریں؟ پھر فخریہ بتایا کہ کیسے شروع دن سے اس نے سب سسرال والوں کو ان کے ''مقام'' پر رکھا ہوا ہے۔ ایک آدھ دفعہ ساس نے کچھ سخت بات کی تو اس نے فوراً اپنے والدین کو بلا لیا۔

تحریم نے رشک سے اسے دیکھا۔ نجمہ پھر کہنے لگی، ''اگر تم اسی طرح اللہ جی کی گائے بن کر رہی تو ایک دن تمھاری ساس تمھیں گھر سے باہر نکال دے گی۔ ان کی ہر بات سننے اور برداشت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اپنے لیے آواز اٹھانا تمھارا حق ہے، آخر تمھاری بھی عزتِ نفس ہے۔''

جب نجمہ رخصت ہوئی تو تحریم دل ہی دل میں اس کی باتوں سے کافی حد تک متفق ہو چکی تھی۔

☆☆☆

فہد کے اسکول میں سرما کی تعطیلات ہوئیں تو تحریم نے جاوید سے کچھ دن اپنے میکے گزارنے کی اجازت چاہی۔ وہ بخوشی راضی ہوگیا۔ اماں کو بتایا تو ان کی بڑبڑاہٹ اور ماتھے کے بل بڑھ گئے۔ تاہم وہ خاموش رہیں۔ تحریم خوشی خوشی جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ پورے گھر کی صفائی کی، کپڑے دھوئے، جاوید کے سُوٹ استری کر کے ہینگر میں لٹکائے، ایک اضافی سالن بنایا اور اپنا بیگ تیار کر لیا تا کہ صبح سویرے نکل پڑیں۔ گھر جانے کی خوشی میں رات نیند بھی ٹھیک سے نہیں آئی۔

نماز فجر پڑھتے ہی ناشتہ بنایا، باورچی خانہ سمیٹا اور فہد کو جگا کر تیار کیا۔ وہ بھی نانی کے پاس جانے کی خوشی

www.urdudigest.pk

میں پھولے نہیں سما رہا تھا جو اس کی دادی کو ایک آنکھ نہ بھایا۔ جاوید سامان کار میں رکھ آیا۔ تحریم چادر اوڑھ کر، پرس اٹھائے جانے کو تیار تھی۔ ساس سے ملنے ان کے کمرے میں گئی تو انھوں نے خشمگیں نظروں سے گھورا اور کہا ''پہلے صفائی کر لو، پھر چلی جانا۔''

تحریم نے حیرت سے ایک نظر اپنے صاف ستھرے نئے سُوٹ پر ڈالی اور پھر فرش پر وہ نادیدہ کوڑا ڈھونڈنے لگی جو اس کی ساس کے خیال میں صفائی کا طالب تھا۔ اپنے اندر امڈتے غصے پر بمشکل قابو پاتے وہ بولی، ''کل اچھی طرح صفائی کی تھی، ابھی ضرورت نہیں۔''

''ضرورت کیوں نہیں؟'' وہ چمک کر بولیں۔

''روزانہ صفائی کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''آپ مجھے پہلے کہہ دیتیں، میں تیار ہونے سے پہلے کام نبٹا دیتی۔''

''ارے واہ! اب یہ بھی میں بتایا کروں کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں؟ تمھیں تو بس میکے جانے کی پڑی رہتی ہے۔ پیچھے گھر جائے بھاڑ میں۔''

وہ اس الزام پر تڑپ گئی۔ پورے چار ماہ بعد وہ میکے جا رہی تھی۔ اس نے جواب دینے کے بجائے فہد کا ہاتھ پکڑا اور باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ تبھی ساس چلائیں ''تم نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا؟''

وہ پلٹ کر بولی ''اور آپ نے نہیں سنا میں نے کیا کہا؟''

لمحہ بھر کو تو وہ حیرت سے چپ رہ گئیں۔ پھر جو تحریم کے لتے لینے شروع کیے تو جاوید کو آکر مداخلت کرنی پڑی۔ تحریم ماتھے پر بل ڈالے ناگواری سے انھیں دیکھتی رہی۔ اماں نے بڑھا چڑھا کر قصہ جاوید کو سنایا تو وہ صلح جویانہ انداز میں اپنی بیوی سے بولا ''جلدی سے صفائی کر دو، پھر چلتے ہیں۔''

ساس نے فاتحانہ انداز سے اسے دیکھا تو وہ چڑ گئی اور بولی ''صاف ستھرا گھر ہے۔ اب مزید صفائی کی ضرورت کہاں ہے؟''

''میں جو کہہ رہا ہوں۔''

''آپ نہیں، آپ کی اماں کہہ رہی ہیں، ان سے برداشت نہیں ہو رہا کہ میں چند دن سکون سے گزارنے میکے چلی جاؤں۔'' وہ درشتی سے بولی۔

''تمیز سے بات کرو۔''

''بس میں ہی تمیز کروں، دوسرے جو مرضی کرتے رہیں۔''

بس پھر اماں اور تحریم کے درمیان جو جھگڑا شروع ہوا، تو بڑھتا ہی گیا۔ پہلے بھی اماں غصہ کرتی تھیں مگر تحریم خاموش رہتی۔ سو وہ آگے نہ بڑھتا۔ مگر آج تو اینٹ کے جواب میں پتھر تیار تھا۔ آخر اماں با آواز بلند روتے اسے کوسنے لگیں تو اب تک خاموش بیٹھے جاوید نے اسے گھُرکا۔ ''بس کرو تحریم، جاؤ جا کر کار میں بیٹھو، جاہل عورت۔''

اس کا لہجہ بڑا تلخ تھا۔ تحریم ٹھٹک گئی، کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا مگر فہد کو لیے باہر نکل آئی۔ جاوید کافی دیر اماں کے پاس بیٹھا ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر وہ اس سے بھی ناراض تھیں۔ ''سب تمھاری شہ کا نتیجہ ہے، ضرورت سے زیادہ سر چڑھایا ہوا ہے بیوی کو۔''

وہ انتہائی خراب موڈ لیے باہر نکلا۔ کار میں بیٹھتے ہوئے ایک کٹیلی نگاہ بیوی پر ڈالی اور خاموشی سے کار چلانے لگا۔ تحریم منتظر ہی رہی کہ وہ اماں کے دیئے گئے زخموں پر پھاہا رکھے گا۔ اپنے تئیں وہ حق بجانب تھی۔ مگر دل مطمئن نہیں تھا، جیسے کوئی بھاری بوجھ دھر دیا ہو اور اس پہ جاوید کا رویہ.....! کہیں کچھ غلط تو نہیں ہوگیا؟ وہ روتی رہی۔ پہلی بار ہوا تھا کہ جاوید نے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی اس کے آنسو نہیں پونچھے۔

فہد سارے رستے سہما رہا۔ اس کا معصوم ذہن از خود نتائج اخذ کر رہا تھا۔ دو گھنٹے سفر کے بعد جب کار نانا جی کے گھر رکی تو سب سے پہلے اُتر کر دوڑ لگانے والا فہد ہی تھا۔ جب تک تحریم اور جاوید نے سامان اتارا اور بشیر صاحب کی ہمراہی میں اندر داخل ہوئے تو فہد اپنی مختصر

مگر جامع رپورٹ نانی جی کو پیش کر چکا تھا:

''نانی جی، صبح دادی نے امی سے لڑائی کی، پھر انھیں ڈانٹا، ابو نے بھی امی کو ڈانٹا اور امی سارا راستہ روتی رہیں۔''

دل میں تفکر مگر چہرے پر مسکراہٹ سجائے وہ بیٹی اور داماد سے ملیں۔ تحریم کی سوجی اور سرخ آنکھیں فہد کی باتوں کی تصدیق کر رہی تھیں۔ مگر انھوں نے کوئی سوال کیا نہ تحریم نے ذکر چھیڑا۔ وہ خوش دلی کے ساتھ بہن بھائیوں سے ملی۔ جاوید کا رویہ بھی معمول کے مطابق تھا۔ دوپہر کو کھانے کے بعد جاوید رخصت ہوا۔ تاہم وہ جاتے ہوئے تحریم سے مل کر نہیں گیا، یہ ناراضی کا اظہار تھا۔ تحریم کا دل رنج سے بھر گیا۔ ''یہ کیا کر دیا میں نے؟''

تنہائی میسر آتے ہی اس نے اپنی والدہ کو پوری بات بتائی، بشمول اپنی بدتمیزی کے! وہ خاموشی سے سنتی رہیں۔ تحریم کو امید تھی کہ وہ اس کی حمایت کریں گی اور بیٹی کا عمل سراہیں گی مگر وہ کچھ نہ بولیں۔ تحریم کو کوفت ہونے لگی۔ سوچا ''یہ نجمہ نے کیا الٹی پٹی پڑھا دی؟ کچھ بھی صحیح نہیں ہو رہا!''

شام کو جب سب چائے پینے اکٹھے ہوئے تو بشیر صاحب نے کسی کا حوالہ دیئے بغیر اسے کہا؟ ''تحریم بیٹا! ایک بار نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک کافر آ کر حضرت ابو بکرؓ کو برا بھلا کہنے لگا۔ وہ خاموش رہے اور نبی ﷺ مسکراتے رہے۔ مگر جب وہ کافر خاموش نہ ہوا تو تنگ آ کر حضرت ابو بکرؓ نے اسے جواب میں کچھ سخت کہہ دیا۔ اس پر نبی ﷺ وہاں سے اٹھ کر چل دیئے۔ آپ کو فکر ہوئی اور استفسار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا، جب تک تم خاموش رہے، ایک فرشتہ تمھاری طرف سے جواب دیتا رہا۔ مگر جب بولے تو فرشتہ چلا گیا اور شیطان آ گیا۔''

بشیر صاحب نے تھوڑا توقف کیا، پھر بولے ''تحریم بیٹا! کیا اچھی بات نہیں کہ ہم بھی جواب دینے کی ذمہ داری فرشتے کے سر پر ہی رہنے دیں؟''

www.urdudigest.pk

جھروکے

کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج برصغیر میں کلکتہ کے بعد طب کی تعلیم دینے والا دوسرا بڑا ادارہ ہے جو ۱۸۶۰ء میں قائم ہوا، اس کا نام لاہور میڈیکل کالج تھا، ادارے کی توسیع میں کنگ ایڈورڈ ہشتم کی کوششوں کا بڑا عمل دخل ہے، حتیٰ کہ ان کی وفات کے بعد بھی کنگ ایڈورڈ میموریل فنڈ قائم کیا گیا، جس سے نیلا گنبد کی موجودہ عمارت تعمیر کی گئی۔ دسمبر میں اسے کنگ ایڈورڈ ہشتم کے نام سے منسوب کیا گیا۔ اس ادارے کا پہلا گریجویٹ جان اینڈ ریو تھا۔ ۱۲ مئی ۲۰۰۵ کو اسے یونیورسٹی کا درجہ مل گیا اور یہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل یونیورسٹی بن گئی۔ غیر منقسم صوبہ پنجاب میں میڈیکل کالج کا منصوبہ ۱۸۵۷ء میں تیار کیا گیا لیکن جنگ آزادی کی وجہ سے اسے ملتوی کرنا پڑا، اس وقت پاک و ہند میں میڈیکل کا ادارہ صرف کلکتہ میں موجود تھا، لہٰذا ۱۸۶۰ء کو کلکتہ کے جنرل ہسپتال کے ڈاکٹر Dr.I.V.Sriver کو دعوت دی گئی کہ وہ لاہور میڈیکل کالج میں پرنسپل کے فرائض سنبھالیں۔ اس ادارے سے فارغ التحصیل ہونے والے ڈاکٹروں کی تعداد ۱۵ ہزار سے زائد ہے۔

''جی بالکل ابو جی۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ دل پر پڑا بوجھ بھی ہٹ گیا۔ اب آگے کی راہ بالکل واضح تھی۔ اس کے اندر ایک سکون اور اطمینان اتر آیا۔ اس کا دل بے اختیار چاہ رہا تھا کہ ابھی ساس کو فون کر کے سوری کر لے۔

''میں بے عقل تھی جو نجمہ کی باتوں میں آ کر یہ امید کر بیٹھی کہ بیٹی کی خاطر ابو، امی، جاوید اور اس کی والدہ سے جھگڑا کریں گے۔'' اس نے بے اختیار اللہ کا شکر ادا کیا کہ اتنے معاملہ فہم والدین سے نوازا جنھوں نے معاملہ بگڑنے سے پہلے ہی سلجھا دیا۔ ''بے شک میں بہت خوش قسمت ہوں۔'' اس نے طمانیت سے سوچا اور محبت سے اپنے والدین کو دیکھا جو فہد کی کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ جاوید قریب ہوتے تو مسکرا بھی دیتے۔■

سچا واقعہ

۳۵۰ کلو وزنی، ۷ رفٹ اونچا ریچھ حملے کے لیے تیار تھا

خونخوار برفانی ریچھ کے سامنے

جب ایک نرم خو، پست قامت عورت کی زندگی داؤ پہ لگ گئی

اس کا جسم کمزور مگر ممتا کا جذبہ بہت طاقتور تھا ایک جان لیوا واقعے نے اسے شہرت کی بلندیوں سے ہمکنار کر دیا

ضمیر احمد

www.urdudigest.pk

"وہ دیکھیے بھیڑیا۔" ۵/ سالہ پلونسی نے اپنی خالہ، ۴۱/ سالہ لیڈیا انجولی کا بازو ہلاتے ہوئے بتایا۔

لیڈیا یہی سمجھی کہ نٹ کھٹ پلونسی مذاق کر رہی ہے۔ وہ اپنی دونوں بھانجیوں اور چھوٹے بیٹے، ۷/ سالہ جیسی کو ساتھ لیے اپنے گھر جا رہی تھی۔ خاصی رات بیت چکی تھی اور انھوں نے ابھی ایک رشتے دار کے ہاں پُرتکلف دعوت اڑائی تھی۔

یہ بھی قطب شمالی کی سرحد پر آباد ایک کینیڈین گاؤں آئیوجیک کے باسی اور اسکیمو تھے۔ گاؤں کے اردگرد برفانی جانور دیکھے گئے تھے مگر آج تک کوئی سڑکوں پر نہیں آیا تھا۔ وہاں تقریباً ڈھائی سو افراد بستے تھے۔

اب پلونسی دوبارہ سرگوشی کرتے ہوئے ڈری آواز میں بولی، "خالہ! وہ واقعی بھیڑیا ہے۔"

تب مقامی اسکول کی استانی اور پانچ بچوں کی ماں، لیڈیا نے مڑ کر دیکھا۔ سب سے پیچھے جیسی آ رہا تھا۔ اس نے کپڑوں کا پلندہ اوڑھ رکھا تھا کیونکہ درجہ حرارت منفی ۳۰/ درجے سینٹی گریڈ تھا۔ لیڈیا پہلے اسے ہی بھیڑیا سمجھی۔ لیکن پھر یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت کے مارے پھیل گئیں کہ جیسی کے پیچھے ایک ۳۵۰/ کلو وزنی برفانی ریچھ اسے گھور رہا تھا۔

چند لمحے کے لیے وقت جیسے تھم گیا۔ پھر لیڈیا نے جیسی کو پیچھے دیکھنے کا اشارہ کیا۔ انجان لڑکے نے جیسے ہی برفانی بلا دیکھی تو چیخ مار کر ماں کی طرف دوڑ پڑا۔

آناً فاناً خون موجیں مارتا لیڈیا کے دماغ میں پہنچ گیا۔ اعصاب تن گئے اور وہ ذہنی و جسمانی طور پر انتہائی خطرناک صورت حال کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو گئی۔ وہ بنیادی طور پر پست قامت اور نرم خو عورت تھی۔ آج تک کسی سے اس کا جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب مادرانہ جبلّت نے اسے خونخوار شیرنی بنا دیا۔ تب اس ۵/ فٹ اور ۴۵/ کلو وزن کی مالک عورت نے اپنے بدن میں غیر معمولی توانائی محسوس کی۔ وہ چلا کر بچوں سے بولی:

"یہاں سے بھاگو اور زیادہ سے زیادہ دور ہو جاؤ۔"

یہ کہتے ہوئے وہ قطبی ریچھ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ جب حیوان نے بچوں کو بھاگتے دیکھا تو لیڈیا کے دائیں طرف سے ہوتے ہوئے ان کی طرف بڑھا۔ ظاہر ہے، لیڈیا کی نسبت بچے اس کے لیے تر نوالہ ثابت ہوتے۔ لیکن ماں بھی اس کے ساتھ ساتھ ہلی اور حیوان و بچوں کے درمیان دیوار بن گئی۔ یہ دیکھ کر ریچھ طیش میں آ گیا۔

وہ پھر دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہوا اور منہ سے دلی غراہٹیں نکال کر لیڈیا کو خوفزدہ کرنے کی سعی کرنے لگا۔ وہ تقریباً ۷/ فٹ اونچا تھا۔ لیڈیا نے اب تک برفانی ریچھوں کے بچے دیکھے تھے۔ اب ایک لمبا چوڑا ریچھ دیکھا تو قدرتاً اس نے خوف محسوس کیا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ برفانی ریچھ کھڑے ہو کر شکار پر وار کرتے ہیں۔ یہ احساس ہوتے ہی وہ حملے کے لیے تیار ہو گئی۔

اس وقت تک بچے بھاگ کر خاصی دور جا چکے تھے، گویا ریچھ کی دسترس سے نکل گئے۔ بچوں کی طرف سے اطمینان ہوا تو اب لیڈیا کو اپنی فکر ہوئی اور وہ بھی بھاگ کھڑی ہوئی۔

بدقسمتی سے برف نرم تھی، لہٰذا لیڈیا کے پاؤں اندر دھنس جاتے۔ اس امر نے بھاگنے کی رفتار سست کر دی۔ ادھر برفانی ریچھ بھربھری برف پر چلنے و بھاگنے کا عادی تھا۔ اسی لیے وہ جلد ہی لیڈیا کے سر پر آ پہنچا۔

ریچھ نے پیچھے سے لیڈیا کی کمر پہ پنجہ مارا تو وہ منہ کے بل نیچے جا گری تاہم زخمی نہ ہوئی۔ کیونکہ اول اس نے موٹے کپڑے پہن رکھے تھے۔ دوم برف بھربھری تھی۔ لیڈیا فوراً کمر کے بل لیٹی اور سائیکل کے مانند ٹانگیں چلا کر ریچھ کو دور کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ساتھ ہی وہ مدد کے لیے چلا رہی تھی۔

www.urdudigest.pk

۷/ سالہ جیسی دیوانہ وار بھاگتا اپنی ماں کے ساتھی، سرکولک ایسنک کے گھر پہنچ گیا۔ سرکولک لیڈیا کے اسکول ہی میں پڑھاتا تھا۔ سمجھ دار لڑکا اس کے گھر رائفل دیکھ چکا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد سرکولک رائفل لیے جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ تب تک ریچھ پنجے مار مار کر لیڈیا کے جسم پر خاصی خراشیں ڈال چکا تھا۔ کمزور عورت موذی جانور کا مقابلہ کرتے کرتے بے حال ہو چکی تھی۔ سرلک جان گیا کہ مزید دیر ہوئی تو بیچاری لیڈیا بھوکے حیوان کے خونخوار دانتوں کا نشانہ بن کر جان سے جائے گی۔ اس نے دو گولیاں چلا کر ریچھ کو مار ڈالا۔

فائرنگ کی آوازوں نے گاؤں کے تقریباً سبھی باشندوں کو چوکنا و ہوشیار کر دیا۔ وہ معاملے کی خبر لینے گھروں سے نکل آئے۔ چند منٹ میں لیڈیا کے گرد ہجوم جمع ہو گیا۔ اب اسے اسپتال لے جانا ضروری تھا۔

لیڈیا نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ جلد ہی ایک پڑوسی وہاں اپنی وین لے آیا۔ اسپتال پہنچے تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ پڑوس سے پتا چلا کہ اکلوتا ڈاکٹر ایک دعوت پر گیا ہے۔ اسی دوران وہاں گاؤں کے دو سپاہی آ پہنچے۔ انھوں نے فون کر کے ڈاکٹر کو بلا لیا۔ یوں زخمی لیڈیا کا علاج شروع ہوا۔

اگلے دن صبح سویرے خوفزدہ جیسی اپنے دیگر بہن بھائیوں اور کزنز کے ساتھ ماں کو دیکھنے پہنچا۔ اس کی بہنیں اور بھائی بھی آئے۔ سبھی کا کہنا تھا "تم نے بچوں کو بچا لیا۔"

یہ حقیقت ہے کہ منحنی اور کمزور لیڈیا نے زبردست دلیری کا مظاہرہ کیا۔ دیوہیکل اور خونخوار برفانی ریچھ کے سامنے بڑے بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔ لیکن لیڈیا محض بچوں کو بچانے اس موذی کے سامنے ڈٹ گئی اور اس بہادری کا ثبوت دیا۔ جس کا مظاہرہ صرف ایک ماں ہی کر سکتی ہے۔ اس کی ہمت کو سپاہیوں اور ڈاکٹر سمیت قصبے کے سبھی لوگوں نے سراہا۔

بعدازاں شمالی کیوبک کے اسکیموؤں کی ایک غیر سرکاری تنظیم، ماکیویک (Makivik) کارپوریشن نے بے مثال ہمت و استقلال دکھانے پر لیڈیا کو "تحفہ دلیری" سے نوازا۔ بعدازاں وہ "گورنر جنرل ایوارڈ" کے لیے بھی نامزد ہوئی۔ دنیا بھر میں لیڈیا کی داستان چھپی۔ آئیوجیک میں تو لیڈیا شہرت کی بلندیوں پر پہنچ چکی۔

لیری ہبرٹ ۱۵/ سال تک علاقے کا تھانیدار رہا۔ وہ کہتا ہے "پہلے پست قامت لیڈیا استانی ہونے کے باوجود قصبے میں غیر معروف تھی۔ لیکن ریچھ سے مقابلے کے بعد ہر کوئی اسے مضبوط عورت سمجھتا ہے۔ حتیٰ کہ اسکول میں بھی طالب علم اب اس کی زیادہ عزت کرتے ہیں۔"

لیڈیا کے زخم مندمل ہو چکے تاہم کبھی کبھی اسے خوابوں میں برفانی ریچھ دکھائی دیتا ہے۔ وہ حیوان سے خوف نہیں کھاتی، مگر خصوصاً رات کو باہر نکلتے ہوئے یہ ضرور دیکھ لیتی ہے کہ آس پاس برفانی ریچھ تو موجود نہیں۔

جرمن کہاوتیں

☆ سچائی ایک قیمتی ہیرے کی طرح ہے، اس لیے لوگ روز روز سچائی نہیں دکھاتے۔

☆ سونے کی سُولی کس کام کی، اگر انسان کو اُس پر لٹکنا ہے۔

☆ سونے کی لگام سے گھوڑا بہتر نہیں بن جاتا۔

☆ صحت مند نہیں جانتا کہ وہ کس قدر امیر ہے۔

☆ ضرورت سے زیادہ عقل مندی کا مظاہرہ بے وقوفی ہے۔

☆ غریب اُس وقت کھاتا ہے، جب اسے میسر آئے، امیر جب اس کا جی چاہے۔

☆ غربت میں انسان دوستوں کو پہچان لیتا ہے۔

☆ کوئی بڑا آدمی چھوٹی غلطی نہیں کرتا۔

(ترجمہ: منیر الدین احمد، انتخاب: رفیق احمد نقش)

بابو کو نیلسن منڈیلا کے ساتھ تصویر ۳۰ ہزار ڈالر میں پڑی

بابوستان کے عالمی بابو

حسین احمد شیرازی

ان سیانے بابوؤں کا عبرت اثر تذکرہ جو بیرون ملک گوری چمڑی والوں کے اشارہ ابرو پر رقص کرتے نہیں تھکتے

ڈرائیوروں کو کرسیوں پر بٹھا کر جعلی فوٹو بنوانے والا سیانا بابو بعد میں ملک کا وزیر خزانہ بن گیا

www.urdudigest.pk

بابونگر

میں عالمی بابو بھی رہتے ہیں۔ آدم اور حوا ایک نافرمانی کی سزا کے طور پر اس کرۂ ارض پر بھجوائے گئے تھے پھر ان کے ایک بیٹے نے اپنے بھائی کو ایک عورت کی خاطر قتل کر دیا۔ گزشتہ کئی ہزار سال کے دوران انسان نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں بے حد ترقی کر لی ہے لیکن بہت سے مذاہب کی موجودگی کے باوجود اخلاقی اعتبار سے، انسان آج بھی شاید روزِ اوّل کی سطح پر کھڑا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے لوگوں نے اپنے اپنے معاشروں میں رہنے والوں کے لیے تو نظم و ضبط اور انصاف کے اصول وضع کیے ہیں لیکن ان ضوابط کا دوسری ریاستوں کے عوام پر اطلاق نہیں کیا جاتا اور بنی نوعِ انسان کی فلاح کے بلند بانگ دعووں کے باوجود، پس ماندہ اقوام کا استحصال آج بھی جاری و ساری ہے۔ مہلک ترین جنگی ہتھیاروں کی تیاری پر کھربوں روپے کے اخراجات عملی طور پر حقیقی انسانی سوچ کی نفی کرتے ہیں۔ اس بابت ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ قیامت کی آمد کے لیے جن دگرگوں حالات کی موجودگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے، ان کے پیشِ نظر بین الاقوامی اخلاقیات میں کسی انقلابی تبدیلی کی توقع عبث ہے کیونکہ آفاقی سچائیاں وقت کی قید سے آزاد ہوتی ہیں ؎

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری، قصۂ جدید و قدیم

اس پس منظر میں دنیا کے تمام ممالک کے کامیاب لیڈر صرف اور صرف اپنے ملکی مفاد کی حفاظت کرتے ہیں۔ یاد کریں، آج بھی سب سے اچھی فلاحی مملکتوں جیسے ناروے وغیرہ میں، اُن کے انسانی بہبود کے اقدامات میں شمول ان ممالک میں داخلہ.....اور غیر ملکی شہریوں میں اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا مذہبی طور پر غیر شادی شدہ مرد و زن میں ہونا چاہیے۔

ہم اٹھارویں صدی میں امریکی انقلاب کے دلی معترف ہیں جس نے اس دنیا کی تاریخ کا رُخ جمہوریت کی جانب موڑ دیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ امریکی ''اعلانِ آزادی'' کے مُصنّف تھامس جیفرسن خود بھی سیکڑوں غلاموں کے مالک تھے بلکہ پہلے امریکی صدر جارج واشنگٹن کے غلاموں کی تعداد تین سو سولہ تھی اور ان غلاموں کے طرزِ عمل کو درست رکھنے کے لیے کوڑے مارنے کی بھی اجازت تھی! اگر جسم کی کھال کا رنگ سفید ہے تو ''حقِ نمائندگی پہلے، ٹیکس کی ادائیگی بعد میں'' کی بنیاد پر باقاعدہ جنگِ آزادی لڑی گئی لیکن اگر اس کا رنگ کالا ہے تو یہ غلام جہاز بھر بھر کر افریقہ سے لائے جاتے تھے اور ان کی کھلے عام قانونی خرید و فروخت ہوتی تھی۔

امریکا میں پہلے ریڈ انڈین آباد تھے، پھر یہ سارا ملک ان سے لے لیا گیا۔ مین ہیٹن جزیرہ ریڈ انڈین سے صرف چوبیس ڈالر میں خریدا گیا تھا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں امریکی چیف جسٹس مارشل نے زمین کے کسی مقدمہ کا فیصلہ ریڈ انڈین کے حق میں دے دیا تو امریکی صدر جیکسن نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اب اس فیصلے پر عمل درآمد بھی چیف جسٹس مارشل ہی کروائے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک ریڈ انڈین نیویارک کے کسی بڑے اسٹور میں گیا تو اسٹور کے مالک نے طنزیہ پوچھا ''دوست! تمھیں ہمارا شہر کیسا لگا؟'' تو ریڈ انڈین نے جواب دیا ''پہلے تم بتاؤ، تمھیں ہمارا ملک کیسا لگا؟'' امریکی صدر جانسن نے ۱۹۶۰ء کی دہائی میں امریکی اصطلاح ''ایس۔ او۔ بی (S.O.B)'' استعمال کرتے ہوئے تیسری دنیا کے ڈکٹیٹروں کا حَسَبْ نَسَبْ ایک ناپاک جانور کی مادہ سے ملا دیا۔ اس پر کسی نے پوچھا کہ ان میں کئی ایک تو آپ کی حمایت سے برسرِاقتدار ہیں تو جانسن نے جواب دیا کہ ہیں تو وہ بھی وہی لیکن وُہ ہمارے ''ایس۔ او۔ بی'' ہیں۔

ایک صدی کی غلامی اور اس کے بعد نصف صدی سے زائد کے نیم آزادی، نیم محکومی کے ادوار نے بابونگر کے باسیوں پر مغربی ممالک کا رُعب نہیں بلکہ ہیبت طاری کی ہوئی ہے اور اقتدار کے ایوانوں میں آئی ایم ایف، عالمی بینک وغیرہ کا نقشہ، اکبر الٰہ آبادی کے سو سال پہلے لکھے ہوئے ان الفاظ

www.urdudigest.pk

میں نظر آتا ہے۔

ملّا غریب چپ ہیں، ان کی کتاب ردّی
بُدّھو اکڑ رہے ہیں "صاحب نے یہ کہا ہے"

اکتوبر ۱۹۹۹ء کے مارشل لا کے بعد ملکی باشندوں کو تو پورا سانس لینے کی آزادی نہیں تھی لیکن مارچ ۲۰۰۰ء میں امریکی صدر کی صرف چند گھنٹے کے لیے آمد پر راولپنڈی اسلام آباد کے متعلقہ ائیرپورٹ، عمارتوں اور سڑکوں کو امریکی کنٹرول میں دے دیا گیا تھا اور امریکی صدر کا قافلہ ہمارے ٹریفک کے اصول "بائیں چلیں" کے اُلٹ امریکی ٹریفک کے اصول "دائیں چلیں" پر سفر کرتا رہا اور ہمارے کمانڈو صدر کو بھی ملاقات کے لیے وردی پہننے کی ممانعت کردی گئی تھی! یاد رہے کہ یہ صاحب وردی کو اپنے جسم کی کھال قرار دیتے تھے۔

۱۹۷۹ء کا واقعہ ہے، اسلام آباد ائیرپورٹ کے وی آئی پی لاؤنج میں ہم نے دو بہت اہم بابوؤں کا یہ مکالمہ سنا تھا:

الف: "مانا تم فلاں ملک کی جیب میں ہو لیکن ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو۔"

ب: "یہ بہتان ہے، تمھیں یہ بات کہنے کی جرأت کیسے ہوئی۔"

الف: "ارے بابا..... میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ تم ان کی اندرونی جیب میں ہو..... کیونکہ میں بھی وہیں ہوں! فلاں خریداری کا مجھے سب پتا ہے۔"

اس پر دوسرے بابو حیرت اور استعجاب کے سمندر میں غوطہ زن ہوکر تشکیک سے یقین کے ساحل پر اترے، پہلے بابو کے چہرے کو عمیق نظروں سے پرکھا، پھر بڑی گرم جوشی سے پہلے بابو کے ہاتھ پر تائیدی ہاتھ مارا اور ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ یہ اندرونی جیب دراصل وہ ناجائز آمدنی اور بیرونِ ملک اثاثے ہیں جن کی مکمل تفصیلات ان عالمی بابوؤں کے پاس موجود ہوتی ہیں۔ اس طرح ان کا دباؤ، ان کی کرپشن کی تفصیلات اور اسے بحفاظت وہاں رکھنے کی شکل میں، ان پر برقرار رہتا ہے۔ "چاہِ یوسف سے صدا" میں اس کے مصنف وزیراعظم نے اپنے والد کا قول تحریر کیا ہے کہ وفاقی وزیر بننے کے لیے امریکا سے تعلقات بہت ضروری ہیں! ۱۹۷۹ء میں ایران میں امریکی سفارت خانے پر قبضہ کے بعد جو کاغذات برآمد ہوئے، ان کے مطابق ہمارے ایک "بزعمِ خود" اسلامی حاکم کا نام بھی سی آئی اے کی ادائیگی لسٹ میں پایا گیا تھا!

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے، لقمے پہ شاد ہے
صیّاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

ہمارے ایک دوست کا دعویٰ ہے کہ وہ نہ صرف موسیقی کی کسی بھی دھن پر رقص کرسکتے ہیں بلکہ اشعار پر بھی ناچ سکتے ہیں۔ تو ہم نے کہا کہ بھائی یہ کون سا کمال ہے تم تو صرف رقص کی بات کرتے ہو، پس ماندہ ممالک کے بیشتر لیڈر گوری چمڑی والوں کی باتوں پر بلکہ اشارۂ ابرو پر نہ صرف ناچتے ہیں بلکہ ان پر وجد بھی طاری ہوجاتا ہے۔

وفاقی بورڈ برائے محصولات کی ٹیکس اصلاحات کے پروگرام کے دوران ہمیں عالمی بینک، آئی ایم ایف، غیر ملکی مشیران وغیرہ سے قریبی رابطے کا موقع ملا۔ ہماری امن و امان کی مخدوش صورتِ حال کے پیشِ نظر گزشتہ کئی دہائیوں سے مشاورت کے لیے ان کے اچھے دماغ پاکستان نہیں آتے۔ لمحوں میں بدل جانے والی صورتِ حال اور غیر یقینی اور خبطی پالیسیوں نے مشاورت کا شعبہ داؤ لگانے والوں کے سپرد کردیا ہے جنھوں نے تیسری دنیا کے لیے بنی بنائی رپورٹیں تیار کی ہوئی ہیں اور وہ انھیں ہمارے سپرد کرتے

ان عالمی اداروں اور مشیران کے ایجنڈے کے معاون میر جعفر اور میر صادق، بعد میں پُرکشش مراعات کے ساتھ نہ صرف پاکستان بلکہ بیرونِ ملک بھی سرفراز کیے جاتے ہیں

www.urdudigest.pk

ہوئے۔ بعض اوقات پرانے افریقی یا لاطینی امریکا کے ملک کا نام بھی تبدیل کرنا بھول جاتے ہیں۔

ہم نے دیکھا کہ کروڑوں روپے فیس وصول کرنے والی فرم کا پہلا پلان واضح غلطیوں کی وجہ سے مسترد کردیا گیا۔ پھر ان کا ٹیم لیڈر ایک دن چپکے سے کسی کو بھی بتائے بغیر پاکستان سے بھاگ گیا اور فرم والے خود بھی کئی ہفتے اس کا اتا پتا ہم سے پوچھتے رہے۔ اگلے ٹیم لیڈر کی آمد کئی دن بعد ہوئی۔ پھر ایک دن پتا چلا کہ آج دو بجے عالمی اداروں کے ساتھ اجلاس ہوگا جس میں مشاورتی فرم کی رپورٹ پر بحث کی جائے گی۔ یہ دو سو صفحات کی رپورٹ اجلاس کے دوران تقسیم کی گئی۔ ہم نے کہا کہ بغیر پڑھے اس پر کیا بحث کی جاسکتی ہے تو بتایا گیا کہ دراصل ان میں سے بیشتر لوگ کل صبح واپس جارہے ہیں! کئی ارب روپے خرچ کرنے کے بعد بھی پاکستان کا جی ڈی پی اور ٹیکس کا تناسب ایسے ہی تو ترقی معکوس نہیں کر رہا۔ اس صورت حال پر کسی دل جلے کا یہ فقرہ کتنا جامع ہے کہ بھئی ٹیکس اصلاحات کا عمل مکمل ہوچکا ہے یا ابھی حالات مزید خراب ہوں گے۔

مریضِ عشق پر رحمت خُدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

۲۰۰۳ء میں وفاقی بورڈ نے مذکورہ بالا قرضہ آٹھ ملین ڈالر کے بجائے پانچ ملین ڈالر کردیا تو عالمی بینک کے مشیر نے بڑے دکھی لہجے میں پوچھا کہ قرضہ کیوں گھٹا دیا گیا ہے۔

عمومی طور پر غیر ملکی مشیران بڑی خوشی سے مقامی بابوؤں کو ان کی رپورٹیں تیار کرنے دیتے ہیں کہ ان کی حقیقی صلاحیتوں کے پیشِ نظر یہ ان کے بس کا روگ بھی نہیں ہے۔ مقامی بابوؤں کو اس کارکردگی کی آڑ میں اپنے ذاتی اور گروہی ایجنڈے کی تکمیل اور اپنے مخالفین جن کی آراء میں لاکھ ملکی مفاد اور سچائی ہو، کو نیچا دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ ۲۰۰۰ء کی پاکستانی حکومت نے غلط اعداد و شمار فراہم کرنے کا جرم قبول کر کے ایک عالمی ادارے کو کروڑوں روپے جرمانہ ادا کیا تھا..... کیونکہ اعداد و شمار پچھلی حکومت نے فراہم کیے تھے۔ ان عالمی اداروں اور مشیران کے ایجنڈے کے معاون میر جعفر اور میر صادق، بعد میں پُرکشش مراعات کے ساتھ نہ صرف پاکستان بلکہ بیرونِ ملک بھی سرفراز کیے جاتے ہیں۔

اسلام آباد ائیرپورٹ پر ایک صوبائی چیف سیکرٹری اور واپڈا کے بڑے بابو بڑے افسردہ لہجے میں اس دن ان سے ہونے والے ناروا سلوک کے لیے وفاقی بابوؤں کو کوس رہے تھے۔ اس دوران میں واپڈا بابو بولے "لیکن کوئی بات نہیں، اللہ بڑا انصاف کرنے والا ہے۔ عالمی بینک کا وفد آج شام آرہا ہے، وہ وفاقی بابوؤں سے ہمارا بدلہ خود ہی لے لے گا....."

ہمارے ایک دوست عالمی بابوؤں کے ساتھ نشست سے اٹھ کر اپنے ساتھیوں کے پاس آئے اور دھاڑے کہ وُہ ایسے ہی ہم پر چڑھائی کرتے رہتے ہیں، میں نے بھی آج ان کی طبیعت صاف کردی ہے۔ یہ کہا ہے، وہ کہا ہے، ان کی رپورٹ میں دس غلطیاں بتائی ہیں، بس سمجھو کہ اڑا کے رکھ دیا ہے، کیا یاد کریں گے، تو ایک بے تکلف دوست نے ان کے پاؤں پکڑ کر کہا کہ سر! بکواس مت کریں آپ کی ٹانگیں ابھی تک کانپ رہی ہیں۔

چلے جاتے ہیں بڑھ بڑھ کر، مٹے جاتے ہیں گر گر کر
حضورِ شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی

ذاتی مفاد کے علاوہ ہماری نااہلی بھی ان بابوؤں کی قدر و منزلت میں اضافہ کرتی ہے۔ کسی اہم شہر میں عالمی

۲۰۰۰ء کی پاکستانی حکومت نے غلط اعداد و شمار فراہم کرنے کا جرم قبول کر کے ایک عالمی ادارے کو کروڑوں روپے جرمانہ ادا کیا تھا

www.urdudigest.pk

بینک کے تعاون سے ہونے والی کانفرنس میں ایک کاروباری بابو نے یہ اعلان فرما دیا تھا کہ ہمارے شہر میں آپ کے بینک کی کوئی برانچ نہیں ہے۔ آپ فوراً برانچ کھولیں، ہم اسے کامیاب کروانے کی گارنٹی دیتے ہیں.....اور عالمی بینک کا نمائندہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

عالمی بابوؤں کے تذکرے میں غیر ملکی امداد بھی ایک اہم موضوع ہے۔ یہ امداد دراصل قرضہ ہوتا ہے جس پر نہ صرف سود ادا کرنا پڑتا ہے بلکہ اس کا بیشتر حصہ مشاورت اور سامان کی سپلائی کی صورت میں امداد دہندہ کے پاس واپس چلا جاتا ہے۔

قفس پہ رکھنے لگا اب تو ہار پھولوں کے
ہزار شکر ہوا مجھ پہ مہرباں صیاد

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اس قرضے کو آمدنی سمجھ کر خرچ کرتے ہیں اور اس کے بارے میں مذاکرات کے دوران ہی نئے گھروں کے ڈیزائن، خواتین کی جیولری اور بچوں کے لیے اچھے غیر ملکی تعلیمی اداروں کی تلاش شروع کر دی جاتی ہے!

ہاتھ سے کاسہ گدائی کا نہ چھوٹا ایک دن
اور منہ سے تاجِ شاہی کے ہیں دعویدار ہم

کوئی ملک اپنا مفاد چھوڑ کر دوسرے ملک کو ٹیکنالوجی کی خیرات نہیں دیتا۔ غیر ملکی امداد کا تفصیلی تجزیہ کرنے کے بعد ہمیں اس جعلی سنیاسی کا نسخہ یاد آ گیا جس کے مطابق مرید، ہوا میں تحلیل ہونے والی حد تک گرم کی گئی گھی کی دیگ کے گرد، سنیاسی کے بتائے ہوئے کلمات پڑھتے ہوئے، دس چکر لگائے گا۔ پھر ایک جن نمودار ہو گا جو چلّہ کاٹنے والے کو دیگ میں پھینک کر تلے گا اور سارا گوشت کھا جائے گا۔ جو ہڈیاں بچ جائیں گی ان پر سنیاسی منتر پڑھے گا اور مرید نہ صرف جی اُٹھے گا بلکہ اسے اپنے من کی مراد بھی مل جائے گی.....ہم ابھی اُبلتے ہوئے تیل کی دیگ میں چھلانگ لگانے لگے ہیں!

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

ہمارے ایک دوست پاکستان کے قرضہ کے انتظام و انصرام کے انچارج تھے۔ ہم نے ان کی کارکردگی کے بارے میں پوچھا تو بولے کہ ہماری پالیسی یہ ہے کہ ایک پارٹی سے قرضہ لے کر دوسری پارٹی کو ادا کرتے ہیں اور پھر تیسری پارٹی سے قرضہ لے کر پہلی پارٹی کو واپس کر دیتے ہیں۔ بس کمال یہ ہے کہ تینوں پارٹیوں کو ایک دوسرے کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔ ہم نے کہا کہ یہ تو مداری کا ہوا میں بیک وقت آٹھ گیند اُچھالنے والا کرتب ہے جو ایک محدود مدت تک تو چل سکتا ہے لیکن اس کے بعد کیا ہو گا.....تو وہ بولے کہ اس کے بعد نئی حکومت، نئے لوگ اور اُن کا دردِ سر! پھر انھوں نے اس پالیسی کو تاریخی مثال سے سمجھایا کہ مغلوں کی حکومت کے دور میں کسی علاقے میں بدامنی پر رپورٹ آئی کہ یہاں بہت اندھیر ہے۔ اس پر حکم دیا گیا کہ تھوڑا اندھیر اور ڈال دیا جائے کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے!

یہ بھی تو اک اندازِ علاجِ غمِ جاں ہے
اے چارہ گرو، درد بڑھا کیوں نہیں دیتے

کئی صورتوں میں یہ بیرونی قرضے ایسے ہی ہیں جیسے آگ کے شعلوں میں لپٹا ہوا آدمی بدحواسی میں پانی سمجھ کر جس بالٹی کو اپنے اوپر انڈیل لے، وہ مٹی کے تیل کی ہو۔ جو تنکے سمندر کی لہروں پر سوار ہو کر سفر طے

ہم نے کہا کہ یہ تو مداری کا ہوا میں بیک وقت آٹھ گیند اُچھالنے والا کرتب ہے جو ایک محدود مدّت تک تو چل سکتا ہے لیکن اس کے بعد کیا ہو گا.....تو وہ بولے کہ اس کے بعد نئی حکومت، نئے لوگ اور اُن کا دردِ سر!

www.urdudigest.pk

کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی رفتار، سمت، منزل بلکہ انجام بھی کب اُن کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔

کہا تھا کس نے کہ ہاتھ تھامو ہوا کا اے برگِ خشک و خستہ
ہوا کی مرضی ہے اب تو پیارے جہاں بھی جائے، جدھر بھی جائے

سوئٹزرلینڈ میں حکومتِ پاکستان کے زیرِ اہتمام منعقدہ سرمایہ کاری کی نام نہاد بین الاقوامی کانفرنس کی کارروائی کا آغاز ہوا تو پتا چلا کہ کانفرنس کے شرکاء صرف پاکستانی وفد پر مشتمل ہیں۔ مسئلہ حل کرنے کے لیے ایک پاکستانی سیانا، وفد کے لیے حاصل کی گئی کرائے کی کاروں کے نائیوں والے ڈرائیور پکڑ لایا اور ان کو اگلی نشستوں پر بٹھا کر ٹی وی اور اخباری تصویروں کا مناسب انتظام کیا گیا.....یہ سیانا آدمی بعد میں پاکستان کا وزیرِ خزانہ اور وزیرِ اعظم بھی رہا ہے!

ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

ہمارے انگلستان میں مقیم ایک دوست بتاتے ہیں کہ جب پاکستان سے سیاستدان یہاں آتے ہیں تو ان کا ایک اہم مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ گوروں کے ساتھ ہماری میڈیا تشہیر کا انتظام کریں۔ چنانچہ میں اپنا دودھ والا، سکیورٹی گارڈ، اپنی سیکرٹری اور دوسرے انگریز ملازمین کو بلا کر ان کی فرمائش پوری کر دیتا ہوں۔ اقوامِ متحدہ میں حقیقی ہمارے ایک ساتھی کا قصّہ بھی سُن لیں۔ وزیرِ اعظم کو اس ادارے میں آمد پر پتا چلا کہ نیلسن منڈیلا بھی وہیں ہیں تو ان کی تلاش شروع کی گئی اور کسی لمبی راہداری میں ان کو ہانپتے کانپتے، چلتے ہوئے پکڑ لیا گیا۔ اس دوران سرکاری فوٹو گرافر غائب ہو گیا تو ایک گزرتے ہوئے فوٹو گرافر سے تیس ڈالر کی ادائیگی پر نیلسن منڈیلا کے ساتھ صرف تصویر کھنچوائی گئی جسے پاکستان کے تمام اخباروں میں ''نیلسن منڈیلا کے ساتھ کشمیر سمیت دیگر بین الاقوامی امور پر مذاکرات'' کی سرخیوں کے ساتھ شائع کروایا گیا۔

کئی دفعہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ ہمارے بیرونِ ملک قیام کے دوران ہمارے اہم سیاسی بابو بھی اُس ملک میں آئے۔ عام طور پر ان کی آمد اور مصروفیات، دہشت گردی کی جواب دہی کے علاوہ، غیر ملکی میڈیا کے لیے غیر اہم اطلاع ہے اور اگر بہت ہوا تو کسی اخبار کے سولہویں صفحے پر تین لائنوں کی خبر ہوتی ہے۔

ہماری خارجہ پالیسی کے بارے میں ہماری رائے ہے کہ اگر آدمی شیر نہ ہو تو اسے شیر بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے اور شیر کی کھال پہن کر تو بالکل نہیں گھومنا چاہیے مبادا کسی شکاری کی گولی کا نشانہ بن جائے۔

ہمیں بیرونِ ملک ایسی کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملا ہے جہاں دوسرے اسلامی ممالک کے نمائندے بھی موجود تھے۔ یقین جانیں کہ ان مجالس میں ہونے والی کارروائی کے پیشِ نظر عالمِ اسلام کی یکجہتی اور باہمی قربانی کے دعوے ''ھذا فقط کلام'' کے زمرے میں آتے ہیں۔ ہم نے اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا جبکہ بہت سے اسلامی ملکوں نے ایسا کر رکھا ہے۔ ہمارے ہاں فرقہ وارانہ جھگڑوں کی افزائش کی جڑیں دو برادر اسلامی ملکوں سے نکل کر آئی ہیں۔

ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسمان کیوں ہو

ہم ایک غیر ملکی سے بحث کر رہے تھے کہ پاکستان دہشت گردی میں بالکل ملوث نہیں ہے اور اس کے پاس اس الزام کا کیا ثبوت ہے؟ تو وہ بولا کہ پاکستان کے بارے میں ہم پاکستان میں مروّج اصولوں پر چلیں گے، جہاں بے گناہی ثابت کرنا ملزم کی ذمہ داری ہے۔

عالمی بابوؤں میں ہر طرح کے لوگ ہیں۔ تیسری دنیا کے کئی سفارت کار جب سفارتی مراعات کی آڑ میں شراب اور دیگر اشیاء کی سمگلنگ میں پکڑے گئے تو تحقیقات کے دوران ہمیں پتا چلا کہ اُن کی حکومتیں پاکستان میں تعیناتی کے وقت ان کی تنخواہ اور الاؤنس مقرر کرتے ہوئے اس مد میں کمائی جانے والی رقم بھی پیشِ نظر رکھتی ہیں۔ ہمارے ماحول کا ان عالمی بابوؤں پر بھی اثر ہوتا ہے۔ ایک سروے رپورٹ کے مطابق وہ مغربی سفارت کار جو ترقی پذیر ممالک میں دو سال سے زائد گزار لیتے ہیں، وہ اپنے وطن واپسی کے بعد کار کی سیٹ بیلٹ کو سر دردی سمجھتے ہیں، حفاظتی اقدام نہیں۔ ہر کہ در کانِ نمک می رود، نمک می شود۔

میں بتاتا ہوں زوالِ اہلِ یورپ کا پلان
اہلِ یورپ کو مسلمانوں کے گھر پیدا کرو

مرفی لاء

کوئی ایسی لیکی نہیں جس کی مرمت نہ کی جاسکتی ہو
ہم آپ کو ڈگری تو دے سکتے ہیں دماغ نہیں

ایک انجینئر کے غصے سے جنم لینے والے قانون کا تذکرہ جسے دل جلوں نے دل بہلانے ذریعہ بنالیا اس قانون کو سمجھنے کی کوشش بھی مت کیجیے گا کیونکہ جو ہونا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے

حنا انور

اگر آپ گاڑی یا کوئی مشین ٹھیک کر رہے ہیں اور آپ کے ہاتھ گریس سے بھرے ہوئے ہیں تو ایسا ممکن ہی نہیں کہ آپ کی ناک پر کھجلی نہ ہو۔ اسی طرح کسی دن صبح آپ گھر سے ۵ منٹ ہی لیٹ ہو جائیں، لازم ہے کہ اُس دن راستے میں نہ صرف ٹریفک بلاک ہوگی بلکہ آپ کے باس بھی وقت سے پہلے پہنچے ہوں گے اور آپ ماسوائے اپنا خون جلانے کے کچھ اور نہیں کر پائیں گے۔ یہی ہے مرفی کا قانون..... مرفی کے قانون کی اس قنوطیت بھری دنیا میں خوش آمدید۔

مرفی کا قانون کہتا ہے کہ غلط ترین صورت حال وقوع پذیر ہو کر ہی رہتی ہے۔ مرفی کا قانون کسی جن یا بھوت کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے منفی سوچ رکھنے اور مثبت چیزوں کو نظر انداز کرنے کا رجحان ہے۔ یہ ہمارے تخیل کو قابو کرتا ہے اور ہم کسی بھی چیز کو مرفی کے قانون کے ساتھ جوڑنے لگ جاتے ہیں کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ حالات ہمارے مطابق چلیں۔ لیکن جیسے ہی ذرا سا بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو ہم وجہ ڈھونڈنے لگ جاتے ہیں۔

صبح کی سیر کو ہی لیجیے۔ روزمرہ معمول میں ہم کبھی نہیں کہتے کہ واہ! آج تو سیر بہت دلفریب رہی۔ لیکن جس دن خدانخواستہ کوئی حادثہ یا واقعہ رونما ہو جائے تو ہم سوچنے لگ جاتے ہیں آخر ایسا کیوں ہوا؟

مرفی کا قانون زیادہ پرانا تصور نہیں ہے۔ یہی کوئی نصف صدی پرانی بات ہے۔ مرفی کا قانون کیسے وجود میں آیا۔ اس حوالے سے کئی روایات ہیں۔ آدم ہل ایک

مرفی کا قانون سائنسی حقیقت

سائنسی اعتبار سے مرفی کے قانون کی کوئی حیثیت نہیں ہے، کیونکہ تجربے یا مشاہدے سے اسے جب بھی ٹیسٹ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، نتائج ناقابلِ یقین ہی ہے۔ ڈبل روٹی کے مکھن لگے حصے کے قالین پر گرنے والی مثال کو کئی بار ٹیسٹ کیا گیا، نتائج خاطر خواہ نہیں تھے۔ مکھن والا حصہ قالین پر کبھی گرتا کبھی نہیں جبکہ مرفی کے قانون کے مطابق اُسے ہر دفعہ قالین پر ہی گرنا چاہئے تھا۔ سائنسی ثبوت نہ ہونے کے باوجود بھی مرفی کے قانون کی ہماری روزمرہ زندگی میں حقیقت مسلمہ ہے لیکن صرف ہمارے دماغوں میں۔۔۔

جادوگر تھا۔ ۱۹۲۸ء میں اس نے اپنے ایک مضمون میں لکھا: جادو کے کسی بھی ایک ایکٹ میں ۹، ۱۰ ر چیزیں عام طور پر غلط ہو سکتی ہیں۔" اس سے پہلے اسے Sod's Law کہا جاتا تھا۔ جس کے مطابق یہ کہا جاتا کہ دنیا میں بدترین واقعات عام طور پر غریبوں کے ساتھ ہی رونما ہوتے ہیں۔ آج بھی انگلینڈ میں سوڈ کے قانون کو مرفی کے قانون کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔

مرفی قانون کا نام کیسے پڑا؟ اس کے پیچھے بھی ایک کہانی ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں مرفی سچ میں ایک جیتا جاگتا انسان تھا جو پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھا اور امریکا میں رہتا تھا۔

وہ ایک دن اپنے کسی پراجیکٹ پر کام کر رہا تھا، اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی شامل تھے۔ جب ہر چیز بظاہر اس حالت میں آگئی کہ اس کی آزمائش کی جائے تو وہ ناکام ہو گئے۔ پتا چلا کہ کسی معمولی سی غلطی کی بنا پر وہ اپنے ہدف تک نہ پہنچ سکے۔ مرفی نے غصے میں اپنے اسسٹنٹ کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا اور کہا کہ یہ شخص جہاں بھی غلطی کرنے کا موقع ہو، وہاں ضرور غلطی کرے گا۔ مزید اس شخص کے بارے میں یہ کہا کہ اگر کسی چیز کے کرنے کے دو طریقے ہوں گے تو جو سب سے بدترین ہوگا یہ وہی کرے گا۔ بس لوگ اس کی بات سے ایسے متاثر ہوئے کہ انھوں نے کھوج کھوج کر اس کے پیش کردہ خیال کے حق میں جانے والی باتیں تیار کر لیں، جس سے اس قانون کی حقیقت مسلمہ ہوگئی۔

ان لوگوں نے اس قانون کو جانچنے کے لیے کچھ مثالیں پیش کیں جن میں سے چند پیش خدمت ہیں۔

آپ کوئی مشین درست کر رہے ہوں تو اس کا باریک اسکرو جو بہت اہم بھی ہو آپ کے ہاتھ سے چھوٹ کر کمرے کے بھاری ترین فرنیچر کے سب سے کونے والے حصے میں پہنچ جاتا ہے۔

مزید مثالوں کی طرف بعد میں چلیں گے۔ پہلے آپ اس قانون کے چند نکات ذہن نشین کر لیں جو حسب ذیل ہیں:

☆ اگر ایک بات کے ساتھ بہت ساری غلط صورت احوال ہونے کے امکانات ہیں تو سب سے بدترین صورتحال سامنے آئے گی۔

☆ کئی چیزیں ایک ساتھ غلط ہونے کے امکانات ہیں تو وہ سب ایک ساتھ وقوع پذیر ہوں گے۔

☆ اگر کوئی چیز کسی بھی طریقے سے غلط سمت میں نہیں جاسکتی تو وہ کسی نہ کسی طریقے سے جائے گی ضرور۔

☆ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ کسی بھی چیز کے غلط سمت میں جانے کے چار طریقے ہو سکتے ہیں تو کوئی پانچواں طریقہ کہیں نہ کہیں سے جنم لے لے گا۔

☆ اگر حالات کو ایسے چھوڑ دیا جائے تو وہ کم بُرے سے زیادہ بُرے حالات کی طرف جاتے ہیں۔

☆ قدرت ہمیشہ اس خفیہ غلطی کے ساتھ ہوتی ہے جس کا حل آپ نے سوچا ہی نہیں ہوتا۔ جس کا آپ نے تصور بھی نہیں کیا ہوتا۔

اس قانون کو سمجھنے کے لیے روزمرہ زندگی سے کچھ مثالیں پیش خدمت ہیں:

- اگر آپ کوئی رانگ نمبر ڈائل کریں، مجال ہے کہ وہ مصروف ملے، کوئی نہ کوئی اٹھائے گا ضرور۔

www.urdudigest.pk

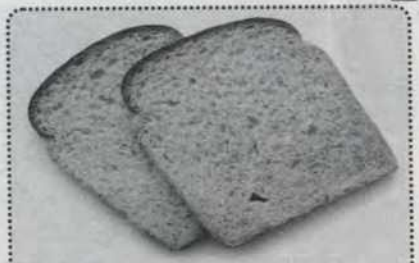

اگر ڈبل روٹی کا سلائس آپ کے ہاتھ سے گرے گا تو ہمیشہ اس کا مکھن لگا ہوا حصہ قالین سے ٹکرائے گا اور مکھن لگے ہوئے حصے کے قالین پر گرنے کے امکانات اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں، جتنا قیمتی قالین ہوتا ہے۔

- کسی دن آپ اپنے باس کو لیٹ پہنچنے کی وجہ یہ بتائیں کہ گاڑی خراب ہو گئی تھی تو گاڑی پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اگلے دن سچ مچ خراب ہو جائے۔
- آپ کسی شخص سے کہیں کہ دنیا میں ایک کروڑ سے زیادہ ستارے ہو ہی نہیں سکتے وہ اس پر تو یقین کرے گا۔ لیکن اگر یہ کہیں کہ سیڑھی پر کیا ہوا پینٹ ابھی گیلا ہے، اسے چھونا نہیں ہے تو وہ اسے چھو کر نہ دیکھے ایسا ممکن ہی نہیں۔
- آپ ٹریفک کی قطار میں کھڑے ہیں جب کہ دوسری طرف کم گاڑیاں ہیں جیسے ہی آپ اپنی لین سے دوسری طرف جائیں گے وہاں قطار پہلے سے بھی لمبی ہو جائے گی۔
- خارش عام طور پر وہاں ہوتی ہے جہاں آسانی سے ہاتھ نہ پہنچ سکے۔
- امتحانات میں ۸۰ رفیصد وہی اسباق آتے ہیں، جنھیں تیاری کے دوران آپ غیر اہم سمجھ کر چھوڑ دیں۔
- جس دن آپ گھر میں گندے کپڑوں میں پھر رہے ہوں اسی دن آپ کے گھر میں مہمان نازل ہو جائیں اور سوئے اتفاق سب سے پہلے آپ ہی ان سے ملیں گے۔
- واش روم میں پہلے سے بھری ہوئی بالٹی خالی کرتے ہی پانی کی ٹینکی میں بھی پانی ضرور ختم ہو جائے گا۔
- غسل خانے میں گرنے والی ہر چیز ضرور ہی سیدھی ٹوائلٹ کے اندر ہی گرے۔
- خواتین جب سولہ سنگھار کر کے کسی دعوت میں جانے کو تیار ہوں تو اسی وقت ان کے بچے کو واش روم جانا ہوتا ہے۔
- آپ کسی ہینڈسم شخص کے خاموش عشق میں مبتلا ہوں تو وہ کسی انجلینا جولی کو آپ کے سامنے لا کر مسکراتے ہوئے ضرور کہے گا، ان سے ملیے یہ آپ کی بھابھی ہیں۔
- جس دن آپ خوب دل لگا کر محنت سے تیار ہو کر جائیں، اسی دن کوئی آپ سے کہہ دے، کیا آج آپ نے منہ نہیں دھویا تھا؟

چند اقوالِ زریں..... مرفی کی زبان میں

- اگر بے وقوف اُڑ سکتے تو پوری دنیا ایک ہوائی اڈا ہوتی۔
- اگر آپ کسی چیز میں کامیاب نہ ہوں تو تمام ثبوت بھی ختم کر دیں گویا آپ نے کبھی کوشش ہی نہیں کی۔
- کوئی نہیں سنے گا جب تک آپ غلطی نہ کریں۔
- کسی بے وقوف کے ساتھ بحث نہ کیجیے وگرنہ لوگ فرق ہی نہ کر پائیں گے کہ دونوں میں سے کون بے وقوف ہے۔
- صبر کا اختتام، طاقت کا آغاز ہوتا ہے۔
- کوئی نیکی ایسی نہیں جس کی سزا نہ بھگتنی پڑے۔
- ہم آپ کو ڈگری یا ڈپلومہ تو دے سکتے ہیں لیکن دماغ نہیں۔
- زندگی میں ہر چیز اہم ہے۔ ہر اہم چیز سادہ جب کہ ہر سادہ چیز آسان نہیں ہوتی۔
- جو لوگ فیصلہ نہیں کرتے ان کے غلطیاں کرنے کے امکانات بھی کم ہوتے ہیں۔
- بے وقوفی اور عقل مندی میں یہ فرق ہے کہ عقل مندی کی حدیں مقرر ہیں۔
- کسی بھی مشکل کو بڑا نہ سمجھیں بلکہ امید رکھیں اس سے بھی بدتر کچھ ہو سکتا ہے۔
- آخر میں ایک بات واضح کر دوں۔ جب بھی آپ مرفی کے اس مضمون کو پڑھنے کی کوشش کریں گے۔ بجلی ضرور جائے گی۔ ویسے مرفی کے قانون کو سمجھنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ جو ہونا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔

میری نعیمہ آپا

راوی: آسیہ راشد

ایک درویش صفت خاتون کی پُراثر آپ بیتی جس نے تاعمر اسلامی تعلیمات پر چلتے ہوئے خدمتِ انسانی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا

ماجد خان کی والدہ اور عمران خان کی خالہ

پیدائش جالندھر کے نامور پٹھان خاندان میں ہوئی۔ ہمارے خاندان کے کئی افراد نے کسی نہ کسی حوالے سے اہم سرکاری عہدوں پر رہتے ہوئے پاکستان کی خدمت انجام دی۔ میرے دادا احمد شاہ خان بحیثیت سیشن جج سبکدوش ہوئے۔ اپنے دور کے بے حد پڑھے لکھے لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ یوں تعلیم و تدریس کا سلسلہ گھر سے ہی شروع ہوا۔ اسی ماحول میں رہنے کی وجہ سے مجھے سماجی کام کرنے کا موقع ملا۔ اسی نے مجھ میں خود اعتمادی پیدا کی اور مجھے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ یوں مجھے علم کی طاقت کا اندازہ ہوا۔

میرے دادا ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے آبائی گھر آ گئے۔ انھوں نے پرانے گھر کی توسیع کی اور اسے حویلی کی شکل دی۔ جالندھر والا ہمارا گھر کئی کنال میں پھیلا ہوا تھا۔ گھر بڑا کرنے میں میرے ابا کے نیک مقاصد بھی شامل تھے۔ انھوں نے حویلی کو لڑکیوں کا سکول بنا دیا۔ اس علاقے میں لڑکیوں کا کوئی سکول نہ تھا۔ آج بھی اس میں چار ہزار بچیاں زیرِ تعلیم ہیں۔

میرے دادا کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بچوں پر خاص توجہ کے نتیجے میں تینوں لڑکے تعلیم پا کر بہت اچھے سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ بڑے بیٹے، شاہ زمان خان جالندھر میں اعزازی مجسٹریٹ تھے۔ زمیندارہ کرتے اور

www.urdudigest.pk

آبائی زمینوں کے نگران بھی تھے۔ دوسرے نمبر پر احمد حسن خان تھے، میرے والدِ ماجد جو میانوالی سے بحیثیت ڈپٹی کمشنر سبکدوش ہوئے۔ تیسرے نمبر پر محمد زمان خان تھے جو پوسٹ ماسٹر جنرل ڈاک خانہ جات رہے۔ انھوں نے لاہور کے علاقہ زمان پارک کی بنیاد رکھی۔ وہ انہی کے نام سے منسوب ہے۔

میری والدہ کا نام امیر بانو تھا۔ والدین کا آپس میں مہر و محبت کا تعلق تھا۔ دونوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت میں بڑھ چڑھ کر ساتھ دیا۔ ہم سب بہن بھائی اپنے والدین کے بہترین کردار کی گواہی دیتے کہ ہماری اچھی پرورش میں انہی کا ہاتھ ہے۔

ہم تین بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ سب سے بڑی بہن اقبال، جن کے شوہر واجد علی تھے۔ وہ صدر ایوب کے دور میں وزیرِ صحت رہے۔ خود ماہرِ امراضِ چشم تھیں۔ دوسری بہن شوکت خانم جن کے میاں اکرام اللہ سول انجینئر تھے۔ مری کا گورنمنٹ ہاؤس انھوں نے بنوایا۔ شوکت خانم کے بیٹے عمران خان نے کرکٹ اور سیاست کے میدانوں میں شہرت پائی۔ بڑے بھائی احمد رضا خان تھے جو راولپنڈی سے بطور کمشنر سبکدوش ہوئے۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔

بچپن اور تعلیم

مجھے ڈاکٹر بننے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ بڑی ہوئی، تو اپنی سہیلی، مریم کے ساتھ میرا میڈیکل کالج میں داخلہ ہوگیا۔ میں اور مریم بہت خوش تھے مگر ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہو۔ بہنوئی کی مخالفت کے باعث کالج میں پڑھ نہ سکی۔

میری سہیلی مریم کا بھی داخلہ ہو چکا تھا۔ مگر ان لوگوں کے مالی حالات ایسے نہ تھے کہ وہ پڑھائی کے اخراجات کے متحمل ہوتے۔ میرے والد نے سرکار سے دو مرلے زمین الاٹ کرائی اور میری سہیلی کے لیے وقف کرا دی۔ یوں مریم ڈاکٹر بن گئی، مگر میں نہ بن سکی۔

میں بہت دل برداشتہ تھی۔ میری دل جوئی کے لیے ایک مولوی صاحب مجھے پڑھانے آنے لگے۔ انہی دنوں میری شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ ڈاکٹر جہانگیر خان ہماری برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان سے میری شادی طے پا گئی۔

ڈاکٹر صاحب کیمبرج یونیورسٹی سے قانون میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے آئے تھے۔ ان دنوں کیمبل پور میں تعینات تھے۔ گورے چٹے اور خوبصورت آدمی تھے۔ اسلام اور سماجی سرگرمیوں کی طرف رجحان تھا۔ پھر اپنے دور کے بہترین کرکٹروں میں بھی ان کا شمار ہوتا تھا۔ ہندوستانی کرکٹ ٹیم میں شامل رہے۔ (یہ ڈاکٹر جہانگیر خان ہی ہیں جنھوں نے برطانیہ میں کھیلتے ہوئے ایسی شاٹ ماری کہ اس کی زد میں آ کر ایک چڑیا مر گئی۔ یہ حنوط شدہ چڑیا اب عجائب گھر میں محفوظ ہے۔)

ڈاکٹر صاحب نے محکمہ تعلیم میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ساہیوال میں انسپکٹر، ڈائریکٹر، جوائنٹ سیکرٹری تعلیم رہے۔ ڈاکٹر صاحب نہایت اصول پسند اور متحمل مزاج شخص تھے۔ انتہائی مخلص اور تعاون کرنے والے شوہر ثابت ہوئے۔ دین سے خاص

"میرے شوہر ڈاکٹر جہانگیر خان کی شاٹ سے برطانیہ میں چڑیا جان سے گئی تھی"

www.urdudigest.pk

لگاؤ تھا۔ مشرقی روایات اور دینی اقدار کی سختی سے پابندی کرتے اور دوسروں سے بھی کرواتے۔

شادی کے چند روز بعد میں نے پہلی فرمائش یہ کی کہ مجھے ایف۔ اے کی کتابیں لا دیجئے تاکہ گھر بیٹھ کر نجی امتحان دے لوں۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے مجھے نصابی کتب کے بجائے دینی کتب لا دیں جس سے مجھے ان کے مزاج اور رجحان کا اندازہ ہوا۔

زندگی کا رخ بدل گیا

شادی کے چند ہی روز بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میری زندگی کو نئی راہ پر لا کھڑا کیا۔ مجھے ثابت قدمی کی ایسی راہ دکھائی جس پر میں تمام عمر چلتی رہی اور پھر کامیابیوں نے بھی میرے قدم چومے۔

مجھ سے پہلے میری بڑی ہمشیر اقبال کی شادی ہوئی۔ ان کے میاں ولایت سے ڈاکٹر بن کر آئے تھے۔ جدید خیالات کے مالک تھے۔ ہمارے گھر میں سبھی خواتین پردے کی سخت پابند تھیں۔ جب آپا کی شادی ہوئی تو میاں نے ان کا برقع اتروا دیا۔ یوں ہمارے گھر میں سب سے پہلے آپا نے پردہ ترک کیا۔ جب میری شادی ہوئی تو خیال تھا کہ میرے انگلینڈ پلٹ میاں بھی میرا برقع اتروا دیں گے۔ میں دل ہی دل میں بہت خوش تھی کہ چلو، شادی کا یہ فائدہ تو ہوا کہ برقع سے جان چھٹے گی۔ مگر شادی کے بعد بالکل الٹ ہوگیا۔ وہ نہایت دین دار اور شریعت کے پابند نکلے اور انھوں نے مجھے سختی سے پردہ کروایا، جب میں نے گھر میں ترجمے کے ساتھ قرآن پاک پڑھا تو سمجھ میں آیا کہ یہ تو اللہ کا حکم ہے۔ لیکن ہم خواتین ناسمجھی اور جہالت میں بے پردہ پھرتی رہتی ہیں۔

اولاد

اللہ تعالیٰ نے مجھے دو بیٹوں اور دو بیٹیوں سے نوازا۔ اسد نے آکسفورڈ اور ماجد نے کیمبرج سے تعلیم حاصل کی۔ ساتھ ہی دونوں نے خوب کرکٹ بھی کھیلی۔ اسد نے آکسفورڈ میں اپنے ہنر دکھائے جبکہ ماجد جہانگیر میدانِ کرکٹ میں وطن عزیز کی خدمت میں مصروف رہے۔ بڑی بیٹی نے شادی سے پہلے ہوم اکنامکس کالج سے بی۔ ایس۔ سی جبکہ چھوٹی نے لاہور کالج سے بی۔ اے کیا۔

میں نے ۱۲ نومبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان گرل گائیڈز میں شمولیت اختیار کی۔ تنظیم کا قیام بھی اسی وقت عمل میں آیا۔ شمولیت کا مقصد مخلوقِ خدا کی راہنمائی اور انھیں سیدھے راستے پر چلانے کی کوشش کرنا تھا۔ میں اپنی قوم کی بچیوں کو مضبوط کردار کی مالک، پُراعتماد، ہنرمند، بااخلاق، دوراندیش، مہربان، دوسروں کی مددگار، باہمت، کفایت شعار اور امانت دار دیکھنا چاہتی تھی۔ یہی گرل گائیڈز کا ماٹو تھا۔

اپوا میں شمولیت

۱۹۴۹ء میں اپوا کا قیام عمل میں آیا۔ جن دنوں میں اپوا میں شامل ہوئی، اس کا ماحول بہت اچھا تھا۔ تمام خواتین مہذب اور بااخلاق تھیں۔ ۵۰ء کی دہائی میں جب پاکستان اور امریکہ کی دوستی ہوئی اور پاکستان میں امریکی امداد آنا شروع ہوئی، تب اپوا کی طرف سے کئی لوگوں نے سکول کھولے۔ میں نے بھی گھر میں سکول کھول لیا۔

زمان پارک کے گرداگرد ان دنوں خالی زمین تھی جہاں غریب لوگوں نے جھونپڑیاں بنا رکھی تھیں۔ وہیں گوالوں کی بستی بھی تھی۔ میں نے جب گھر کے اردگرد گندا ماحول دیکھا تو مجھے ان بچوں کی فکر ہوئی۔ میں ان بچوں سے پوچھتی کہ کیا آپ پڑھو گے تو وہ بہت شوق سے کہتے "جی ہم ضرور پڑھیں گے"، میں نے اللہ کا نام لے کر اپوا کی طرف سے سکول اپنے گھر میں بھی کھول لیا۔ یوں زمان پارک کی کوٹھیوں کے کوارٹروں اور محلے کے غریب گھروں سے ۳۲ لڑکے

www.urdudigest.pk

پڑھنے آنے لگے۔ یہ ایک پرائمری سکول تھا۔ اپوا کی لاگ بک میں سکول کے متعلق لکھا جاتا ''یہ ایک ماڈل سکول ہے۔'' پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد یہ بچے دوسرے سکولوں میں داخلہ لیتے۔ یوں یہ سلسلہ کئی سال چلتا رہا۔

بھٹو دور میں قومیائے جانے کی وجہ سے یہ سکول ختم ہوگیا۔ اس کا خاتمہ ایک دلخراش داستان ہے۔ بعض اوقات حکمرانوں کے مفادات قوموں کی تاریخ کو سنگین موڑ پر لا کھڑا کرتے ہیں۔ ہمارا ذاتی گھر بھی سکول کی وجہ سے شاید قومی تحویل میں چلا جاتا۔

کارخانے، فیکٹریاں ہر چیز، ہر ادارہ قومی تحویل میں لے لیا گیا۔ یہ سراسر ناانصافی تھی مگر حکومت کے غلط فیصلے کے آگے سب لوگ بے بس ہو گئے۔ بعد میں حکومت سے نہ تو سکول چلے اور نہ ہی کارخانے، یوں معیشت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی۔

مغرب پرست خواتین کی تنظیم

۱۹۷۹ء میں ضیاء الحق کا دور آیا تو انھوں نے اصلاح کے لیے تمام خواتین کو چادریں اوڑھنے کا حکم جاری کیا۔ فیشن ڈیزائنر سے کہا گیا کہ وہ ایسے لباس متعارف کروائیں جس میں بڑی چادریں باریک دوپٹوں کی جگہ لیں۔ یوں کارخانوں میں تھری پیس سوٹ بننے شروع ہوئے۔

ضیاء الحق کے اس اقدام سے مغرب پرست طبقے میں کھلبلی مچ گئی۔ یہ خواتین سرے سے دوپٹا لینا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔ انھوں نے ''ویف'' نامی تنظیم بنائی اور اس کا ایک اجلاس بلایا۔

وائٹ ہاؤس جو زمان پارک کے قریب ہی واقع ہے، وہاں ان خواتین کا اجلاس ہوا۔ مجھے بھی بلایا گیا۔ ویف والوں نے پردے کے خلاف کتابچے چھاپ رکھے تھے اور سیاہ چادریں لی ہوئی تھیں۔ انھوں نے پردے کے خلاف تقریریں کیں۔

میں نے جب ان کے خیالات سنے تو مجھے بہت دکھ ہوا۔ مجھے بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ کیوں نہ ہم شر توڑنے کے لیے خیر و بھلائی کا کچھ اقدام کریں۔ چنانچہ میں نے دینی ذہن کی حامل خواتین کی تنظیم بنانے کا ارادہ کیا۔ میں نے اپوا کی راہنما بیگم خورشید نیازی کے ساتھ بیگم مودودی، سابق وزیرِ اعلیٰ پرویز الٰہی کی اہلیہ قیصر پرویز، ماڈل ٹاؤن کلب کی صدر بیگم منور علی اور نثار فاطمہ صاحبہ سے ملاقاتیں کیں۔ بیگم نثار فاطمہ نے بڑھ کر ہمارا ساتھ دیا اور کہا ''میں آپ کے ساتھ مل کر تنظیم بناؤں گی جو ویف کے غلط اقدامات کے خلاف کام کرے گی۔''

پاک انجمن خواتین

یوں ہماری پاک انجمن خواتین کا قیام عمل میں آیا۔ ہم نے سب سے پہلے جنرل ضیاء الحق کی بیگم کو چادریں بنوا کر بھیجیں۔ یوں حکومت نے پھر ملک میں یہ رواج پھیلایا کہ خواتین چادر اوڑھ کر باہر نکلیں۔ ہم سب نے مل کر پھر نثار فاطمہ کو رکن قومی اسمبلی بنوایا تاکہ وہ پارلیمان میں بیٹھ کر حق کی بات کر سکیں۔

میں نے پھر اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر فی سبیل اللہ ٹرسٹ قائم کیا۔ شیخوپورہ روڈ پر یوسف

''جنرل ضیاالحق کے حکم سے مغرب پرست خواتین میں کھلبلی مچ گئی''

www.urdudigest.pk

پارک واقع ہے۔ وہاں ایک مسلم لیگی راہنما کے گھر میں ہم نے ڈسپنسری کھولی۔ ہمارے ساتھ دو لیڈی ڈاکٹر اور چند دیگر خواتین تھیں۔ گاؤں کی کافی عورتیں اور بچے آجاتے۔ سبھی کو مفت دوائیاں ملتیں۔ ساتھ ہی ان کی دینی تربیت بھی کی جاتی۔

یوں اس کمرے میں ایک ڈسپنسری بنا کر ہم نے کام کا آغاز کیا۔ اب اس کے ساتھ پرائمری سکول اور سلائی سکول بھی کام کر رہے ہیں۔ سکول کا نام ''فی سبیل اللہ ٹرسٹ گرلز سکول'' ہے۔

درویشی ہے ہمارا وتیرہ

میرا مزاج شروع سے سادہ رہا۔ میں نے ہمیشہ اپنے گھر کو تزئین و آرائش سے مبرا رکھا۔ گھر میں آرام دہ فرنیچر ضرور ہے مگر سامانِ آرائش کبھی نہیں خریدا۔ میرا نظریہ ہے کہ گھر رہنے کی جگہ ہے، سجانے کی نہیں۔ جو آرام اور سکون انسان کو سادگی میں ملتا ہے، وہ تکلف میں نہیں۔ بہت سارا سامان اکٹھا کر لینے کے بعد سارا دن ان کی جھاڑ پونچھ میں لگ جاتا ہے۔ نہ معلوم لوگ اپنے گھر اتنا سجاتے کیوں ہیں؟

جب ہم نے نیا گھر بنایا تو میری بیٹی سارہ کی سہیلیاں تحائف لے آئیں۔ یوں ہمارے گھر میں چند سجاوٹی اشیا احباب کی عنایت ہیں۔ سیدھا سادا صاف ستھرا گھر دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے۔ حد سے زیادہ سجے گھر دیکھ کر دوسروں کے دلوں میں ویسے بھی احساسِ کمتری جنم لیتا ہے۔

عورت کا مقام

میں ہمیشہ عورتوں کو باوقار دیکھنا چاہتی ہوں۔ تمام مسلمان بچیوں کو میرا پیغام ہے کہ اگر وہ برقع نہیں پہنتیں تو کم از کم سر ضرور ڈھانپ کر رکھیں۔ ان کے بدن پر بھی لباس پورا ہونا چاہیے۔ جب بھی گھر سے باہر قدم نکالیں، جسم اور سر لپیٹ کر نکلیں۔

صنفِ نازک کا کامل نمونہ

بیگم نعیمہ جہانگیر کی بڑی صاحب زادی اپنی والدہ کے متعلق کچھ یوں اظہارِ خیال کرتی ہیں:

میری والدہ غیر معمولی شخصیت کی مالک، نہایت دبنگ اور حتمی رائے رکھنے والی خاتون تھیں۔ صورت و سیرت میں اپنی مثال آپ تھیں۔ دراز قد، گوری چٹی، ستواں ناک، بیضوی چہرے اور لمبے بالوں والی دلکش خاتون تھیں۔ انھیں نسوانی حسن کا مرقع کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ اپنے شوہر کی قابلِ افتخار بیوی اور اپنے سسرال کی منظورِ نظر بہو تھیں۔

ہمارے خاندان بھر میں کوئی ان کی رائے سے اختلاف کرنے کی ہمت نہ رکھتا۔ کیونکہ بات حق پر ہوتی اور سچی بات کرنے میں انھوں نے کبھی جھجک یا تامل محسوس نہیں کیا نہ ہی کسی مصلحت کو آڑے آنے دیا۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

ہمارے خاندان کے لوگ کہتے، کلمۂ حق کہنا کوئی ان سے سیکھے۔ امی کے چچا جب بھی ان سے ملنے آتے، کہتے: ''کاکی تو ں لیڈر ایں۔''

امی میں خداداد انتظامی صلاحیتیں تھیں اسی لیے وہ گرل گائیڈز اور اپوا کے کام بخوبی انجام دیتیں۔ یوں ترقی کرتے کرتے لاہور کی کمشنر بن گئیں۔ میں نے امی کو کبھی فارغ بیٹھے نہیں دیکھا۔ دوسروں کے دکھ درد بغور سنتیں اور ان کے مسائل حل کرنے کی حتیٰ المقدور کوشش بھی کرتیں۔ امی سادہ طبیعت کی مالک تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کے علاوہ انھیں معاشرے میں بلند مقام بھی دیا۔ ان کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہنے والے شوہر موجود تھے جو سماجی کاموں کے لیے ان کی راہ ہموار کرتے اور حوصلہ افزائی فرماتے۔ امی بھی ہر معاملے میں ابو کے کہنے پر چلتی رہیں حتیٰ کہ لباس بھی ان کی پسند کا پہنتیں۔ ابو کو ساڑھی ناپسند تھی، کہتے کہ یہ ہندوانہ لباس ہے۔ اسی لیے امی نے تمام عمر ساڑھی نہیں

www.urdudigest.pk

پہنی۔ ابو کے بھرپور پیار نے انھیں خود اعتمادی دی۔

امی ملازمین پر بے حد شفقت فرماتیں۔ ملازمین کی ضروریات کے ساتھ ان کی عزت کا خیال رکھنا بڑے لوگوں کا خاص وصف ہے۔

صحن میں ٹاٹ بچھ جاتے۔ بچے اونچی آواز میں پہاڑے یاد کرتے:۔

اِک دُونی دُونی دو دُونی چار

یوں ہم نے بھی ان کے گرد گھومتے پھرتے پہاڑے یاد کر لیے جو ہمارے بہت کام آئے۔ اکثر ان کی جماعت گھر کے صحن میں واقع اس پیڑ کے نیچے لگتی جس میں بہت رسیلے اور میٹھے آم لگا کرتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ بچوں کو پڑھانے سے پہلے ان سے درود شریف ضرور سنتیں۔ بچے پہلے اونچی آواز میں درود شریف پڑھتے پھر پڑھائی شروع ہوتی۔

امی نے زندگی کے آخری دس سال امراضِ قلب اور فالج جیسی بیماریوں کے ساتھ گزارے مگر ان کے اندر اتنی طاقت تھی کہ بیماریوں کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا۔ دس سال وہ وہیل چیئر پر رہیں، ان کا ایک ہاتھ نہیں چلتا تھا، مگر اپنی کوشش سے اسے چلایا اور اسی ہاتھ سے دستخط بھی کرتیں۔ امی کی زندگی مخصوص دائروں میں گھومتی رہی جس میں گرل گائیڈز، اپوا، فی سبیل اللہ ٹرسٹ، لیڈیز کلب، گورمانی ہاؤس اور تعلیم نسواں ٹرسٹ شامل تھے۔

ایک باہمت خاتون

رخسانہ صاحبہ نعیمہ جہانگیر کی قریبی عزیزہ ہیں۔ وہ ان کے بارے میں بتاتی ہیں:

''نعیمہ آپا باہمت خاتون تھیں۔ میں نے انھیں آخر وقت تک کسی نہ کسی کام میں مصروف پایا۔ وہ شدید بیماری کے باوجود اونچے نیچے راستے کی مشکلات عبور کرتے ہوئے اپنی وہیل چیئر پر بیٹھ کر سکول کے سالانہ جلسہ میں تشریف لائیں تو حاضرین محفل حیرت و مسرت سے

بیگم نعیمہ جہانگیر لاہور کی معروف سماجی راہنما رہی ہیں۔ ۱۱ جنوری ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئیں۔ یکم جنوری ۲۰۱۰ء کو وفات پائی۔ مرحومہ کی یادداشتیں آسیہ راشدہ صاحبہ نے قلم بند کیں جن کا خلاصہ آپ کے زیرِ مطالعہ ہے۔ بیگم نعیمہ کی زندگی دورِ جدید کی خواتین کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ پاکستانی کرکٹ ٹیم کے مشہور بلے باز، ماجد خان کی والدہ اور نامور گیند باز عمران خان کی خالہ تھیں۔

اتنی ضعیف العمری میں بھی وہ اللہ کی راہ کے کسی کام میں پیچھے ہٹنے والی نہیں تھیں

جب بندہ اللہ کی راہ میں کام کرنے کے لیے نکلے، تو وہ بھی بڑھ کر اپنے بندوں کے ذریعے اس کی مدد کرتا ہے۔ یوں حیرت انگیز طریقے سے اس کے بھی کام ہو جاتے ہیں

ششدر رہ گئے۔

ہمیں ان پر فخر ہونا چاہیے

رضوانہ صاحبہ، نعیمہ مرحومہ کے چچازاد، ہمایوں زمان خان کی بیٹی ہونے کے علاوہ ان کی منہ بولی بہن بھی ہیں۔ وہ مرحومہ کے متعلق بتاتی ہیں: ''جن دنوں میں کیلی فورنیا میں مقیم تھی، تو وہاں میں نے بیشتر لوگوں کو تین قسم کے کام کرتے دیکھا:

۱۔ ایک کام ان کی ملازمت تھی جو ہر کوئی کرتا۔

۲۔ دوسرے وہ کوئی نہ کوئی رضا کارانہ سرگرمی اپناتے ۳۔ تیسرے اردگرد کے لوگوں سے ملاقاتیں کر کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرنا۔

میں نے نعیمہ آپا میں تینوں طرح کی خصوصیات دیکھیں۔

مغربی دنیا کے لوگ سینٹ ویلنٹائن جیسی شخصیات کی یاد مناتے ہیں۔ لیکن ہمیں اپنے ملک میں نعیمہ آپا جیسی محبت کرنے والی اور انسان دوست شخصیات کی یاد منانی چاہیے۔''■

باتیں دانش کی

رفیدہ کلیم فاروقی

کہا ارسطو نے:

۱۔ دوست کیا ہے؟ دو جسموں میں ایک روح۔

۲۔ تعلیم کی جڑیں کڑوی لیکن پھل میٹھا ہوتا ہے۔

۳۔ خوشی کا انحصار ہم پر ہے۔

۴۔ علم خوشحالی میں اور زیور زبوں حالی میں ایک پناہ گاہ ہے۔

۵۔ غربت انقلاب اور جرم کی ماں ہے۔

۶۔ بچوں کو تعلیم دینے والے انھیں پیدا کرنے والوں سے بہتر ہیں کیونکہ وہ تو صرف بچوں کو زندگی دیتے ہیں جبکہ معلم زندگی کو بہتر طریقے سے گزارنا سکھاتے ہیں۔

۷۔ جو سب کا دوست ہو وہ کسی کا دوست نہیں ہوتا۔

۸۔ انسان تمام جانوروں میں شریف ترین ہے: لیکن اگر قانون اور انصاف سے علیحدہ کر دیا جائے تو وہ بدترین ہے۔

۹۔ اپنی خواہشات کو اپنے موجودہ وسائل کے دائرے میں لاؤ، اور صرف اس وقت بڑھاؤ جب وسائل بڑھ جائیں۔

۱۰۔ جو اچھا حکمران ہونا چاہتا ہو اسے پہلے اچھا محکوم ہونا چاہیے۔

۱۱۔ سب سے مشکل فتح اپنے آپ پر ہوتی ہے۔

۱۲۔ آرٹ کا مقصد اشیا کی ظاہری ہیئت کے بجائے ان کی خفیہ معنویت کو نمایاں کرنا ہے۔

۱۳۔ میرے دوست! دنیا میں کوئی دوست نہیں۔

۱۴۔ ناامیدی کم عمری کا باعث ہوتی ہے۔

ارسطو

افلاطون کا شاگرد اور عظیم یونانی فاتح اسکندر اعظم کا استاد ارسطو ۳۸۴ ق م میں پیدا ہوا اور ۳۲۲ ق م میں فوت ہوا۔ اس کے نام کے معانی یونانی زبان میں ''بہترین مقصد'' کے ہیں۔ اور اس نے نام کی خصوصیت کو عملی طور پر ثابت کیا۔

اس نے طبیعیات، مابعد الطبیعیات، شاعری، تھیٹر، موسیقی، منطق، سیاسیات، حکومت، اخلاقیات، بیالوجی، اور زوالوجی علم البیان، فن خطابت، لسانیات غرضیکہ اس زمانے کے تقریباً تمام مروجہ علوم کا مطالعہ کیا اور افلاطون اور سقراط کی طرح مغربی فلسفہ، اخلاقیات، جمالیات، منطق، سائنس، سیاسیات اور مابعد الطبیعیات جیسے مضامین پر زبردست دسترس حاصل کی۔ زوالوجی کے متعلق اس کے بہت سے نظریات کی تصدیق انیسویں صدی میں ہی ممکن ہو سکی۔ اس کے نظریات و خیالات کے عیسائیت پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ارسطو کا بہت سا علمی ورثہ ضائع ہو چکا ہے۔ اگرچہ اس کے بہت سے سائنسی اور علمی نظریات غلط ثابت ہو چکے ہیں، جیسے زمین کائنات کا مرکز ہے یا بلندی سے گرائی جانے والی وزنی اشیا ہلکی چیزوں سے پہلے زمین پر پہنچتی ہیں لیکن آج بھی علمی حلقوں میں موضوع بحث ہیں اور ان کی اہمیت و افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ تحریک احیائے علوم سے قبل اور بعد کے یورپی مفکرین ارسطو سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ سسرو اس کے خیالات کے تاریخی اثاثے کو ''سونے کا دریا'' کا نام دیتا ہے۔

اس کا باپ شاہ مقدونیہ امنتاس کا ذاتی معالج تھا۔ غالباً اس کی ابتدائی زندگی شاہی محلات میں گزری اور ۱۸ سال کی عمر میں حصول علم کی غرض سے ایتھنز چلا گیا اور افلاطون کی شاگردی اختیار کی اور بیس سال تک تحصیل علم میں مشغول رہا اور استاد کی وفات کے بعد ترکی چلا گیا۔ اس نے پائھیاس کی بیٹی یا بھتیجی ہرمیاس سے شادی کی۔ ہرمیاس کی وفات کے بعد شاہ فلپ کی دعوت پر مقدونیہ چلا گیا اور شاہی اکیڈیمی کا صدر مدرس، اور اسکندر اعظم کا اتالیق بھی مقرر ہوا۔ اسی کی تحریک پر ارسطو نے مشرقی ممالک کی فتح کا منصوبہ بنایا اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

335 ق م میں وہ ایتھنز واپس آیا اور ''لائسیم'' کے نام سے اپنا مدرسہ قائم کیا۔ اس کی بہت سی تصنیفات 335 سے 323 ق م کے دوران پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔

کہا ابنِ رُشد نے:

۱۔غماز ایک لمحے میں ایک سال کا فتنہ اٹھا سکتا ہے۔

۲۔طالب دنیا اس پیاسے کی طرح ہے جو سمندر کے پانی سے اپنی پیاس بجھا سکتا رہا ہو، جتنا پیئے گا پیاس اتنی ہی بڑھے گی اور بالآخر ہلاک ہو جائے گا۔

۳۔کتنا خوش قسمت ہے وہ انسان جس کی زندگی کا انجام اس کے آغاز جیسا ہو۔

۴۔سچائیاں ایک دوسرے کی نفی نہیں کر سکتیں۔

۵۔دوست کا دیا ہوا زخم دشمن کے دیے ہوئے زخم سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

۶۔عقل قانون کی ساتھی ہے۔

۷۔علم مادے اور ذہانت کی مطابقت ہے۔

۸۔(ہمارا) ہونا علم کی وجہ اور سبب ہے، جبکہ دائمی علم ہونے کا سبب اور وجہ ہے۔

ابنِ رُشد:

ابوالولید محمد ابنِ رُشد 1126ء کو قرطبہ، اندلس میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے قانون اور طب کی تعلیم حاصل کی۔ 1169ء میں انھیں اشبیلیہ کا منصف مقرر کیا گیا۔ انھوں نے ارسطو کی کتاب ''روح کا'' ترجمہ کیا۔ 1171ء کو انھیں قرطبہ کا قاضی بنایا گیا۔ وہ 10 سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔ 1182ء میں انھیں مراکش بلا کر خلیفہ کا طبیب نامزد کیا گیا۔ لیکن جلد ہی واپس قرطبہ کا صدر قاضی بنا دیا گیا۔ لیکن جلد ہی دینی علماء نے ان کی تصنیفات پر اعتراض اٹھائے اور انھیں بدعتی قرار دیا جس پر خلیفہ نے انھیں معزول کر کے لوسینا میں نظر بند کر دیا اور ان کی طب، ریاضی اور فلکیات کی کتب کے علاوہ باقی کتب کو جلانے کا حکم دیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد خلیفہ نے نظر بندی کا حکم واپس لے کر انھیں مراکش بلوا لیا۔ ابنِ رُشد کے علمی کام کو یورپ میں پذیرائی ملی۔ تیرھویں صدی عیسوی میں پیرس، آکسفورڈ اور کینٹر بری کے بشپس نے اس کے بعض مذہبی نظریات کی وجہ سے اس کی مخالفت کی جیسا کی اندلس کے مسلمان علماء نے کی تھی۔

ابن رشد کو مسلمان فلسفیوں میں بہت اہم مقام حاصل ہے۔ اس کے خیال میں مذہب اور فلسفہ میں کوئی تفاوت نہیں اگر انھیں اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ابن رشد نے خلیفہ کے حکم پر ایک طویل عرصے تک ارسطو کے افکار و نظریات کی تشریح کی۔ عیسائیت اور یہودیت پر اس کے نظریات کے اثرات بہت گہرے تھے جس کی وجہ سے ان دونوں مذاہب کے علماء اس کے مخالف تھے۔ اس نے الفارابی، ابن سینا اور الغزالی کے فلسفیانہ نظریات کی مخالفت کی۔ وہ انبیاء کو فلسفیوں سے عظیم تر گردانتا ہے۔ کیونکہ پیغمبروں کو اللہ تعالیٰ کی براہ راست راہنمائی حاصل ہوتی ہے اور وہ قانون بنا سکتے ہیں جبکہ فلسفی صرف عقل و وجدان کے بل پر نظریات پیش کرتا ہے، اور ضروری نہیں کہ ان کے نظریات اس قابل ہوں کہ ان پر قانون کی بنیاد رکھی جا سکے۔

ابن رشد نے ۱۰ر دسمبر ۱۱۹۸ء کو مراکش میں وفات پائی۔

باپ کے دشمن سے لیتے ہیں بہادر انتقام
آدمی کو دشمنِ شیطان ہونا چاہیے
(نیاز سواتی)

علامہ اقبالؒ کیمبرج میں مقیم تھے کہ ایک دن ان کی ہم عصروں سے مذہب پر بحث چھڑ گئی۔ ایک صاحب پوچھنے لگے ''مسٹر اقبال؟ یہ کیا بات ہے کہ جتنے بھی پیغمبر دنیا میں مذہب میں آئے وہ بلا استثنا ایشیا میں مبعوث ہوئے۔ یورپ میں ایک بھی پیدا نہ ہوا؟''

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ ''بھئی شروع شروع میں اللہ میاں اور شیطان نے اپنا اپنا پینترا جمالیا۔ اللہ میاں نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو، اسی لیے پیغمبر جو اللہ میاں کی طرف سے آئے، ایشیا میں مبعوث ہوئے۔''

وہ صاحب بول اُٹھے تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے؟ انھوں نے جواب دیا ''یہ تمھارے میکاولی اور مشہور اہلِ سیاست اسی کے تو رسول ہیں۔'' اس پر بہت قہقہہ پڑا۔

ایک مرتبہ علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔ ''ایک دن میں نے

محمود فیضانی

ایک حیران کن تحریر جو ان ناموں، جگہوں اور بیماریوں کا بھی احاطہ کر رہی ہے جو شیطان سے منسوب ہیں

دنیا شیطان کی

اس دشمنِ جان و ایمان کا تذکرہ کہ جسے جانتے سبھی ہیں اور مانتے بھی مگر پھر بھی اس سے دوری کی کوششوں میں کمی بیشی رہتی ہے

www.urdudigest.pk

دیکھا کہ شیطان میرے لان میں اطمینان سے بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ تمھیں اتنی زیادہ مصروفیات سے فراغت کیسے مل گئی؟ اس نے جواب دیا کہ ”میں نے اپنے زیادہ تر کام مغربی دنیا کے سیاست دانوں کے حوالے کر دیے ہیں۔“

علامہ اقبالؒ کی یہ باتیں گو مزاح میں کہی گئیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ شیطان سے منسوب تقریباً سبھی باتیں یورپ اور مغربی دنیا میں پائی جاتی ہیں۔

ایک شخص ہر برس ایک مرتبہ خاص گاؤں میں جاتا اور لوگوں سے پوچھتا کہ فلاں شخص کیسا ہے؟ کیا وہ خیریت سے ہے؟ لیکن اسے ملے بغیر واپس آ جاتا۔ آخر ایک بار اس سے کسی نے پوچھ لیا کہ اگر وہ تمھارا دوست ہے تو اسے ملتے کیوں نہیں؟ لوگوں کے اصرار پر اس نے بتایا کہ اصل میں، میں شیطان ہوں۔ اس گاؤں میں میری ڈیوٹی لگی تو میں نے اسی شخص کے ہاں کام کرنا چاہا۔ اس نے مجھے فصل بونے پر لگا دیا اور پوچھا کہ فصل بوؤ گے تو کونسا حصہ اپنے لیے رکھو گے؟ میں نے کہا کہ اوپر والا حصہ۔ اس نے مجھے آلو بونے کو کہا اور اس طرح سب کار آمد فصل خود لے گیا۔ دوسری دفعہ میں نے نچلا حصہ پسند کیا تو اس نے گندم بونے کا حکم دیا۔ تیسری دفعہ میں نے تنگ آ کر کہا کہ میں اوپر اور نیچے والا حصہ لوں گا۔ تم درمیان والا حصہ لینا۔ اس نے مکئی کی کاشت کرا دی اور درمیان سے سب بھٹے لے گیا۔

میں بھاگ کھڑا ہوا اور سوچا کہ میری اس جگہ کیا ضرورت ہے جب کہ میری فطرت کا ایک شخص یہاں موجود ہے۔ میں اب صرف یہ دیکھنے آتا ہوں کہ یہ جگہ اس شیطان نما انسان سے خالی تو نہیں ہوئی؟

ایک انسان کی شیطان سے ملاقات ہوئی تو اس نے شیطان کو بہت بُرا بھلا کہا۔ شیطان نے کہا کہ میں کیسے قصور وار ہوں۔ اب مشاہدہ کرو۔ شیطان نے پھر ایک دیوار پر تھوڑا سا گُڑ لگا دیا۔ اس پر مکھی آ کر بیٹھ گئی۔ ایک چھپکلی کی نظر پڑی تو مکھی کو ہڑپ کر گئی۔ بلی نے چھپکلی کو دیکھا تو اس پر لپکی۔ بلی کو دیکھ کر کتا اس پر حملہ آور ہوا۔ بلی کے مالک نے کتے کو مارا تو کتے کا مالک غضب ناک ہو کر بلی کے مالک سے جھگڑ پڑا۔ دونوں الجھ گئے تو ان کے ساتھی بھی آ گئے۔ پھر اچھی خاصی جنگ ہوئی جس میں کئی لوگ مارے گئے، کئی زخمی ہوئے۔

شیطان کہنے لگا ”دیکھ لو میرا کیا قصور ہے؟ میں نے تو صرف گُڑ لگایا ہے۔“

شیطان انٹرنیٹ پر

کمپیوٹر پر انٹرنیٹ سے رابطہ کرنے پر Satan لکھیں تو شیطان کے بارے میں بے شمار ویب سائٹس کھل جاتی ہیں جن کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ (۱۲۰۰۰۰۰۰)

چرچ آف شیطان

اس چرچ کی بنیاد سان فرانسسکو (امریکا) میں رکھی گئی۔ اسے Walpurgisnacht نامی مقام پر بنایا گیا۔ اس کا بانی انطون سازندور لیوے (Anton Szandor Lavey) نامی شخص تھا۔ یہ ۱۹۶۶ء کا واقعہ ہے۔ یہی شخص ۱۹۹۷ء میں اپنی وفات تک اس چرچ کا اعلیٰ پادری رہا۔ اس نے اپنے عقیدے پر Satanic Bible لکھی۔ اس کے علاوہ چار کتابیں لکھیں۔ اس عقیدے کے لوگ ”شیطانی“ (Satanist) کہلاتے ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق ہر شخص اپنا خدا خود بن سکتا ہے اور اپنی قسمت کا خود مالک ہو سکتا ہے۔

شیطان کا لفظ انٹرنیٹ سے متعلق ایک ادارے کا مخفف بھی ہے۔ پورا نام یہ ہے: (Security Administration Tool for Analysing Networks)

شیطان پورہ

التمش کے دور میں ایک عالم دین، نور الدین مبارک کا کہنا تھا کہ طوائفیں ختم نہیں کرنی چاہئیں، ورنہ لوگ

www.urdudigest.pk

شہوانی خواہشات کی تکمیل کے لیے شریف گھروں میں گھسیں گے۔ اکبر اعظم نے ساری طوائفیں ایک علاقے میں آباد کر کے علاقے کا نام شیطان پورہ رکھ دیا۔

شیطان کے چیلے

برطانوی سیاستدان، سر فرانسس ڈیش وُڈ (۱۷۸۱۔ ۱۷۷۱) بدنام زمانہ ہیل فائر (Hell fire club) کا بانی تھا۔ یوں اس کے اس نے شیطان سے ملاقات اور باتیں کرنے کے بعد شیطانی مسلک اختیار کیا۔ اس کی خصوصی محفلوں میں حصہ لینے والے مرد اور عورتیں راہب اور راہبہ کے لباس میں آ کر کھل کھیلتے تھے۔ اس کا ”عبادت خانہ“ ہندوستان کے قدیم مندروں کی طرح عریاں مناظر والے مجسموں اور تصویروں سے اٹا پڑا تھا۔

شیطان رُشدی

ایک ہندوستانی نژاد برطانوی شہری، سلمان رشدی نے ایک بدنام زمانہ کتاب لکھی۔ ایران کے مذہبی رہنما آیت اللہ خمینی نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا۔ اب وہ جان بچانے کے لیے طاغوتی طاقتوں کی حفاظت میں چھپ کر زندگی گزار رہا ہے۔ یوں تو ہر وہ شخص شیطان کا پیروکار ہو سکتا ہے جو اس کے راستے پر چلتا ہو لیکن بعض لوگ اس راستے پر بہت آگے جا چکے۔

کردستان (عراق) کا شیطان پرست قبیلہ

کردستان میں روایت مشہور ہے کہ یزید بن معاویہؓ کی مسلمان فوجوں نے حضرت امام حسینؓ اور ان کے اہل و عیال پر حملہ سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ بزداریوں (ایک قبیلے جسے واقعہ کربلا سے قبل نبرداری کیا جاتا تھا) کو گھیر گھار کر لایا گیا اور معقول تنخواہیں دے کر حضرت امام حسینؓ کے خلاف جنگ کرائی گئی۔ اس واقعہ کربلا کے بعد یہ کُرد قبیلہ، یزیدی کے نام سے مشہور ہو گیا۔

یزیدی دن میں ۳ نمازیں پڑھتے ہیں مگر ان کے اوقات وہ ہیں جن میں نماز پڑھنے سے مسلمانوں کو منع کیا گیا۔ وہ ابلیس کو خدا مانتے اور کہتے ہیں کہ ابلیس خدا کا دوست تھا۔ دونوں نے مل کر زمین و آسمان بنائے مگر کسی وجہ سے دونوں میں اختلاف ہو گیا۔ ابلیس کمزور تھا، اس لیے اسے خوار کر دیا گیا۔

یزیدیوں نے ابلیس کو اپنا خدا بنایا اور تمام صفاتِ الٰہی کو اس کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ یہ لوگ اپنے ”خدا“ کی تعظیم اس حد تک کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک شیطان اور ابلیس کا لفظ زبان سے نکالنا سخت منع ہے۔ اسی لیے انھوں نے اس کا نام ”ملک طاؤس“ تجویز کر رکھا ہے۔

شیطان اینسے (Devil Anse)

ویسٹ ورجینیا (امریکا) کے جنوب مغربی کونے کی تاریخ تشدد سے عبارت رہی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں یہاں کان کنوں اور کان مالکوں کے درمیان جھگڑے ہوئے اور قتل و غارت تک نوبت پہنچتی رہی۔ نیٹ فیلڈ اور میکائے خاندانوں کی لڑائی زیادہ عرصہ تک چلی اور مشہور ہوئی۔ اینسے ہیٹ فیلڈ جو شیطان اینسے کے نام سے مشہور ہوا، اپنے پاس دو پستول رکھتا تھا۔ ان جنگوں میں یہ جنگی ترانہ بہت مشہور ہوا جو شیطان اینسے کے بارے میں تھا۔

☆☆

”ایک ہیٹ فیلڈ شخص باہر گیا اور ناشتے سے پہلے ۷ اشخاص کو مار ڈالا، پھر وہ واپس آیا اور ۷ انڈے کھا گیا۔ ہر مقتول کے بدلے میں ایک انڈا۔“

شیطان کا وکیل (Devil's advocate)

رومن کیتھولک چرچ میں اس شخص کو شیطان کا وکیل کہا جاتا ہے جس کے فرائض میں ہر اُس شخص کا باریک بینی سے جائزہ لینا شامل ہے جسے مذہبی اعزاز دیا گیا ہو۔ اسے سب حقائق پیش کرنے ہوتے ہیں چاہے وہ اُمیدوار کے لیے کس قدر ناخوشگوار ہوں۔ ایسے شخص کو بھی کہا جاتا ہے جو

اختلاف پیدا کرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی اُچھالنے کا عادی ہو۔

شیطان کے رشتے دار

افریقی ملک لائبیریا کے اندرونی علاقے کا ایک قبیلہ گورزیس (Guerzes) 'اخوان الشیطان' (Brotherhood of devil) نامی تنظیم کا رکن ہے۔ یہ لوگ مختلف بے جان چیزوں کی پرستش بھی کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے معبود شیطان کے لیے ایک خاص قسم کی جھونپڑی بناتے ہیں جس میں اس کی مختلف تصاویر بنی ہوتی ہیں۔ یہ جھونپڑی جو ان کی عبادت گاہ ہوتی ہے، گاؤں سے باہر الگ جگہ بنائی جاتی ہے۔

قرآن میں فضول خرچ لوگوں کو شیطان کے بھائی قرار دیا گیا ہے۔

شیطان کا بیٹا

یونان کے شمالی علاقے میں واقع ایک انتہائی قدیم عیسائی عبادت گاہ میں عورتوں کا داخلہ قطعی ممنوع ہے۔ یہ پابندی ۱۰۶۰ء سے اب تک نافذ ہے۔ کچھ عرصہ قبل یورپین یونین نے ایک ایسے معاہدے پر غور کیا جس کی رُو سے یورپ کے رکن ممالک کے لوگ پابندی یا ویزا کے بغیر کسی بھی جگہ جاسکیں گے۔ انھیں یورپین کارڈ جاری کیے جائیں گے جن کی مدد سے انھیں کسی بھی یورپی ملک میں آنے جانے کی آزادی ہوگی۔

اس قدیم یونانی چرچ کے پادریوں نے تجویز کی سختی سے مخالفت کی اور کہا کہ یہ تو سراسر شیطانی منصوبہ ہے۔ اس کا سبب انھوں نے یہ بتایا کہ ایسے چند کارڈز میں ۶۶۶ کا ہندسہ بھی درج ہے۔ ان پادریوں کے نزدیک ۶۶۶ ہندسے کا تعلق براہِ راست شیطان کے فرزند سے ہے۔ اس انکشاف سے حیرت ہوئی کہ پادری حضرات حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو تو خدا کا بیٹا

www.urdudigest.pk

پکارتے ہی ہیں، مگر انھوں نے شیطان کا بیٹا بھی دریافت کرلیا۔ شاید وہ شیطان کے باقی رشتے داروں کا بھی انکشاف کردیں۔

مصر میں شیطانی فرقے کے خلاف کارروائی

مصر میں پولیس نے شیطان کی پرستش کرنے والے فرقے کے خلاف کارروائی کی اور ۱۷ سے ۲۰ سال کی عمر کے ۷۶ نوجوانوں کو گرفتار کرلیا۔ ان نوجوانوں کا تعلق خوش حال گھرانوں سے ہے۔ یہ ہر قسم کے گناہ کرنے کو کارِ ثواب قرار دیتے ہیں۔ مفرورین میں ایک مشہور اداکارہ کی بیٹی بھی شامل ہے۔

یہ گروہ رمضان المبارک میں اپنی کارروائیوں کے دوران پکڑا گیا۔ وزیر داخلہ نے ٹیلی ویژن پر اعلان کیا کہ اس فرقے کے تمام لوگ پکڑے جائیں گے خواہ وہ کتنے ہی بااثر خاندانوں کے ہوں۔ جامعہ ازہر کے شیخ نے کہا

www.urdudigest.pk

کہ یہ سب کچھ معاشرے میں ہماری اقدار کو تباہ کرنے کی گہری سازش ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے اسلامی عناصر نے اسلام کو تشدد کا مذہب بنا دیا ہے۔ اس لیے نوجوان مذہب سے دور ہیں اور ان خیالات کو قبول کررہے ہیں۔

ایک پروفیسر نے کہا کہ جمہوریت کے نہ ہونے سے بھی لوگ غیر فطری رجحانات اور گناہ آلودہ زندگی کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ ذہنی خلا کی حالت میں غلط نظریات ذہن پر قبضہ کرلیتے ہیں۔ جو لوگ گرفتار کیے گئے انھوں نے اپنے ۳ سو ساتھیوں کے نام بتائے۔ سب دولت مند تاجروں یا سرکاری افراد کی اولاد ہیں۔ ان کی محفلوں میں موسیقی، منشیات کے علاوہ بلیوں، کتوں اور پرندوں کا خون اپنے جسم پر لگانے کی رسم بھی ادا ہوتی تھی۔ مصر کے مفتی شیخ نصر واصل نے فتویٰ دیا کہ شیطان کی پرستش کرنے والے نوجوانوں میں جو اپنے عقائد سے توبہ نہ کریں، انھیں مرتد قرار دے کر سزائے موت دی جائے۔

شیطان سے منسوب

شیطان کی آنت اس چیز کو کہتے ہیں جو بے حد لمبی ہو۔

☆☆

شیطان کی کتاب (Devil's book) تاش کی گڈی کو کہتے ہیں۔

قربانی کا بکرا

لاوران (منگولیا) کی بدھ خانقاہ میں ہر سال ایک راہب کو شیطان قرار دے کر علاقہ بدر کردیا جاتا ہے۔ وہ اس علاقے سے ہمیشہ کے لیے غائب ہوجاتا ہے۔ یوں وہ مقامی روایت کے مطابق علاقے کے باشندوں کے گناہ اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

شیطان کی دکان (Devil's tavern)

یہ ایک شراب خانہ اور اشیائے خورونوش کی دکان تھی جو لندن میں ٹمپل بار اور مڈل ٹمپل گیٹ کے درمیان کھلی۔ یہ جگہ بادشاہ جیمز اول کے زمانے میں مشہور اور مقبول تھی جہاں اپالو کلب کے ارکان اس کے اوپر ایک کمرے میں محفل جمایا کرتے۔ غالباً اسی جگہ پیشہ قانون سے تعلق رکھنے والے وہ لوگ زیادہ جاتے جن کی پریکٹس کم چلتی تھی۔ اسی جگہ معروف وکیل اپنے زیادہ کام نمٹانے کے لیے بیکار وکیلوں سے کچھ کام کرالیا کرتے تھے۔ اسی سے ان وکیلوں کے لیے جو دوسرے وکلا کا کام کرتے تھے، شیطان کی اصلاح (Devil) رائج ہوئی۔

شیطان کا کام (Devil's work)

چین کے منگ شاہی خاندان کے زمانے میں چینی کے عمدہ قسم کے برتن بنتے تھے جو زیادہ تر بیرونی ممالک کو بھیجے جاتے۔ چونکہ اس کام میں بہت مہارت کی ضرورت ہوتی تھی، اس لیے اسے شیطان کا کام کہا جانے لگا۔

☆☆

سری لنکا کے بدھوں کا ایک ناچ ''شیطانی'' کہلاتا ہے۔ وہ خاص شکل کے نقاب پہن کر کیا جاتا ہے تاکہ کسی بیمار شخص کی بیماری یا بدقسمتی کو دور کیا جاسکے۔

شیطان کی جائیداد

فرانس میں ایک قلعہ شیطان کی ملکیت ہے۔ Chateau de tiffanges gilles de rais اس کا پورا نام ہے۔ ایک شخص، Gilles de Rais (۱۴۴۰-۱۴۰۴) نے باقاعدہ ایک قانونی دستاویز کی رو سے اپنی تمام جائیداد (ماسوائے اپنی ذات اور روح) شیطان کے نام کردی تھی۔

☆☆

طب کے شعبے میں بھی شیطان کو دخل حاصل ہوچکا، دو امراض اس سے منسوب ہیں:

Devil's pinches جلد کی ایک بیماری کو کہا جاتا ہے۔

www.urdudigest.pk

اس کے دوسرے نام یہ ہیں:

Vascular purpura

Non-thrombocytopenic purpura

Purpura simplex

Devil's grip (Pleuro-dynia) پٹھوں کا وبائی درد اور بخار ہے جو وائرس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا نام Bornholm disease ہے۔

☆☆

Devil's dung (ہینگ) مشہور چیز ہے جو بدبودار ہونے کے باوجود دواؤں اور خوراک میں استعمال ہوتی ہے۔ اسے شیطان کا گوبر بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا انگریزی نام Asafoetida ہے۔

☆☆

ریاضی کا شعبہ بھی شیطان کے ذکر سے خالی نہیں۔ ریاضی کا ایک فارمولا ہے Y4+my4-x4+nx2=0 اسے قوسِ شیطان (Devil's curve) اور شیطان دو چھڑیوں پر بھی کہا جاتا ہے۔

شیطانی دنیائے حیوانات میں

حیوانیات: میں بھی شیطان کو کسی حد تک نمائندگی حاصل ہے۔

(Devil ray یا Devil Fish) منطقہ حارہ کی ایک دیو قامت مچھلی ہے۔ اس کا سائنسی نام Manta birostris ہے۔ اس کا وزن ڈیڑھ ٹن سے بھی زیادہ ہوتا ہے اور پر کی لمبائی ۶ میٹر تک ہوتی ہے۔

کانٹے دار شیطان (Thorny Devil): ڈائنوسار جیسی شکل اور گلاب کی جھاڑی کی طرح بیرونی سطح رکھنے والا جانور آسٹریلیا کے ایلس سپرنگ قومی پارک میں پایا جاتا ہے۔ دیکھنے میں خطرناک لگتا ہے لیکن یہ آہستہ چلنے والا چھپکلی نما جانور صرف چیونٹیاں کھاتا ہے۔ جب اسے خوف زدہ کیا جائے تو اپنا سر ٹانگوں میں گھسیڑ لیتا ہے۔ سامنے گردن کا ابھار رہ جاتا ہے جو سر کی طرح لگتا ہے۔ خشک علاقے کا جانور ہے۔ اس کی جلد پر بنی چھوٹی چھوٹی نالیاں بارش اور شبنم کا پانی منہ تک پہنچاتی ہیں۔ یہ صرف ۶ انچ لمبا ہوتا ہے۔

تسمانیہ کا شیطان: یہ ایک تھیلی دار گوشت خور جانور ہے۔ اپنے بچوں کو کینگرو کی طرح تھیلی میں رکھتا ہے۔ اس کا چہرہ اور دانت بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ اس کا شمار خونخوار جانوروں میں ہوتا ہے۔ یہ صرف تسمانیہ (آسٹریلیا) کے دشوار گزار علاقوں میں پایا جاتا اور علاقے کے مرغی خانوں پر دھاوا بولتا ہے۔

پودوں کی دنیا

نباتات کی دنیا میں بھی شیطان کا کافی ذکر ہوتا ہے۔

شیطان کی چھڑی (Devil's walking stick) ایک کانٹے دار درخت کا نام ہے۔ یہ مشہور نباتات جن سنگ کی ایک قسم ہے۔ یہ درخت ۵۰ فٹ تک بلند ہوتا ہے۔ براعظم امریکا میں پایا جاتا ہے۔ اس کے دوسرے نام Hercules club اور Prickly ash ہیں۔

شیطان کی لکڑی (Devil's wood): اسے Tea Olive بھی کہا جاتا ہے۔ زیتون کی قسم کا ایک درخت شمالی امریکا اور میکسیکو میں پایا جاتا ہے۔ اس کے پتے خوشبودار چائے بنانے میں کام آتے ہیں۔ پھل کھانے کے قابل ہوتا ہے۔ اس کی لکڑی بہت پسند کی جاتی ہے۔

Devil's cotton (اُلٹ کمبل): ایک جھاڑی دار پودا۔ یوپی (بھارت) میں پایا جاتا ہے۔ بنگال میں بطور دوا قلت حیض اور درد میں استعمال ہے۔

تاریخ کے جھروکوں سے

تاریخ میں بعض جگہ شیطان کا ذکر ملتا ہے۔

بُرجِ شیطان (Devil's tower) اٹلی کے قلعہ پاپی کا بُرج ہے۔ اس کا نام کاؤنٹس ٹلڈا (کے نام) پر رکھا گیا جو ظلم کی وجہ سے عوام میں بے حد بدنام تھی۔

ایک دن غضب ناک ہجوم نے بُرج میں اس کا گھیراؤ

www.urdudigest.pk

کرلیا۔ ظالم عورت نے برج میں محصور رہ کر بھوکوں مرنا گوارا کرلیا لیکن اپنے آپ کو عوام کے حوالے نہ کیا۔

Devil's causeway: رومیوں کی بنائی ہوئی قدیم سڑک جو نارتھمبر لینڈ (برطانیہ) میں واقع ہے۔

(Devil's dyke) شیطانی پشتہ: برطانیہ میں متعدد قدیم و جدید پشتے اور حصار اس نام سے موسوم ہیں۔

جغرافیہ میں شیطان کا عمل دخل: جغرافیہ میں شیطان کی دسترس کچھ زیادہ ہی پائی جاتی ہے۔

شیطان کا جزیرہ Devil's island فرنچ گی آنا کے ساحل سے نزدیک بحراوقیانوس (Atlantic) میں واقع ہے۔ فرانسیسی میں اس کا نام Ile du diable ہے۔ یہاں فرانسیسی حکومت نے ایک تعزیری آبادی قائم کی تھی جہاں زیادہ خطرناک مجرم بھیجے جاتے۔ ۱۹۳۸ء میں اسے بند کر دیا گیا۔ جزیرے کا رقبہ صرف 410x1300 گز ہے اور یہ ناریل کے درختوں سے بھرپور ہے۔

(Devil's den) شیطانی بھٹ، امریکی شہر (Gettysburg) گیٹس برگ میں واقع ہے۔ اس جگہ امریکی خانہ جنگی کے دوران ایک تنگ درے کو پتھروں کی دیوار بنا کر مورچے کی شکل دی گئی۔ یہ مورچہ یکے بعد دیگرے جنگ کے دونوں فریقوں کے استعمال میں آیا۔ اسے (Devil's den) کا نام دیا گیا۔

(Devil's slide): تسمانیہ (آسٹریلیا) میں سمندر کے کنارے چٹانوں میں سمندر سے اٹھنے والی لہروں نے ایک شگاف بنا دیا ہے جو ۲۰۰ فٹ گہرا لیکن صرف چند فٹ چوڑا ہے۔ اسے شیطان کا باورچی خانہ کہا جاتا ہے۔

Devil's kitchen: امریکا کی ریاست (Utah) میں قدرتی طور پر بنی ہوئی ۲ متوازی چٹانیں ہیں وہ چوٹی سے دریا تک بتدریج نیچی ہوتی جاتی ہیں۔

شیطان کی چوٹی: جنوبی افریقہ کے شہر کیپ ٹاؤن کے مشہور پہاڑ Table mountain کے ایک حصے میں ۳۳۰۰ فٹ بلند (Devil's peak) شیطان کی چوٹی کہلاتی ہے۔ کیپ ٹاؤن یونیورسٹی اسی کے دامن میں واقع ہے۔

شیطان کا پہاڑ: دنیا کا سب سے گہرا آب درہ (Canyan) جہنم کا آب درہ کہلاتا ہے وہ امریکا کی ریاستوں، اوریگون اور اڈاہو کو جدا کرتا ہے۔ یہ کوہِ شیطان (Devil's mountain) سے شروع ہو کر نیچے سانپ دریا (Snake river) تک جاتا ہے۔ یہ دریا ۷۹۰۰ فٹ گہرائی پر واقع ہے۔

شیطان کا پُل: کارڈیگن شائر (برطانیہ) میں ایک گاؤں کا نام جو قریبی ندی پر بنے پل کی وجہ سے پڑا۔ نچلا پل جو راہبوں نے بنایا تھا، گیارہویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ بالائی پل ۱۷۵۴ء میں بنا۔

(Devil's beef tub) شیطانی خمی کھائی: ڈمفری شائر (برطانیہ) کی ایک گہری وادی کا نام جو پہاڑی علاقے میں واقع ہے۔

شیطان کی چمنی (Devil's chimney): یہ جزیرہ Puffin میں واقع ایک بلند چٹان ہے جہاں سمندری پرندے (Guillemots) بسیرا کرتے ہیں۔ جزیرے میں بنی دیگر نوکدار بلند چٹانیں سمندری پرندوں کے لیے قدرتی پناہ گاہ ثابت ہوتی ہیں۔

شیطان کی چھلانگیں: تین مخروطی شکل کی پہاڑیوں کا مقامی نام جو باسلمیئر، (سرے۔ انگلینڈ) سے ۵ میل شمال مغرب میں واقع ہے۔

(Devil's punch bowel) ڈیول پنچ باؤل: اس کا دوسرا نام Highcomb bottom ہے۔ یہ درختوں سے بھری ایک گہری وادی ہے۔

اسی نام کی ایک جگہ کاؤنٹی کیری، انگلستان میں ہے۔ یہ ایک ذخیرہ آب ہے۔ طبقات الارض کے بعض ماہرین کے مطابق یہ کسی پرانے آتش فشاں کا دہانہ ہے۔ یہ کافی گہرا ہے، قصبہ کلارنے کو یہاں سے پانی مہیا کیا جاتا ہے۔

Devil's bit mountain: ٹپی ایری (آئرلینڈ) کا ۱۵۷۷ فٹ بلند پہاڑ۔ نام اس کی بلند ترین چوٹی پر واقع ایک شگاف سے پڑا جو مقامی

www.urdudigest.pk

روایت کے مطابق شیطان کے دانتوں کے کاٹنے کی وجہ سے پیدا ہوا۔ شیطان نے چُونے کے پتھر کا ایک ٹکڑا کاٹا اور اسے تھوک دیا۔

شیطان کی جھیل (Devil's lake) کاؤنٹی رامسے، شمال مشرقی ڈکوٹا (ولایات متحدہ امریکا) میں واقع نمکین پانی کی جھیل ہے۔ کنارے پر اسی نام کا شہر آباد تھا لیکن جھیل کے سکڑنے سے اس کا خاتمہ ہوگیا۔

Devil's hole : بحراوقیانوس کا شمال مشرقی بازو جو برطانیہ اور شمال مغربی یورپ کے درمیان واقع ہے۔ اس میں کچھ گہرے حصے بھی موجود ہیں۔ جیسے مغربی حصے میں Devil's hole جو ایڈنبرا کے قریب ہے۔ اس کی گہرائی ۱۵۰۰رفٹ سے زیادہ ہے۔

کیوبا کی ایک سمندری کھاڑی بھی اسی نام سے موسوم ہے۔ یہ جگہ غوطہ خوروں میں بہت مقبول ہے۔ سیاحوں کو ترغیب دینے والی کتابوں میں اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ وہاں سمندری مخلوقات اور عجیب چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

شیطانی قومی یادگار: یہ مشرقی کیلی فورنیا (امریکا) میں تقریباً ۷۹۸/۱ ایکڑ رقبے پر بنی عجیب وغریب قدرتی عمودی چٹانیں ہیں۔ ۱۹۱۱ء میں انھیں قومی یادگار قرار دے کر محفوظ کرلیا گیا۔ سیاح کثیر تعداد میں انھیں دیکھنے آتے ہیں۔

مینار شیطان قومی یادگار (Devil's tower national mounment) امریکا میں سب سے پہلی قرار دی جانے والی قومی یادگار، شمال مشرقی وائی مونگ میں واقع یہ قدرتی چٹانی مینار ہے جو وادی سے ۱۳۰۰رفٹ بلند ہے۔ اس کی چوٹی ہموار سطح رکھتی ہے۔

شیطان کا گلا (Devil's throat): آبشار (Iguacu) ایک چٹانی تنگ جگہ سے گرتی ہے۔ یہی جگہ شیطان کا گلا کہلاتی ہے، یہ آبشار برازیل اور ارجنٹائن کے درمیان سرحد بناتی ہے۔ (جس طرح آبشار نیاگرا امریکا اور کینیڈا کے درمیان حد بناتی ہے)

۱۹۷۸ء میں جبوتی میں چند آتش فشانی دہانوں کے درمیان زمین پھٹنے سے ایک شگاف نمودار ہوا جو بڑھتا چلا گیا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اس طرح ایک نیا سمندر بننے کے امکانات ہیں۔ اس جگہ کو بھی شیطان کا گلا کہتے ہیں۔

شیطان کا گولف کورس (Devil's golf course): امریکا کی مشہور وادی موت (Death valley) کا سب سے نشیبی حصہ جو سطح سمندر سے ۳۰۰رفٹ نیچا ہے۔ وہاں گرمیوں میں درجہ حرارت ۱۴۸/ڈگری سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے۔

شیطانی رو (Devil's current): یہ خلیج باسفورس (ترکی) کے ایشیائی اور یورپی حصے کو جدا کرتی ہے۔ رومی حصار کے نیچے خلیج کے پانی کی رفتار تیز ہوکر ۴ میل فی گھنٹہ ہوجاتی ہے۔ ترک اس کو شیطانی رو کہتے ہیں۔

شیطان کی تکون (Devil's triangle): یہ برمودا تکون کا دوسرا نام ہے جو فلوریڈا (امریکا)، بہاماس اور کیوبا کے درمیان واقع ہے۔ اس جگہ سمندری اور ہوائی جہاز غائب ہوجاتے ہیں۔ سبب ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا۔

وادی شیطان: موصل (عراق) کے قریب ایک وادی اس نام سے موسوم ہے۔

شیطان: کوفہ (عراق) کے ایک محلہ تمیم کی ایک شاخ، شیطان بن زبیر کوفہ کے اس محلے میں آباد تھی۔ یہ محلہ اسی نام سے مشہور ہوگیا۔

☆☆

صنعتی میدان میں بھی شیطان کے داخلہ کو روکا نہیں جاسکا۔ ۱۸۰۰ء کے آغاز میں مغربی امریکا میں منظم انداز میں مویشی پالنا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ کسان اپنی زمین کے گرد باڑ نہیں بنا سکتے تھے۔ عمارتی سامان بھی اس قدر زیادہ مقدار میں دستیاب ہونا مشکل تھا۔ مگر کانٹے دار تار کی ایجاد نے کسانوں کی یہ مشکل آسان کر دی۔ اسے Devil's rope یعنی شیطان کی رسی کہا گیا۔ اس کے دوسرے نام Barbed wire یا Bob wire مشہور ہوئے۔

حفیظ جالندھری نے پیپر ویٹ اٹھا کر سکندر مرزا کو کیوں دے مارا؟

انوکھے لوگ، چشم کشا واقعات

محمود عزیز

جواہر ریزوں سے سجی ایک انوکھی لائبریری کے خالق کا قصہ جسے لطف اللہ خان نے بنایا اور سجایا، انہی کی کتاب ''تماشا اہل قلم'' سے تماشے کی چند باتیں جو اس لائبریری سے جڑی ہیں۔

ادیب ودانش ور، موسیقی اور سیر وسیاحت کے دلدادہ لطف اللہ خاں کو ان کی قیمتی آڈیو لائبریری کی وجہ سے یاد رکھا جائے گا جس میں انھوں نے علم وادب کی ممتاز شخصیات کے علمی، شعری، نثری یادداشتوں کو انہی کی آواز میں محفوظ کر رکھا تھا۔ ۹۴سال کی طویل عمر پانے والے لطف اللہ خاں نے کئی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ وہ ۲۵نومبر ۱۹۱۶ء کو چنائے (مدراس) میں پیدا ہوئے اور ۳مارچ ۲۰۱۲ء کو کراچی میں وفات پائی۔ انھوں نے اپنی کتاب ''تماشۂ اہل قلم'' میں تماشے کی جو باتیں لکھی ہیں، آیئے اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں:

حفیظ

صاحب کوئی مال دار شخص نہ تھے۔ روزمرہ کے اخراجات غالباً وہ مشاعروں کی شرکت سے پورے کرتے تھے یا پھر تصانیف کی رائلٹی پر گزر بسر ہوتی تھی۔ رائلٹی پر مجھے ایک واقعہ یاد آگیا جو حفیظ صاحب ہی سے متعلق ہے سن لیجیے! جب حفیظ صاحب سے میری راہ رسم بڑھی تو خیال آیا ان کی کہی ہوئی نعتوں کا ایک ایل۔ پی ریکارڈ تیار کرنا چاہیے۔ ایل پی ریکارڈ تیار ہوکر مارکیٹ میں آگیا مگر اس کا حشر جنگل میں مور کے ناچنے جیسا ہوا۔ ریکارڈ بنانے والی کمپنی نے اس کی تشہیر ہی نہیں کی تو بکری کیا خاک ہوتی۔ اس واقعے کے دو ایک سال بعد ایک دن حفیظ صاحب چیک لہراتے ہوئے میرے گھر آئے، دور ہی سے بولے ''خان جی'' آپ کے دوست منصور بخاری (مینجنگ ڈائریکٹر، ای ایم آئی) نے مجھے نہال کردیا'' میں فوراً سمجھ گیا یہ تعریفی جملہ ہو ہی نہیں سکتا۔ دراصل یہ چیک گراموفون کمپنی کی طرف سے بطور رائلٹی موصول ہوا تھا۔ رقم تھی کل ساڑھے چودہ روپے۔

حفیظ صاحب کی ایک خوبی کا تذکرہ لطف اللہ خاں جس طرح بیان کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حفیظ صاحب کی یہ خوبی اُن کو مہنگی پڑی۔ وہ کیسے ان ہی کی زبانی سنیے:

حفیظ صاحب کی ایک خوبی یہ تھی کہ جہاں قدرشناسی

www.urdudigest.pk

کے فن سے وہ بخوبی آگاہ تھے وہاں تجارتی پہلو پیش نظر رکھنا انھیں اچھی طرح آتا تھا۔ بچپن سے لے کر آغازِ جوانی تک انھیں دربدر کی خاک چھاننے سے زندگی کو عملی طور پر برتنے کا گُر ہاتھ آگیا تھا۔ جب ریکارڈنگ ختم ہوئی (حفیظ صاحب نے لطف اللہ خاں کی آڈیو لائبریری کے لیے اپنی نظمیں، غزلیں اور چند گیت اور کچھ آئٹم ریکارڈ کروائے تھے) اور جانے کے لیے تیار ہوئے تو میری بیوی نے حفیظ صاحب کا اخلاقی شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے پیار بھری نظروں سے زاہدہ کی طرف دیکھا اور مسکرا کے بولے۔ ''بیٹی'' آج میں نے آپ کے شوہر کی لائبریری کے لیے ڈھائی ہزار روپے کی ریکارڈنگ کروائی ہے۔''

لطف اللہ صاحب نے حفیظ صاحب کی زندگی کے اہم واقعات بھی ریکارڈ کر لیے تھے۔ لطف اللہ صاحب دو تین واقعات کی جزئیات کو محل نظر بھی سمجھتے ہیں۔ قومی ترانہ کے حوالے سے حفیظ صاحب کا قصہ لطف اللہ خاں صاحب کی زبانی سنیے۔ وہ کہتے ہیں کہ سردار عبدالرب نشتر جو ترانہ کمیٹی کے پہلے صدر تھے جب وہ پنجاب کے گورنر ہو کر لاہور چلے گئے تو وفاقی وزیر پیرزادہ عبدالستار کو ترانہ کمیٹی کا صدر بنا دیا گیا۔ پیرزادہ صاحب ہندوستانی علم موسیقی سے نہ صرف آشنا تھے بلکہ عملی طور پر بھی شغف رکھتے تھے۔ دھن تو منظور ہو ہی چکی تھی، اب اس پر الفاظ جڑنے کے کام پر توجہ ہونے لگی، یعنی گاڑی کو گھوڑے کے آگے جوتنے کا اہتمام ہونے لگا۔ شاعروں کو ترغیب دلانے کے لیے انعام واکرام مقرر کیے گئے۔ صرف شعرا ہی نہیں بلکہ اہلِ ذوق کو اذنِ عام ہوا کہ بنی بنائی دھن میں فٹ ہونے والے الفاظ تجویز کریں۔ بیسیوں تخلیقات زیرِغور آئیں۔ چھٹ چھٹا کر بالآخر دو شاعر مدمقابل آگئے۔ ایک تھے سیّد ذوالفقار علی بخاری اور دوسرے ابوالاثر حفیظ جالندھری۔ بخاری صاحب نے جو ''بندشیں'' پیش کی تھیں، بقول حفیظ صاحب اس کے الفاظ کچھ ایسے تھے جو لسانی اعتبار سے دُھن پر پورے نہیں اُتر رہے تھے یعنی انھیں توڑ مروڑ کر یا کھینچ تان کر فٹ کرنا پڑتا تھا۔ حفیظ صاحب نے ارکان کمیٹی کی توجہ اس سقم کی طرف دلائی۔ پیرزادہ صاحب کا جھکاؤ غالباً بخاری صاحب کے حق میں تھا۔ انھوں نے یہ لسانی سقم درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ حفیظ صاحب کب چپ رہنے والے تھے۔ بطور نمونہ خود پیرزادہ عبدالستار کا نام موڑ توڑ کر دُھن میں موزوں کیا اور ترنم سے سنا دیا، جس سے نام کی صوتی شکل بہت مضحکہ خیز بن گئی۔ ظاہر ہے کہ پیرزادہ صاحب کو یہ مظاہرہ برا لگا۔ ایک تو وفاقی وزیر، دوسرے صدر ترانہ کمیٹی، طیش میں آنے والی بات تو تھی ہی، کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور آستینیں چڑھالیں۔ بولے ''میں تمھارا منہ توڑ دوں گا۔'' حفیظ صاحب نے بھی تابڑ توڑ جواب دیا۔ ''میں تمھارا دانت توڑ دوں گا۔'' خیریت ہوئی کہ ممبروں نے بیچ بچاؤ کرایا ورنہ بات ہاتھا پائی تک پہنچ چکی تھی۔

لطف اللہ صاحب اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں کہ ذوالفقار علی بخاری، جو قومی ترانے کے مقابلے میں حفیظ صاحب کے حریف تھے، کسی زمانے میں حفیظ صاحب سے اِصلاح لیا کرتے تھے۔ حفیظ صاحب کے بیان سے ایسا لگتا ہے کہ ترانۂ پاکستان کے قضیے سے پہلے بھی آپس میں چشمک رہی تھی۔ مقابلہ ہوا تو کھل کر دونوں آمنے سامنے آگئے۔ بخاری صاحب کی ریشہ دوانیوں سے زچ ہو کر حفیظ صاحب نے ایک جگہ یہ بیان ریکارڈ کرایا ''سیّد ذوالفقار بخاری میری ذہنی اولاد ہیں۔ یعنی ایک شعر کا مصرع انھوں نے لکھا اور دس شعر میں نے کہہ کر ان کی غزل پوری کر دی،

صدر ترانہ کمیٹی نے غصے سے کہا میں تمھارا منہ توڑ دوں گا۔
وہ بولے میں تمھارے دانت توڑ دوں گا۔

www.urdudigest.pk

یہ زمانہ بھی رہا ہے، وہ انکار نہیں کر سکتے کیوں کہ میرے پاس ایسی چیزوں کا ریکارڈ رہتا ہے۔'' حفیظ صاحب نے اپنی مشہور غزل انہی حالات سے متاثر ہو کر کہی تھی۔ اس کا مطلع ہے ''عرضِ ہنر بھی وجہِ شکایات ہوگئی۔''

حفیظ صاحب کا ایک اور واقعہ ایفرو ایشین کانفرنس کے بارے میں ہے جو ۱۹۵۸ء کے دوران تاشقند میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں حفیظ اور فیض صاحبان نے شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس کے دوران چند اہم موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ جب فیض صاحب نے پاکستان کے مستقبل کے بارے میں اپنے ''مخصوص'' خیالات کا برملا اظہار کیا تو حفیظ صاحب نے بڑے تلخ لہجے میں کہا ''مجھے خیال نہیں تھا کہ آپ پاکستان کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔''

اس ریکارڈنگ میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ روسی نمائندوں نے حفیظ صاحب کو اپنا ہم خیال و ہم نوا بنانے کے عوض تیس لاکھ روپے کی پیش کش کی تھی (جسے قبول کر لینے کی فیض صاحب نے صلاح دی تھی) حفیظ صاحب نے یہ پیش کش ٹھکرا دی۔ یہ رویہ دیکھ کر روسی اہل کار حیران رہ گئے۔ سُنا ہے کہ اس سودے کے نتائج کی تصدیق اس خط سے ہوتی ہے جسے روس میں متعین پاکستانی سفیر نے وزیرِخارجہ پاکستان کو بھیجا تھا۔ لکھا تھا ''حفیظ نے وہ کام کیا ہے جو بارہ برس سے ہم نہیں کر سکے۔''

ایک قصہ اسکندر مرزا سے متعلق ہے جب کہ وہ محکمہ دفاع کے سیکریٹری تھے بقول لطف اللہ صاحب، ہوا یوں کہ حفیظ صاحب جو خود بھی محکمہ دفاع سے منسلک تھے، اسکندر مرزا کی پیشگی اجازت حاصل کیے بغیر وزیرِاعظم لیاقت علی خاں صاحب سے، جو وزیرِدفاع بھی تھے، مل آئے۔ ظاہر ہے یہ ملاقات ایک قومی شاعر اور وزیرِاعظم کے درمیان ہوئی تھی جو خالص ذاتی قسم کی تھی۔ اتفاقاً اسکندر مرزا بھی اسی وقت وزیرِاعظم کے استقبالی کمرے میں موجود، یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ ایک بیوروکریٹ سے یہ ''بے قاعدگی'' بھلا کیسے دیکھی جاتی، دوسرے دن بلا بھیجا۔ یہ گئے تو آمد کی اطلاع پا کر اسکندر مرزا نے اپنے کمرے سے کرسیاں اُٹھوا دیں تاکہ حفیظ صاحب کو بیٹھنے کا موقع نہ دیا جائے۔ حفیظ صاحب کی دُوربین نگاہوں نے معاملے کی نزاکت تاڑ لی اور ڈھٹائی سے فائلیں ہٹا کر میز کے ایک سرے پر بیٹھ گئے۔ یہ دیکھ کر اسکندر مرزا بے قابو ہوگئے۔ رُولر لے کر مارنے کے لیے اُٹھے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے غصّے کو عملی جامہ پہناتے حفیظ صاحب نے میز سے اُتر کر..... بہتر ہے بقیہ روداد انہی کی زبانی سنیے ''اس نے کوئی چیز اُٹھانی چاہی۔ میں نے بڑھ کر پہلے تو پکڑا اس کا رولر اور آگے بڑھ کر میں نے ایک تھپڑ اس کے منہ پر دیا۔ میں نے کہا، تم چاہتے تھے کہ میں تمھارے سامنے کھڑا ہو کر اپنی پتلون میں کانپوں'' پھر انگریزی میں گویا ہوئے:

"You have selected a wrong man. I will not let you out from here unless I beat you for insult."

اس کے بعد ''میرے پاس پتھر پڑا ہوا تھا۔ پیپر ویٹ میں نے اُٹھا کر زور سے مارا جو اس کی چھاتی پر پڑا۔''

لطف اللہ خاں صاحب اپنی آڈیو لائبریری کے بارے میں کہتے ہیں:

ظاہر ہے کہ اس واحد اور مخصوص ریکارڈنگ سے نہ صرف سامعین کرام محظوظ ہوتے ہیں بلکہ ان جواہر ریزوں سے میری لائبریری کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ ■

روسی نمائندوں نے حفیظ جالندھری کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے 30 لاکھ کی پیش کش کی تو فیض احمد فیض نے اسے قبول کرنے کی صلاح دی

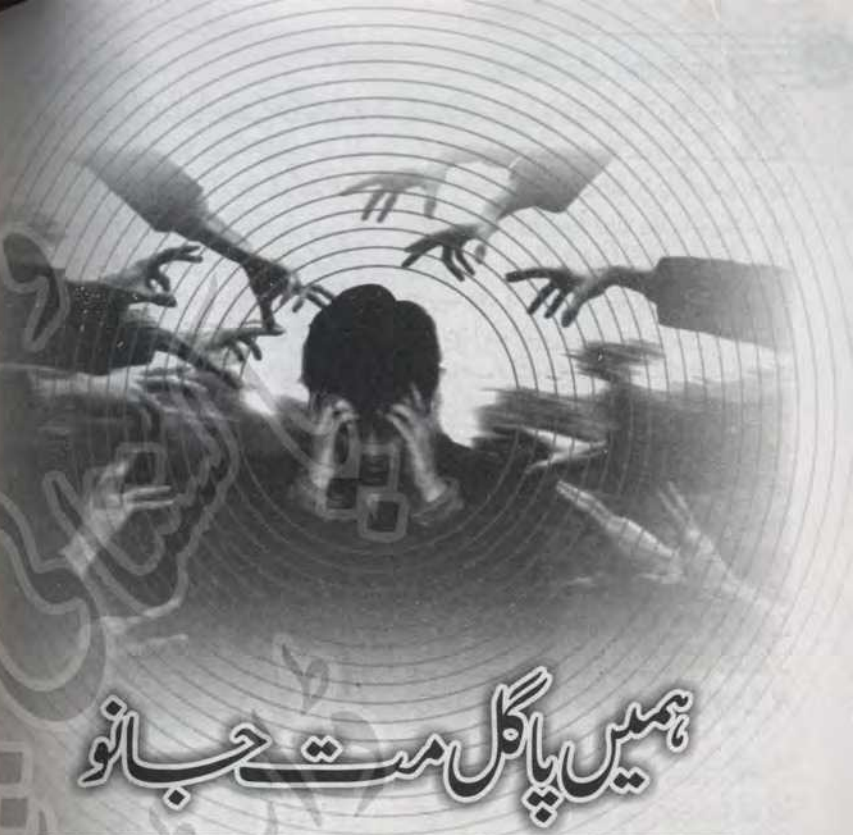

ہمیں پاگل مت جانو

آس پاس زندگی سے ڈرے، خوف زدہ لوگوں کا ماجرا
جو کسی ذہنی یا نفسیاتی مرض کے باعث زندگی کی ہر خوشی اور لطف سے محروم ہو جاتے ہیں

ماہر نفسیات پروفیسر ارشد جاوید

۲۶/ سالہ شائزہ نے ایک صبح ماں سے کہا کہ اب وہ اس گھر میں نہیں رہے گی اور چلی گئی۔ اسے وہم تھا کہ گھر والے اُس سے محبت نہیں کرتے، توجہ نہیں دیتے بلکہ اس کے خلاف ہیں۔ وہ پہلے بھی چند بار ایسا کر چکی تھی مگر کالج سے بروقت واپس آجاتی۔ لیکن اس دن وہ واپس نہ لوٹی۔ گھر والوں کو فکر ہوئی تو اسے تلاش کرنے نکلے۔ وہ سب سے پہلے اس کے کالج گئے۔ وہ کالج سے نکل کر کسی دوسری طرف جا رہی تھی۔ اسے دور سے دیکھ کر گھر والوں کی جان میں جان آئی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ برے لوگوں کے ہتھے نہیں چڑھی۔

شائزہ چونکہ نارمل نہ تھی لہٰذا گھر والوں کے ساتھ جانے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ انھوں نے زبردستی اسے گاڑی میں ڈالا اور دماغی امراض کے ایک کلینک لے

وہ لیبیا میں بطور انگریزی ٹیچر ملازمت کرتا تھا۔ ایک دن کئی پاکستانی دوست بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے۔ ایک دوست نے کہا، ”قذافی بہت سخت آدمی ہے۔ اسے اگر کسی غلط بات مثلاً دھوکہ دہی کا علم ہو جائے تو بدترین سزا دیتا ہے۔“ یہ سن کر حمید خوف زدہ ہو گیا۔ دراصل اس کی ایم۔ اے انگریزی والی ڈگری جعلی تھی۔ یہ خوف اس پر اتنا سوار ہوا کہ وہ پاگل ہو گیا۔ نفسیاتی طریق علاج کی مدد سے ہم نے وہ واقعہ اس کے ذہن سے کھرچ دیا۔ چند ملاقاتوں کے بعد وہ ٹھیک ہو گیا۔ حتیٰ کہ اس نے ادویہ کھانی بھی چھوڑ دیں۔

گئے۔ وہاں انکشاف ہوا کہ وہ ایک خطرناک ذہنی مرض، شیزوفرینیا میں مبتلا ہے مگر اسے اپنی بیماری کا احساس نہ تھا۔ اسے ادویہ دینے کی کوشش کی گئی مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ آخر زبردستی سکون آور ٹیکہ لگایا گیا تو وہ نیند میں چلی گئی۔ اس کا چند دن کلینک میں علاج ہوا پھر وہ تندرست ہو کے گھر سدھاری۔ اب وہ معمول کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کی شادی بھی ہو چکی۔

☆☆

نفسیاتی بیماریوں کی دو بڑی اقسام ہیں: شدید ذہنی بیماریاں (Psychosis) اور خفیف ذہنی بیماریاں (Neurosis)۔ شدید ذہنی بیماریوں میں سے دو ”شیزوفرینیا اور بائی پولر ڈپریشن“ عام ہیں۔ عام زبان میں انھیں پاگل پن بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان بیماریوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مبتلا فرد خود کو مریض نہیں سمجھتا۔ بیشتر مریضوں میں پاگل پن کی وجہ جسمانی خرابی ہوتی ہے۔ گو مریض کے دماغ میں کچھ کیمیائی تبدیلیاں بھی جنم لیتی ہیں۔ ایسے مریضوں کے لیے ادویہ بڑی نعمت ہیں اور شدید ذہنی امراض کے علاج میں ان کا کردار بہت اہم ہے۔ اگرچہ کامیابی کی شرح نہ ہونے کے برابر ہے، کیونکہ مریضوں کو ساری عمر ادویہ کھانی پڑتی ہیں۔

شدید ذہنی مریضوں میں ۴۰ر فیصد نفسیاتی وجوہ کی بنا پر بیمار ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک باپ کا نوجوان اکلوتا بیٹا اچانک فوت ہو جائے تو کیا وہ پاگل نہیں ہو گا؟ مگر ایسے مریضوں کو اگر ادویہ کے ساتھ نفسیاتی علاج بھی ملے تو وہ دو چار ماہ میں بالکل ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ پھر ادویہ سے بھی ان کی جان چھوٹ جاتی ہے۔ ہم ایسے ہی مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔

حمید شیزوفرینیا کا مریض تھا۔ اسے وہم تھا کہ گھر میں لوگ اسے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ وہ اکثر سوچتا کہ قبل اس کے گھر والے اسے نقصان پہنچائیں، کیوں نہ وہ انھیں قتل کر دے؟ وہ طویل عرصے سے ادویہ کھا رہا تھا اور کافی حد تک ٹھیک بھی ہو گیا۔ مگر جونہی ادویہ چھوڑتا، زیادہ بیمار ہو جاتا۔ اہل خانہ اسے میرے پاس علاج کرانے لائے۔ ہم نے اس کی بیماری کی وجہ معلوم کی جو بہت دلچسپ نکلی۔

خفیف ذہنی بیماریوں میں زیادہ اہم ڈپریشن، اضطراب (Anxiety) اور وہم و وسوسے ہیں۔ ڈپریشن میں فرد شدید اداسی اور افسردگی محسوس کرتا ہے۔ اس کا کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ بعض مریض تو خودکشی کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ اضطراب میں مریض شدید گھبراہٹ، بے چینی، خوف خصوصاً موت کا خوف محسوس کرتا ہے۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ وہم اور وسوسوں کا شکار ایسا مریض عموماً مذہب اور معاشرے کے متعلق منفی خیالات رکھتا ہے۔ کئی مریضوں کو صفائی کا وہم ہوتا ہے۔ خفیف ذہنی بیماریوں کی سو فیصد وجہ عموماً نفسیاتی ہوتی ہے۔ انھیں عموماً ماضی کا کوئی واقعہ ذہنی مریض بناتا ہے۔

پاکستان میں نفسیاتی بیماریوں کا علاج دو طریقوں سے ہوتا ہے:

۱۔ ادویہ سے علاج۔ ۲۔ نفسیاتی علاج۔

پاکستان میں چونکہ نفسیاتی علاج کے مستند ماہرین نہ ہونے کے برابر ہیں لہٰذا ادویہ سے علاج پر زیادہ زور ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ جو سائیکیاٹرسٹ ادویات سے علاج کرے، وہ بہت مصروف ہوتا ہے۔ اس کے پاس وقت کم

ماہر نفسیات دوا نہیں لکھتا بلکہ علاج کرتا ہے جس میں عموماً پون گھنٹہ لگتا ہے۔ جس بیماری کو ادویہ ایک سال میں دور نہ کر سکیں، مختصر نفسیاتی علاج عموماً اسے صرف ایک ماہ میں ٹھیک کر دیتا ہے۔ بعض اوقات مریض ایک ہی ملاقات کے بعد تندرست ہو جاتا ہے۔ میری ایک مریضہ کو ایک شے سے شدید خوف لاحق تھا۔ اس کا یہ خوف صرف ۱۰ رمنٹ میں ختم ہو گیا۔ اس طریقہ علاج میں چونکہ وجہ کافور ہوتی ہے لہٰذا معالجے کے بعد مرض لوٹ کر نہیں آتا۔ یہ طریقہ ادویاتی علاج سے زیادہ موثر اور سستا ہے۔ ادویہ کے برعکس یہ مضر اثرات بھی نہیں رکھتا۔

مختصر طریقہ علاج خفیف اور شدید ذہنی امراض کے علاوہ کئی مسائل مثلاً خود اعتمادی میں کمی، شرمیلا پن، سٹیج کا خوف، تعلیمی مسائل، جذباتی اور جنسی مسائل وغیرہ کے لیے بھی بہت موثر ہے۔ یہ مسائل ختم کرنے میں ادویہ کا کردار نہ ہونے کے برابر ہے۔ بدقسمتی سے اس طریق علاج کے ماہرین پاکستان میں بہت کم ہیں۔ پنجاب میں یہ ماہرین بہاولپور، ملتان، لاہور، گجرات اور اسلام آباد میں ملتے ہیں۔ سندھ، بلوچستان، پختونخواہ میں اس کا ایک ماہر بھی موجود نہیں۔

اس طریقہ علاج کو پاکستان میں ہم نے متعارف کرایا۔ اب ہم اسے عام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ مریض نہ صرف جلد شفایاب ہوں بلکہ ادویات کے مضر اثرات سے بھی بچ سکیں۔ یہ طریقہ علاج ادویہ کے مقابلے میں بہت سستا ہے۔ مریض صرف فیس ادا کرتا ہے، یوں ادویات کے اخراجات بچ جاتے ہیں۔

اور مریض زیادہ ہوتے ہیں۔ اسی باعث وہ ایک مریض کو پورا وقت نہیں دے پاتا۔ ایک مریض کو عموماً ۱۵ رمنٹ یا کم وقت ملتا ہے۔ یوں تشخیص ادھوری اور نامکمل رہتی ہے۔ ماہر ایک کے بجائے کئی ادویہ تجویز کرتا ہے۔ بعض ڈاکٹر تو ''اٹھارہ اٹھارہ ر ادویات'' تک لکھ دیتے ہیں۔ مریض انھیں کھاتا ہے مگر صحیح تشخیص نہ ہونے کے باعث اسے خاطر خواہ افاقہ نہیں ہوتا۔

جب مریض دوبارہ آئے تو ڈاکٹر دو چار ادویہ ختم کر کے نئی لکھ دیتا ہے اور مریض سے پوری فیس لیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ڈاکٹر اپنی کوتاہی کی رقم بھی مریض سے لیتا ہے۔ لاہور میں بعض ڈاکٹر (مثلاً ڈاکٹر وسیم اصغر وغیرہ) مریض کو موزوں وقت دے کر مریض کی صحیح تشخیص کرتے اور چند ادویات دیتے ہیں۔ مگر ایسے اچھے ڈاکٹر بہت ہی کم ہیں۔ یاد رہے، بیشتر ادویہ بیماری ختم نہیں کرتی ہیں بلکہ دبا دیتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ادویہ چھوڑتے ہی مرض پھر لوٹ آتا ہے اور عموماً زیادہ شدت سے!

۴۰ رفیصد شدید ذہنی مریضوں اور تقریباً ۱۰۰ رفیصد خفیف ذہنی مریضوں کا معالجہ اگر نفسیاتی علاج کے مختصر طریقے (Brief Psychotherapy) سے کیا جائے تو لوگ جلد شفایاب ہو سکتے ہیں۔ مختصر نفسیاتی طریقہ علاج کا فلسفہ یہ ہے کہ ہر نفسیاتی بیماری کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ اگر وہ وجہ دریافت کر کے دماغ سے نکال دی جائے تو مریض تندرست ہو جاتا ہے۔ اس طریقہ علاج میں کامیابی کی شرح ۹۵ رفیصد سے زیادہ ہے اور مریض کو صرف ۴ رتا ۶ ر بار ماہر نفسیات کے پاس آنا پڑتا ہے۔ ■

چند

سال پہلے کی بات ہے، میرے محلے (واقع اسلام آباد) میں ایک اسکول کھلا۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ تب رہائشی علاقوں میں تعلیمی ادارے عنقا تھے۔ اسکول انھیں آبادیوں کے مضافات میں تعمیر کیا جاتا تھا تاکہ طلبہ و طالبات آرام و سکون سے تعلیم حاصل کریں۔

اسکول کی پرنسپل سے بات ہوئی تو وہ کہنے لگی ''آپ کے محلے میں اسکول کھلنا تو خوش خبری ہے۔ یوں یہاں آباد والدین کے بچوں کو دور دراز علاقوں میں نہیں جانا پڑے گا۔'' دلچسپ بات یہ کہ میرے محلے میں بھی کھاتے پیتے گھرانے آباد تھے۔ وہ کاروں میں بآسانی بچوں کو کہیں بھی چھوڑ سکتے تھے۔

پاکستانی شہر و قصبے آج جس بدنظمی و بے ترتیبی سے پھیل رہے ہیں، درج بالا واقعہ اس کا محض ایک پہلو یا مظہر ہے۔

گزشتہ چند عشروں سے دیہات میں یہ نظریہ جڑ پکڑ چکا کہ شہر میں ترقی کے بڑے مواقع موجود ہیں۔ وہاں پہنچتے ہی انسان خوب کمانے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان ہی نہیں پوری دنیا میں دیہاتی کثیر تعداد میں شہروں کا رخ کر رہے ہیں۔

اس نقل مکانی یا ہجرت میں کوئی قباحت نہیں کیونکہ شہروں کو بھی افرادی قوت و ہنرمندوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن پاکستانی شہروں کو سب سے بڑا مسئلہ یہ درپیش ہے کہ آبادی میں اضافے سے وہ بہت بے ہنگم انداز میں اور نہایت بدنظمی سے پھیل رہے ہیں۔ اس پھیلاؤ میں منصوبہ بندی نظر آتی ہے اور نہ کوئی نظم و ضبط!

ایک منصوبہ ایسا جسے خفیہ رکھ کر فائدہ اٹھایا گیا اور مشتہر کر کے بھی لوٹا گیا

ڈی ایچ اے کا ڈاکا

ایک لاکھ اکیس ہزار بے بس پاکستانیوں کے محنت سے کمائے ہوئے پیسے تعمیراتی منصوبے میں پھنس چکے ہیں.....

ان میں چالیس ہزار فوجی جوان اور افسر بھی شامل ہیں

ڈاکٹر عائشہ صدیقہ

www.urdudigest.pk

اگرچہ یہ امر باعث مسرت ہے کہ پنجاب کی حکومت نے اپنے محکمہ پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ میں ایک تحقیقی یونٹ قائم کیا ہے۔ یہ یونٹ شہروں کے پھیلاؤ کے سلسلے میں اعداد و شمار اور معلومات جمع کرے گا۔ اس ڈیٹا کی بدولت یہ سمجھنے و جاننے میں مدد ملے گی کہ پنجاب میں شہر کس رفتار و انداز میں ترقی کر رہے ہیں۔

بدقسمتی سے افسر شاہی اور سیاست دان، دونوں کو اس امر کا احساس نہیں کہ شہر باقاعدہ منصوبہ بندی سے پھیلتے بڑھتے ہیں۔ حکمران طبقے میں جسے اس حقیقت کا احساس ہے، وہ بھی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہروں و قصبات میں رہائشی بستیوں کے اندر ہر قسم کی دکانیں کھل چکی۔ حتیٰ کہ رہائشی علاقوں میں کالج و یونیورسٹیاں کھل رہی ہیں۔ اس کچ پچ کے باعث اب محلوں میں بھی ٹریفک ہجوم رہنا معمول بن چکا۔

ایک بڑا مسئلہ

شہروں کے پھیلاؤ سے اس اہم مسئلے نے بھی جنم لیا کہ مضافات میں ''ایلیٹ ہاؤسنگ سوسائٹیاں'' بننے لگیں۔ یہ سوسائٹیاں اب تک کئی دیہات کو نقشے سے ہمیشہ کے لیے مٹا چکیں۔ ان کی بڑھوتری بھی کسی منصوبہ بندی کے بغیر جاری ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ دیہاتی خوشی خوشی ہاؤسنگ سوسائٹیوں کے مالکان کو اپنی زمین فروخت کرتے ہیں، کیونکہ انھیں منہ مانگی قیمت ملتی ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ سوسائٹیوں کے بارسوخ مالکان نے غریب و کمزور دیہاتیوں سے زیادہ تر زمینیں دھونس دھمکی اور مارپیٹ کے ذریعے حاصل کی ہیں اور اگر انھیں رقم دی بھی گئی، تو وہ اونٹ کے منہ میں زیرہ کے مترادف تھی۔ گزشتہ چند برس میں اس سلسلے میں ہونے والی عدالتی تحقیقات میں چشم کشا ثبوت موجود ہیں۔

مزید برآں یہ بھی حقیقت ہے کہ ہاؤسنگ سوسائٹیوں کے مالکان نے ہر ممکن غیر قانونی و ناجائز ذرائع اختیار کر کے بھی نہ صرف غریبوں کی بلکہ سرکاری زمینوں پر بھی قبضے کیے۔ یہی نہیں، انھوں نے طاقتور سرکاری اداروں کو ساتھ ملا کر حکومت ہی کی زمینوں پر قبضے جما لیے۔ میں اس ضمن میں ڈی ایچ اے، راولپنڈی کی مثال دینا چاہوں گی۔

ایک سال قبل ڈی ایچ اے کے ایک ریٹائرڈ کرنل ''وسل بلوئر'' بن کر سامنے آئے۔ انھوں نے قوم پر انکشاف کیا کہ ڈی ایچ اے نے ایک ریئل اسٹیٹ ''ٹائکون'' کے ساتھ مل کر کیسا گھپلا کیا۔

ہوا یہ کہ ڈی ایچ اے اور ریئل اسٹیٹ گروپ نے ایک جگہ مشترکہ طور پر ہاؤسنگ سوسائٹی بنانے کا اعلان کیا۔ بظاہر اس اعلان میں کوئی غیر قانونی بات نہ تھی، مگر حقیقتاً جس زمین پر سوسائٹی بننی تھی، وہ پنجاب حکومت نے ایک ڈیم کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ یہ راول ڈیم کا متبادل ڈیم تھا۔

دراصل ڈی ایچ اے کو بعض جرنیلوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ چنانچہ تنظیم یہ کہہ کر زمین حاصل کرنے میں کامیاب رہی کہ وہ وہاں مجوزہ ڈیم بنائے گی۔ سب سے پہلے تو اسی امر پر چھان بین ہونی چاہیے کہ پنجاب حکومت نے ایک عوام دوست ترقیاتی منصوبہ کیونکر نجی شعبے کے حوالے کر دیا؟

صد افسوس کہ ڈی ایچ اے، راولپنڈی نے زمین پر ڈیم نہیں بنایا بلکہ اسے ایک ہاؤسنگ سوسائٹی بنانے کے لیے مخصوص کر دیا۔ ابتداء یہ منصوبہ خفیہ رکھا گیا۔ وجہ یہ ہے کہ علاقے میں مشہور ہو چکا تھا کہ وہاں ڈیم بننا ہے۔ چنانچہ

وجہ یہ ہے کہ علاقے میں مشہور ہو چکا تھا کہ وہاں ڈیم بننا ہے۔ چنانچہ راتوں رات علاقے میں زمینوں کی قیمت گر گئی

www.urdudigest.pk

راتوں رات علاقے میں زمینوں کی قیمت گر گئی۔ تب ڈی ایچ اے نے بڑے سستے داموں زمینیں خرید لیں۔ لوگوں نے خوشی خوشی اپنی زمین فروخت کی۔ انھیں تو یہی گمان تھا کہ شکر ہے، کچھ رقم مل گئی، ورنہ زمین زیر آب آجاتی۔

بعد ازاں ڈی ایچ اے نے ریئل اسٹیٹ گروپ کے ساتھ علاقے میں ہاؤسنگ سوسائٹی بنانے کی خاطر معاہدہ کر لیا۔ تنظیم نے منصوبے کے لیے مختص رقم اور ہماری زمین بھی گروپ کے حوالے کر دی۔ مدعا یہی تھا کہ وہ مزید زمین خرید کر ہاؤسنگ سوسائٹی کا منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔

لیکن کئی برس بیت چکے، وہ سوسائٹی ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ یوں تقریباً ایک لاکھ اکیس ہزار پاکستانیوں نے محنت و مشقت سے جو کروڑوں روپے کمائے تھے، وہ اس غیر اراضی منصوبے میں پھنس چکے۔ ان میں چالیس ہزار فوجی افسر و جوان بھی شامل ہیں۔

متاثرین نے اس منصوبے کی چھان بین کرانے کے لیے نیب (NAB) میں درخواست جمع کرائی۔ لیکن افسروں نے درخواست نچلے کارکنوں کی طرف سرکا دی۔ اب وہ انہی کی میزوں کے گرد چکر کھا رہی ہے۔ کئی متاثرین کو تو یقین ہے کہ انھیں انصاف ملنے کی کوئی توقع نہیں۔

پہلی درخواست ریٹائرڈ کرنل نے جمع کرائی تھی۔ ان پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ خاموش ہو جائیں۔ وجہ یہی ہے کہ اس منصوبے میں ''بڑی مچھلیاں'' ملوث ہیں۔ یوں طاقت اور اثر و رسوخ کے ذریعے لوگوں کو ان کے جائز حق سے محروم کیا گیا۔ پہلے غریبوں کو دھوکا دے کر سستے داموں ان کی زمین خریدی گئی۔ پھر عوام کو سبز باغ دکھائے اور ہاؤسنگ سوسائٹی کے نام پر کروڑوں روپے لوٹ لیے گئے۔ پھر وہ جگہ بھی برباد ہوئی جہاں ڈیم بننا تھا۔ افسوس کہ راولپنڈی و اسلام آباد کے لاکھوں مکینوں کو پانی کی سہولت دینے والا ایک نہایت اہم منصوبہ چند لالچی اور خود غرض لوگوں کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔

وطن عزیز کے نامی گرامی ریئل اسٹیٹ گروپ نے شہروں میں جو ہاؤسنگ سوسائٹیاں بنائی ہیں، ان کی خوبیاں اپنی جگہ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان کی خامیاں بھی بے شمار ہیں۔ مثلاً ان کے چاروں طرف دیواریں بنی ہیں اور مخصوص جگہ گیٹ نصب ہیں۔ گویا یہ حکومت کی حد سے دور ہو کر خاصی خود مختار ہو چکیں۔ پھر یہ جس انداز میں وجود میں آئیں اور پھیل رہی ہیں، وہ بھی چھان بین مانگتا ہے۔

کراچی، لاہور، اسلام آباد اور دیگر شہروں میں جنم لینے والی ان ہاؤسنگ سوسائٹیوں سے ایک اہم معاشی پہلو بھی وابستہ ہے۔ وہ یہ ان کی وجہ سے تقریباً ۶۰ ہزار ایکڑ زرعی رقبہ نیست و نابود ہو گیا اور وہاں گھر بن گئے۔ وطن عزیز پہلے ہی غذائی قلت کا شکار ہے۔ نیز کسان کھیت چھوڑ کر شہروں کا رخ کر رہے ہیں۔ لہٰذا سوسائٹیوں کے باعث زرعی پیداوار مزید کم ہو گئی۔

ان سوسائٹیوں سے پھر ایک اہم معاشرتی مسئلہ بھی منسلک ہے۔ یہ ایلیٹ طبقے کے لیے عام آبادیوں سے الگ تھلگ بنائی گئیں۔ یوں بااثر طبقہ جو پہلے ہی عوام سے مختلف ماحول میں بستا ہے، وہ معاشرے سے مزید کٹ گیا۔ چنانچہ یہ سوسائٹیاں پاکستان میں امیر و غریب کے مابین بڑھتے تفاوت کی نمایاں مثال بھی ہیں۔ (بشکریہ ہیرالڈ کراچی) ■

افسوس کہ راولپنڈی و اسلام آباد کے لاکھوں مکینوں کو پانی کی سہولت دینے والا ایک نہایت اہم منصوبہ چند لالچی اور خود غرض لوگوں کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔

آپ بیتی

قسمت کا دھنی

گلاسگو انگلینڈ کے ملک غلام احمد ربانی کی کہانی خالد ارشاد کی زبانی

ایک مضطرب چرواہے کی حیران کن داستان

آنے والے برسوں میں قدرت نے اسے انسانوں کی خدمت اور نگہبانی کا کام سونپ دیا تھا

پنجاب کے ضلع تلہ گنگ کے ایک دور افتادہ اور بنیادی سہولتوں سے محروم گاؤں ڈھلی کے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولنے والے ملک غلام احمد ربانی کو برسوں کی مسلسل محنت، مشقت اور دیانت کا خوب پھل ملا۔ جہاں لوگوں کے دلوں میں جگہ ملی وہاں حکومتی سطح پر سماجی خدمت کا اعتراف الگ سے کیا گیا۔ برطانوی شہریت کا ''اعزاز ممبر برٹش ایمپائر'' اور برطانوی کمیونٹی کی طرف سے کنگ آف گلاسکو اور بابائے امن کے اعزازات اس کا اظہار و اقرار ہے۔

آپ بیتی ایک مضطرب چرواہے کی کہانی ہے جس کا تعلیم سے دل اچاٹ ہوا۔ نوکری سے باغی ہوا، ملک سے باہر جا کر بھی روح کا اضطراب ختم نہ ہوا۔ وہ ہمیشہ نوکری کی محدودیت اور خود مختاری سے کہیں آگے کا سوچتا تھا۔ اسی سوچ نے اسے زندگی میں کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ اس کی زندگی کا کینوس، جہد مسلسل تحریک اور فعالیت کے رنگوں سے مزین ہے۔ آج برطانیہ اور پاکستان میں ان کی پہچان خدمت خلق کے لیے گرانقدر خدمات سرانجام دینے والے اور کامیاب کاروباری شخصیت کے طور پر ہے۔

اپنی نصف صدی پر محیط عملی زندگی میں انھوں نے جو ہمہ جہت اور ہمہ گیر کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں وہ اس سادہ، کم پڑھے لکھے اور غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والے ملک غلام احمد ربانی کے لیے ہی اعزاز و اطمینان کی بات نہیں بلکہ ایسے ہی مشکل اور صبر آزما حالات سے دوچار آج کے نوجوانوں کے لیے بھی ایک چراغ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

انھوں نے زندگی بھر دیانت داری، صاف دلی اور محنت سے جی نہ چرانے اور مسلسل بہتر سوچتے رہنے کو اپنے معمول کا حصہ بنائے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ خدائے مہربان نے ہر جگہ ان کا بازو تھامے رکھا۔

یوں کل کا گڈریا، گاؤں میں بکریاں اور بھینسیں چرانے والا، آج پورے قد سے کھڑا اپنی زندگی کے سبھی دنوں اور لمحوں کو پورے فخر اور اعتماد سے بیان کرتا ہے اور کسی لمحے اپنی عزت، کمزوری یا کسی کمی پہ پریشانی کا اظہار نہیں کرتا۔

آئیے اس ماہ ایک سادہ سے انوکھے آدمی سے ملتے اور اُس کی آپ بیتی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ (مدیر)

''میرا تعلق ڈھلی کے ایک غریب گھرانے سے ہے۔ میرے والد حاکم خان ایک معمولی کاشت کار تھے اور گزر بسر مشکل سے ہوتی۔ میرے والد مجھے اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ تعلیم کے ذریعہ میں معاشی خوشحالی حاصل کرسکوں گا۔ مجھے گاؤں کے پرائمری اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ میں نے پرائمری کا امتحان اعزازی نمبروں سے پاس کیا۔ اس کے بعد مجھے گورنمنٹ ہائی اسکول ٹمن میں داخل کروایا گیا۔ یہ اقامتی درسگاہ تھی۔ میرے تمام عزیز و اقارب اس بات پر بے حد مسرور تھے کہ میں تعلیم حاصل کررہا ہوں اور فارغ التحصیل ہو کر سکول ٹیچر لگ جاؤں گا۔ ان کے نزدیک سکول ٹیچر بہت بڑا عہدہ تھا۔ انہی دنوں میری منگنی میری ماموں کی بیٹی سے ہوگئی تھی۔ میرے ماموں (سسر) اور میری خالہ جن کی اولاد نہیں تھی، مجھے بہت پیار کرتے تھے اور جیب خرچ کے لیے معقول رقم دیا کرتے تھے۔ میں اس رقم سے دوستوں کے ساتھ خوب مزے کیا کرتا تھا، کچھ شرارتی بھی تھا انہی حرکات کی بنا پر اسکول سے خارج کر دیا گیا۔ میرے

میرے والد نے سزا کے طور پر مجھے بکریاں اور بھینسیں چرانے کی ذمہ داری سونپ دی۔

والد نے سزا کے طور پر مجھے بکریاں اور بھینسیں چرانے کی ذمہ داری سونپ دی۔ یہ ایک نہایت مشکل کام تھا۔ میرے ریوڑ میں شامل جانور روزانہ کسی نہ کسی کا کھیت خراب کر دیتے تھے اور لوگ میرے والد کے پاس شکایت لے کر آتے تھے۔ کئی دفعہ لوگوں سے جھگڑا بھی ہوجاتا تھا۔ میں اس کام سے تنگ آگیا تھا۔ میرے والد نے مجھے دوبارہ گورنمنٹ مڈل سکول سکھر میں داخل کروادیا۔ میرا ایک سال ضائع ہوچکا تھا۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر ملک کرم الٰہی نے میرا حوصلہ بڑھایا اور مجھے پڑھائی کی طرف مائل کیا۔ میں نے ان کی خصوصی توجہ سے اینگلو ورنیکلو (مڈل) کا امتحان دیا۔ جب نتیجہ نکلا تو میرا رزلٹ لیٹ تھا۔ استاد محترم ملک کرم الٰہی صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ میرا نتیجہ نکلے اور مجھے اپنی زیرِ تربیت منشی بھرتی کروادیں۔ مگر ایسا نہ ہوسکا، قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

میں گاؤں میں بے قراری سے نتیجے کا انتظار کررہا تھا۔ میرے علاقے کے نوجوان فوج میں بھرتی ہونا فخر سمجھتے تھے میں نے بھی سوچا کہ مزید تعلیم لینے کے بجائے فوج میں بھرتی ہوجاتا ہوں۔ یہ ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ پاکستان ابھی بنا تھا۔ میرے ایک عزیز محبت خان اجناس کو گوجر خان لے جاکر منڈی میں بیچتے تھے۔ میں نے سیاحت کے لیے ان کے ساتھ جانے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن میری والدہ کی ناراضی کے ڈر سے انہوں نے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا۔ میں نے والدین سے بات کی مگر وہ نہیں مانے۔ لیکن میں کچھ کرنے کے لیے بے قرار تھا۔

جس دن گاؤں سے محبت خان نے گندم کا ٹرک لے کر جانا تھا میری والدہ نے گھر کے دروازے کو تالا لگا دیا تھا کہ میں رات کو اس کے ساتھ نہ چلا جاؤں۔ گرمیوں کے دن تھے۔ میں چھت پر سویا ہوا تھا۔ جب ٹرک میرے گھر کے قریب سے گزرا تو میں نے چھلانگ لگائی اور گندم کی بوریوں میں چھپ گیا۔ جب گوجر خان پہنچے تو محبت خان کو میری اس حرکت کا پتا چلا۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ وہاں ہمارے ایک عزیز غلام محمد بھی گندم بیچنے آئے ہوئے تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ کسی دور میں جنرل گریسی (سابق چیف آف آرمی سٹاف (۱۱ر تا ۱۶ر فروری

میں سوچنے لگا اگر اتنے بڑے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی آدمی نے نوکری ہی کرنا ہے تو پھر یہ میری زندگی کا مقصد نہیں ہوگا۔ میں نے فوج کی ملازمت چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا

www.urdudigest.pk

۱۹۵۰ء) کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ وہ مجھے ان کے گھر لے گئے۔ جنرل گریسی سے ملاقات کے دوران میں نے فوج میں سگنلز کے شعبے میں ملازم ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ دراصل میرے گاؤں کے اکثر لوگ فوج کے شعبہ سگنلز میں تھے اور ان کی بیویاں مجھ سے خط لکھوایا کرتی تھیں۔ لہٰذا میرا خیال تھا کہ فوج میں سگنلز کے شعبے کی بڑی اہمیت ہوگی۔

جنرل گریسی نے مجھے کرنل نیگ کے نام خط لکھ دیا۔ میں جی ایچ کیو آگیا۔ وہاں کرنل نیگ نے مجھے سگنلز کے انچارج کے پاس بھیج دیا۔ انہوں نے میری جسمانی حالت کا جائزہ لیا اور کہا کہ تمہاری عمر بھی کم ہے اور قد بھی چھوٹا ہے لیکن وہ مجھے ملازمت دینے پر مجبور تھے کیونکہ میری سفارش فوج کے سربراہ نے کی تھی۔ یوں دھوتی پہننے والے دیہاتی نے پتلون شرٹ پہننا شروع کر دی۔ میں نے بھرتی ہونے کے دو ہفتوں بعد اپنے والدین کو خط لکھ کر گھر سے بھاگنے کی معذرت کی اور اپنی ملازمت کا بتایا۔ دوران ملازمت میں نے زندگی کا سلیقہ سیکھا۔ کچھ عرصہ بعد میں لیفٹیننٹ بن گیا تھا اور اہم ذمہ داری پر فائز تھا مگر وہ بے قراری ابھی موجود تھی جس نے مجھے گھر سے بھاگنے پر مجبور کیا تھا۔

ایک دن میں کسی کام سے جہلم گیا ہوا تھا کہ میری یونٹ کے ایک ریٹائر میجر علی حسین شاہ سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ایک فیکٹری میں سپر وائزر کی ملازمت کر رہے ہیں۔ اس ملاقات نے مجھے کچھ کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں سوچنے لگا اگر اتنے بڑے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی آدمی نے نوکری ہی کرنا ہے تو پھر یہ میری زندگی کا مقصد نہیں۔ میں نے فوج کی ملازمت چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا میں درخواست لے کر کرنل انچارج کے پاس پیش ہوا۔ وہ ہمارے علاقے سے تعلق رکھتے تھے اور میرے گھریلو حالات سے بھی واقف تھے۔ وہ ڈانٹنے لگے کہ تم روزگار کیسے کماؤ گے تمھیں فوج سے فارغ نہیں کروں گا۔ میں نے انہیں علامہ اقبال کے شعر کا یہ مصرع سنایا۔

؎ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

میری بات سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ جاؤ اپنی قسمت آزماؤ۔

ان دنوں منگلا ڈیم بن رہا تھا اور واپڈا غیر سرکاری ادارہ تھا۔ وہاں میں نے انچارج کمیونیکیشن کے طور پر ملازمت شروع کر دی۔ میری تنخواہ ۲۵۰ر ماہوار لگائی گئی۔ میں لاہور کے ہیڈ آفس میں کام کرنے لگا لیکن میں کاروبار کرنا چاہتا تھا۔ میں کشادگی رزق کے لیے سوچتا رہتا تھا۔ میری پہلی شادی ماموں زاد سے تقریباً بارہ سال کی عمر میں ہوگئی تھی لیکن میری اولاد نہیں تھی۔ حسن اتفاق سے میری دوسری شادی لاہور میں مقیم میری خالہ زاد سے ہوگئی جو سرکاری سکول میں معلّمہ تھی۔ انہی دنوں ایک دفتری ساتھی کی معرفت پاسپورٹ آفس کے ایک آفیسر نذیر احمد سے تعارف ہوا۔

ان کے بچے برطانیہ کے شہر برمنگھم میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور وہ ان سے فون کے ذریعے بات چیت کرنے میرے دفتر آیا کرتے تھے۔ ان سے دوستی ہوگئی۔ ایک دن انہوں نے مجھے برمنگھم جاکر قسمت آزمانے کا مشورہ دیا۔ میں نے کہا میرے پاس تو پاسپورٹ نہیں ہے۔ ان دنوں پاسپورٹ کا حصول بہت مشکل تھا۔ انہوں نے کہا کوئی بات نہیں، آپ فوٹو دے دیں۔ میں نے

فتح شرف نے میری ذہانت اور دیانت کو کئی بار آزمایا۔ بینک میں جتنی رقم جمع کروانا ہوتی اس سے زیادہ مجھے دے کر بھیج دیتے، میں زائد رقم انہیں واپس کر دیتا

اور میرے دوست چوہدری نذیر (برطانیہ) نے اپنی تصویریں انہیں دے دیں۔ چند دنوں بعد ہمارے پاسپورٹ بن گئے۔ چوہدری نذیر احمد فوراً برطانیہ روانہ ہو گئے لیکن مجھے گھر سے اجازت نہ ملی میری دوسری بیوی کا خیال تھا کہ میں برطانیہ میں نئی شادی کرلوں گا۔ انہوں نے میرے والد صاحب کو بھی قائل کر رکھا تھا۔ مجھے ایک ترکیب سوجھی منصوبے کے مطابق برطانیہ سے چوہدری نذیر نے مجھے خط لکھنا شروع کر دیئے جس میں گھر والوں کو ہر مہینے ہزاروں روپے ارسال کرنے کا ذکر ہوتا۔

میں دانستہ خط ایسی جگہ پر رکھتا کہ میری بیوی پڑھ لے۔ بالآخر میری یہ ترکیب کامیاب ٹھہری اور مجھے برطانیہ جانے کی اجازت مل گئی۔

میں جب برطانیہ کے لیے عازم سفر ہو رہا تھا تو اپنے مستقبل کے حوالے سے بہت پُر امید تھا۔ مجھے اپنی صلاحیتوں، محنت اور خصوصاً اللہ تعالیٰ پر یقین تھا۔ میں اس وقت ۲۶ رسال کا نوجوان تھا۔ اس دور میں برطانیہ کا ٹکٹ اٹھارہ سو روپے ہوتا تھا جو میں نے بڑی مشکل سے مانگ تانگ کر پورا کیا۔ میں گلاسکو پہنچا تو ان دنوں وہاں پاکستانیوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ موسم بہت سرد تھا۔ وہاں ایک کمرے میں میرے چھ دوست رہتے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ رکھ لیا۔ میں روزانہ ملازمت کی تلاش میں نکل جاتا۔ روزگار کے مواقع محدود تھے۔ پاکستان میں بیوی اور چند ماہ کے ایک بیٹے کو چھوڑ کر آیا تھا۔ پاکستان میں میری تنخواہ بھی معقول تھی۔ لیکن معاشی ترقی کا خواب مجھے دیار غیر لے آیا تھا۔

مجھے اپنی باری پر دوستوں کے لیے کھانا بنانا پڑتا اور کمرے کی صفائی بھی کرنی پڑتی۔ بہرکیف مجھے جلد ہی بس میں کنڈیکٹر کی نوکری مل گئی۔ میری پہلی تنخواہ سات پاؤنڈ ہفتہ تھی۔ محنت کرنے سے میں کبھی نہیں گھبرایا۔ میں نے پیسے کمانے کے لیے اضافی وقت میں بھی کام کیا۔ مقررہ آٹھ گھنٹے کام کے بعد ایک گھنٹہ آرام کر لیتا اور جس بس کا کنڈیکٹر چھٹی پر ہوتا، اس کی جگہ کام کرنے لگتا۔ میں نے

www.urdudigest.pk

انتھک محنت کی، اس لیے جلد ہی مجھے بس کا ڈرائیور بنا دیا گیا۔ ان دنوں وہاں مقیم پاکستانیوں کی ایک تنظیم جمعیت اتحاد المسلمین تھی جو فلاح و بہبود کا کام کرتی تھی۔ اس کے الیکشن ہو رہے تھے اور صدر کے عہدے کے لیے فتح شرف امیدوار تھے۔ میں اور چوہدری نذیر ان کے پاس گئے اور اپنی رضاکارانہ خدمات پیش کیں۔ وہ ہماری کوششوں سے الیکشن میں صدر منتخب ہو گئے۔ تب میری ان سے دوستی ہو گئی۔ وہ ان پڑھ تھے۔ لیکن ان کی بصیرت کا یہ عالم تھا کہ وہ ۱۹۳۳ء میں گلاسگو گئے تھے۔ ان کا تمباکو اور کپڑے کا ہول سیل کا کاروبار تھا۔

انہیں ایک محنتی اور ایماندار ساتھی کی ضرورت تھی۔ پاکستانی کمیونٹی میں میرا تعارف ایک محنتی اور فرض شناس فرد کے طور پر تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم کارپوریشن سے جتنی تنخواہ لیتے ہو، مجھ سے لے لیا کرو اور میرے کاروبار کو سنبھال لو۔ میں نے ملازمت کا آغاز کر دیا۔ روپے پیسے کا سارا لین دین میرے ذریعے ہوتا۔ فتح شرف نے میری ذہانت اور دیانت کو کئی بار آزمایا۔ بینک میں جتنی رقم جمع کرانا ہوتی، اس سے زیادہ مجھے دے کر بھیج دیتے۔ میں زائد رقم انہیں واپس کر دیتا۔ میری صلاحیتوں سے مطمئن ہو کر فتح شرف صاحب نے کاروبار کو مزید وسعت دینے کے لیے کپڑا بنانے والی چار مشینیں بھی لگا لیں۔ انہی دنوں مجھے ایک پاکستانی، محمد ارشد نے اسٹور میں حصہ دار کی حیثیت سے کام کرنے کی پیش کش کی۔ میں نے فتح شرف صاحب سے بات کی تو انہوں نے مجھے کہا کہ کاروبار کے پیسے تمہارے پاس ہوتے ہیں، تم حسب ضرورت خود ہی لے لیا کرو۔ لیکن مجھے تم جیسے ایماندار، محنتی اور مخلص ساتھی کی ضرورت ہے۔

کچھ اسی طرح کا اصرار محمد ارشد صاحب کا بھی تھا۔ ان کا بہت بڑا اسٹور تھا اور وہ میری انتظامی صلاحیتوں کے بے حد معترف تھے۔ انہوں نے مجھے چالیس پاؤنڈ ہفتہ معاوضہ، ملازمت اور اسٹور میں حصہ دار بننے کی پیش کش کی میں نے فتح شرف سے بات کی۔ انہوں نے مجھے

www.urdudigest.pk

اجازت دے دی۔ محمد ارشد کے ایک دوست اکرم بھٹی بھی کاروبار میں شامل ہو گئے۔ یوں اس اسٹور میں ہم تینوں حصہ دار بن گئے۔ میں نے اسٹور چلانے اور وسعت دینے کے لیے دن رات ایک کر دیئے۔ میری کوششوں سے اسٹور نے خوب ترقی کی۔ چار سال کے عرصے میں ایک اسٹور سے چار اسٹور بن گئے۔

ایک روز ارشد نے مجھے کہا کہ میں اب کاروبار ختم کر کے آرام کرنا چاہتا ہوں۔ تم اسٹور خریدنا چاہتے ہو تو خرید لو۔ بھٹی صاحب نے بھی کہا کہ میں اپنا حصہ نکالنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ دونوں کو ان کے حصے کے پیسے دیتا۔ میں نے اپنے دوستوں سے ذکر کیا تو انہوں نے مجھے قرض دے دیا۔ ان میں چوہدری نذیر اور فتح شرف بھی تھے۔ اب میری عملی زندگی کا دور شروع ہوا میں نے اپنی بیوی کو ڈرائیونگ سکھائی۔ وہ سلک لینڈ میں موجود دوسری پاکستانی خاتون تھی جس نے ڈرائیونگ سیکھی۔ وہ میرا ہاتھ بٹانے لگی۔ صبح بڑی سڑک پر بچوں کو اسکول چھوڑتی پھر ہول سیل مارکیٹ سے سامان خریدتی اور تمام اسٹوروں پر پہنچاتی۔ میں اسٹوروں پر کام کرتا۔ یوں ہم دونوں میاں بیوی نے تقریباً بیس سال تک مسلسل محنت کی اور اللہ کے فضل سے پورے گلاسگو میں ہمارے سات بڑے اسٹور بن گئے جہاں ضرورت کی ہر چیز دستیاب ہوتی۔

میں نے جو کچھ کمایا، دوبارہ کاروبار میں لگایا اور مزید ترقی کی۔ میں نے روپے پیسے کو کفایت سے استعمال کیا اور کبھی فضول خرچی نہیں کی۔ جب بڑا بیٹا کاروبار میں ہاتھ بٹانے کے قابل ہو گیا تو میں نے بیگم کو کہا، اب تم آرام کرو، تم نے برسوں میرا ہاتھ بٹایا ہے۔ میں نے اسٹور کے ساتھ فرنیچر کی ایک بہت بڑی دکان بھی بنالی وہاں پاکستانی کھانوں کا ایک ریستوران بھی کھول لیا یہ ریستوران خوب چلتا۔ وہاں ہم نے سیاحت اور سٹوڈنٹ ویزہ پر آنے والے پاکستانیوں کو روزگار کمانے کے مواقع فراہم کر رکھے تھے۔ ایک دن میں ریستوران میں موجود تھا، اچانک امیگریشن کا عملہ پولیس کے ساتھ آگیا۔ اس نے چاروں طرف سے ریستوران کو گھیر لیا۔ وہ غیر قانونی لوگوں کو پکڑنے آئے تھے۔

جب امیگریشن کا افسر ریستوران میں داخل ہوا تو مجھے دیکھ کر حیران ہوا کیونکہ پورے گلاسگو میں خدمت خلق کے حوالے سے میری پہچان تھی۔ اس نے مجھے کہا کہ مجھے یقین ہے، ملک غلام ربانی کوئی غیر قانونی کام نہیں کر سکتا، لہٰذا اس نے پولیس اور اپنے عملے کو واپس بھیج دیا۔ یوں اللہ نے میرا بھرم رکھ لیا۔ میں جرمانے سے، جب کہ روزگار کمانے کے لیے آئے پاکستانی برطانیہ میں قید اور وطن واپسی سے بچ گئے۔ میں نے سوچا، یہ لوگ مجھ پر اتنا اعتماد کرتے ہیں تو مجھے بھی ان کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانی چاہیے۔ لہٰذا میں نے اپنا نہایت منافع بخش ریستوران اونے پونے فروخت کر دیا۔ پھر چند گھر خرید کر کرائے پر دے دیئے۔ کچھ عرصے کے بعد میں نے اسٹور فروخت کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہاں مجھے بہت وقت دینا پڑتا تھا جب کہ گلاسگو میں میری سماجی فلاح و بہبود کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں۔

خدمت خلق میری گھٹی میں شامل ہے۔ ہمارے گھر کے ساتھ مسجد تھی۔ اس دور میں لوگ دور دراز کے سفر پیدل کیا کرتے تھے۔ اور دیہات کی مساجد میں قیام کرتے تھے۔ ہمارا گھر مسجد کے ساتھ تھا۔ میری والدہ ہمیں اپنے کھانے میں سے مسافروں کو کھانا کھلانے کی تلقین کیا کرتی تھی۔ لہٰذا گلاسکو آنے کے تھوڑے عرصے بعد ہی میں نے سماجی فلاح و بہبود کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ان دنوں وہاں جمعیت اتحاد المسلمین نامی تنظیم کام کر رہی تھی۔ پھر ہم دوستوں نے سوشل اینڈ کلچرل سوسائٹی بنائی۔ جمعیت اتحاد المسلمین کے تحت ہم پاکستانی کمیونٹی کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے۔ سوشل اینڈ کلچرل سوسائٹی کے تحت ہم نے پاکستانی ثقافت کو فروغ دینے اور باہمی رابطے کا انتظام کیا۔ اس ادارے کے پلیٹ فارم

www.urdudigest.pk

سے سکاٹ لینڈ میں ہر ہفتے پاکستانی فلم چلانے کے علاوہ مشاعرے اور دیگر تفریحی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں۔ یوں پاکستانیت کو فروغ ملا اور پاکستانیوں کو پاکستان کی خدمت کرنے پر مائل کیا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے موقع پر ہم نے پاکستان میں رقم بھجوانے کے لیے ایک کیمپ لگایا۔ لوگوں کے گھروں اور دفاتر میں جاکر میں نے انہیں قائل کیا کہ وطن کو اس وقت ہماری ضرورت ہے۔ لوگ اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے پورے مہینے کی تنخواہیں بھی جمع کروادیں۔

گلاسگو میں کوئی باقاعدہ مسجد نہیں تھی۔ باجماعت نماز کے عارضی انتظامات تھے۔ ہم نے جمعیت اتحادالمسلمین کے پلیٹ فارم سے ایک جامع مسجد بنانے کا فیصلہ کیا۔ حکومت سے ہمیں شہر کے مرکز میں دریا کے کنارے تین ایکٹر قطعہ اراضی مل گیا۔ حکومتی شرط کے مطابق ہمیں چار سال کے اندر مسجد کو مکمل کرنا تھا۔ ہم نے تمام پاکستانیوں کو متحرک کیا خصوصاً خواتین نے فنڈ ریزنگ میں بھرپور کام کیا۔ میں ان دنوں جمعیت اتحادالمسلمین کا نائب صدر تھا۔ ۱۹۸۱ء میں مسجد کی تعمیر کا آغاز کیا۔ ۱۹۸۴ء میں یہ مسجد تعمیر ہوگئی۔ یہ مسجد تعمیراتی فن کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کی تعمیر پر اس وقت کے تقریباً ۳۰ کروڑ پاکستانی روپے خرچ ہوئے۔ اس کے بعد مزید مساجد بھی تعمیر ہوئیں۔ اس وقت گلاسگو میں سترہ مساجد ہیں۔

افغان مجاہدین کے لیے ہم نے عطیات جمع کیے اور اس وقت تقریباً تین کروڑ روپے لے کر میں پاکستان آیا یہاں افغان مجاہدین میں یہ رقم خود تقسیم کرکے گیا۔

جنرل (ر) جہانداد نے اپنی جائیداد الشفاء ہسپتال کے لیے وقف کی۔ وہ اس ادارے کے لیے فنڈ ریزنگ کرنے کے لیے برطانیہ آئے تو ہم نے انہیں کروڑوں روپے کے عطیات جمع کرکے دیئے۔ وہ کئی سال تک مسلسل اس مقصد کے لیے گلاسگو تشریف لاتے رہے۔

عمران خان نے کینسر ہسپتال کا آغاز کیا تو ہم نے کینسر ہسپتال کے لیے بھی عطیات جمع کرکے دیئے۔ ابرارالحق کے ادارے سہارا فار لائف ٹرسٹ کے لیے بھی عطیات جمع کیے۔

جب کارگل کی جنگ کے دوران بھارتیوں نے امریکی اور برطانوی اخبارات میں پاکستانی فوج کے توہین آمیز اشتہارات شائع کرائے تو مجھے بہت رنج ہوا۔ میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اس اشتہار کا جواب دینے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے عطیات بھی جمع کیے اور پاکستانی کونسل خانہ سے بات کی مگر ہمیں یہ کہہ کر جوابی اشتہارات شائع کرنے سے روک دیا گیا کہ اس طرح ایک لاحاصل سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ بہرکیف میں نے اپنے جذبات کا اظہار گلاسگو اور اس وقت کے حکومتی عہدیداران سے بھی کر دیا بلکہ میری تنقید سے اس وقت کے برسراقتدار سیاستدان ناراض بھی ہوگئے۔

پاکستان میں جب بھی کبھی کوئی مصیبت کی گھڑی آئی ہم نے دل کھول کر عطیات فراہم کیے۔ ۲۰۰۵ء کے زلزلے اور ۲۰۱۰ء کے سیلاب کے دوران بھی ہم نے کروڑوں روپے جمع کیے۔ میں نے اپنی نگرانی میں سیلاب متاثرین کو گھر تعمیر کروا کر دیئے۔

میں نے آٹھ سال قبل تمام کاروباری معاملات اپنے بیٹے اور پوتے کی سپرد کر دیئے اور خود کو گلاسگو اور پاکستان میں خدمت خلق کے لیے وقف کر دیا۔ ۷۸ سال کی عمر میں بھی ایک نوجوان کی طرح متحرک اور پرجوش ہوکر خدمت خلق کے امور نبھاتا ہوں۔ میری سماجی خدمات کے اعتراف میں پاکستانی کمیونٹی نے بابائے امن اور کنگ آف گلاسگو کے خطابات سے نواز رکھا ہے۔ جب کہ حکومت برطانیہ نے سماجی خدمات کے اعتراف میں اعلیٰ شہری اعزاز ممبر برٹش ایمپائر عطا کیا ہے۔ حکومت پاکستان نے بھی میری خدمات کے اعتراف میں ستارہ خدمت عطا کیا۔ میری یہ عزت افزائی اور شہرت خدمت خلق کا انعام ہے۔ ■

فرق

ایک بدقسمت بیوی کا انوکھا ماجرا، وہ عجب امتحان میں پھنس گئی تھی

معلوم نہیں کون سی گھڑی تھی جو اس چار منزلہ عمارت کا آخری فلیٹ خرید لیا۔ پتا نہیں کسی سے پوچھا تھا یا نہیں! شاید سوچا ہو کہ یہ ٹھکانہ فراہم کر رہے ہیں، یہی بہت ہے۔ اس وقت تو بس سوچ تھی کہ اللہ تیرا

اُم ایمان

www.urdudigest.pk

شکر، میرا گھر بس رہا ہے..... اب یہ گھر آسمان پر بس رہا ہے یا آسمان سے ذرا نیچے، یہ کسی نے نہ سوچا۔"

خالدہ بیگم یہ باتیں سوچتی ہانپتی کانپتی زینے طے کر رہی تھیں۔ ایک ہاتھ میں ترکاری کے تھیلے اور دوسرے میں گھر کا سودا۔

صبا کب کی اوپر پہنچ کر ماں کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ "اف جلدی آیئے نا، مجھے غسل خانے جانا ہے۔" صبا سے صبر نہیں ہوا۔ ایک سیڑھی نیچے اتر کر ماں کے ہاتھ سے چابی لے لی۔

"لو یہ تھیلے بھی لے لو....."

"اونہوں، مجھے غسل خانے جانا ہے۔"

اس نے بیگ بھی باہر ہی چھوڑ دیا۔ ماں نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر آخری سیڑھی پر قدم رکھا۔ سانس پھولا ہوا تھا اور گھٹنوں میں درد الگ! اتنے زینے دن میں کئی دفعہ چڑھنے اترنے ہوتے تھے۔ ضعیف العمری پھر وزن بھی خاصا تھا..... ہر دفعہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انھیں اپنے بھائیوں پر غصہ آتا۔ آخر پہلی منزل یا دوسری پر بھی تو فلیٹ لیا جاسکتا تھا؟

بیاہ کے وقت خالدہ بیگم چار بھائیوں اور تین بہنوں کی چوتھی بہن تھیں۔ ماں باپ حیات تھے۔ ابا کا کاروبار بھائیوں نے سنبھالا بلکہ اچھا خاصا بڑھا بھی لیا۔ چار بہنوں میں سے بڑی کی شادی وقت پر ہوئی۔ دوسرا نمبر خالدہ کا تھا۔ واجبی شکل و شباہت سی تھی۔ پھر ایک بہن ذہنی معذور تھی اور چوتھی شاہدہ جس کی بات چیت خاندان میں ہی طے تھی۔ لیکن خالدہ کی وجہ سے اس کی بھی رخصتی نہ ہو پائی۔

خالدہ کی شادی کے لیے سب نے ہی بڑی کوششیں کی لیکن عمر ۳۰ سال اور پھر شکل وصورت بھی معمولی، تعلیم بھی کوئی خاص نہیں بس انٹر تھیں۔ لہٰذا معاملہ کہیں جم نہ سکا۔ آخر شادی دفتر والوں نے مشورہ دیا کہ اگر آپ لڑکی کے نام کوئی جائیداد، زمین وغیرہ کر دیں گے تو معاملہ کچھ آسان ہوسکتا ہے۔ بھائیوں نے مشورہ کر کے طے کیا کہ جائیداد کے حصے میں سے خالدہ کے لیے ایک فلیٹ خرید کر اسے جہیز میں دے دیا جائے۔ یوں بالآخر بات بن گئی۔

عرفان عمر میں خالدہ سے تھوڑا ہی بڑا اور چار بھائیوں کا سب سے چھوٹا بھائی تھا۔ نوکری کرتا اور پھر کنوارا تھا۔ سب کو ہر لحاظ سے ٹھیک لگا..... سو چار ماہ میں شادی کر دی گئی۔

خالدہ شادی کے بعد سسرال میں دو چار ماہ ہی رہیں اور پھر اپنے فلیٹ میں منتقل ہوگئیں۔ ایک بچی ہوئی جو اب خیر سے گیارہ سال کی ہو چکی۔ لیکن خالدہ کی زندگی کے امتحان نہ کم ہوئے نہ ختم بلکہ ان میں اضافہ ہی ہوا۔ پھر والدین کا سایہ بھی سر پر نہیں رہا۔

ایک جگہ رہنے والوں میں بات چیت اور دوستی ہو جاتی ہے۔ خالدہ بھی پہلی منزل پر رہنے والی حمیدہ کی پکی سہیلی بن گئی۔ کبھی یہ ہوتا کہ سودا سلف لے کر چڑھتے ہوئے وہ حمیدہ کے پاس ٹھہرتیں اور دل کی دو باتیں کر لیتیں۔ آج حمیدہ کے گھر میں تالا لگا تھا، ورنہ وہاں صبا بھی حمیدہ آنٹی کے بچوں، ارسلان اور ماہم کے ساتھ کھیلنے لگتی۔

"شام کو اترنا ہوا تو حمیدہ سے پوچھوں گی کہ سارا دن کہاں غائب رہی.....؟" انھوں نے سوچا۔

.....

"ابا! مجھے ہوم ورک کرا دیں..... حساب کے یہ سوال تو بہت مشکل ہیں۔ مجھے ان کی بالکل سمجھ نہیں آرہی۔"

عرفان نے گھر میں قدم رکھا تو صبا الجھتی ہوئی باپ کے پاس آگئی۔

"اوہ ہو، ابھی تو آیا ہوں، امی سے پوچھ لینا تھا..... لیکن وہ بھلا کہاں بتا پائے گی، اُردو میڈیم ایف اے پاس!" عرفان نے حسب عادت طعنہ دیا۔

"ویسے خالدہ بیگم یہ تو بتاؤ، تمھاری شادی اتنی دیر میں ہوئی۔ پھر تم نے پڑھائی مکمل کیوں نہ کی؟ کچھ پڑھ لکھ لیتی تو آج کہیں ملازمت کر لیتی۔ گھریلو خرچے پورے کرنے میں کچھ آسانی بھی ہو جاتی..... بھلا اُردو میڈیم ایف اے پاس کو کون پوچھتا ہے؟"

"اتنا چڑ چڑا کیوں ہو رہا ہے عرفان؟ کہیں پھر ملازمت چھوڑ کر تو نہیں آگیا؟" گزشتہ ۸، ۱۰ برس میں کوئی دس نوکریاں تو چھوڑیں ہوں گی اس نے! کہیں ٹک کر کام

www.urdudigest.pk

کرے تو تنخواہ میں اضافہ بھی ہو..... بھلا خالی بی کام کو کون پوچھتا ہے؟ ہونہہ، مجھ سے دو سال ہی تو زیادہ پڑھ پائے اور طعنے ایسے دیتے ہیں جیسے خود تو پی ایچ ڈی کیا ہے۔"

خالدہ نے سارے اندازے دل ہی دل میں لگائے اور صحیح لگائے۔ وہ جب بھی ملازمت چھوڑ کر آتا تو چڑچڑا پن انتہا کو پہنچ رہا ہوتا۔ ذرا کوئی بات مزاج کے خلاف ہوتی، وہ مالک کو سنا کر گھر آجاتا۔ پھر گھر پر دو چار ماہ بے روزگاری کے گزارتا۔ خالدہ بھائیوں سے خرچا لے کر آتی تو گھر کا دال دلیا چلتا۔ پھر صبا کی فیس بھی تھی..... باپ کو اچھے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھانے کا شوق تھا۔

صبح صبا کو اسکول بھیج کر سودا لیتی ہوئی خالدہ اوپر چڑھ رہی تھی تو دیکھا کہ حمیدہ کے فلیٹ کا دروازہ کھلا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ اندر چلی گئی۔

.....

"کیا کہہ رہی ہو خالدہ؟ عرفان بھائی پھر نوکری چھوڑ کر آگئے؟ آج کل ملازمت ملنا کتنا مشکل ہو گیا ہے اور پھر مہنگائی۔" حمیدہ نے سہیلی کا دکھڑا سن کر کہا۔

"اف مہنگائی! پتا نہیں قیمتیں کہاں پہنچ کر رُکیں گی؟ کل پیاز، آلو ۲۰ روپے کلو تھے، آج ۳۰ روپے بول رہا تھا۔ زیادہ لے بھی نہیں سکتی۔"

"تم عرفان بھائی کو سمجھاؤ تو سہی، یوں نوکری کو لات نہ مارا کریں۔"

"تم سمجھتی ہو کہ میں بولتی نہیں؟ میں تو سمجھا سمجھا کر عاجز آگئی ہوں۔ ادھر ان کی الٹی سیدھی سنوں، ادھر میرے بھائیوں کا خیال کہ میں شوہر کو نکھٹو بنا رہی ہوں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بعض دفعہ لگتا ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ پھر عرفان کی منصوبہ بندی تو سنو۔ جائیداد میں سے حصہ ملنے کے انتظار میں ہیں۔ کہتے ہیں، کاروبار کروں گا، یہ چھوٹی موٹی نوکری مجھ سے نہیں ہوتی۔ "غلامی ہے غلامی، ان کے خیال میں۔"

"جائیداد میں حصہ ملنے کا انتظار..... کیا تمھارے والدین کی جائیداد؟

"میرا حصہ تو بھائیوں نے اس فلیٹ کی شکل میں دے دیا، ان کے بھائیوں نے دینا ہے۔"

"تو عرفان بھائی کے بھائی کیوں نہیں دیتے؟ شاید شوق کے باعث محنت بھی کریں اور کاروبار کامیاب ہو جائے۔"

"کہتی تو حمیدہ تم ٹھیک ہو لیکن عرفان کے بھائی کچھ دینے والے نہیں..... مجھ سے کہتے ہیں کہ یہ پیسا بھی عرفان اڑا ڈالے گا۔ پھر صبا کی شادی کے وقت تمھارے ہاتھ میں کچھ نہیں ہوگا۔"

"چھوڑو خالدہ، صبا تو ابھی دس گیارہ سال کی ہے۔ اس کی شادی میں کم از کم دس سال پڑے ہیں۔"

"ہاں مگر دس سال گزرتے کون سی دیر لگتی ہے؟

"اچھا میں چلتی ہوں۔ عرفان اٹھ گیا ہوگا۔ پھر آؤں گی۔ ایک مشورہ بھی کرنا ہے تم سے....."

"ارے چائے تو پیتی جاؤ۔"

"پھر آؤں گی ذرا اطمینان سے..... خدا حافظ۔"

خالدہ نے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

حمیدہ نے دل میں سوچا "خالدہ کے چہرے پر یہ مسکراہٹ کتنی عجیب لگ رہی ہے۔ شاید اس لیے کہ اسے کبھی ہنستے مسکراتے نہیں دیکھا یا شاید یہ مسکراہٹ تھی ہی نہیں، یہ تو نوحہ تھی، ایک نئے انداز کا نوحہ!"

☆☆

اگلے ہفتے خالدہ پھر صبح ہی آگئی۔ حمیدہ کو صبح کسی کے آنے سے خدشہ رہتا تھا کہ اب کام وقت پر نہیں ہوں گے۔ ایک لحاظ سے یہ خدشہ صحیح بھی تھا۔ جب دو خواتین گفتگو کریں تو وقت کا پتا کہاں چلتا ہے؟ لیکن پھر بھی اسے اچھا لگا..... کیونکہ خالدہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور وہ زبردستی کی بھی نہیں لگتی تھی۔ اس نے خالدہ کو خوش آمدید کہا۔ خالدہ نے چائے کے لیے منع کیا تو حمیدہ فرج میں رکھے دو امرود اور ایک کینو پلیٹ میں رکھے لے آئی۔

"تم اس دن کچھ کہتے کہتے چلی گئی تھیں؟" اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''ہاں حمیدہ!، وہی بات کہنے اور مشورہ کرنے آئی ہوں۔ تمھیں تو پتا ہے میری شادی دیر سے ہوئی۔ ماں کی بیماری کی وجہ تھی یا میری معمولی شکل وصورت! ماں کی خدمت کرنے کی وجہ سے پڑھ بھی نہیں سکی۔ میں مشکل سے مہینے میں دو چار دن کالج جاتی تھی۔ پھر کالج چھوڑا اور گھر بیٹھ گئی۔ بھائیوں نے پھر شادی کر دی، پتا نہیں کیا کیا جتن کر کے! عرفان جیسے ہیں، تم جانتی ہو۔ مشکل سے کسی نوکری پر نکلتے ہیں۔ میں نے ان دس بارہ برسوں میں بڑا کڑا وقت گزارا ہے۔ بھائی ہیں، چار چار اور کھا رہے ہیں۔ جے سجائے گھروں میں اپنی بیویوں کے ساتھ مزے سے رہتے ہیں۔ میرے گھر میں فاقے ہونے لگیں، تو مجبوراً ان کے پاس جاتی ہوں۔ کڑوی کسیلی سنا کر دو چار ہزار روپے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں۔''

''ایک بات بتاؤں.....'' خالدہ کی آنکھوں میں خوشبوں کے دیپ سے جل رہے تھے۔ حمیدہ وہ بات سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوگئی کہ کس نے یہ دیپ جلائے ہیں؟ اس اُمید اور خوشی کے ٹمٹماتے سے دیے.....''

''صبا کے اسکول کے پرنسپل مجھے پسند کرنے لگے ہیں۔'' ایک لمحے کو خالدہ جھجکی پھر بولیں ''انھوں نے پیشکش کی ہے..... عمر تو خاصی ہے لیکن اچھے کھاتے پیتے اور مال دار ہیں۔''

خالدہ کی بات سن کر حمیدہ ہکا بکا رہ گئی۔ حواس کچھ بحال ہوئے، تو پوچھا، ''انھیں یہ نہیں پتا کہ تم شادی شدہ ہو..... تمھارے شوہر ہیں؟''

حمیدہ دانتوں میں انگلی دیے خالدہ کو تکتے ہوئے سوچنے لگی ''جاتی ہوئی جوانی کا آخری پل..... اگر جوانی کہیں تو؟ صحت کے مسائل میں الجھا بھاری جسم، تیسری منزل پر چڑھنا مشکل لیکن پھر بھی دوسری شادی کے حسین خواب..... دولت سے کھیلنے کی تمنائیں۔ یہ تو دن میں خواب دیکھنا ہوا اور ایسے خوابوں کی تو بڑی بھیانک تعبیر نکلتی ہے۔ کیا میں خالدہ کو آئینہ دکھاؤں.....؟ اس کی آنکھوں میں جلتے دیپ بجھا ڈالوں؟ یا..... یا ایک عشقیہ کہانی کے مزے لوں..... چٹ پٹی..... مزیدار؟''

حمیدہ نے آخر گہری سانس لے کر سہیلی کا ہاتھ تھاما اور بولیں، ''خالدہ کچھ کام اور فیصلے ایسے ہوتے ہیں جنھیں انسان خود ہی کر سکتا ہے۔ تب اسے ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ حالات سے شکست کھانے کے بجائے انھیں تبدیل کرنے کا عزم ضروری ہے۔'' یہ کہہ کر حمیدہ نے خالدہ کی آنکھوں میں جھانکا جہاں چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ آس کی لو میں اضافہ شاید اس اُمید پر تھا کہ مشورہ مرضی کے مطابق ملے گا۔

وہ پھر گویا ہوئیں ''عمر کے اس حصے میں دوسرا بیاہ، وہ بھی کسی انجان کے ساتھ جس نے شاید شادی یا شادیاں کی ہوں گی۔ معلوم نہیں ان کی بیوی یا بیویوں کے ساتھ کیسا تجربہ رہا ہو؟ پھر ان کے رویے، طور طریقے اور معاملات کیا ہیں؟ اس شادی کے بعد معاشرے میں تمھیں کیسے دیکھا سنا جائے گا؟ تمھاری بیٹی کہاں رہے گی؟ تم اس کے بغیر زندگی گزار لو گی؟

''یہ بہت سارے سوالات ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ شادی ٹھیک نہیں، نہ اخلاقی نہ شرعی لحاظ سے! غور کرنے پر تم بھی اس نتیجے پر پہنچو گی۔ عرفان بھائی اگر مالی لحاظ سے کمزور اور غیر سنجیدہ ہیں، تو گاڑی کا دوسرا پہیہ تم ہو..... تم بہت کچھ کر سکتی ہو۔ علم حاصل کرنے کی کوئی قید نہیں، تم نجی طور پر پڑھنا شروع کرو۔ جو وقت گزر گیا، سو گزر گیا۔ امر بیل نہ بنو جسے کسی نہ کسی کا سہارا درکار ہوتا ہے بلکہ خود کو اتنا مضبوط بناؤ کہ تم دوسروں کا سہارا بنو۔ تمھیں اپنے گھر کی بنیاد مضبوط بنانی اور بیٹی کے لیے مثال بننا ہے.....''

یہ کہہ کر حمیدہ نے دوبارہ خالدہ کی آنکھوں میں جھانکا، جنھیں آنسوؤں نے دھندلا دیا تھا۔ وہ بولی، ''تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں ماں ہوں اور پھر ایک عورت بھی۔ میں شادی نہ کرنے کا فیصلہ ہی کروں گی۔ لیکن عرفان..... اگر انھیں ایسا موقع ملے تو کیا وہ بھی ایسا فیصلہ کر پائیں گے؟'' یہ کہتے ہوئے خالدہ کے ہونٹوں سے دل چیر دینے والی سسکی نکلی اور وہ حمیدہ کے گلے لگ کر بلکنے لگی۔ ■

اُردو ڈائجسٹ
کا مقبول سلسلہ

مشورہ حاضر ہے

آپ بھی ان مشوروں کا حصہ بن سکتے ہیں، بڑے بڑے مسائل کے چھوٹے چھوٹے حل اکثر زندگی آسان کر دیتے ہیں

صغیرہ بانو شیریں

میرا بچہ کب بولے گا

میرا بچہ ایک سال کا ہے۔ منہ سے آوازیں تو نکالتا ہے مگر اب تک اس کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا جس کی وجہ سے پریشان ہوں۔ آخر وہ کب بولنا شروع کرے گا؟

(بیگم عبدالمجید)

کچھ بچے دیر سے بولتے ہیں۔ پریشان نہ ہوں۔ اسے تھوڑا سا وقت دیا کریں۔ جب وہ موڈ میں ہو تو اس کے سامنے ماما کا لفظ کئی دفعہ دہرائیں۔ کئی بچے سات آٹھ ماہ کی عمر ہی میں لفظ سیکھ کر دہراتے ہیں اور کئی ڈیڑھ سال کے بعد سیکھتے ہیں۔ بچے کی غذا اور صحت کا خیال رکھیے، وہ ان شاء اللہ بولنا شروع کر دے گا۔ زبان کے نیچے تانتوا ہوتا ہے۔ بعض دفعہ وہ جڑا ہوا نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر اس پر ہلکا سا کٹ لگا دیتا ہے۔ آپ ڈاکٹر کو ایک بار ضرور دکھائیے۔

اٹھرا کا مرض

میری بیوی کو اٹھرا کا مرض ہے۔ بچے زندہ پیدا ہوتے ہیں مگر فوراً ہی فوت ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹری علاج بھی جاری ہے۔ میں فیصل آباد میں رہتا ہوں۔ پانچ بچے اسی طرح فوت ہو چکے ہیں آپ اس بارے میں ہمیں کچھ مشورہ دے سکتی ہیں؟

(ع۔ا)

فیصل آباد میں ہومیوپیتھک ڈاکٹر میاں محمد یونس صاحب ہیں۔ وہ اٹھرا کا علاج بھی کرتے ہیں۔ آپ ان سے رابطہ کریں (ڈاکٹر یونس 0322-6330219)

بچوں کا رجحان بدل گیا ہے

ہمارے معاشرے میں انٹرنیٹ کا عمل دخل زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ میں بچوں کو روکتا ٹوکتا نہیں بلکہ ان کی آزادی کا قائل ہوں۔ میرے بچے اوسط لیول کر رہے ہیں۔ پچھلے دنوں ان کا رزلٹ دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ اتنے کم نمبر، دوسرا صدمہ یہ ہوا رات گئے کسی دوا کی تلاش میں بچوں کے کمرے میں گیا تو دیکھا پڑھائی نہیں ہو رہی بلکہ عجیب وغریب پروگرام دیکھے جا رہے ہیں۔ یہ اب میرا ہی نہیں بلکہ بہت سارے لوگوں کا مسئلہ ہے۔ کیا کرنا چاہیے؟

(ایک پریشان باپ)

اس مسئلہ پر میرے پاس تین چار خواتین کے فون آئے۔ وہ بھی سخت پریشان تھیں، بچوں پر بڑھوتری کی عمر میں خاص نگاہ رکھنی چاہیے۔ کمپیوٹر، ٹی۔وی علیحدہ ان کے کمرے میں نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ ایسے کمرے میں رکھنا

www.urdudigest.pk

چاہیے جہاں آتے جاتے آپ نظر رکھ سکیں۔ دوسری بات یہ کہ آپ بچوں کو یہ سمجھائیے۔ مہنگائی کے اس دور میں آپ ان کو کس طرح تعلیم دلا رہے ہیں۔ یہ چند سال ان کے لیے بہت اہم ہیں۔ آج کل بچوں کو اس بات کا احساس نہیں وہ اپنا وقت اور والدین کا پیسا کیسے ضائع کر رہے ہیں۔ رات بھر جاگ جاگ کر نیٹ پر کام کرنے کے بہانے پروگرام دیکھے جاتے ہیں نہ اپنی عزت کا خیال اور نہ والدین کا احساس۔ تعلیم مہنگی ہوگئی ہے مگر بچے بالکل خیال نہیں کرتے۔ آٹھویں تک کے بچوں کو ویڈیو گیمز کھیلنے اور انٹرنیٹ سے روکنا چاہیے۔ دو گھنٹے سے زیادہ نہ کھیلنے دیں اور خود بھی ان کو دیکھتے رہیں۔ بند کمرے میں بڑے بچوں کو بھی بالکل کمپیوٹر پر مصروف نہ ہونے دیں۔

نیند میں بولنا

میرے شوہر نیند میں بڑبڑاتے رہتے ہیں۔ واضح بات نہیں سمجھ آتی اور اب میرا چھ سالہ بیٹا بھی رات کو بولتا ہے۔ کبھی کبھی لڑنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کی صحت بھی اچھی ہے۔ آخر ایسا کیوں کرتا ہے؟ (بیگم خواجہ سعید)

اکثر لوگ جب خواب دیکھتے ہیں تو ساتھ ساتھ بولنے لگتے ہیں۔ جب خواب ختم ہوتا ہے تو وہ بھی خاموش ہو جاتے ہیں۔ آپ کے شوہر کے دماغ پر بھی بوجھ ہوگا۔ بے شمار دفتری پریشانیاں ہوسکتی ہیں جنھیں وہ ظاہر نہ کرتے ہوں۔ ان سے کہیے کہ نماز پڑھ کر لیٹا کریں تا کہ ان کا بوجھ قدرے کم ہو جائے۔

بیٹے کی کروٹ بدل دیا کریں۔ دل کی بائیں طرف کروٹ لینے سے بھی یہ مسئلہ ہوتا ہے۔ بچے کو چھوٹی چھوٹی قرآنی آیات سکھائیں، سوتے وقت وہ پڑھ لے۔

ایگزیما

محترمہ سعیدہ کا کراچی سے فون آیا پوچھتی ہیں، خشکی کی وجہ سے ہاتھوں پر ایگزیما ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے؟ ان کی نواسی کے ہاتھوں میں مسئلہ ہے۔ دمام اور مکہ مکرمہ میں ان کی بہو اور بیٹی رہتی ہیں۔ وہ اس مسئلہ کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔

سعیدہ بہن کی بہو فارمسٹ ہیں، کریمیں وغیرہ لگاتی ہیں۔ سعودی عرب میں گھیکوار مل جاتی ہے۔ کسی مالی سے کہہ کر پودا منگوائیے۔ خشکی اور بالوں کی سکری کے زخموں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی دوا نہیں۔ لگانے کے ساتھ ساتھ اگر ایک چھوٹا سا ٹکڑا صبح نہار منہ نگل جائیں تو زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ دن میں دو تین دفعہ لگانا پڑتا ہے۔ ایگزیما اور دوسری جلدی بیماریاں حتیٰ کہ جلد کا سرطان بھی ہو تو اس میں فائدہ دیتا ہے۔ بہت زیادہ خشکی ہو تو آپ تھوڑا سا زیتون کا تیل ملا کر لگا سکتی ہیں۔

اسگند پاک

قاریہ شاہین بہن کا کراچی طارق روڈ سے فون آیا۔ وہ اسگند پاک کے متعلق پوچھنا چاہ رہی تھیں۔ میں نے انھیں حکیم سلیمانی صاحب کا نمبر دے دیا۔ گھر میں دوا بنانا مشکل ہے۔ وہ بنی ہوئی دوا منگوا لیں تو زیادہ بہتر ہے۔ پنجاب میں اسگند کے پودے عام دستیاب ہیں۔ گاؤں دیہات میں بھی اسگند سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ جوڑوں کے درد میں خواتین کی اندرونی تکالیف میں، مردانہ، زنانہ کمزوری کے لیے اولاد کے لیے عموماً اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ مختلف دواؤں کے ساتھ اس کا مرکب بنایا جاتا ہے۔ ہومیوپیتھی میں بھی اس کی جڑ کا ٹنکچر بنا کر کامیابی سے استعمال کرایا جا رہا ہے۔ اسگند خریدتے وقت اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے کہ اس میں سوراخ نہ ہو، گھن نہ لگا ہو، پرانی نہ ہو۔ ورنہ فائدہ کے بجائے نقصان ہوتا ہے۔

اولاد کا مسئلہ

آزاد کشمیر سے عظمیٰ طارق پوچھتی ہیں۔ میری عمر ۳۳ رسال ہے، باوجود علاج کے اب تک اولاد سے محروم ہوں۔ بہت پریشان ہو کر آپ سے پوچھ رہی ہوں۔ اس

www.urdudigest.pk

بارے میں ضرور بتائیں۔

عظمیٰ بی بی! پہلی فرصت میں آپ اپنے شوہر کا بھی معائنہ کرائیں اور اپنا بھی۔ پھر دیکھیے ڈاکٹر کیا کہتے ہیں۔ اب بانجھ پن قابل علاج ہے۔ ڈاکٹر آپ کو خود کسی اچھی گائنا کالوجسٹ کا پتا دے گا۔ جدید طریقہ علاج اب آپ بھی کرا سکتی ہیں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، نماز پڑھ کر آپ اللہ سے دعا کریں۔ وہ رحیم کریم ہے۔ ان شاء اللہ آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ غذا اور دوا سے سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔

گلا خراب ہے

سردی میرے گلے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جیسے ہی سردی بڑھے نزلہ شروع اور آواز بیٹھ جاتی ہے۔ گلا خراب ہونے پر بہت مسئلہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے بتائیے؟ (عامر شہزاد)

کچھ لوگ سردی سے زیادہ ہی متاثر ہوتے ہیں۔ مچھلی کے تیل کا ایک کیپسول آپ نومبر کے آخری ہفتہ سے کھانا شروع کریں۔ دو تین ماہ کھائیں گے تو بہت فرق پڑے گا۔ جیسے ہی گلا خراب ہونے کی علامت محسوس ہو، آپ رات کو سوتے وقت ضرور گرم پانی میں تھوڑا سا نمک ڈال کر غرارے کریں۔ اسی طرح گرم پانی میں ایک چمچہ شہد ملا کر پئیں، گلا صاف ہو جائے گا۔ اب تو بازار میں جوشاندہ بنا بنایا دستیاب ہے۔ آپ صبح شام گرم پانی میں ایک پیکٹ ڈال کر پینا شروع کریں۔ تھوڑی سی ادرک چھیل کر کوٹ کر دو چمچ رس نکال کر اس میں تین چمچ شہد ملا کر رکھیے۔ دن میں دو تین بار چاٹ سکتے ہیں۔ ذرا سی احتیاط آپ کے گلے کو بہتر رکھے گی۔

وٹامن ای

میری امی دوا نہیں کھاتیں۔ ان کو ڈاکٹر نے وٹامن ای کے کیپسول بتائے ہیں۔ ان کو سردی بھی بہت لگتی ہے۔ انھوں نے مجھ سے کہا ہے کہ آپ سے پوچھوں، وٹامن ای کن چیزوں میں ہوتا ہے تا کہ وہ استعمال کر سکیں۔ (رابعہ حسین)

بی بی! آپ گھر میں گندم کا چکی والا آٹا منگوائیے۔ اس میں اچھی خاصی چوکر یا بھوسی ہوتی ہے۔ آٹا بغیر چھانے گوندھ کر پکائیے۔ آج کل بازار میں سرسوں کا ساگ، میتھی، چولائی ملتی ہے۔ آپ ہری سبزیوں کا استعمال کریں۔ ساگ تو موسم کا تحفہ ہے۔ سیم کے بیج، لوبیا کے بیج کا شوربہ بنائیں۔ بازار میں لوبیے کی پھلیاں مل جاتی ہیں۔ انھیں آپ مختلف طریقوں سے پکا سکتی ہیں۔ ہرے مٹر پکائیے، گہرے سبز رنگوں کی سبزیوں کی سلاد بنائیے، ان میں ابلے مٹر ملا دیجیے۔ سیم اور لوبیا کے بیجوں کی سلاد بہت مزے کی ہوتی ہے۔ وہ بنا سکتی ہیں۔ اگر صرف وٹامن ای کا ایک کیپسول دوپہر کے کھانے کے ساتھ لیا کریں تو بڑھاپے کی کئی بیماریوں کا تدارک ہوسکتا ہے۔ اپنے ڈاکٹر سے پوچھیے، غذا میں انڈا شامل کریے، گیہوں کا دلیہ، شکر قند، کلیجی وغیرہ بھی آپ کے لیے اچھی ہے۔

اسپغول

پیچش میں اسپغول کس طرح کھا سکتے ہیں، یہ کوئی نقصان تو نہیں کرتی۔ میں نے دیکھا ہے اسپغول کی بھوسی لوگ بہت خریدتے ہیں۔ (عمارہ)

عمارہ بی بی! اسپغول کی بھوسی آج سے نہیں بلکہ برسوں سے استعمال کی جا رہی ہے۔ پیٹ خراب ہو، پیچش کا مسئلہ ہو تو آدھے کپ تازہ دہی میں تقریباً نو دس گرام اسپغول ڈال کر رکھ دیں۔ اسے کانٹے سے اچھی طرح ملا دیں۔ آپ اسے پون گھنٹہ یا ایک گھنٹہ بعد کھائیں۔ دو تین دن کھانے سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔ آپ کیلے کو چھیل کر اس پر چاروں طرف بھوسی اچھی طرح لگا کر بھی کھا سکتے ہیں۔ اسی طرح قبض میں عموماً لوگ رات گرم دودھ کے ساتھ اسپغول کی بھوسی کھا لیتے ہیں۔ اس سے آنتوں کا فعل ٹھیک رہتا ہے۔ قبض دور ہو جاتا ہے۔ یہ نقصان نہیں دیتی۔ آپ اسے استعمال کر سکتی ہیں۔

عام انسانوں کے درمیان رہنے والے

غیر معمولی انسان

کرامت علی بھٹی کی کتاب ''کیسے کیسے چہرے'' کی تقریب رُونمائی

صحافی کا کام شور مچانا ہے اور صوفی کا کام خاموش رہنا

عمیر محمود

ماہنامہ ادب لطیف کے مدیر جناب شاہد بخاری نے تلاوت کلام پاک سے تقریب کا آغاز کیا۔ یہاں معلوم ہوا، کہ ادیب ادیب ہی ہوتا ہے، انہوں نے سورۃ اخلاص کی تلاوت کی اور ترجمے کو منظوم کر دیا

کہو وہ خدا ایک ہے بالیقیں
کسی کا وہ محتاج ہرگز نہیں
نہ اس نے کسی کو تولد کیا
نہ وہ خود کسی شے سے پیدا ہوا

باقاعدہ تقریب سعد اللہ شاہ کی تحریر اور عمران نقوی کی نظم سے شروع ہوئی۔ وہ حیران تھے کہ کتاب لکھنے والا کرامت علی بھٹی کیسا راجپوت ہے کہ راجپوت لگتا ہی نہیں۔؟

اس سلسلے کا سب سے دلچسپ تبصرہ اخوت کے سربراہ ڈاکٹر امجد ثاقب کا تھا۔ انہوں نے کرامت علی بھٹی کو معمولی لوگوں میں رہنے والا غیر معمولی انسان قرار دیا، اور مضمون کا عنوان باندھا ''صوفی اور صحافی''۔

کہنے لگے ''صوفی اور صحافی دو مختلف کردار ہیں لیکن کرامت بھٹی نے ان دونوں کرداروں کو اپنی ذات میں یک جا کر لیا ہے۔ صحافی کا کام کھوج لگانا ہے، صوفی کا کام پردہ ڈالنا۔ صحافی کا کام شور مچانا ہے، صوفی کا کام خاموش رہنا۔ صحافی معاشرے کو آئینہ دکھاتا ہے، صوفی خود آئینہ بن جاتا ہے۔ صحافی ارتعاش اور ہلچل ہے، صوفی تحمل اور برداشت۔ کرامت بھٹی کی صحافت صوفیانہ صحافت ہے۔''

کالم نگار اور سفر نامہ نگار ارشاد عارف نے کرامت علی بھٹی سے برسوں کی رفاقت کا ذکر کیا۔ کتاب میں ۶۵ شخصیات کے انتخاب نے تو انہیں متاثر کیا ہی، یہ بات بھی خوب لگی کہ کرامت جس کے انٹرویو لیتے ہیں، اس پر حاوی ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ اپنا نقطہ نظر اس پر مسلط نہیں کرتے، جو سنتے ہیں اسے عمدگی سے رپورٹ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عاصم اللہ بخش، کرامت علی بھٹی کو چھ سال سے جانتے ہیں، اور انہیں ایسا شخص پایا جو اپنے اندر دردمند دل اور حساس طبیعت لیے ہوئے ہے۔ انہیں کتاب کی اس بات نے متاثر کیا کہ جن لوگوں کے پروفائل انٹرویوز کیے گئے وہ امید کا پیغام دیتے ہیں، قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ البتہ ایک شکایت انہیں ضرور تھی کہ ''کرامت علی بھٹی کی اس کتاب میں ایک شخص کا پروفائل رہ گیا ہے..... خود کرامت علی بھٹی کا۔''

ٹی وی اینکر، ممتاز صحافی اور کالم نگار سجاد میر نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ پوری کتاب ہی کرامت علی بھٹی کا پروفائل ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے تو لکھنے والے کو پہچانا ہی اس کتاب سے ہے۔ یہاں پر ایک بار پھر صاحب کتاب کا راجپوت ہونا زیر بحث آیا جب سجاد میر نے کرامت علی بھٹی کو راجپوتوں کا فقیر قرار دیا۔ انہیں یہ حسرت بھی تھی کہ جب کتاب مرتب ہو رہی تھی، ان دنوں وہ کراچی میں کیوں رہائش پذیر تھے؟ اگر لاہور میں ہوتے تو کتاب میں ان کا ذکر بھی ہوتا۔ وہ ۲۴ سال بعد لاہور آئے ہیں۔

''اب میں جن صاحب کو بلانے جا رہا ہوں، وہ معروف اور مقبول کالم نگار ہیں، دھیمے لہجے میں بات کرتے ہیں اور اپنے وزن سے زیادہ دلائل کی مضبوطی سے لکھتے ہیں۔''

تقریب کے میزبان اختر عباس کے چہرے پر شرارتی سی مسکراہٹ تو کھیلتی ہی رہتی ہے، وہ خود کتنے شرارتی ہیں اس کا مشاہدہ تب ہوا جب انہیں دوران تقریب شرارت کا موقع ملا۔ روزنامہ دنیا سے وابستہ عامر ہاشم خاکوانی کو اظہار خیال کے لیے بلاتے ہوئے پیار سے چٹکی لینے سے باز نہ رہے۔ عامر نے بھی مسکرا کر جملے کا لطف لیا۔

عامر ہاشم خاکوانی کے مطابق اردو صحافت کی تاریخ میں یہ کتاب ایک اہم حصہ ہوگی۔ کتاب میں نثر کے اعتبار سے بھی خوبصورت تحریریں ہیں۔ اس سے نئے لکھنے والے بھی سیکھ سکتے ہیں۔ عامر ہاشم خاکوانی کا کہنا تھا کہ خود انہوں نے کرامت علی بھٹی سے خودداری سیکھی ہے۔

اور کتاب کی نثر کتنی خوبصورت ہے، اس کا اندازہ بھی جلد ہی ہو گیا، جب براڈ کاسٹر اصغر زیدی کو دعوت دی گئی کہ وہ کتاب سے کچھ اقتباسات

ڈاکٹر امجد ثاقب

ارشاد عارف

عامر ہاشم خاکوانی

ڈاکٹر خواجہ زکریا

عامر خاکوانی

سعد اللہ شاہ

عمران نقوی

ڈاکٹر عاصم اللہ بخش

اصغر یزدانی

سجاد میر

www.urdudigest.pk

سنائیں۔ انہوں نے حامد علی خان اور حافظ محمد سعید کے باب میں سے اقتباسات پڑھے، حامد علی خان کے بارے میں لکھتے ہوئے تو چلو نغمگی خود بخود در آتی ہوگی، لیکن حافظ سعید کے باب کے کیا کہنے:

''حافظ محمد سعید۔ عجب تاثیر ہے اس نام میں۔ کھٹی میٹھی سی تاثیر۔ کہیں غضب کی طرح دلوں میں بستے ہیں تو کہیں فاتح کی طرح آنکھوں میں جھلکتے ہیں۔ ساری دنیا ان کی نظروں میں ہے، اور یہ ساری دنیا کی نظروں میں۔ سامراج ان کے پر کاٹنے کے درپے ہے، تو یہ اس کی جڑ کاٹنے کے درپے ہیں..... یہی تو ہیں حافظ محمد سعید .....ملاقات میں ہمارے سوال نپے تلے تھے تو ان کے جوابات بھی جچے تلے۔ دوران گفتگو کئی مقامات ایسے بھی آئے کہ دونوں نے ایک دوسرے کو عافیت سے گزر جانے کا راستہ دیا۔''

۲۰ر ہزار سے زائد کتابوں کے مالک پروفیسر ہمایوں احسان بھی کتاب پڑھنے کے بعد اس بات کے قائل نظر آئے کہ یہ امید پیدا کرتی ہے، ایسے لوگوں کا بتاتی ہے جن کے بارے میں پڑھ کر احساس ہو کہ حالات اتنے بھی برے نہیں کہ مایوس ہوا جائے۔ اس کتاب نے انہیں سیکھنے کو بہت کچھ دیا۔ یہ کتاب پڑھنے والے میں morality based اقدار پیدا کرتی ہے۔ ہمایوں احسان صاحب کو کتاب میں درج احمد جاوید کی باتوں سے اتفاق نہیں، وہ یہ باتیں بغیر کوئی لگی لپٹی رکھے کہہ گئے۔

تقریب جاری تھی کہ گلوکاری سے سیاست میں قدم رکھنے والے ابرار الحق بھی آگئے۔ تاخیر سے آئے تھے، سٹیج پر بیٹھنے کے بعد کتاب کی ورق گردانی کی، دعوت خطاب ملی تو کتاب کے بجائے امجد ثاقب صاحب کے تبصرے پر تبصرہ کر گئے۔ وقت گزارنے کے لیے اور بھی خدا جانے کیا کہنا چاہتے تھے اور کیا کہتے رہے، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ البتہ یہ بات انھوں نے خوب کہی کہ جہاں سے وہ اٹھ کر آرہے ہیں، وہاں نہ تو ادب ہے نہ سیاست، منافقت اور سازش بہت ہے۔

''فکر و نظر کی یہ تصویریں، یہ تحریریں،
لوح وقت پر ایک شہادت ٹھہری ہیں
اس کی نوک قلم کی گویا، ایک کرامت ٹھہری ہیں''

کتاب پر یہ منظوم تبصرہ تھا عمران نقوی کا۔

صاحب کتاب، کرامت علی بھٹی جب خود اظہار خیال کے لیے آئے تو سب کو حیران کر گئے۔ افسانوی سے انداز میں ایک خاندان کا ذکر کیا، جن کے گھر آگ لگ گئی، اور ارمانوں کے ساتھ ساتھ بیٹیوں کے جہیز کا سامان بھی جل گیا۔ کرامت نے کہا کہ آج کے دن فروخت ہونے والی کتابوں کی تمام آمدنی اس خاندان کو جائے گی۔ پروگرام کے اختتام تک ۷۰ر ہزار کی کتابیں فروخت ہو چکی تھیں۔

آخر میں باری آئی مہمان خصوصی پروفیسر ڈاکٹر خواجہ زکریا صاحب کی۔ وہ اس بات سے خوش تھے کہ کتاب میں معاشرے میں خیر پھیلانے والے افراد کا ذکر ہے۔ ان کے نزدیک کتاب لوگوں کو بتاتی ہے کہ جستجو ہو تو برے حالات راستہ نہیں روک سکتے۔ کتاب مثبت اقدار کو فروغ دیتی ہے۔ لیکن کتاب پڑھنے کے بعد ان کے ذہن میں کچھ سوالات نے بھی جنم لیا۔ مثلاً وہ سوچتے ہیں کہ عمل خیر کا تسلسل ضروری ہے تو اس کتاب میں شامل لوگوں جیسے کتنے لوگ ہیں پاکستان میں؟ یہ خیر پھیلانے والے لوگ یک جا کیوں نہیں ہو سکتے؟ یک جا ہو سکتے ہیں تو کب ہوں گے؟ اور کیا انفرادی کوششوں سے معاشرے کو بدلا جا سکتا ہے؟

اس تقریب کے ذریعے میں ''رائیڈنگز'' گلبرگ کے ذیلی ادارے سالوں کی شائع کردہ کتاب سے متعارف ہوا، مصنف سے بھی، لیکن اس سے بھی بڑھ کر ایک تصور مجھ پر آشکار ہوا، خیر پھیلانے کا تصور! میں نے سوچا، کیا ہم سب اپنی اپنی انفرادی سطح پر خیر پھیلا سکتے ہیں؟ اور میں نے یہ بھی سوچا، کرامت علی بھٹی کیسا راجپوت ہے، کہ راجپوت لگتا ہی نہیں۔ ■

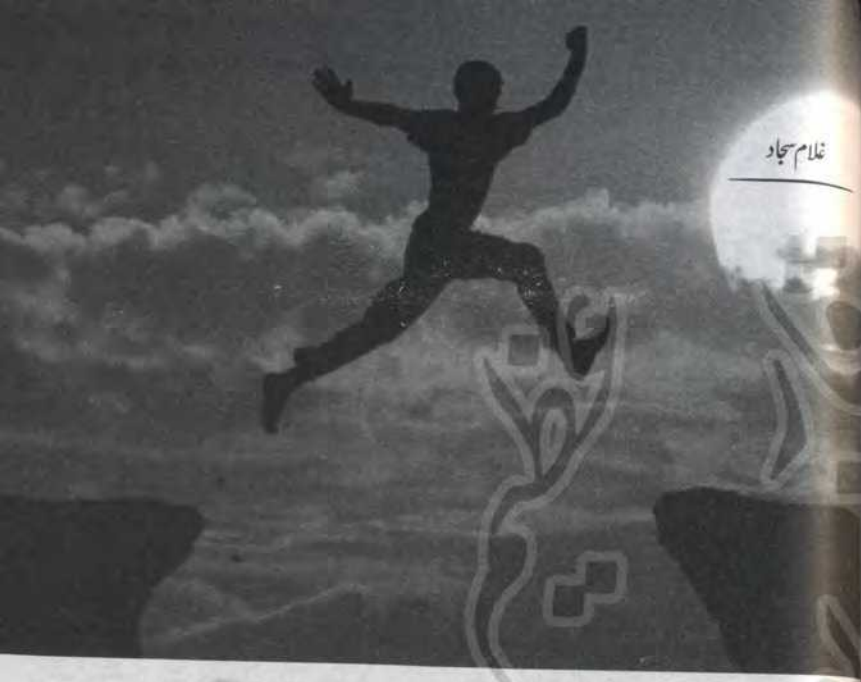

غلام سجاد

اپنی سی کوشش

وقتی ناکامی سے مایوس نہ ہوئیے بلکہ اُسے کامیابی کی سیڑھی کا پہلا زینہ سمجھیے

سڑک

سے گزرتے ہوئے ایک شخص نے دیکھا کہ ایک بہت بڑے ہاتھی کو معمولی سی رسی کے ساتھ باندھے ہوئے اس کا مہاوت لیے جا رہا ہے۔ وہ شخص بہت پریشان ہوا کہ اتنا بڑا ہاتھی اور ایک معمولی سی رسی ہاتھی کو کنٹرول کیے کیے ہوئے ہے جب کہ یہ اتنا زور آور جانور ہے کہ مضبوط سے مضبوط زنجیریں تک توڑ ڈالتا ہے؟ اس سے رہا نہ گیا اور اس نے مہاوت سے پوچھا کہ اتنا بڑا ہاتھی ایک معمولی سی رسی کے ساتھ آپ نے کیسے قابو کیا ہوا ہے؟ مہاوت نے جواب دیا کہ جب ہاتھی چھوٹا ہوتا ہے بلکہ پیدا ہونے کے بعد ہی ہم اس کے پاؤں میں رسی ڈال دیتے ہیں۔ تب یہ اس رسی سے نجات پانے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر اس وقت رسی اس کی طاقت سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ لیکن جوں جوں یہ بڑا ہوتا جاتا ہے تو رسی کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیتا ہے۔ یوں اس کا ذہن بن جاتا ہے کہ میں اس رسی کو توڑ نہیں سکتا۔ اسی لیے یہ ساری زندگی اس رسی کے ساتھ بندھا رہ جاتا ہے۔

اس ہاتھی کی طرح ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو خود

www.urdudigest.pk

پر اعتماد رکھتے ہیں کہ وہ زندگی میں کچھ کر سکتے ہیں یا نہیں؟ کئی لوگ ہیں جو زندگی میں کسی کام کے لیے صرف ایک بار کوشش کرتے ہیں اور ناکام ہو جاتے ہیں تو دوبارہ اس کام کو انجام دینے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ناکامی ہی کامیابی کا اصل زینہ ہوتی ہے۔ ان کو تاریخ کی یہ بات بھی یاد نہیں کہ محمود غزنوی نے جب ہندوستان کو فتح کرنا چاہا تو وہ ۱۷ بار ناکام ہوا مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ اپنی منزل سے جنون کی حد تک عشق کر رہا تھا اور مکمل بہادری، ہمت، حوصلہ، صبر، استقامت اور مسلسل جدوجہد کے بعد آخر اس نے اپنی منزل کو حاصل کر لیا۔ مگر آج کے نوجوان میں نہ تو حوصلہ ہے نا ہمت، تدبر، تفکر، جستجو، خواہش، پر امیدی اور عرق ریزی جیسی خصوصیات کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ خیالوں ہی خیالوں میں وہ آسمان پر کمند ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں مگر عملاً وہ ایک مرغا بھی ذبح نہیں کر سکتے۔

آج کے نوجوانوں میں ہمت اور برداشت نہیں ہے۔ وہ جلد باز اور مستقل مزاجی سے عاری ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہر کام آسانی سے اور بٹن دبانے سے ہو جائے۔ مگر ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ کیونکہ جب تک آپ کسی کام میں محنت اور جدوجہد نہیں کریں گے تب تک آپ کو منزل نہیں ملے گی۔

کئی لوگ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اگر دو چار ماہ ان کو ملازمت نہ ملے تو وہ حوصلہ چھوڑ بیٹھتے ہیں اور ہزاروں کہانیاں ان کے دماغ میں اتر آتی ہیں۔ کئی لوگ تو یہ تک کہنے لگ جاتے ہیں کہ پڑھنا لکھنا صرف امیر لوگوں کا کام ہے۔ غریب لوگوں کو تو ملازمت ملتی ہی نہیں ہے لہٰذا پڑھنے کا فائدہ! جب آپ یہ سوچ کہ پڑھیں گے کہ میں ملازمت حاصل کرنے کے لیے پڑھ رہا ہوں تو آپ کبھی کامیاب نہیں ہو پائیں گے۔ آپ جب تعلیم حاصل کریں تو دماغ میں یہ بات رکھیں کہ آپ علم حاصل کرنے کے لیے پڑھ رہے ہیں۔ تو یاد رکھیں تعلیم حاصل کر جائیں گے بلکہ زندگی کے عملی میدان میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

اکثر لوگ جو ملازمت کر رہے ہیں، ان کی ماہانہ آمدنی بھی بہت اچھی ہے مگر وہ مطمئن نہیں ہیں۔ کیوں؟ کیونکہ وہ ملازمت پر اس لیے جاتے ہیں کہ ان کے دماغ میں ہوتا ہے، ہمیں پیسے ملیں گے۔ اگر وہ یہ بات ذہن سے نکال دیں اور کام کو انٹرٹینمنٹ (Entertainment) سمجھ کر ملازمت پر جائیں تو وہ کبھی بھی زندگی میں ڈپریشن کا شکار نہیں ہوں گے اور ان کی زندگی پُرسکون ہو گی۔ پیسا زندگی کو گزارنے کے لیے ضروری چیز ہے مگر اتنا ضروری نہیں ہے کہ آپ زندگی ہی داؤ پر لگا دیں۔ کسی شخص نے کیا خوب کہا تھا کہ انسان پیسا کمانے کے لیے اپنی صحت برباد کر دیتا اور پھر صحت پانے کے لیے پیسا، تو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ہر چیز اعتدال میں اور اپنے مرتبہ و معیار کے مطابق ہی اچھی لگتی ہے۔

کوشش کریں کہ زندگی میں خواہشیں کم سے کم ہوں۔ جتنی آپ کی خواہشیں کم ہوں گی اتنی ہی آپ کی زندگی پُرسکون اور خوب صورت ہو گی۔ انسان جب اپنی خواہشوں کو بڑھا لیتا ہے تو پھر ان کو پورا کرنے کے لیے تمام جائز و ناجائز ہتھکنڈے کو اپنا لیتا ہے جس کے باعث اس کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ آپ کو بہت سے ایسے لوگ ملیں گے جن کے پاس بے بہا دولت، پیسا، بنگلہ اور گاڑیاں ہوں گی مگر ان کے ماتھے پر ہر وقت آپ کو پریشانی کے آثار دکھائی دیں گے۔ کون کم بخت کہتا ہے کہ پیسا سکون کی کنجی ہے۔ چند نام نہاد اور خود غرض لوگوں کی شطرنج پر سب جت جاتے ہیں اور ساری زندگی پیسے کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں اور اتنا دوڑتے ہیں کہ ان کی یہ دوڑ دوگز کے گڑھے ہی میں جا کر ختم ہوتی ہے۔ لوگوں کی خواہشیں جب حد سے بڑھ جاتی ہیں تو وہ ان کی تکمیل کے چکر میں سرگرداں ساری زندگی بھاگتے رہتے ہیں۔

www.urdudigest.pk

انسان کی خواہش بھی ہونی چاہیے اور پیسا حاصل کرنے کی جستجو بھی مگر اتنی جتنی کہ ضرورت ہے۔ اتنا پیسا انسان کبھی نہ کمائے کہ پیسا آنے کے بعد اس انسان کو کوئی انسان ہی نظر نہ آئے۔ وہ لوگ جو خود پر اعتبار کرتے اور محنت و جستجو کو اپنا شعار بناتے ہیں، کامیابی ہمیشہ ان کے قدم چومتی ہے۔

انسان جب کسی کام کے لیے دل سے کوشش کرتا ہے تو یقیناً وہ کامیاب ہوتا ہے۔ ہمارے اکثر جوان پڑھے لکھے ہوں یا ان پڑھ انھیں سنانے کے لیے ان کے پاس ناامیدی، مفلسی، مجبوری و بے بسی کے ہزاروں قصے ہوں گے۔ ان کے دل پر ہزاروں زخم ہوں گے۔ لیکن وہ ان بناوٹی اور من گھڑت کہانیوں کے دائرے سے کبھی باہر نکلنے کی کوشش بھی نہیں کریں گے۔ انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک کوئی شخص یا قوم اپنی حالت بدل لینے کا تہیہ نہیں کرتی تو تب تک اللہ بھی ان کی مدد نہیں فرماتا۔

آپ میں قوت ارادی ہونی چاہیے۔ اپنی منزل، اپنے ہدف کو پا لینے کی شدید خواہش ہی آپ کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہے۔ ناکامیوں سے ہنس کر گلے ملنے والا شخص ہی کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھتا ہے۔ اپنی سوچ کو تعصب اور حسد سے ہمیشہ پاک رکھیں۔ آپ کے اردگرد کئی ایسے لوگ ہوں گے جو خوشیوں سے لدے پھندے ہوں گے۔ اگر آپ ان کے چہروں پر پھیلی مسکراہٹ کو دیکھتے رہے اور اپنی زندگی میں کامیاب ہونے کے لیے کچھ نہیں کیا تو نہ صرف آپ بُری طرح ناکام ہوں گے بلکہ اپنے اندر دوسروں کے خلاف حسد بھی پیدا کر بیٹھیں گے۔ حوصلہ کامیابی کی کنجی ہے جس کی صبر کے ساتھ حفاظت کی جا سکتی ہے۔ اپنے آپ کو منوانے کے لیے آپ کی سوچ کا صاف ہونا اور ارادے کا نیک ہونا بھی ضروری ہے۔ آپ اپنے اندر موجود خوبیوں اور صلاحیتوں کو پہچانیں، اس کے بعد عملی طور پر انھیں بروئے کار لائیں، تب ہی جا کر آپ زندگی میں کامیاب ہو سکیں گے۔

کامیابی حاصل کر کے تو ہر شخص مسحور ہوتا ہے مگر عظیم وہ ہے جو ناکامی میں بھی نہیں گھبراتا۔ زندگی میں ان عوامل اور وجوہات کی طرف زیادہ توجہ دیں جو آپ کی ناکامی کا سبب بنتی ہیں ورنہ آپ ناکام ہی ہوتے رہیں گے۔ اپنے اندر وہ تمام صفات پیدا کریں جو آپ کو آسانی سے آپ کی منزل تک لے جا سکیں۔ کبھی بھی زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے کسی دوسرے شخص کا کندھا ہرگز استعمال نہ کریں کیونکہ آپ کسی اور کے سہارے تھوڑا بہت تو آگے چلے جائیں گے مگر آپ کو منزل تک پہنچنے کے لیے وہ سہارا کبھی نہیں ملے گا۔ ایک معذور شخص پر لوگ رحم کھا کر سڑک تو ضرور پار کرا دیتے ہیں مگر اسے گھر تک چھوڑنے کوئی نہیں جاتا۔ آپ کسی کی سفارش یا نظر کرم سے کسی سسٹم میں گھس تو جائیں گے مگر وہاں آپ کو مکمل طور پر جگہ تب ہی ملے گی جب آپ عملی طور پر کچھ کر کے دکھائیں گے اور خود کو ثابت کریں گے۔

کچھ لوگ سسٹم کے ساتھ چلتے ہیں، کچھ کو سسٹم چلاتا ہے اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو سسٹم کو چلاتے ہیں۔ آپ کی سوچ اور خیالات ہمیشہ بلند ہونے چاہئیں۔ کبھی یہ مت سوچیں کہ کوئی اور شخص کام کرے گا اور ہمیں فائدہ پہنچے گا۔ ہمیشہ دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کے لیے تیار رہیں۔ آپ کی سوچ تخلیقی اور تعمیری ہونی چاہیے جو نہ صرف آپ کا بھلا کرے بلکہ دوسرے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھائیں۔ آپ زندگی میں جہاں کہیں بھی ہوں آپ کی حیثیت اور وجود دوسرے کے لیے پہچان ہونی چاہیے۔ کبھی بھی ایسا کوئی کام مت کریں جس سے آپ کی شخصیت کے متعلق لوگوں کو منفی تاثر ملے۔ اپنے آپ کو دوسروں سے کم تر مت سمجھیں بلکہ خود کو دوسروں سے آگے لے جانے کے لیے تگ و دو کریں۔ کبھی شکست کو تسلیم کرتے ہوئے ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ کیونکہ کامیابی تو صبر و شکر کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے۔

جب بچے کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو وہ روتا ہے۔ تب

اس کی ماں کو پتا چلتا ہے کہ بچہ کسی تکلیف میں ہے۔ پہلے وہ اس کو بھوکا سمجھ کر دودھ پلانے کی کوشش کرتی ہے، اگر وہ دودھ نہیں پیتا تو پھر پیٹ پر ہاتھ لگا کر، ماتھے پر ہاتھ لگا کر جسم کے مختلف حصوں پر ہاتھ لگا کر بچے کی تکلیف جاننے کی کوشش کرتی ہے۔ اگر بچہ روئے نہ اور ہاتھ پاؤں نہ مارے تو ماں کو کیسے پتا چلے کہ بچہ تکلیف میں ہے؟ اسی طرح جب تک کوئی بھی شخص اپنے مستقبل اور منزل کو پانے کے لیے جستجو نہیں کرے گا، دن رات محنت نہیں کرے گا تو وہ اپنی منزل تک کیسے پہنچ پائے گا؟ ہیلن کیلر ایک معذور عورت تھی، وہ دیکھ نہیں سکتی تھی نہ سن سکتی تھی اور نہ بول سکتی تھی۔ وہ صرف محسوس کر سکتی تھی مگر اس نے محنت کی اور بہت ساری کتابیں لکھ ڈالیں جو ہمارے جیسے صحت مند لوگوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔

تصویر کے ہمیشہ دو رُخ ہوتے ہیں۔ پتا نہیں ہمارے لوگوں کی ایسی کیا مجبوری ہے کہ وہ تصویر کا ہمیشہ ایک ہی رخ دیکھتے ہیں جو مجبوریوں، ناکامیابیوں، اور افسردگیوں سے بھرا ہوتا ہے۔ وہ کبھی بھی اپنی خوبیوں کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ اگر کسی شخص میں کچھ خامیاں ہوتی ہیں تو یقیناً اس میں کچھ خوبیاں بھی ضرور ہوتی ہیں۔ لیکن وہ شخص بجائے اپنی خوبیوں کا صحیح استعمال کرنے کے اپنی چند خامیوں کا تذکرہ لے کے بیٹھ جاتا ہے اور اپنی قوت اور صلاحیت کو استعمال کرنے کا فن نہیں سیکھ پاتا۔ جس دن کسی شخص کو اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں کا ادراک ہو جاتا ہے تو پھر وہ اپنی زندگی میں کامیابیوں کو پھلانگتا چلا جاتا ہے۔

ہمیشہ اپنی سوچ کا دائرہ وسیع رکھیں اور آپ کی خواہشیں، منزلیں اور مرادیں مثبت ہونی چاہییں۔ اپنی قوت بازو پر یقین رکھ کر کامیابی کے آنگن میں کود جانے کا حوصلہ ہونا چاہیے۔ جب کبھی زندگی میں انسان دوسروں پر انحصار کر لیتا ہے۔ یا پھر خود کو کمتر سمجھتا ہے تو پھر ساری زندگی ناکامی اور پستی ہی اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ قدرت ہی انسان کی ہر موڑ پر مدد کرتی ہے مگر صرف ان کی جو کچھ کرنے اور پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ''بیشک انسان وہی کچھ پاتا ہے جس کے لیے وہ سعی کرتا ہے۔'' تو کیا کبھی زندگی میں آپ نے ازالہ کیا کہ آپ اپنی زندگی میں کتنی سعی کرتے ہیں۔ آپ خود کو تو کامیاب کرنے کے لیے کبھی جرأت نہیں کرتے مگر اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی سست پڑے رہنے کا مفت مشورہ دیتے رہتے ہیں۔

وہ بھی تو لوگ تھے جنھوں نے بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑائے، اپنی تدبیر سے ہواؤں کا رخ بدلا، طوفانوں کا منہ موڑا، شہروں کے شہر اور علاقوں کے علاقے فتح کیے، صرف اپنی قوتِ بازو اور مسلسل جدوجہد وجستجو سے اور انھوں نے اپنی خواہشوں اور جذبوں کو حقیقت کا رنگ و روپ دینے کی خاطر اپنی خوبیوں کا صحیح اور مناسب استعمال کیا۔ کبھی کسی ناکامی یا رکاوٹ سے مجبور ہو کر زندگی سے منہ نہیں موڑا۔ بلکہ زندگی کو اپنے اشاروں کے مطابق چلایا۔

زندگی کو ایک کہکشاں بنائیں جس کے سائے میں نہ صرف آپ کی زندگی رنگین ہو بلکہ آپ کے قریب رہنے والے بھی اس سے مستفید ہوں۔ آپ کا حوصلہ اور عزم آپ کی خواہشوں کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے ہمیشہ جوان ہو۔ کبھی بھی اپنے حوصلے اور ہمت کو مایوسی اور ناکامی کی نذر مت کریں۔ اس سے آپ کی زندگی میں ہمیشہ اندھیرا ہی رہے گا۔ زندگی میں کرنے کے لیے انسان کو بہت کام ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اپنے عزم اور حوصلے کو صبر اور استقامت کے ساتھ منزل کو پانے کی جستجو میں صرف کرے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانے والے کو کامیابی کبھی جھلک نہیں دکھلاتی۔ جب آپ شان کے ساتھ چل کر کامیابی کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو چاہے آپ جتنے بھی مسائل میں گھرے ہوئے ہوں، کامیابی آپ کے قدموں کی دھول کو پہچانتے ہوئے آپ تک ضرور آ کھڑی ہوتی ہے۔ ■

قصہ کوئز دراصل اہم تاریخی واقعات سے ایسے دلچسپ قصوں کا انتخاب ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں کو بڑے کاموں پر اُکساتا اور زندگی کو بامقصد بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔ دلچسپی، معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ، اس کی ۳ر بنیادی خوبیاں ہیں۔ ان قصوں کو بہ غور پڑھیں اور ہر قصے کے آخر میں دیے گئے ۲ر سوالات سے اپنی ذہانت کو پرکھیں۔ درست جواب ہمیں بھجوا دیجیے۔ درست جوابات دینے والے زیادہ ہوئے تو قرعہ اندازی کی جائے گی اور دو خوش نصیبوں کو ''اردو ڈائجسٹ'' کے ۶ رشماروں کی انعامی واعزازی ترسیل کے علاوہ مشہورات کی ۲ر خوبصورت کتابیں دی جائیں گی۔

جوابات بھیجنے کا پتہ: **مدیر ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ** G-III 325، جوہر ٹاؤن لاہور

ماہ فروری میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز۱۔ (الف) سرسید احمد خان (ب) اخبار سائنٹیفک۔ تہذیب الاخلاق (رسالہ)

قصہ کوئز۲۔ (الف) مولانا محمد علی جوہر (ب) کامریڈ (انگلش)، ہمدرد (اُردو)

قصہ کوئز۳۔ (الف) ابوالکلام آزاد (ب) الہلال

درست جوابات دینے والوں کے نام

اعجاز حسین بٹ (لاہور)، رقیہ ہاشمی (اسلام آباد)، اُلفت حسین (شیخوپورہ)، عبدالمعیز، محمد عرفان (پشاور)، سید عاصم علی (کراچی)، راحت عائشہ (کراچی)، فرقان رفیق (میرپور آزاد کشمیر)، محمد یوسف (حیدرآباد)، ہاشم ہارون (ہنسمرہ)، منور سعید (سکردو)، شمیم اقبال (آزاد کشمیر)، حمیرا جبیں (ہارون آباد)، محمد عباس (سیالکوٹ)، منظور احمد بھکمو (نواب شاہ)، محمد منور خان (سرگودھا)، محمد شکیل عباس جنجوعہ (سرگودھا)، صفیہ حنیف ترمذی (کراچی)، محمد یونس کریم (ڈیرہ اسماعیل خان)، سید ظفر علی (حیدرآباد)، انعام اللہ بکھروی (کراچی)، قاری عبدالماجد میو (بہاولپور)، احمد ندیم چشتی، سید محمد افضل (اسلام آباد)، شہباز احمد مغل (گوجرانوالہ)، عرفان عثمانی (لاہور)، اللہ بخش سومرو (شکارپور)، راؤ محمد شاہد اقبال (نواب شاہ)، محمد الیاس گھمن (سیالکوٹ)، عاطف ممتاز (راولپنڈی)، ساجد ممتاز (چکوال)، مریم فاروق قریشی (کراچی)، عائشہ (لاہور)، ڈاکٹر خالد سیف اللہ خان (لاہور)، شعیب شاہد (لاہور)، محمد یونس کریم (ڈیرہ اسماعیل خان)، نہال احمد (لاہور)، علی اختر (جامشورو)، پروفیسر خان محمد (پشاور)، مرزا فرحان بیگ (حیدرآباد)، آصف کریم (حیدرآباد)، عبدالسلیم (حیدرآباد)، محمد یسین راندوری (کراچی)، ایاز خلیل (حیدرآباد)، ظفر اسماعیل (راولپنڈی)، حافظ محمد ابراہیم (ننکانہ صاحب)، حافظ طیب بیگ (لاہور)، محمد مفاص منصور، ضیب سعید (گوجرانوالہ)، سیف اللہ (رائیونڈ)، محمد طیب (قصور)، بس فوزیہ فیاض (چکوال)، حاجی شوکت علی (اوکاڑہ)، جمیل احمد خان (کراچی)، نوشین اختر (راولپنڈی)

انچارج کوئز: غلام سجاد

دلچسپی، معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ، یہی ہے اس کوئز کا اصل مقصد

یہی ہے قصہ کوئز

درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

- رقیہ ہاشمی 10/4-I اسلام آباد
- فرقان رفیق نیو ٹاؤن پوسٹ بیسی ڈاکخانہ پوسٹ بیسی تحصیل وضلع میرپور آزاد کشمیر

آپ کو ۶ر ماہ تک اُردو ڈائجسٹ کے شمارے بطور تحفہ ملیں گی

آپ ہمیں جوابات اپنے نام اور پتے کے ساتھ editor@urdu-digest.com پر بھی بھجوا سکتے ہیں

www.urdudigest.pk

قصہ کوئز/۱

شہر جہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا مزار واقع ہے، ۱۱۰۰ء میں آباد ہوا۔ ۱۱۹۲ء میں محمد غوری نے اسے فتح کیا اور ۱۱۹۵ء میں قطب الدین ایبک نے اسے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ ۱۳۹۸ء سے یہ شہر راجپوتوں کے قبضے میں رہا اور ۱۴۵۵ء سے ۱۵۳۱ء تک مالوہ کے سلاطین کے قبضہ میں رہا۔ اکبر نے ابتداء ہی میں اس شہر کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ وہ اکثر مزار کی زیارت کے لیے یہاں آیا کرتا تھا۔ ۱۷۳۱ء میں اس پر راجپوتوں نے دوبارہ قبضہ کرلیا۔ بعدازاں یہ مرہٹوں کے قبضے میں چلا گیا۔ جنھوں نے ۱۸۱۸ء میں اسے انگریزوں کے حوالے کردیا۔

اس شہر کی دیگر تاریخی عمارتوں میں سے ایک اکبر کا قلعہ بند محل ہے، دوسرا جہانگیر کا بنایا ہوا ایک باغ اور تیسرا شاہجہان کا تعمیر کردہ پشتہ ہے۔ زیادہ تر عمارتیں ہندوانہ طرز تعمیر کا نمونہ نظر آتی ہیں۔ تاہم کئی عمارتیں اسلامی، ہندی امتزاج کی بہترین مثال ہیں۔ بازار سیدھے اور کشادہ ہیں۔ شہر سے کچھ فاصلے پر پُشکر ایک چھوٹی سی جھیل ہے جو خوب صورتی میں اپنی مثال آپ ہے۔

(الف) مزار کب تعمیر ہوا اور کس نے تعمیر کرایا؟

(ب) کس شہر کا تذکرہ ہے اور یہ کہاں واقع ہے؟

قصہ کوئز/۲

ایک قدیم تاریخی اور اسلامی اہمیت کا شہر، بہاولپور سے جنوب مغرب کی طرف اڑتیس میل کے فاصلے پر پنجند کے سنگم پر واقع ہے۔ اس کا نام غالباً قصبے کے اونچے ہونے یعنی بلندی کی وجہ سے پڑا تھا۔ مسلمانوں کی ایک روایت کے مطابق سید جلال الدین شیر شاہ بخاری ترکستان سے یہاں آئے اور انھوں نے یہاں ایک قلعہ تعمیر کرایا اور اس شہر کا نام رکھا۔

اب یہ شہر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی وجہ سے مشہور ہے۔ ابن بطوطہ اس شہر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ دریائے سندھ کے کنارے واقع ایک بہت بڑا اور خوب صورت شہر ہے۔ بازار عمدہ اور عمارتیں مضبوط ہیں۔ اس کا یہ کہنا مبالغہ آمیز معلوم نہیں ہوتا۔ آج بھی یہاں کی آب و ہوا صحت مند ہے۔ البتہ پرانا شہر ہونے کی وجہ سے مندروں، مزاروں اور مقبروں کے سلسلے دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں، جو اس کی سابقہ عظمت کی گواہی دیتے ہیں۔ شہر سڑک کے ذریعے پاکستان کے دیگر شہروں سے ملا ہوا ہے۔ قریب ترین ریلوے اسٹیشن احمد پور شرقیہ ہے، جو یہاں سے بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

(الف) کس شہر کا تذکرہ ہے اور یہ کہاں واقع ہے؟

(ب) اس شہر میں موجود بزرگ کا مزار کس بادشاہ کے دور میں تعمیر ہوا؟

قصہ کوئز/۳

دریائے چناب کے کنارے واقع شہر جو رقبے کے لحاظ سے پاکستان کا تیسرا بڑا جب کہ آبادی کے لحاظ سے پانچواں بڑا شہر ہے۔ یہاں پرانے بازار، مزار اور مقبرے بھی واقع ہیں۔ پنجابی زبان کے سب سے بڑے صوفی شاعر کی جائے پیدائش بھی ہے۔ نہ صرف برصغیر بلکہ ایشیا کی تاریخ میں یہ بہت پرانا شہر ہے۔ ۳۲۶ قبل مسیح اسے سکندر اعظم نے فتح کیا۔ ۷۱۲ء میں اسے محمد بن قاسم نے فتح کیا۔ برصغیر میں آنے والے اکثر فاتحین نے اس شہر کو فتح کیا اور یہاں قیام بھی کیا۔ اس شہر کی سب سے پرانی مسجد محمد بن قاسم نے ۷۱۲ ہجری میں بنوائی جو کہ ۱۹۵۴ء میں شہید ہوگئی۔

(الف) کس شہر کا ذکر ہے، اس کا دوسرا مشہور نام بتائیں؟

(ب) اس شہر میں موجود دو مشہور مزاروں کے نام بتائیں؟

انعامات کے لیے تعاون
خوبصورت اور معیاری کتب
منشورات ہیڈ آفس: منصورہ، ملتان روڈ لاہور

اُردو ڈائجسٹ کا ایک
قابلِ قدر سلسلہ

وزن کم کریں مگر صحت نہیں

نوشین ناز
ماہر غذائیات/ نیوٹریشنسٹ
0301-4585405

چند لمحوں کے زبان کا چسکا
برسوں آپ کو بھگتنا پڑتا ہے

انسانی جسم میں کاربوہائیڈریٹس سنسر لگے ہیں جو بھوک کو قابو میں رکھتے ہیں مگر چکنائی کو قابو میں رکھنے کے لیے کوئی سنسر نہیں، یہ سنسر آپ کو خود ہی لگانا پڑے گا

ہمارے پورے جسم میں کاربوہائیڈریٹس سنسر لگے ہوتے ہیں۔ منہ سے لے کر آنتوں اور جگر سے لے کر دماغ تک پورے جسم میں یہ سنسر ہوتے ہیں۔ یہ سنسر بھوک کے احساس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور آپ کو بھوک لگتی ہے اور جب آپ کو نشاستہ فراہم ہوتا ہے تو یہ سنسر بھوک کے اس احساس کو ختم کر دیتے ہیں۔ آپ جتنا عرصہ ان کاربوہائیڈریٹس سنسرز کو مطمئن رکھیں گے اتنا ہی آپ کو خوراک کی طلب کم ہوگی۔

ایسی خوراکوں میں ان کے حجم کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے جو آپ کو اتنی توانائی فراہم کرتی ہے کہ آپ دن بھر گزارہ کر سکتے ہیں اور یہ چیز نشاستہ یعنی کاربوہائیڈریٹس ہیں۔ آلو، مالٹا، سیب اور مکمل اناج نشاستے سے بھرپور ہوتے ہیں، جو خون میں شوگر کی سطح میں اضافہ کر دیتے ہیں اور جسم کے سگنل سسٹم کو متحرک کرتے ہیں جس کے نتیجے میں یہ دماغ اور پیٹ کو پیغام بھیجتے ہیں کہ توانائی کی ضرورت پوری ہوچکی ہے اور پیٹ بھر چکا ہے۔

اس کے برعکس ہمارے جسم میں چکنائی کے لیے کوئی سنسر بھی نہیں ہوگا۔ اس طرح آپ کے پیٹ اور دماغ کو کوئی پیغام نہیں ملے گا کہ اب بس یوں آپ کھاتے ہی رہیں گے۔ لہٰذا یاد رکھیے یہ سنسر آپ کو خود ہی لگانا پڑے گا۔

www.urdudigest.pk

پیٹ بھرنے والی نشاستے دار غذاؤں کا صرف یہی فائدہ نہیں بلکہ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ہمارا معدہ ایسی خوراکوں کو آہستگی سے ہضم کرتا ہے۔ اس طرح غذا زیادہ دیر تک آپ کے جسم میں رہتی ہے اور آپ کو پیٹ بھرا محسوس ہوتا ہے اور یوں آپ کو اپنا ریفریجریٹر کھول کر مزید کچھ اڑانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے۔ یہ نشاستے پولیمر آف گلوکوز کہلاتے ہیں۔ لیکن مسئلہ نام کا نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ زیادہ طویل المیعاد ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ہضم ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ سادہ آلو عموماً وزن کے ساتھ آپ کے پیٹ کو بھر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس جب آپ وہ نشاستہ کھاتے ہیں جس کو سادہ چینی کہا جاتا ہے اور جو تیار شدہ غذاؤں مثلاً کیک، چاکلیٹس وغیرہ میں پائے جاتے ہیں، وہ بہت ہی جلدی ہضم ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سبزیوں، پھلوں اور مکمل اناج میں پایا جانے والا فائبر یعنی ریشہ بھی کھانے کے انہضام کی رفتار کو سست لیکن مسلسل جاری رکھتا ہے۔ اس طرح فائبر یعنی ریشہ پیٹ کو بھر بھی دیتا ہے۔

اس لیے آپ کوشش کریں کہ چینی سے بنی اشیا کیک، بسکٹ، چاکلیٹ وغیرہ چھوڑ دیں کیونکہ سوائے کیلوری کے یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ چند لمحوں کا مزہ سالوں آپ کو بھگتنا پڑتا ہے۔

اب آتے ہیں آپ کے سوالات کی جانب: جو ایس ایم ایس موصول ہوئے ہیں جن کے جوابات باری آنے پر ہر ماہ دیئے جاتے ہیں۔

ہربل واٹر کی حقیقت

س: السلام علیکم کیا آپ نادیہ کے شو میں آئی تھیں؟ کل دیکھا شاید آپ ہیں۔ پلیز آپ یہ بتائیں کہ ہربل واٹر کے نقصانات تو نہیں ہوتے ہیں؟ پلیز پلیز جواب دیں؟

ج: سمیرا وہ میں نہیں تھی اور ہاں دنیا میں آپ کو کوئی ایسا ''ہربل واٹر'' نہیں ملے گا جو آپ کو بنا محنت کے پتلا کر سکے۔

اگر ہمیں پانی سے توانائی ملتی اور ہم پانی سے ہی پیٹ بھر سکتے تو پانی ہمیں اس طرح کا فائدہ بھی دے دیتا۔ سادہ قدرتی پانی ہمیں تسکین دیتا ہے۔ پانی اللہ تعالیٰ کی ایسی نعمت ہے جو بہترین اینٹی آکسیڈنٹ ہے جو آپ کے جسم سے زہریلے مادے خارج کر دیتا ہے۔

قدرتی پانی میں شفا ہے۔ آپ سادہ پانی سنت رسول ﷺ کے تحت تین سانسوں میں پئیں۔ مسلسل پئیں۔ لیکن پلیز ہربل واٹر کے Illusion سے بچیں۔ یہ ایک ایسا سراب ہے جس کی کوئی سائنسی حقیقت بھی نہیں، دوسری چیز قدرتی دودھ ہے۔ کم چکنائی والا دودھ استعمال کریں۔ یہ ایک بہترین تحفہ ہے جو مالک کائنات نے خود اپنے بندوں کو عطا کیا ہے۔ تیسرا قدرتی Liquid سبزیوں اور پھلوں کا جوس ہوتا ہے۔ آپ جب جب یہ استعمال کرتے ہیں تو جسم کومل جاتا ہے اور اس کی ضرورت دنیا میں کوئی ایسا واٹر پوری نہیں کرتا ہے جو آپ کو پتلا کر دے۔ یہ طرح طرح کے تجرباتی ہربل واٹر فوری دستوں (Loose motion) کا باعث بنتے ہیں اور ایک دم سے جسم کے ضروری پانی کم کو کر دیتے ہیں اور ہمیں لگتا ہے کہ ہمارے جسم سے چکنائی (Fats) کم ہو رہی ہے جب کہ ایسا کچھ نہیں ہوتا ہے۔

پلیز سادہ سا ڈائیٹ پلان دیجیے۔

س: میرا نام نازیہ، قد چار فٹ دو انچ، وزن ستاسی کلوگرام ہے۔ ناشتہ پراٹھا اور چائے، دوپہر کا کھانا چپاتی اور کوئی سا بھی سالن کھا لیتی ہوں، کبھی سالن کے ساتھ اور دوپہر کو ایک کپ چائے، کبھی بالائی والا دودھ بھی لے لیتی ہوں۔ پلیز میرا ڈائیٹ پلان سادہ سا ہو کیونکہ میں گاؤں کی رہنے والی ہوں۔ تین بچوں کی ماں اور آپریشنوں کے بعد وزن کی زیادتی کا شکار ہوں۔

www.urdudigest.pk

ج: آپ فوری طور پر صبح کی واک شروع کریں۔ پہلے دن صرف ۱۰ رمنٹ تک پیدل چلیں، روزانہ ایک منٹ بڑھائیں اور کم از کم ۴۵ رمنٹ تک لے جائیں۔ ناشتے میں ایک گلاس دودھ بنا بالائی کے ساتھ ایک سیب، دوپہر بارہ بجے ایک پیالی بنا بالائی دہی کے ساتھ ایک پیالی اسٹرابری لیں۔ یہ آسانی سے مل جائیں گی۔ ۲ رجے ملی جلی سبزیوں کا سلاد، جو کی روٹی، ایک عدد شامی، گرین ٹی۔ ۴ رجے چائے، ایک کھجور۔ ۶ رجے سیب لیں۔ ۸ رجے گھر کا بنا سالن چھوٹی کٹوری، ایک عدد فور گرین آٹے سے بنی روٹی، سلاد، گرین ٹی۔ ۹ رجے اسپغول کا چھلکا دو چمچ، آدھی پیالی بنا بالائی کا دودھ استعمال کریں، نماز پانچ وقت کی ادا کریں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ نماز کی باقاعدگی اور اہتمام سے وزن کم ہوتا ہے۔ پانی کا استعمال مسلسل رکھیں، خوش رہیں غصہ کم سے کم کریں اور لوگوں کو خوشی دینے کی بھرپور کوشش کریں۔

میرا وزن کیوں بڑھ رہا ہے

س: میرا نام صائمہ، عمر ۲۸ رسال، وزن ۶۴ رکلو گرام، قد ۵ رفٹ دو انچ۔ اپنا وزن کم کرنا چاہتی ہوں۔ ناشتے میں ایک چھوٹی روٹی اور چائے، دوپہر کو روٹی اور سالن رات کو ایک اور روٹی کھاتی ہو۔ میرا وزن کیوں بڑھ رہا ہے؟ مجھے ڈائیٹ پلان دیں۔

ج: صائمہ آپ ناشتے میں دودھ یا چائے کے ساتھ ایک انڈہ لیں۔ سنیکس ٹائم میں آپ کھجور اور چائے لیں اور ایک فروٹ سرونگ، دوپہر کھانے میں آپ ایک روٹی، ایک چھوٹی پیالی سالن اور سلاد کھائیں۔ رات کو آپ ابلی سبزیاں (Steamed) لیں یا پھر سبزیوں کا سوپ (Vegetables soup) لیں۔ اسپغول کا چھلکا رات سونے سے پہلے لیں، ۲۰ رمنٹ قلبی ورزش (Cardio exercise) اور ۳۰ رمنٹ واک کریں۔ پانی گرم پئیں۔ ان شاء اللہ مفید نتائج سامنے آئیں گے۔ ڈائیٹ پلان کا اصول یہ ہے کہ چار ہفتے کے بعد اسے بہرحال بدلنا ہوتا ہے۔ ورنہ مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوتے۔

کم خوراک سے چکر آتے ہیں

س: میرا نام صغیرہ ہے، میرا وزن ۱۸۰ رکلو، عمر ۵۸ رسال ہے۔ میرے جوڑوں میں درد ہے اور سانس کا بھی مسئلہ ہے۔ بہت پھول جاتا ہے، کم خوراک سے چکر آتے ہیں۔ میں صبح پراٹھا، انڈہ اور چائے لیتی ہوں۔ دوپہر میں چاول، روٹی جو ہو تھوڑی سی لیتی ہوں اور ایک کپ چائے پھر رات میں کچھ نہیں کھاتی ہوں۔ بہت کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ کام کاج میرے ذمے نہیں ہے۔ میری بہوئیں میری بہت خدمت کرتی ہیں۔ سارا کام وہی کرتی ہیں۔

ج: آنٹی! اپنی خدمت تو ضرور کروائیے مگر اپنے ساتھ دشمنی نہ کریں۔ لمبی واک پر نکلا کریں، اپنی ہی کسی بہو کو ساتھ لے کر۔ اس سے اچھی اچھی باتیں بھی کریں اور گھنٹہ بھر کی واک (تھوڑی تیز) روزانہ کا معمول بنا لیں۔ آپ ناشتے میں ایک سیب لیں پھر دس بجے کے لگ بھگ white oatmeal لیں۔ بغیر بالائی (Skim milk) کے ساتھ بارہ بجے اسٹرابری کا ایک پیالہ لے لیں۔ ۲ رجے مٹن یا کالے چنوں کی یخنی کے ساتھ ایک براؤن سلائس اور گرین ٹی لیں۔ شام میں گریپ فروٹ جوس کے ساتھ ایک براؤن سلائس لیں۔ رات کو اسپغول کا چھلکا لیں ساتھ ایک سیب، ایک پیالی دہی اور براؤن سلائس لیں۔

ہر کھانے سے پہلے نیم گرم پانی کا استعمال کریں۔ سونے کے ایک گھنٹہ پہلے ایک پیالی اسکم ملک لیں۔ ملٹی وٹامن ضرور استعمال کریں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ خود کو Misery کی طرف لے جائیں۔ مسلسل محنت اور لمبے عرصے تک وزن کم کرنے کی کوشش کا ارادہ آپ کو کامیابی کی طرف لے جائے گا۔ خدمت

اور آرام سب کی خواہش ہوتی ہے مگر جوڑوں میں درد ہو رہا ہو اور سانس لینے میں بھی دقت ہو تو زندگی کا مزہ جاتا رہتا ہے۔ کم خوراک کا مسئلہ نہیں ہے سلیقے اور مشورے کے مطابق خوراک ان شاء اللہ آپ کو بہت اچھا کر دے گی۔

پولی سسٹک اووری کا مسئلہ ہو چکا ہے

س: بے شک ایس ایم ایس پہ بھیجے گئے مسئلہ کا باری آنے پر آپ جواب ضرور دیتی ہیں مگر میں ذاتی طور پر آپ سے مل کر مشورہ کرنا چاہتی ہوں، وزن کی زیادتی کے ساتھ ساتھ میرا پولی سسٹک اووری کا مسئلہ پیدا ہو چکا ہے اور آپ پر اللہ کی خصوصی مہربانی ہے کہ اس معاملے میں آپ کا علاج بہت کارگر ہے۔ میں کئی سال سے ''کنسیو'' نہیں کر پا رہی۔ شادی سے پہلے بھی وزن میرا زیادہ تھا مگر شادی کے بعد کی مسلسل دعوتوں اور مرغن کھانوں کی دستیابی نے مجھے اس وقت ۹۸ کلو گرام پر پہنچا دیا ہے۔ شرمندگی کے علاوہ بھی کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ کیا میں اتوار کو آ کر مل سکتی ہوں؟ (سمیرا ارم، ساہیوال)

ج: میں اتوار کو کلینک پر نہیں بیٹھتی۔ اگر آپ فون پر رابطہ کر لیں اور میں شہر میں ہی ہوئی تو پھر سیکنڈ ٹائم آ سکتی ہیں۔ آتے ہوئے اپنی رپورٹس اور خصوصاً الٹرا ساؤنڈ ضرور ساتھ لیتی آئیے۔ مجھے لگتا ہے بچیوں سے زیادہ یہ ماؤں کو سمجھانے والا مسئلہ ہو گیا ہے کہ شادی سے پہلے اور بعد میں بیٹیوں کو وزن سنبھالنے کی ہدایات دینا کس قدر ضروری ہے۔ شادی کے بعد دعوتیں اچھی چیز ہیں۔ رشتے مضبوط ہوتے ہیں، خوشی ہوتی ہے، تحفے ملتے ہیں مگر زیادہ کھا کر تو خود آپ خوراک کے ہاتھوں وزنی ہو جائیں اور ایک ناختم ہونے والی پریشانی میں مبتلا ہو جائیں۔ یہ عقل مندی نہیں سالوں زندگی بھی مشکل میں رہتی ہے۔

خوشخبریاں

سلمان سرور، آزاد کشمیر سے لکھتے ہیں، ایک ماہ میں چھ کلو کم کیا ہے۔ گڈ لیکن میرا یہ کہنا ہے محنت کرنا کمال نہیں، مسلسل محنت کرنا کمال ہے۔ آپ مسلسل محنت کریں، ۹۴ کلو کم کرنے کے لیے تقریباً سال درکار ہے۔ اللہ کا نام لے کر لگے رہیے۔ دودھ کا استعمال تو ضرور کریں۔

رمیش آنند، سندھ: آپ کو پہلے بھی عرض کیا ہے کہ آپ کم از کم دودھ کا استعمال تو کریں اگر آپ کو انڈے اور مرغی سے نفرت ہے۔ بہرحال مبارک ہو ۱۰ کلو دو ماہ میں کم کرنا ایک بڑی کامیابی کی ابتدا ہے، واک جاری رکھیں۔

مہرین کمال گوجرہ: آپ کی ماہواری کا تسلسل آپ کے وزن پر ہی منحصر ہے۔ آپ مزید کم کریں، یہ اچھی بات ہے کہ آپ کا وزن کم ہونے لگا ہے۔ لیکن اتنا کم نہیں ہوا کہ بے فکر ہو کر بیٹھ جائیں۔ مبارک Motivation کے لیے ہے۔ اطمینان بذریعہ ڈاک آگاہ کرتی رہیے۔ ایس ایم ایس پہ جواب دینا میرے لیے ممکن نہیں ہوتا یا تو وزٹ ہو سکتا ہے یا بذریعہ ڈاک اپنا مفصل احوال بھیج کر رہنمائی لی جا سکتی ہے۔

رخسانہ احمد فیصل آباد: آپ پیٹ پر بیلٹ (Belt) مسلسل رکھیں، کھاتے پیتے اتاریں۔ ۳ کلو کم کرنا مبارک ہو۔ چندا وزن کی کمی، عمر اور آپ کی ظاہری صحت (Physcical health) پر منحصر ہوتی ہے۔

ہر شخص اپنی عمر، وزن اور کھانے کی عادات (Food habits) میں مختلف ہوتا ہے۔ اس کا پلان بھی مختلف ہوتا ہے۔ کچھ لوگ بہت آہستہ (Slow) وزن کم کرتے ہیں، یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ آپ مسلسل محنت پر توجہ رکھیں بس۔ اس کے ساتھ ہی اجازت چاہوں گی، مجھے میرے اہل خانہ اور بچوں کو اپنی اچھی دعاؤں میں شامل رکھیں۔ ■

چمنِ خیال

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

عورتوں کی عقل کی باتیں

بہت عرصے میں میرے دل میں کئی سوال تھے۔ مگر کہیں سے کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔ مولانا محمد یوسف اصلاحی کے انٹرویو نے میرے بہت سے سوالوں کے جواب دے دیئے۔

میں اکثر سوچتی تھی کہ آج تک دنیا میں جتنی دانش کی باتیں ہیں وہ سب مردوں کے حوالے سے کیوں ہیں، کیا آج تک کسی عورت نے عقل کی بات نہیں کہی؟ وجہ اب سمجھ میں آئی کہ جب تاریخ ہی عورتوں کی تعلیم سے خالی ہے تو ان کی دانش سے بھی خالی ہی ہو گی۔ آپ پھر بھی کوشش کریں عورتوں کی کہی عقل کی باتوں کو ڈھونڈیں اور ڈائجسٹ کا حصہ بنائیں۔ (بنت عذرا۔ کراچی)

دماغ ماؤف ہو رہا ہے

۷/ماہ، ۱۴/دن اور ۲/گھنٹے کی جدائی، ایک ماں دوسری ماں کا دکھ بہت اچھی طرح محسوس کر سکتی ہے۔ سب کچھ بالکل حقیقت ہے مگر اصل شکوہ مجھے آپ سے ہے۔ آپ نے ایک ڈاکٹر کی طرح مرض دیکھا، تشخیص بھی کی، درد کا احساس سارے قارئین کے دل اور دماغ میں پیدا کر دیا مگر پھر بیچ منجھدار میں تشنہ چھوڑ کر تحریر ختم کر دی۔ کوئی تو حل دیں ہم گھر میں بیٹھی، اپنی بچیوں کے لیے فکر مند، رو رو کر دعائیں کرنے والی، سادہ ماؤں کو۔ ہماری نیتیں بھی صاف ہیں۔ دعا کے حصار بھی ہم بچوں کے گرد باندھتے ہیں۔ بھلا برا بھی سمجھاتے ہیں۔ مگر اب ایسے معاملات میں ہم کیا کریں؟ یقین مانیں ڈپریشن سے دماغ ماؤف ہو رہا ہے۔ ایسی تحریروں میں کچھ تو عملی نکات بھی دیا کریں کہ کہیں کنارہ دکھائی دے۔ (صالحہ محبوب۔ خانیوال)

آپ دوبارہ سے پڑھیے۔ جہاں جہاں دل اٹکے اور خیال ٹھٹھکے کہ یہاں غلط ہوا۔ وہی پیمانہ ہوتا ہے۔ بدلنے کا، رکنے کا۔ اصل میں بڑوں سے بات کرتے ہوئے کبھی بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ اللہ کے رسول ﷺ نے خوب فرمایا تھا جس بات پر تمھارا دل ٹھک جائے وہ نیکی ہے اور جس پر دل نہ مانے وہ نیکی نہیں ہے۔

روح تک ہلا دی

دردل پہ دستک، سر جی! کہاں سے لاتے ہیں۔ ایسے موضوعات! قسم سے آپ کا انداز بیان (خصوصاً اس شمارے کا موضوع) رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ پریشان کر دیتا ہے۔ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ آپ کے لیے بہت بہت دعائیں۔ میری والدہ نے بھی آپ کو اپنی نیک تمنائیں پہنچانے کی فرمائش کی ہے۔ وہ بھی آپ کی تحریروں کو بہت توجہ اور شوق سے پڑھتی ہیں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ آخری صفحات ڈائجسٹ کی جان ہیں۔ آپ کے اٹھائے ہوئے موضوعات قاری کی روح تک ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ (ڈاکٹر طوبیٰ قادر، کوالٹی کنٹرول ریفائنر۔ کراچی)

خود کو پارسا ثابت کرنے والوں کا غلط فیصلہ

اردو ڈائجسٹ ''دردل پہ دستک'' کے عنوان سے جن معاشرتی مسائل کو قارئین کے سامنے رکھنے کی روایت کا آغاز کیا ہے۔ وہ آج کے دور میں رہنمائی کے لیے بہت ہی ضروری ہیں۔ فروری ۲۰۱۳ء کے شمارہ میں بچیوں کے جس مسئلے پر قلم اٹھایا وہ قابل تعریف ہے۔ میری طویل ملازمت (بطور استاد) میں ایسے کئی رسوا کن مسائل سامنے آئے۔ میرے مشاہدے میں یہ بات ہے کہ ۹۵ رفیصد واقعات ماں کی لاپرواہی، عدم توجہ اور اپنی بچی پر اندھے اعتماد کی وجہ سے رونما ہوئے۔ اکثر واقعات میں تو ماں سو فیصد حالات سے آگاہ ہوتی ہے۔ مگر دانستہ پردہ پوشی کرتی ہے۔ بعض اوقات ماں کا کردار ہی درست نہ ہونے کے سبب بیٹی نہ چاہتے ہوئے بھی ایسے حالات کا شکار بن جاتی ہے۔

معصوم بیٹیوں پر والدین کی لاپروائی سے جب کوئی ایسی مشکل آن پڑتی ہے تو والدین ساتھ کھڑے ہو کر ان کی مدد کرنے کے بجائے خود کو پارسا اور سچا ثابت کرنے کے لیے بیٹی کے لیے اس قسم کی غلط سزاؤں کا احمقانہ فیصلہ کرتے ہیں۔ میرے خیال میں بیٹی کی تربیت اور نگرانی میں غفلت برتنے والوں کو ہی سزا ملنی چاہیے تا کہ آئندہ والدین محتاط اور ذمہ دارانہ رویہ اختیار کریں اور بیٹیوں کو کوئی نقصان نہ ہو۔

(مسز فرحت قادر۔ سٹیلائیٹ ٹاؤن سرگودھا)

شاندار شخصیت

پروفیسر عبدالغفور احمد کی زندگی حکمت و تدبر کا مظہر تھی۔ وہ ہماری قومی زندگی میں حکمت سے کام کرنے کی ایک مثال تھے۔

رہ گئے قاضی حسین احمد تو وہ ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔ قاضی حسین احمد نے اخلاق و کردار کی ایک روایت قائم کی تھی۔ وہ بہت شاندار شخصیت کے مالک تھے، مسلمانوں کے مختلف مسالک کو ایک پلیٹ فارم پر لانا ان کا کارنامہ بجا، لیکن مختلف مسالک کے آپسی یعنی داخلی اختلافات ختم کرانے میں بھی حضرت قاضی حسین احمد نے ہمیشہ ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے قائد تھے، عالمی اسلامی تحریکیں ان سے رہنمائی لیتی تھیں۔ بوسنیا سے لے کر کشمیر تک وہ سب مسلمانوں کے دلوں پر حکمرانی کرنے والے تھے۔ قاضی حسین احمد اپنے کارہائے نمایاں کے باعث لمبے عرصے تک یاد رکھے جائیں گے۔

(سید مزمل حسین، کالم نگار۔ راولپنڈی)

معیار کی کوئی حد نہیں

میں اردو ڈائجسٹ کا بہت پرانا قاری ہوں اور بہت سے دوسرے حضرات کی طرح اسے اردو کا ریڈرز ڈائجسٹ کہا کرتا ہوں۔ اگر یہ پہلے اس معیار کا نہیں بھی تھا تو اب ضرور ہو گیا ہے۔ مضامین کا تنوع اور طباعت کی جدید سہولتوں کی وجہ سے اس میں بہت ہمہ رنگی آ گئی ہے۔

شمارہ فروری میں شاہد احمد دہلوی کے مضامین، اقتباسات میں نواب حیدر آباد کے متعلق ہوش ربا معلومات ملیں۔ قدیم و جدید صحافت کے امتزاج میں الہلال، ہمدرد، زمیندار، تہذیب الاخلاق سے مضامین، اقتباسات شامل کرتے ہیں کیونکہ سنجیدہ قارئین ایسی تحریریں پڑھنا چاہتے ہیں لیکن ان تک رسائی آسان نہیں۔

آرٹ بک والڈ پر جاوید چوہدری کا کالم جوں کا توں نہیں چھپنا چاہیے تھا کیونکہ ممدوح کو گزرے ہوئے غالباً چھ سات سال ہو گئے ہیں۔ امید ہے آپ رسالے میں مزید بہتری کی کوشش جاری رکھیں گے کیونکہ معیار کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ (ظفر اسماعیل۔ راولپنڈی)

تازہ اور نئے افسانے چھاپنے کی روایت

دسمبر کے شمارے میں اپنا افسانہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ خوشی اپنے نام کی نہیں بلکہ اس بات کی کہ اس میں چھپا پیغام قارئین تک پہنچنے کی ایک سبیل پیدا ہو گئی۔ جزاک اللہ۔

اردو ڈائجسٹ نے تازہ اور نئے افسانوں اور تحریروں کو جگہ دینے کی بہت عمدہ روایت کا آغاز کیا ہے۔ ایک اور افسانہ پیش خدمت ہے۔ میں نے ایک معاشرتی پہلو شعبۂ نکاح کو موضوع بنایا ہے جب یہ فریضہ دین داری کو بنیاد بنا کر ادا نہیں کیا جاتا تو ایک فرد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا ہے۔ اگر ہر شعبۂ زندگی مثلاً کاروبار، معیشت، تعلیم، عدالت، سیاست اور معاشرت کے دیگر پہلوؤں سے خدا اور رسول ﷺ کے مقرر کردہ معیار قدموں تلے روندے جاتے رہیں تو پورا معاشرہ شکست و ریخت کا شکار ہوتا ہے۔

بلا امتیاز صحافیوں کی عزت افزائی

اس شمارے میں کئی لوگوں کا گلدستہ سجایا گیا۔ صحافی بھائی اپنے صحافی بھائیوں کو کم ہی جانتے اور اپنے سوا کسی کو عزت کے قابل سمجھتے ہیں۔ آپ نے اپنی صحافتی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت اس ڈائجسٹ میں دیا ہے۔ سات میگزین ایڈیٹرز سے ملاقات اور جاوید چودھری کا آرٹیکل اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو ڈائجسٹ میں سب کو مقام بلا امتیاز ملتا ہے۔

مولانا محمد یوسف اصلاحی کا موثر انٹرویو

تازہ شمارہ میں سچی بات تو یہ ہے کہ سب سے زیادہ موثر اور پسندیدہ تحریر مولانا یوسف اصلاحی کی انٹرویو نما آپ بیتی تھی۔ جس سادگی اور عمدگی سے ان کی باتیں قارئین تک پہنچی ہیں وہ قابل داد ہے۔ آپ بیتی کے لیے افراد کا انتخاب بھی خوب ہے۔

(ڈاکٹر منصور باجوہ، سابق سربراہ شعبہ صحافت اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور)

اس روایت کی جتنی تحسین کی جائے کم ہے۔ سروے کا موضوع بھی زبردست تھا۔

(خواجہ مظہر صدیقی، کالسٹ نوائے وقت، ملتان)

روح میں اترنے والی تحریر

روح میں اترنے، عقل و شعور کو جھنجوڑنے والی تحریر تھی، آپ نے نے یہ ہمیشہ کی طرح ایک دردمند دل کی آواز اس سچ بیانی میں عمدگی سے شامل کی ہے۔ پڑھ کر کئی لمحے پریشانی سے سوچتا رہا۔ (محمد ناصر زیدی، دنیائی وی۔ لاہور)

قصور بچوں کا نہیں والدین کا ہے

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آپ کا رسالہ اچھا تھا۔ موبائل اور انٹرنیٹ کے نقصانات کے حوالے سے قارئین اکثر اپنے غصے کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ میں اتنا ہی کہوں گی کہ ہم سارا ملبہ موبائل اور انٹرنیٹ پر کیوں ڈال دیتے ہیں۔ بے راہ روی کی وجہ صرف یہ نہیں ہو سکتی۔ کیا ہم نے اپنے گریبان میں جھانکا ہے کہ ہم اپنے بچوں کو تعلیم کیا دے رہے ہیں؟ کیا ماں کا کام صرف گھر کے کام کرنا ہے اور باپ کا کام صرف پیسے کمانا ہے؟ ہم نے کبھی بیٹھ کر ان سے بات کی ہے ان کی مشکلوں کو سنا ہے، ان کی جذباتی تبدیلیوں کو نوٹس کیا ہے۔ ہم خود بچوں کو برائی کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ میں تمام والدین سے کہنا چاہوں گی کہ جذباتی عمر میں اپنے بچوں کو اعتماد میں لیں۔ انھیں

وقت دیا کریں، انھیں اپنی روایات، تہذیب اور اقدار دیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ سنیں اور عمل نہ کریں۔

(مریم ملک۔ راولپنڈی)

بس ایک چھوٹی سی گزارش

میں کافی عرصہ سے آپ کے ڈائجسٹ کی قاریہ ہوں۔ آپ کے کوئز پورے ملک میں منفرد اور تخلیقی سطح کی خوب صورتی لیے ہوئے ہیں۔ اس مرتبہ قصہ کوئز میں انعام یافتہ قرار دے کر آپ نے میرا مان بڑھایا ہے۔ جس کے لیے میں ادارے کی بہت شکرگزار ہوں۔ بس ایک چھوٹی سی گزارش سمجھیے جو کتب دی جائیں تو وہ آپ کے اور جناب وصی شاہ کے دستخط کے ساتھ ہوں۔ یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہوگی۔ میری یہ آپ سے خصوصی گزارش ہے۔ (شگفتہ رحمان۔ ایکسپریس وے راولپنڈی)

مضامین ڈاؤن لوڈ کر کے بات نہیں بنتی

میں کافی مدت سے اردو ڈائجسٹ کا مداح، متلاشی اور فدوی ہوں۔ پچھلی صدی کی آٹھویں اور نویں دہائی میں جب میں کشمیر کا سب سے معروف میگزین تکبیر شائع کرتا تھا تو آپ نے اس ناچیز پر اپنا دست شفقت رکھ کر اپنا فراخدلانہ تعاون (اردو ڈائجسٹ) کی صورت میں عنایت کیا تھا اور کئی سال تک مجھے میرا سب سے محبوب اور پسندیدہ جریدہ رجسٹرڈ ڈاک سے ملا کرتا تھا۔

پھر یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ جب کبھی کوئی عزیز پاکستان کے سفر پر جاتا ہے تو میرا اس سے ایک ہی مطالبہ ہوتا ہے کہ وہاں سے جتنے شمارے میرے محبوب ''اردو ڈائجسٹ'' کے ممکن ہوں لا کے دینا۔ میرے لیے یہی سب سے بڑی سوغات ہے۔

میں نے دس سال قبل قلب معائیت کے بعد ایک خالصتاً دینی، دعوتی علمی رسالہ اطیات شروع کیا ہے۔ ساتھ ہی جون ۲۰۰۹ء سے Cresent انگریزی رسالہ بھی شائع ہو رہا ہے۔ لیکن سب کے باوجود میں

نقارہ خوب بج رہا ہے

میں نے یونہی اُردو ڈائجسٹ کا مطالعہ مکمل کیا تو رہ نہیں سکا۔ فوری طور پر فون اٹھا اور ایڈیٹر صاحب کا نمبر گھما دیا۔ گھڑی پر نظر گئی تو رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ خیال آیا لائن کاٹ دوں۔ آرام کر رہے ہوں گے۔ اگلے ہی لمحے وہ لائن پر تھے، معلوم ہوا ابھی آفس سے گھر پہنچے ہیں۔ بٹ برادران کے انٹرویو، یوسف اصلاحی کی آپ بیتی، الطاف قریشی صاحب کے تجزیے سے لے کر طیب اعجاز کے نوٹ تک شوق سے سبھی پڑھ ڈالا تھا۔ کس کس کی تعریف کرتا۔

جو چیزیں بہت توجہ اور چاہت سے پڑھتا ہوں ان میں ''دردِ دل پہ دستک'' شامل ہے۔ ایسا سبق آموز، دل نواز اور دل گداز کرنے والا کالم ہے کہ یقین کریں رات گئے فون کرنے سے اپنے آپ کو روک ہی نہیں سکا۔ وہ بالکل ایسا ہی تھا جب لاہور میٹرو بس پہ بیٹھے ہم جی سی کے پاس سے گزر رہے تھے تو ہمارے کالم نگار دوست فرخ سہیل گوئندی میرے ساتھ موجود جناب ارشاد عارف اور خالد مسعود کو بتا رہے تھے کہ ترکی والے ویسے اسلامی نہیں ہیں۔ جیسے آپ لوگ انھیں سمجھتے ہیں۔ میں نے تڑپ کر کہا: ''یار فی الحال اتنے خوب صورت مناظر دیکھنے دو، لاہور کو اتنا خوشنما ہم پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔'' کاہنہ سے لے کر لٹن روڈ تک جہاں جہاں سے گزر رہے تھے لوگ ہاتھ ہلا رہے تھے۔ تصویریں بنا رہے تھے۔ حتیٰ کہ جن کی دکانیں مسمار ہوئی تھیں ان کی فیملیز بھی ٹوٹے چھجوں پر کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ اصل میں یہی دل کی آواز ہوتی ہے۔ یہی آواز حلق، نقارہ خدا کہلاتی ہے۔ اردو ڈائجسٹ کا نقارہ تو خوب بج رہا ہے۔

(رؤف طاہر، کالم نگار روزنامہ جنگ، مشیر صوبائی وزارت اطلاعات پنجاب)

تازگی اور گہرائی لیے ہوئے

اردو ڈائجسٹ سے محبت مجھے ورثے میں ملی۔ میرے والد صاحب نے اکیس بائیس سال پہلے لگوایا تھا۔ بیچ میں دس پندرہ سال گزرے، آتا تھا۔ مگر میں اٹھا کر رکھ دیتا تھا۔ اب کچھ سالوں سے دوبارہ سے اس نے دل پکڑ لیا ہے۔ کیا کیا عمدہ چیزیں آرہی ہیں۔ تازگی اور گہرائی لیے ہوئے۔ آپ کی ٹیم اچھی ہے، اچھا کام سامنے آرہا ہے۔ خدا سلامت رکھے۔

اب بھی دیوانگی کی حد تک اردو ڈائجسٹ سے عشق کرتا ہوں اور شدید ترین خواہش ہے کہ اس کے سبھی شمارے حاصل ہو جائیں۔ جب سے آپ کی web site لانچ ہوئی ہے تب سے کسی حد تک پیاس کم ہو جاتی ہے۔ لیکن کہاں اس کی طبع شدہ کاپی اور کہاں ڈاؤن لوڈز مضامین۔ اگر ممکن ہو تو ازراہ کرم پھر مجھے میرا سب سے محبوب رسالہ بذریعہ ڈاک بھجوائیں۔ میں ممنون کرم تاحیات رہوں گا۔

نادیدہ عاشق: (ڈاکٹر جوہر قدوسی۔ گاہ کدل سری نگر)

(ڈاکٹر صاحب! اس قدر محبت کا بے حد شکریہ۔ ہمارے لیے کچھ تحریر بھی فرمائیے۔ ہم بھی سری نگر کی زندگی، اس کی خوب صورتی، سماجی، ادبی اور تعلیمی احوال جان کر خوش ہوں گے)

سوچ کی نئی راہیں

اگر ممکن ہو سکے تو امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں تفصیل اور مکمل معلومات شائع فرمائیں۔ ڈائجسٹ بڑا ہی جاندار اور جامع ہے۔ اس کی تحریریں بڑوں، کے لیے نہیں، طالب علموں کے لیے بھی یکساں مفید ہیں۔ سوچ کی نئی راہیں سامنے آتی ہیں۔ اللہ اسے مزید ترقی دے اور اس کی ٹیم کو خوشحالی اور کامرانی نصیب کرے جو کہ اتنی محنت سے مسلسل اپنے قارئین کو دینی اور دنیاوی معلومات فراہم کر رہی ہے۔ (آمین)

حبیب اشرف صبوحی کی سچی کہانیاں پڑھ کر سمجھ میں آیا کہ ہمارے حکمران کس قدر انصاف پسند تھے۔ اسی وجہ سے وہ دنیا کے حاکم تھے اور آج کے مسلمان کس قدر بے انصاف اور اقربا پرور ہیں۔ اسی وجہ سے مسلمان ہر جگہ ناکام اور محکوم ہیں۔ لیڈر کی خوبیوں کے بارے واقعی مانک شا نے درست کہا اور آپ نے ہمت کر کے درست چھاپا۔ اگر یہ خوبیاں ہمارے حکمرانوں میں ہوتیں تو مشرقی پاکستان کبھی ہم سے جدا نہ ہوتا اور ہم بھی اقوام عالم کی ترقی یافتہ قوموں میں سے ایک ہوتے۔

شکیل احمد ''قوموں کو زوال نہیں آتا'' نے بجا فرمایا۔ مضمون ذہن میں لانے کی ضرورت ہے۔ ہمارا تو کلچر ہی جھوٹ بولنا، فراڈ کرنا، کام نہ کرنا ہے، امتحان میں نقل کرنا، پڑھ کوئی اور رہا ہے امتحان کوئی اور دے رہا ہے۔ ہمیں بہت فکر کرنے اور بہتر ہونے کی ضرورت ہے۔ آپ کے مضامین اس حوالے سے اچھی توجہ دلاتے ہیں۔

(محمد اویس دانش خانزادہ راجپوت۔ بے نظیر آباد)

(ہم دانش مشرق کے عنوان سے خلفاء راشدین، آئمہ کرام پر ہر ماہ مختصراً معلومات شائع کر رہے ہیں۔ ان شاء اللہ جلد ہی چاروں آئمہ کرام پر تفصیلی مضامین بھی آپ دیکھ سکیں گے۔)

زندگی کو زحمت نہیں نعمت سمجھیے

دردِ دل پہ دستک

اختر عباس

akhter.abbas.92

akhterabas@ymail.com

ایک دم سے بھگدڑ سی مچی تھی۔ دو تین سٹاف نرسیں آپریشن تھیٹر سے خوفزدہ حالت میں باہر بھاگی تھیں۔ ان کے کوریڈور سے باہر آنے تک بدبو کا ایک بھبوکا پہلے پہنچ چکا تھا، اس قدر شدید بدبو کہ بیان سے باہر تھی۔ ”ڈاکٹر فیصل جاوید کی ہمت ہے کہ اتنی بدبو کے باوجود آپریشن تھیٹر میں اکیلے ڈٹے ہوئے ہیں۔“ ایک نوجوان نرس بڑبڑائی تھی۔ ریلوے کیرن ہسپتال ہم اتفاق سے نہیں ضرورت سے گئے تھے، اب زندگی اچھے فیملی ڈاکٹر کے بغیر ادھوری سی رہتی ہے۔ آئے روز کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا مسئلہ، بندہ ہر بار کہاں کسی نئے معالج کو کہانی سمجھانے اور بتانے بیٹھ جائے۔

ریلوے کیرن ہسپتال جانے کے لیے ہم بڑی مشکل سے وقت نکال پائے تھے۔ ایک تو دور پھر دن کا وقت، ڈاکٹر سے ملاقات و مشورہ تو اب برسوں سے رات کی زندگی کا حصہ ہے۔

”یہ کیا تھا؟“ کچھ دیر بعد منہ ہاتھ دھو کر لمبے لمبے سانس لیتے ڈاکٹر سے ہم نے پوچھا، ایم فل کرنے کے بعد بھی ان کے چہرے کی مسکراہٹ اور روزمرہ زندگی کے گھمبیر مسائل پہ لطیف سا تبصرہ کرنے کی عادت میں کمی نہیں آئی۔

”ہمارے ہاں دو طرح کے کیسز آتے ہیں۔ اچھے خاندانوں کے لڑکے اور لڑکیاں جب کسی گھریلو مسئلے میں دلائل سے ہار جاتے ہیں۔ محبت کا تیر خطا ہو جاتا ہے یا کوئی معصوم سا مطالبہ غیر معقولیت کی حدوں تک پہنچ کر منظوری نہیں پاتا تو انھیں لگتا ہے کہ خودکشی کا ڈراما رچانے سے والدین کو آسانی سے ڈرایا اور دباؤ میں لایا جا سکتا ہے۔ نیند کی گولیاں ان کی مددگار بنتی ہیں اور وہ پوری منصوبہ بندی سے کچھ گولیاں کھا کر باقی بیڈ پر گرا کر، کمرے کا دروازہ کھول کر، کسی کو فون پہ مطلع کر کے خود گہری نیند کی وادی میں اتر جاتے ہیں۔ اُن کا علاج آسانی سے ہو جاتا ہے۔ البتہ لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے لڑکے لڑکیاں محبت میں ناکامی، گھر کی ڈانٹ ڈپٹ، پیسے ملنے سے انکار، امتحان میں متوقع یا غیر متوقع برے نتائج آنے پر گھر میں موجود گندم میں رکھنے والی گولیاں، یا چوہے مار گولیاں کھا کر خودکشی کی جو کوشش کرتے ہیں وہ ہم تک پہنچنے میں ذرا سی تاخیر کی صورت میں زندہ نہیں بچ پاتے۔ معدہ صاف کرنے کے دوران ان گولیوں کی بدبو سے آپریشن تھیٹر بھر جاتا ہے اور بُو اتنی شدید ہوتی ہے کہ سٹاف تھیٹر سے بھاگنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لاش جانے کے بعد یہ بُو تو کم ہو جاتی ہے مگر مرنے والا جاتے جاتے اپنے خاندان والوں کو جس بدبُودار صورتِ حال کے حوالے کر جاتا ہے اس سے برسوں نکلنا ممکن نہیں ہو پاتا۔ لوگوں کے سوال، بے عزتی کا احساس اور گناہِ عظیم کا ارتکاب والدین کو سکھ کا کوئی سانس لینے نہیں دیتا۔

دنیا کے مختلف ممالک میں کسی نہ کسی حوالے سے خودکشی کی لہر چل رہی ہوتی ہے۔ اگر امریکا میں افغانستان سے لوٹ کر جانے والے فوجیوں کی ایک قابل ذکر تعداد نے اپنے لیے یہ انجام چنا ہے تو افغانستان اور پاکستان کے سرحدی علاقوں میں بہت سے لوگوں نے مذہبی رنگ

اوڑھ کر خودکش حملوں کی صورت اپنے جسم کے چیتھڑے اڑوائے ہیں اور تیس ہزار سے زائد بے گناہوں کو موت کا جبری جام پلا کر اپنے گھر والوں کو دینی اور دنیاوی دونوں اذیتوں سے ہمکنار کیا ہے، ایسی وارداتوں کے بعد تو کوئی اُن کے کٹے پھٹے سر اور ادھڑے ہوئے جسموں کا دعوے دار بھی سامنے نہیں آتا۔

ہم نے سیاسی خودکشیوں کے عبرت اثر واقعات بھی بہت دیکھے ہیں۔ ان واقعات میں خودکشی کرانے والے پس پردہ رہتے تھے اور باقاعدہ منصوبہ بندی اور ترغیب سے پورا ڈراما اور سین اسٹیج کیا جاتا تھا۔ بھٹو صاحب کی پھانسی کے بعد جب پوری پارٹی خاموش تھی اور احتجاج کی ہلکی سی لہر بھی پیدا کرنے میں ناکام رہی تھی، پیپلز پارٹی کے ان جیالوں کو جن میں سے اکثر کا تعلق غربت کی لکیر سے نیچے جینے والوں میں سے تھا۔ مالی ترغیبات کے سہانے خواب دکھا کر ”خودسوزی“ کے پردے میں خودکشی پر آمادہ کیا گیا۔ اکثر کو تو وہ کمبل بھی دکھائے گئے جو جسم کو آگ لگانے کے بعد ان پر ڈالے جانے تھے تاکہ احتجاج بھی ریکارڈ ہو جائے اور ان کی جان بھی بچالی جائے۔ کتنے ہی مرنے والوں کے پیاروں کو بعد میں روتے دیکھا گیا کہ عین موقع پر کمبل والا ہی غائب ہو گیا اور خودسوزی والا اپنے ہاتھوں لالچ اور عقیدت کی لگائی آگ میں جل کے کوئلہ بن کر ان کے بعد تماشائیوں کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا جنھیں ہمدردی اور نفرت کے ملے جلے نعرے لگانے اور سیاسی قربانی کی مثال دینے کے لیے ایک لاش درکار تھی۔

میاں نواز شریف کے دوسرے دور میں مہنگائی کے ہاتھوں ستائے ہوئے کئی بے روزگاروں نے ان کے دفتر کے باہر خودسوزی کر کے جانیں گنوائیں۔ خدا جانے یہ عذاب انھوں نے اپنے لیے خود چنا یا کسی کے کہنے پر اس آگ کو گلے لگایا جو تا عمران کو جھلساتی رہے گی۔

حالیہ برسوں میں خودکشی کی وبا ٹین ایج (Teen age) کے بچوں میں اس شدت سے پھیلی ہے کہ والدین اب کانپ کانپ جاتے ہیں۔ دو ہفتوں میں ۱۵ر بچے اپنی جان سے گئے۔

غور کریں تو بظاہر جذباتی عدم توازن کو خودکشی کی وجہ ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ پاکستان ورلڈ کپ ہار گیا تو خودکشی، پیار کیا اور شادی نہ ہو سکی تو خودکشی، امتحان دیا اور مطلوبہ نمبر نہ آئے تو خودکشی، ابو، امی نے ڈانٹ دیا، استاد نے سبق یاد نہ کرنے پر بے عزتی کر دی، ساس کے طعنے، شوہر کی زیادتی، محبوبہ کی شادی، بیوی کی بے وفائی، مالک کی کج ادائی، قرعہ اندازی میں انعام نہ ملنے کا دُکھ، کسی پیارے کی موت کی خبر سن کر خود کی جان لے لینے کا فیصلہ، ذہنی حالت اور معاشرتی حالات جیسے بھی ہوں زندگی کے بدترین فیصلے تک پہنچنے کے اس فیصلے کے نتائج کئی سطحوں پر عذاب سے دوچار کرتے ہیں۔

کچھ سال قبل مقامی یونیورسٹی کے شعبہ فارمیسی کے سربراہ کے نوعمر بیٹے نے امتحان میں کم نمبر آنے پر اپنے کمرے میں خودکشی کرتے ہوئے ایک لمحے کو بھی سوچا ہوتا کہ وہ اپنے ماں باپ کو کیا تحفہ دے کر جا رہا ہے۔ ایک ایسا دکھ کہ جو ان کی زندگی کے آخری سانس تک ان کے ساتھ رہے گا۔ وہ دنیا بھر کے لیے دعائیں کریں گے۔ خیر مانگیں گے اور جانتے ہوں گے کہ سب کو خبر پڑ جائے گی سوائے اپنے بیٹے کے کہ جس نے اپنی جان خود لینے کا گستاخانہ فیصلہ کیا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ خودکشی کرنے والوں کا بظاہر بزدلانہ نظر آنے والا یہ فیصلہ تکبّر اور گستاخی سے بھرا ہوتا ہے۔ اپنی سانس لیتی، جیتی جاگتی اس مسکراتی زندگی کو وہ اپنے پاؤں کی ٹھوکر مارتے ہیں جو اصل میں ان کی ملکیت تھی ہی نہیں، امانت پسند ہو یا ناپسند، جن شرائط پہ ملتی ہے واپس بھی انہی پر کرنی پڑتی ہے۔ وہاں من مرضی، دل پشوری یا غصے میں ہو گیا جیسی دلیلیں کسی کچہرے میں پڑے ڈبے یا ناکارہ ٹوٹے دھاگے جیسی وقعت بھی نہیں رکھتیں۔

ہمارے ہاں سرکاری اعداد و شمار ایک روح فرسا تصویر دکھا رہے ہیں۔ کیا دنیا بھر میں خود سے موت کو گلے لگانے کے واقعات میں یہ شدت اور اضافہ صرف دولت کی غیر مساوی اور غیر منصفانہ تقسیم کے باعث سامنے آ رہا ہے؟ یا سیاسی عدم استحکام یا اعلیٰ طبقات کے لالچ اور ظلم اور

www.urdudigest.pk

چھوٹے طبقات کا بڑھتا ہوا استحصال اس کی وجہ بن رہا ہے؟ کیا غربت اور امارت کا فرق اس کی بڑی وجہ ہے یا معاشی، معاشرتی اور سیاسی ظلم خودکشی کی اس اندھیر نگری کا اصل حکمران ہے یا عدم تحفظ عدم برداشت اور شکل کا مقابلہ نہ کرسکنے کی بزدلانہ سوچ موت کے قریب لے جاتی ہے؟

دوسرے ملکوں میں ہونے والی خودکشیوں کی خبریں کبھی ہمارے دل کو وہ درد عطا نہیں کرتیں جو اپنے بچوں اور بڑوں کی دردناک اموات کا پڑھ اور سن کر محسوس ہوتا ہے۔ کراچی جیسے شہر میں جہاں روزانہ ٹارگٹ کلنگ کا دکھ ہی کم نہیں وہاں روزانہ پانچ سے چھ بچیوں کی خودکشی اور وہ بھی چودہ سے چوبیس سال کی عمریں اور کبھی کبھی اس سے بھی کم عمر۔ موت کی اندھی وادی میں اترنے والی یہ معصوم لڑکیاں غربت یا نوکری کے مسائل سے زیادہ زندگی سے لگائی ہوئی جھوٹی توقعات اور اپنے آس پاس جینے والے ان جھوٹے لوگوں سے بڑھتے ہوئے تعلق کے اچانک ٹوٹنے کے دکھ سے مری ہیں۔

مجھے ان اعداد و شمار سے رتی برابر بھی دلچسپی نہیں ہے کہ امریکا سے لے کر جاپان اور چین سے لے کر ہندوستان تک خودکشی کا رجحان کس قدر بڑھا ہے۔ پریشانی تو اس بات کی ہے کہ ہمارا تو سارا غرور ہی اس بات پر رہا ہے کہ ہمارا خاندانی نظام سب سے مضبوط حصار ہے۔ ماں باپ کی محبت، توجہ، بہن بھائیوں کا پیار، عزیز رشتہ داروں کی تربیت، پھر اچھے اساتذہ اور اداروں کا حصار پھر اپنے معاشرتی تعلقات اور سب سے بڑا دین اسلام کا حصار جو امید ہی امید ہے۔ محبت ہی محبت، اللہ کی رحمت کے احساس سے بھرا ہوا جو اس کی رضا اور خوشنودی سے جوڑے رکھنے کے لیے سو سبیلیں نکالتا ہے۔ ایمان و یقین کے آس پاس نازک سی تار باندھے رکھتا ہے کہ ادھر نہیں جانا کیونکہ اس تار پر دنیا کے سب سے مہربان، پیار کرنے والے، غیر موجودگی میں بھی دعا دینے والے پیغمبر کا فرمان لٹکا ہوا ہے۔ سیدنا ثابت بن ضحاکؓ نے آنحضورﷺ سے روایت کی تھی کہ ”جو شخص خود اپنے آپ کو کسی ہتھیار سے قتل کرے گا، اسی ہتھیار سے اسے جہنم میں عذاب دیا جائے گا۔“ ایک دوسرے موقع پر سیدنا ابوہریرہؓ نے آنحضورﷺ کا فرمان پہنچایا ”جو شخص اپنی جان گلا گھونٹ کر دیتا ہے۔ وہ دوزخ میں بھی اپنا گلا برابر گھونٹتا رہے گا جو اپنے آپ کو زخم لگا کر ہلاک کر لیتا ہے وہ دوزخ میں بھی برابر اپنے آپ کو زخم لگاتا رہے گا۔“

آپ کو نہیں لگتا کہ ہمارے ہاں بڑھتی ہوئی خودکشیاں خاندانی، معاشرتی اور مذہبی تعلیمات سے بے نیازی کے باعث ہمیں اس ناکامی، نامرادی اور بے چارگی سے دوچار کر رہی ہیں جو بہرحال ہمیں مطلوب نہیں۔ آپ کو نہیں لگتا کہ ایک دن کیا ایک لمحہ ضائع کیے بنا جگہ جگہ سر جوڑنے کا وقت سر پر آن لگا ہے۔ ہم جو کبھی فخر سے اپنی خاندانی محبتوں کا تاج سر پر سجائے پھرتے تھے آج وہ سر بازار زمین پہ بے یارومددگار پڑا ہے۔ معاشرتی حفاظت ہوا ہوئی، ملکی قوانین کی بے اثری بھی ظاہر اور باہر ہے۔ مذہبی تعلیمات سے بے نیازی اور بے خوفی کا یہ عالم ہے کہ ۲۰۰۲ء میں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی رپورٹ کے بعد بھی ہم نہیں جاگے۔ کسی سطح پر غور کرنے کی زحمت نہیں کی۔ اس سال ۵ر ہزار لڑکے اور لڑکیوں نے خودکشی کی تھی۔ اس کے بعد کے برسوں میں یہ تعداد سرکاری طور پر ۸ر سے ۷ر ہزار اموات سالانہ کی بتائی جاتی رہی۔ جب کہ بعض ادارے ۵۰ر ہزار تک کے خوفناک اعداد و شمار پر اصرار کرتے ہیں۔

اس انجام کو جس کے بارے میں آنحضورﷺ نے بطور خاص سمجھایا تھا۔ سیدنا جندبؓ نے ایک شخص کا قصہ بیان کیا تھا جسے کچھ زخم لگ گئے تو اس نے اپنے آپ کو مار ڈالا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ناراضی سے فرمایا: ”میرے اس بندے نے مجھ سے سبقت کی یعنی اپنی جان میرے فیصلے سے پہلے خود لے لی۔ لہٰذا میں نے اس پر جنت حرام کر دی۔“

۱۸ر کروڑ زندہ لوگوں سے ابھی امید اور ایمان کی دولت نہیں چھنی، اپنے بچوں پر پڑھائی کا بے جا بوجھ، ہر وقت کی بے عزتی، پوچھ گچھ، گھر میں محبت کی کمی، رشتوں میں خالی وقت گزاری کا بے کیف احساس، والدین کے باہم جھگڑے، خاندانی سازشیں، منشیات کا استعمال،

www.urdudigest.pk

خوداعتمادی کی کمی، عزتِ نفس کی پامالی، ناگوار و نامناسب ماحول، جذباتی عدم توازن، کیریئر کا خوف، محبت میں ناکامی، صلاحیت سے زیادہ توقعات کا رجحان، والدین سے محبت کی کمی، دین سے دوری اللہ کی پسند و ناپسند سے ناواقفیت اور سب سے بڑھ کر بزدلی کہ مرضی کے خلاف کچھ ہونے پر مقابلہ کرنے کے بجائے مرنے کا فیصلہ کرانے والی وجوہات کو جان کر مان کر اپنے بچوں سے گفتگو نہیں کر سکتے۔ انھیں اس دکھ، درد اور عذاب کا نہیں بتا سکتے جو جانے والے کے بعد گھر والوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔

ذاتی طور پر ایک واقعے نے مجھے لرزا کر رکھ دیا تھا۔ تب میں ایسج کیئر ایڈورٹائزنگ میں ڈائریکٹر آپریشن تھا اور مس خان میرے ساتھ پرنسپل سیکرٹری کے طور پر کام کر رہی تھی۔ لبرٹی پلازہ گلبرگ کے سیکنڈ فلور پر ہمارا ایک خوب صورت سا آفس تھا، اعجاز چوہدری صاحب (تحریک انصاف کے نائب صدر) اس ایجنسی کے سربراہ تھے، مس خان ٹاؤن شپ میں اپنی والدہ اور بہن کے ساتھ رہتی تھی اور بڑی سمجھداری کے ساتھ اپنے دفتری فرائض سرانجام دیتی تھی۔ ان برسوں میں اس نے صرف ایک ناسمجھی کی تھی جب ساتھ کے دفتر میں کام کرنے والے ایک کمپیوٹر مکینک سے راہ و رسم بڑھائی اور شادی کے وعدے وعید کر لیے۔ مجھے پتا چلا تو لڑکے کو بلایا اور تفصیل پوچھی تو پتا چلا کہ اس کا والد ایک سائیکل اسٹینڈ کے ٹھیکیدار کا ملازم ہے۔ ایک کمرے کے گھر میں تین بہنوں اور دو بھائیوں کے ساتھ رہتا ہے اور بہنوں کی شادی کے بعد شادی کا سوچے گا۔ مس خان نے زندگی کے بڑے بڑے خواب بُن رکھے تھے، بڑا سا گھر، بنگلہ، گاڑی اور آسودگی سے بھری زندگی، اسے بلا کر سمجھانے کے بجائے صرف بتایا کہ اس محبت کی نیا پار لگنے کے لیے ایک زندگی اور چاہیے ہو گی تاکہ خوابوں میں سے کوئی ایک آدھ پورا ہو جائے۔ یہاں تو کوئی ایک خواب بھی پورا ہوتا دکھائی نہیں دیتا، اتنا بتا کر اسے صرف یہ کہا کہ یہ قصہ تو ختم سمجھو، اب سکون سے اپنے کام پر توجہ دو۔ ہاں دوبارہ محبت کرنے سے پہلے مشورہ کر لینا اور اپنے اصل ہدف پر نگاہ رکھنا۔

اگلے روز سہ پہر کو آفس پہنچا تو پتا چلا کہ مس خان صبح سے رو رہی ہیں۔ آفس کے لوگ باری باری چپ کرانے کی کوشش کر کے تھک چکے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ ہوسکتا ہے کل کے مشورے کی اسے سمجھ اب آئی ہو اور مکینک سے متوقع بریک اپ کا دُکھ اسے رلا رہا ہو۔ اسے آفس بلایا اور ابھی پوچھنے اور کہنے کو موزوں لفظ ہی ڈھونڈ رہا تھا کہ وہ پوری آواز اور آنسوؤں سے زار و قطار روتی میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ میں نے تھوڑی ناراضی سے کہا ”مسئلہ کیا ہے؟ جاؤ گھر جا کر آرام کرو، سارا دفتر تمھارے رونے دھونے سے بھرا ہوا ہے۔ تمھیں اسی ایک کمرے کے گھر میں زندگی گزارنی ہے تو جاؤ کنویں میں چھلانگ لگاؤ۔ تمھاری زندگی ہے۔“ اس نے روتے ہوئے کہا نہیں سر! وہ مسئلہ نہیں ہے وہ تو میں نے نیا ہدف ڈھونڈ لیا ہے ساتھ والی کمپنی میں مارکیٹنگ مینیجر ہے، کار بھی ہے اس کے پاس، ابھی تو مسئلہ الگ ہے۔ آپ صبح کے وقت نوائے وقت آفس جاتے ہیں، سیکنڈ ٹائم اِدھر آتے ہیں، بتا ہی نہیں سکی۔ دوپہر کو میں گھر گئی تھی ہمارے ہمسائیوں کا ایک بڑا خوب صورت لڑکا ہے۔ وہ کل سے غائب تھا ابھی اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ والدین نے شادی کے لیے اس کی بات نہیں مانی کہ ابھی چھوٹا ہے۔ سب لوگ اُسے دوستوں، عزیزوں کے ہاں ڈھونڈ رہے تھے۔ اطلاع ملی کہ کوٹ لکھپت اسٹیشن کے قریب اس کا اسکول بیگ ملا ہے۔ وہاں پہنچے تو ایک مسخ شدہ لاش ملی اور وہ بھی اس حالت میں کہ اس کے جسم کے ٹکڑے اور اعضا دور دور بکھرے تھے۔ اس بے وقوف نے ٹرین کے آگے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ ٹرین نے اس کے جسم کے پرخچے اُڑا کے رکھ دیے۔

لڑکے کی ماں جو اسکول بیگ ملنے کی خبر سن کر خوشی خوشی وہاں گئی تھی کہ بیٹا کہیں آس پاس ناراض بیٹھا ہوگا۔ وہاں اپنے جگر کے ٹکڑے کے بکھرے ہوئے اعضا دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ مس خان نے پہلے ماں کی حالت دیکھی پھر تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر چارپائی پہ خودکشی کرنے والے لڑکے کی لاش پر سے سفید کپڑا ہٹا کر دیکھ لیا تھا۔

ماہِ رواں کی شخصیات

محمد خلیل (دینہ)

اس معلوماتی سلسلہ کو بہت محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ آپ کے لیے اہم معلومات کا ماخذ ثابت ہوگا

ماہ مارچ میں پیدا ہونے والی اہم عالمی وملکی شخصیات

یکم مارچ ۶۲۵ء حضرت امام حسنؓ (نواسۂ رسول ﷺ)
یکم مارچ ۱۸۸۸ء سر شاہنواز بھٹو (ذوالفقار علی بھٹو کے والد)
یکم مارچ ۱۹۳۹ء مستنصر حسین تارڑ (ادیب، صحافی، سفرنامہ نگار)
یکم مارچ ۱۹۲۳ء عارف عبدالمتین (معروف اُردو شاعر اور استاد)
۲/مارچ ۱۹۳۱ء گورباچوف (سابق روسی صدر)
۲/مارچ ۱۹۷۲ء ڈاکٹر عافیہ صدیقی (امریکہ میں قید مشہور پاکستانی خاتون)
۲/مارچ ۱۹۱۴ء شاکر علی (مشہور مصور)
۳/مارچ ۱۸۴۷ء گراہم بیل (ٹیلی فون کا موجد)
۳/مارچ ۱۹۳۵ء منور سلطانہ لکھنوی (ممتاز شاعرہ)
۳/مارچ ۱۹۷۰ء انعام الحق (پاکستانی کرکٹر)
۴/مارچ ۱۹۲۵ء خواجہ ریاض الدین عطش (اردو ادیب، محقق و شاعر)
۴/مارچ ۱۹۳۸ء ڈاکٹر قمر واحد (معلم اور محقق)
۴/مارچ ۱۹۴۱ء میاں محمد اظہر (سابق گورنر پنجاب)
۵/مارچ ۱۸۷۱ء آغا شاعر قزلباش (شاعر)
۵/مارچ ۱۹۲۱ء نذر محمد (پاکستان کے نامور کرکٹر)
۵/مارچ ۱۹۴۰ء رشید امجد (افسانہ نگار)
۶/مارچ ۱۹۱۵ء سیدنا محمد برہان الدین (داؤدی بوہرہ فرقہ کے سربراہ)
۶/مارچ ۱۹۳۷ء ویلنٹینا تیریشکوا (دنیا کی پہلی خاتون خلاباز)
۶/مارچ ۱۹۴۰ء سردار گل محمد خان جوگیزئی (سیاستدان)
۷/مارچ ۱۹۱۴ء، قیوم نظر (ممتاز شاعر)
۷/مارچ ۱۹۳۸ء محمد علی صدیقی (ممتاز نقاد)
۸/مارچ ۱۹۱۵ء مطلوب الحسن سید (قائداعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری)
۸/مارچ ۱۹۲۱ء ساحر لدھیانوی (معروف اردو شاعر)
۹/مارچ ۱۹۳۴ء یوری گیگارین (دنیا کا پہلا خلاباز انسان)
۹/مارچ ۱۹۰۹ء کنور مہندر سنگھ بیدی سحر (اردو کے نامور شاعر)
۹/مارچ ۱۳۵۴ء امریگو ویس پوچی (مشہور سیاح)
۱۰/مارچ ۱۸۶۹ء سر محمد شفیع (تحریک پاکستان کے رہنما)
۱۰/مارچ ۱۸۷۲ء مولانا عبیداللہ سندھی (تحریک آزادی کے رہنما)
۱۰/مارچ ۱۸۷۳ء مولانا شوکت علی (تحریک پاکستان کے رہنما)
۱۰/مارچ ۱۹۱۶ء علی جواد زیدی (اردو کے نامور محقق)
۱۱/مارچ ۱۹۶۸ء عمار مسعود (اردو افسانہ نگار)
۱۱/مارچ ۱۹۸۲ء حسن رضا (کم عمر بین الاقوامی پاکستانی کرکٹر)
۱۱/مارچ ۱۹۳۴ء سلیم اختر (اردو کے مشہور نقاد، ادیب)
۱۲/مارچ ۱۸۸۰ء مصطفیٰ کمال اتاترک (جدید ترکی کا بانی)
۱۲/مارچ ۱۹۳۲ء خالد بزمی (شاعر اور ادیب)
۱۲/مارچ ۱۹۳۲ء ابوالخیر کشفی (اردو ادیب وصحافی)
۱۳/مارچ ۱۹۵۲ء خالد اقبال یاسر (اردو شاعر)
۱۳/مارچ ۱۷۳۳ء جوزف پریسٹلے (مشہور انگریز کیمیا دان)
۱۳/مارچ ۱۹۳۷ء عبدالوحید کاکڑ (پاک فوج کے سابق سربراہ)
۱۴/مارچ ۱۸۷۹ء آئن اسٹائن (نامور سائنس دان)
۱۴/مارچ ۱۹۶۴ء نوشی گیلانی (اردو کی مقبول شاعرہ)
۱۵/مارچ ۱۹۶۸ء حوالدار لالک جان شہید (نشان حیدر)
۱۵/مارچ ۱۹۳۰ء محمد حنیف رامے (پاکستان کے ممتاز مصور، سیاستدان)
۱۵/مارچ ۱۹۵۵ء محسن حسن خان (پاکستانی کرکٹر وفلمی اداکار)
۱۶/مارچ ۱۵۰۸ء نصیر الدین ہمایوں (خاندان مغلیہ کا دوسرا بادشاہ)
۱۶/مارچ ۱۹۳۵ء واجدہ تبسم (اردو کی معروف افسانہ نگار)
۱۶/مارچ ۱۹۰۴ء جلیل قدوائی (معروف ادیب وشاعر)
۱۷/مارچ ۱۹۳۶ء عابد علی (فلم اور ٹی وی کے معروف اداکار)
۱۸/مارچ ۱۹۵۰ء ڈاکٹر ہلال نقوی (مرثیہ گو شاعر، محقق)
۱۸/مارچ ۱۹۵۱ء یاسمین حمید (اردو کی معروف شاعرہ)
۱۸/مارچ ۱۸۵۸ء رودولف ڈیزل (تیل سے چلنے والے انجن کا موجد)
۱۸/مارچ ۱۸۶۹ء نیول چیمبرلین (سابق برطانوی وزیر اعظم)
۱۹/مارچ ۱۸۶۳ء مولانا اشرف علی تھانوی (مشہور عالم دین)
۱۹/مارچ ۱۹۲۶ء ستیش مترا (اردو کے ممتاز افسانہ نگار)
۲۰/مارچ ۱۶۱۵ء دارا شکوہ (مغل شہنشاہ شاہجہاں کا بڑا بیٹا)
۲۰/مارچ ۱۹۲۲ء سیف الدین سیف (شاعر گیت نگار)
۲۰/مارچ ۱۹۲۳ء شوکت صدیقی (ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار)
۲۱/مارچ ۱۹۱۳ء خواجہ خورشید انور (موسیقار)
۲۱/مارچ ۱۹۳۷ء فرخندہ لودھی (اردو کی معروف ادیبہ)
۲۱/مارچ ۱۹۴۵ء افتخار عارف (شاعر، دانشور)
۲۲/مارچ ۱۹۴۰ء ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا (محقق، معلم، ادیب)

ماہ مارچ میں وفات پانے والی شخصیات

یکم مارچ ۱۹۷۸ء سید آل رضا (معروف شاعر)
یکم مارچ ۱۹۶۴ء ظریف جبلپوری (اردو کے معروف مزاح گو شاعر)
یکم مارچ ۱۹۹۸ء مولانا سید حسن مثنیٰ ندوی (عالم دین، صحافی، مقرر)
یکم مارچ ۱۹۹۰ء اے رحیم خان (سابق ایئر مارشل)
۲/مارچ ۱۹۷۲ء ناصر کاظمی (اردو کے نامور شاعر)
۲/مارچ ۱۹۹۶ء نسیم حجازی (اردو کے معروف ناول نگار)
۲/مارچ ۱۸۹۵ء اسماعیل پاشا (مصری حکمران)
۲/مارچ ۱۹۷۴ء رفیق غزنوی (ممتاز موسیقار)
۳/مارچ ۱۷۰۷ء اورنگ زیب عالمگیر (خاندان مغلیہ کا چھٹا بادشاہ)
۳/مارچ ۱۹۸۲ء فراق گورکھپوری (اردو کے نامور شاعر)
۳/مارچ ۱۹۷۶ء اسلم شیر (پاکستان اچھا پہلوان)
۴/مارچ ۱۱۹۳ء سلطان صلاح الدین ایوبی (نامور مسلم فاتح)
۴/مارچ ۱۳۲۵ء خواجہ نظام الدین اولیاء (سلسلہ نظامیہ کے بانی)
۴/مارچ ۱۹۹۲ء جام صادق علی (سابق وزیر اعلیٰ سندھ)
۵/مارچ ۱۹۶۶ء فخر ماتری (نامور صحافی روزنامہ حریت کے مالک)
۵/مارچ ۱۹۸۹ء منشی عبدالرحمٰن (دانشور، ادیب ومحقق)
۶/مارچ ۱۹۸۵ء بھولو پہلوان (پاکستان کے مشہور پہلوان)
۶/مارچ ۱۹۹۲ء سردار عبدالرشید (سابق وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان)
۶/مارچ ۱۹۶۳ء مولانا سید محمد عیسیٰ غزنوی (عالم دین)
۷/مارچ ۱۹۷۰ء منظر حسین شمیم رائے پوری (شاعر اور صحافی)
۷/مارچ ۱۹۷۲ء یوسف ظفر (ممتاز شاعر اور نقاد)
۷/مارچ ۱۹۸۲ء ارباب سکندر خلیل (سابق گورنر سرحد)
۸/مارچ ۱۸۷۵ء مرزا سلامت علی دبیر (نامور مرثیہ گو شاعر)
۸/مارچ ۱۹۷۷ء کرشن چندر (اردو کے معروف افسانہ نگار)
۸/مارچ ۱۹۸۵ء جی الانہ (مشہور شاعر، محقق، ماہر معاشیات)
۹/مارچ ۱۸۹۷ء جمال الدین افغانی (مسلم رہنما)
۹/مارچ ۱۹۸۶ء اے بی عظیم (معروف صحافی)
۱۰/مارچ ۱۹۲۴ء غلام محمد بھرگڑی (تحریک آزادی کے رہنما)
۱۰/مارچ ۱۹۸۱ء عبدالحمید عدم (ممتاز غزل گو شاعر)
۱۰/مارچ ۱۹۸۶ء تاج محمد ابڑو (ممتاز قانون دان)
۱۱/مارچ ۱۹۴۰ء آغا شاعر قزلباش (شاعر، ڈراما نگار)
۱۱/مارچ ۱۹۵۵ء سر الیگزینڈر فلیمنگ (پنسلین کے موجد)
۱۱/مارچ ۱۹۷۳ء ممتاز شیریں (ممتاز خاتون، ناول نگار اور نقاد)
۱۱/مارچ ۱۹۷۷ء محمد یوسف دہلوی (مشہور خوشنویس)
۱۲/مارچ ۱۹۸۵ء ڈاکٹر غلام جیلانی برق (معلم، ادیب، عالم)
۱۲/مارچ ۱۹۲۵ء سن یات سین (چین کا نجات دہندہ اور چین کا بانی)
۱۲/مارچ ۱۹۹۳ء حبیب جالب (نامور عوامی اور انقلابی شاعر)
۱۲/مارچ ۱۹۹۳ء جنرل (ر) محمد شاہد حامد (سابق وفاقی وزیر)
۱۳/مارچ ۱۹۹۳ء رانا پھول محمد خان (معروف سیاستدان)
۱۳/مارچ ۱۹۷۱ء ڈاکٹر تصدق حسین خالد (نامور شاعر)
۱۳/مارچ ۱۹۹۱ء جنرل (ر) محمد موسیٰ خاں (بری فوج کے سابق سربراہ)
۱۴/مارچ ۱۲۰۶ء شہاب الدین محمد غوری (مسلم حکمران وفاتح)
۱۴/مارچ ۲۰۰۵ء عمر قریشی (صحافی، کالم نگار، کرکٹ کے تبصرہ نگار)
۱۴/مارچ ۲۰۰۰ء جسٹس (ر) ذکی الدین پال (ج)
۱۵/مارچ ۱۹۴۸ء مولانا ثناء اللہ امرتسری (عالم دین)
۱۵/مارچ ۱۹۷۹ء اکبر علی ایڈووکیٹ (قائداعظم کے بھانجے)
۱۶/مارچ ۱۴۰۶ء ابن خلدون (مورخ، فقیہ، فلسفی اور سیاستدان)
۱۶/مارچ ۱۲۳۶ء خواجہ معین الدین چشتی اجمیری (ولی اللہ، عالم دین)
۱۷/مارچ ۱۹۶۸ء شجاعت علی حسنی (سابق گورنر اسٹیٹ بینک)
۱۷/مارچ ۲۰۰۹ء مصباح نجمی (مشہور ماہر تعمیرات)
۱۷/مارچ ۲۰۰۷ء رجب علی رضا (ممتاز موسیقار)
۱۸/مارچ ۱۹۹۳ء محمد خان جونیجو (سابق وزیر اعظم پاکستان)
۱۸/مارچ ۲۰۰۷ء باب ولمر (انگلستان کے سابق ٹیسٹ کرکٹر اور پاکستانی کرکٹ ٹیم کے سابق کوچ)
۱۹/مارچ ۱۳۵۱ء سلطان محمد تغلق (حکمران)
۱۹/مارچ ۱۹۹۴ء مولانا کوثر نیازی (ادیب، شاعر، سابق وفاقی وزیر)
۱۹/مارچ ۱۹۷۳ء ڈاکٹر شوکت سبزواری (ماہر لسانیات)
۲۰/مارچ ۱۷۲۷ء سر آئزک نیوٹن (دنیا کے عظیم سائنس دان)
۲۰/مارچ ۱۹۹۳ء نصیر بندہ (پاکستان ہاکی کے نامور کھلاڑی)
۲۱/مارچ ۱۹۸۲ء احسان دانش (نامور شاعر، ادیب)
۲۱/مارچ ۲۰۰۹ء محمد اقبال (پشتو کے ممتاز شاعر)
۲۱/مارچ ۱۹۹۱ء ویدت دلوکائے (شاہ فیصل مسجد کے معمار)
۲۲/مارچ ۱۸۳۱ء گوئٹے (جرمنی کا عظیم شاعر، ڈراما نویس)
۲۲/مارچ ۱۹۷۴ء جسٹس عبدالحمید (نیشنل عوامی پارٹی کے ممتاز رہنما)
۲۳/مارچ ۱۹۸۵ء غلام حسن لغاری (سابق ہوم سیکرٹری)
۲۴/مارچ ۱۶۰۳ء ملکہ الزبتھ اوّل (برطانوی ملکہ)
۲۴/مارچ ۱۹۷۶ء فیلڈ مارشل منٹگمری (دوسری جنگ عظیم کا نامور جرنیل)
۲۴/مارچ ۱۹۴۸ء علامہ نور بخش توکلی (مصنف، عالم دین)
۲۵/مارچ ۱۹۷۵ء شاہ فیصل بن عبدالعزیز (سعودی عرب کے بادشاہ)
۲۵/مارچ ۱۹۹۳ء ستار طاہر (ممتاز صحافی، ادیب، محقق، مترجم)
۲۶/مارچ ۱۹۹۳ء ماسٹر عنایت حسین (مشہور فلمی موسیقار)
۲۶/مارچ ۱۹۵۷ء پیر محمد شاہ بھیروی (پیر طریقت، عالم دین)
۲۶/مارچ ۱۹۹۸ء جوگی جھلمی (پنجابی زبان کے شاعر)
۲۷/مارچ ۱۸۹۸ء سر سید احمد خان (ماہر تعلیم، مسلم رہنما)
۲۷/مارچ ۱۹۸۶ء ڈاکٹر عبدالحئی (مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفہ، عالم دین)
۲۷/مارچ ۱۹۶۶ء نواب سر محمد یامین (مسلم لیگ کے رہنما)
۲۸/مارچ ۱۹۴۷ء اصغری بیگم (بیگم مولانا محمد علی جوہر)

ایک مقابلہ صرف نوجوانوں کے لیے

بوجھیں تو جانیں

مرتب: لیفٹیننٹ کرنل (ر) مبشر احمد (دوالمیال، چکوال) (جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر ۱۸ سے ۲۸ سال کے درمیان ہی ہے)

ماہ فروری میں دیے گئے اسلامی کوئز کے صحیح جوابات

اسلامی کوئز ۱۔ (الف) جاالحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا (ب) کوہ صفا

اسلامی کوئز ۲۔ (الف) مسلم بن عقیلؓ (ب) ۱۔ ہانی بن عروہ، ۲۔ نیک دل بوڑھی عورت

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

۱۔ محمد شکیل عباس جنجوعہ، کوٹ سنبلا نوالہ ۲۔ اقصیٰ امتیاز، آگوگی سیالکوٹ ۳۔ ظہیر احمد، منڈی بہاؤ الدین ۴۔ مس ثمینہ، اوکاڑہ

درست جوابات دینے والوں کے نام

انجینئر محمد سعید اقبال بھٹی، محمد الیاس گھمن (سیالکوٹ)، انعام اللہ بھکروی (کراچی)، محمد شکیل عباس جنجوعہ (سرگودھا)، طاہرہ عنایت (پشاور)، زریں ناز (کراچی)، اقصیٰ امتیاز (سیالکوٹ)، صفہ امتیاز (سیالکوٹ)، سید حسن مصطفیٰ (کراچی)، مس ثمینہ سکندر (اوکاڑہ)، حمیرا جبیں (ہارون آباد)، مقسم اقبال (کیانی آزاد کشمیر)، ظہیر احمد (منڈی بہاؤ الدین)، کنول سعید خانزادہ (سکرنڈ)، الفت حسین (شیخوپورہ)، عاطف ممتاز (راولپنڈی)، ساجد ممتاز (تلہ گنگ)، ابتہال سلیم (حیدر آباد)، مرزا اسفار بیگ (حیدر آباد)، مرزا فرحال بیگ (حیدر آباد)، رضا امین (فیصل آباد)، محمد عثمان (حیدر آباد)، ایاز خلیل (حیدر آباد)، طٰہٰ یسین (حیدر آباد)، حافظ عبداللہ (اوکاڑہ)، حافظ امداد اللہ (اوکاڑہ)، سدرہ سحر انجم (آزاد کشمیر)، محمد حسان ضیا (سیالکوٹ)

اسلامی کوئز/۱

حضرت خدیجہؓ آنحضور ﷺ کی پہلی زوجہ محترمہ تھیں۔ آپ ﷺ کے دل میں حضرت خدیجہؓ کا کوئی رقیب نہیں تھا۔ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک آپؓ اپنے شوہر کی واحد محبوب بیوی تھیں۔ آپ کے بطن سے سات بچے پیدا ہوئے: تین بیٹے قاسم، عبداللہ اور ابراہیم اور چار بیٹیاں: رقیہؓ، فاطمہؓ، زینبؓ اور ام کلثومؓ۔ کچھ سیرت نگاروں کے خیال میں عبداللہ ہی کو طیب اور طاہر کے نام سے پکارتے تھے۔

(الف) نکاح کے وقت حضرت خدیجہؓ عمر میں آپ ﷺ سے کتنے سال بڑی تھیں؟

(ب) آپ ﷺ کے ساتھ نکاح سے قبل حضرت خدیجہؓ نے کتنے نکاح کیے تھے؟

اسلامی کوئز/۲

اس لڑائی میں بہت مشہور مجاہدین شہید ہو چکے تھے۔ اللہ کے دشمنوں نے ان محدود سے مسلمانوں پر تیروں اور پتھروں کی بارش برسا دی تھی جو آنحضور ﷺ کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھے اور آپ ﷺ کی حفاظت کر رہے تھے۔ اسی دوران ابو وقاص کے بیٹے نے ایک پتھر پھینکا جو رسول اللہ ﷺ کے چہرہ مبارک پر آ کر لگا۔

(الف) بتایئے کہ یہ کس غزوہ کا ذکر ہے؟

(ب) اس غزوہ میں آپ ﷺ کے کتنے دانت مبارک شہید ہوئے؟

آپ کے جوابات ہمیں ۱۵ تاریخ تک مل جانے چاہئیں

مدیر اُردو ڈائجسٹ

325۔جی III، جوہر ٹاؤن لاہور

انعامات کے لیے تعاون

اسلامک پبلی کیشنز

۴۔کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور

ہیڈ آفس: بیرون منصورہ ملتان روڈ لاہور